حقیقۃ الفقہ

جلد اوّل و دوم

تالیف حقائق آگاہ فقاہت دستگاہ حضرت شیخ الاسلام عارف باللہ
امام محمد انوار اللہ فاروقی فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ بانی جامعہ نظامیہ

بحسن تعاون: مولانا ابو حمد موسی بن عبد الجلیل باحجاج العجاج غفر اللہ لہ ولوالدیہ
مولوی عالم جامعہ نظامیہ۔ حال مقیم شارجہ، متحدہ عرب امارات

ناشر: مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ
حیدر آباد، الہند

بار چہارم	بموقع صد سالہ عرس شریف شیخ الاسلام بانی جامعہ علیہ الرحمہ
تاریخ طبع	فبروری ۲۰۱۵ء
قیمت	300/-
تعداد	1000 ایک ہزار
کتابت	جامعہ نظامیہ کمپیوٹر سنٹر
طباعت	مطبعة ابو الوفاء الافغانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد
ناشر	مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد

پتہ

دفتر مجلس اشاعت العلوم، جامعہ نظامیہ

حیدرآباد ۵۰۰۰۶۴ ٹی۔ایس (الہند)

فون: 24576772 / 24416847 فیاکس: 0091 40 24503267

ویب سائٹ : www.jamianizamia.org

ای میل : fatwa@jamianizamia.org

fatwajamianizamia@yahoo.com

کشفِ رموز

حقیقۃ الفقہ

(حصۂ اول)

ص . الانتصار للعلامة سبط ابن الجوزی الحنبلی ثم الحنفی رحمه الله

ت . تبییض الصحیفة للامام السیوطی الشافعی رحمه الله

خ . الخیرات الحسان للمحقق ابن الحجر المکی الشافعی رحمه الله

م . مناقب الامام رحمه الله للامام الموفق رحمه الله

ک . المناقب للامام الکردری رحمه الله

فہرست مضامین حقیقۃ الفقہ حصہ اول

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سید المرسلین و الہ و اصحابہ اجمعین امابعد !

فقہ حنفی وتقلید پر غیر مقلدین جو اعتراض کرتے ہیں اس کے جواب میں شیخ الاسلام حضرت العلامہ عارف باللہ امام حافظ محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمۃ بانی جامعہ نظامیہ نے تقلید کو قرآن کریم واحادیث شریفہ واجماع امت اور عقلی نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا اور تقلید شخصی کے جواز میں مدلل بحث فرماتے ہوئے ایک عظیم کتاب دو جلدوں میں ''حقیقۃ الفقہ'' کے نام سے تحریر فرمائی۔ خاص کر فقہ حنفی پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن واحادیث کے خلاف ہے' شیخ الاسلام نے فقہ حنفی کے تمام مسائل کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہونا ثابت فرمایا اور یہ بتلایا کہ اکابر محدثین امام صاحب کے ثناخواں ومقلد رہے۔

یہ کتاب تین مرتبہ طبع ہونے کے باوجود اس کے تمام نسخے ختم ہو چکے ہیں' اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مجلس اشاعت العلوم نے حضرت علیہ الرحمہ کے صد سالہ عرس کے ضمن میں کمپیوٹر کتابت کے بعد دونوں جلدوں کو یکجا کر کے چوتھی مرتبہ شائع کرنے کا قصد کیا' مولوی حافظ محمد عبید اللہ فہیم قادری ملتانی صاحب منتظم جامعہ نظامیہ نے اس سلسلہ میں سعی فرمائی' مولانا سید ضیاء الدین نقشبندی شیخ الفقہ' مولوی سید واحد علی اور مولوی محمد خالد علی اساتذۂ جامعہ اور ان کے معاونین طلبۂ جامعہ نے نہایت ہی دقیق النظری سے اس کی پروف ریڈنگ کی اور محترمی مولانا ابو محمد موسیٰ بن عبد الجلیل باحاج العجاج صاحب نے اپنے زر خاص سے اعانت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط

(حضرت مولانا مفتی) محمد عظیم الدین (دامت برکاتھم)
مفتی جامعہ نظامیہ' حیدر آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغاز سخن

الحمدلله رب العالمين والصلوة و السلام على سيدالانبياء و المرسلين و على اله و اصحابه اجمعين . امابعد !

یہ بات سب پر عیاں ہے کہ ابتداء اسلام سے یعنی دور تابعین سے اسلام میں مختلف فرقوں کی ابتداء ہوئی اور ہر فرقہ شد و مد سے اپنے دلائل پر قائم رہا اور اس کی تبلیغ کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا رہا جس کی وجہ سے بعض وقت جدال و قتال کی بھی نوبت آئی۔ ان تمام نو ایجاد فرقوں کی بنیاد عقل پر تھی، جس کی وجہ سے وہ عوام کو عقلی دلائل بیان کر کے گمراہ کیا کرتے تھے اور عوام ان دلائل سے، جو نصوص سے ثابت ہیں، ناواقف ہونے کی بناء پر مخالفین کی بات کو قبول کر لیتے۔ جب اس طرح کے فتنے زور پکڑنے لگے تو علماء حق یعنی علمائے اہل سنت ان کے ابطال کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور انہوں نے بھی علوم عقلیہ حاصل کئے، اس کے بعد قرآن و حدیث کے دلائل اور عقلی براہین سے ان کا ابطال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے مسلک حق، مذہب خیر محفوظ ہو گیا اور عوام گمراہی سے بچ گئے۔ حضرت شیخ الاسلام بانی جامعہ علیہ الرحمۃ نے اپنی زبان و قلم سے ان باطل فرقوں کا ابطال کیا اور موثر انداز میں حق کو ثابت کیا۔ اسی کا ایک حصہ زیر نظر کتاب حقیقۃ الفقہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حضرت نے فقہ کی حقیقت، اہمیت و ضرورت کو بتلایا تا کہ مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ ختم ہو جائے کہ فقہ کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ پھر اس کے بعد فقہاء کی خدمات کو واضح کیا اور بتلایا کہ استخراج مسائل میں فقہاء نے کیسی کوشش کی اور اس سے ملت کو کس طرح فائدہ ہوا، اس کے بعد امام الائمۃ حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات، شخصیت، لیاقت، زہد و ورع، علم و کمال اور محدثین و مفسرین و فقہاء کی نظر میں آپ کی شان و عظمت کو تفصیل سے بیان کیا اور جن افراد نے آپ پر طعن کیا اور آپ کی ذات پر اور آپ کی علمیت پر اعتراض کیا ان تمام اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے علماء و طلبہ کے اندر ایک قوت استدلال پیدا ہوتی ہے۔ یہ کتاب، جس میں فقہ کی تمام جہات کا احاطہ کیا گیا ہے طالبان حق کے لئے نعمت عظمی ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے خود قاری کو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کی تصنیف میں حضرت مصنف علام نے کس قدر محنت شاقہ کی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ یہ کتاب متقدمین کی کتابوں کا خلاصہ، اس پر قابل قدر اضافہ اور عقلی و نقلی دلائل کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ آپ کے صد سالہ عرس شریف کے ضمن میں اس کی از سر نو کمپوزنگ و پروف ریڈنگ کی جا کر دو جلدوں کو یکجا کرتے ہوئے شائع کیا جارہا ہے تا کہ طلبہ و علماء اور عامۃ الناس کو استفادہ ہو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سابق کی طرح اس کتاب کو اب بھی مقبول عام بنائے اور خلق خدا کو اس سے فائدہ پہنچے۔ آمین

بجاه سيد الانبياء و المرسلين صلى الله عليه و اله و اصحابه و بارک و سلم ۔ فقط

(حضرت مولانا) مفتی خلیل احمد (دامت برکاتہم)
شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ، حیدرآباد

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد و آله و اصحابه اجمعین .

ضرورتِ فقہ

امّا بعد۔ خیر خواہ اسلام مفتقر الی اللہ محمد انوار اللہ الحنفی، ابن مولائی مرشدی مولوی حافظ محمد شجاع الدین صاحب قندہاری، دکنی، حنفی، نقشبندی، قادری، چشتی غفر الله له و جعل الجنة مثواه و نور مرقده اہل اسلام کی خدمت میں گزارش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو ابدی بنایا یعنی اس عالم کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا اور کبھی فنا نہ ہوگا۔ پھر نشأۃ انسانی کا ظہور اس عالم میں اس طور پر ہوا کہ اس کو جسم دیا گیا جو دو حصوں پر منقسم ہے؛ ظاہری اور باطنی، اور ہر حصہ میں متعدد اعضاء متعدد کاموں کے لئے بنا کر باطنی پورا حصہ حق تعالیٰ نے خاص اپنے تصرف میں رکھا یعنی آدمی اپنے اختیار سے کوئی کام اُس حصہ کے اعضاء سے نہیں لے سکتا اور ظاہری حصہ کے اعضاء جو اُس کے کام کرنے کے لئے آلات بنائے گئے ہیں، کسی قدر اُس کے تصرف میں دے گئے ہیں جن سے جو جی چاہتا ہے کام لے سکتا ہے, پھر انسان کو پیدا کرنے سے جو مقصود ہے' اس آیۂ شریفہ میں بیان فرمایا ''وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون''، یعنی ہم نے جن وانس کو فقط اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس آیت پر ایمان لانے کے بعد مسلمانوں کو ضرور تھا کہ تمام کاروبار چھوڑ کر صرف عبادت الٰہی میں مشغول ہو جائیں اور عمر بھر کوئی دوسرا کام نہ کریں، مگر حق تعالیٰ نے اُس کے ساتھ ہی کسب معیشت اور نکاح وغیرہ جتنے کام بقائے شخصی اور بقائے نوعی سے متعلق ہیں' ان میں قطعی حکم دیا کہ وہ سب کام کئے جائیں اور

صرف حکم ہی نہیں، بلکہ اُس کے ساتھ ترغیبیں دی گئیں کہ اگر یہ کام عمدگی سے ادا کئے جائیں تو اُس کے صلہ میں اعلیٰ درجہ کی نعمتیں آخرت میں ابدالآباد کے لئے دی جائیں گی، اوران کاموں کے طریقے بتلا دیئے گئے کہ اس طرح کئے جائیں اور جتلا دیا گیا کہ اگر اُن طریقوں سے انحراف ہوا اورخدا و رسول کے حکم کے مطابق وہ کام نہ کئے جائیں تو اُس کی باز پرس بلکہ سزائے ابدی ہوگی ,اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا اپنی ذاتی ضرورتوں میں مشغول ہونا بھی عبادت الٰہی ہے بشرطیکہ شریعت کے مطابق ہو۔اب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو کام کرے اُنہی طریقوں پر کرے جو خدا اور سول نے بتلا دیئے ہیں جس سے کھانا، پینا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، بیع وشراء، عیش وعشرت وغیرہ سب کام عبادت ہی عبادت ہوجائیں جیسا کہ ارشاد ہے قولہ تعالیٰ ’’ **تلک الجنة التی اورثتموها بما كنتم تعملون** ‘‘یعنی مسلمانوں سے قیامت کے روز کہا جائیگا کہ یہ جنت جس کے تم وارث کئے گئے، اُن کاموں کا بدلہ ہے جو دنیا میں تم کرتے تھے۔کام تو سبھی کرتے تھے مگر مسلمانوں کے کام اُس طریقہ پر تھے جس کی تعلیم خدائے تعالیٰ نے کی تھی اور وہ سب کام بطور عبادت کیا کرتے تھے جس کے معاوضہ میں جنت دی گئی۔

ہر ایک کام کے طریقے مسلمانوں کو جو بتلائے گئے۔قرآن وحدیث میں سب مذکور ہیں ,مگر چونکہ مختلف اسباب سے قرآن وحدیث کو سمجھ کر نکالنے میں دشواریاں واقع ہوگئی ہیں، جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا، اس وجہ سے ہر شخص میں صلاحیت نہیں کہ خود قرآن وحدیث سے وہ نکال سکے اس لئے علماء **شکر اللہ سعیھم** نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ مختلف آیات واحادیث واقوال صحابہ وغیرہم سے تحقیق کر کے ہر ایک مسئلہ مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کہ اس میں یہ کرنا چاہئے، چنانچہ ایک مدت کی کوشش میں انہوں نے ہر ایک جزئی مسئلہ کا حکم قرآن وحدیث سے نکال کر ایک علم ہی مستقل مدون کر دیا جس

کا نام فقہ ہے، یہ ہے حقیقت فقہ۔

تفصیل اس اجمال کی کئی اُمور سے متعلق ہے، جن کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے اگر غور سے ملاحظہ فرمایا جائے تو بشرط انصاف معلوم ہو جائیگا کہ فقہا نے جو کام کیا، کس قدر ضروری تھا اور اُن کی جانفشانیاں کس درجہ قابل قدر ہیں۔

قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کرنا ہر کسی کا کام نہیں

یہ امر پوشیدہ نہیں کہ قرآن شریف، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ میں واقع ہے جس کو مخالفین نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ کیونکہ جب دعویٰ سے کہا گیا ''**فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله ان كنتم صادقين**'' تو کسی سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ایک دو سطر لکھ کر پیش کر دیں جو فصاحت و بلاغت میں قرآن کا جواب ہو سکے اس سے بلاغت قرآن کا معجز ہونا بداہۃ ثابت ہے۔ اور کلام بلیغ کا خاصہ ہے کہ باوجود عام فہم ہونے کے اکثر مضامین اُس میں ایسے بھی ہوں کہ خاص خاص لوگ ہی اُس پر مطلع ہوسکیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے ''**الكناية ابلغ من التصريح**'' کنایہ کے ابلغ ہونے کی کوئی وجہ سوائے اس کے نہیں کہ اُس کا پورا پورا مضمون سمجھنا خاص لوگوں کا ہی حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ نکتہ رس اور سخن شناس علماء نے غور وفکر کر کے ایک ایک آیت کے کئی کئی معنی بیان کیے جن کا سمجھ لینا بھی ہر کسی کا کام نہیں پھر جس طرح عبارت قرآن سے مسائل سمجھے جاتے ہیں، دلالت اور اشارت اور اقتضاء سے بھی سمجھے جاتے ہیں۔ اور اس کے سوا نظم اور معانی سے اتنے مباحث متعلق ہیں کہ اُن کے بیان میں خاص ایک فن اصول فقہ مدون ہوگیا ہے۔ غرض ہر کسی کا کام نہ تھا کہ ان مباحث پر مطلع ہو کر قرآن سے مسائل نکال سکتا۔

پھر قرآن شریف میں ناسخ ومنسوخ آیتیں بھی ہیں اور ہر ایک آیت کی تاریخ نزول نہیں

لکھی گئی جس سے ناسخ آیتیں جو واجب العمل ہیں معلوم ہو جائیں اور جو اقوال وارد ہیں متواتر نہ ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت نہیں، بہر حال ناسخ آیتوں کا معین کرنا قرائن حالیہ و مقالیہ سے متعلق ہے جس کے لئے اعلیٰ درجہ کی فہم درکار ہے۔

پھر اسی قسم کی دقتیں احادیث کے سمجھنے میں بھی پیش آئیں اور علاوہ اس کے احادیث میں اختلاف بھی بہت کچھ واقع ہو گیا ہے، اس وجہ سے کہ صحابہ وقتاً فوقتاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے رخصت ہو کر اپنے قبائل کو اور جہاد وغیرہ کیلئے جایا کرتے تھے اور جو حضرات مدینۂ منورہ میں رہتے تھے وہ بھی ہر وقت حاضر خدمت نہیں رہ سکتے تھے۔ غرضکہ غیر حاضری کے زمانہ میں سب ارشادات اُن کو نہیں معلوم ہوئے اور جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا اُس کا بیان کر دینا بھی اُن کو ضرور تھا اس وجہ سے ہر قسم کے احادیث مخلوط ہو گئیں اور ہر مسئلہ میں مابعد کے اقوال و افعال ممتاز نہ ہو سکے جو ناسخ سمجھے جاتے کیونکہ جس طرح قرآن میں ناسخ و منسوخ ہیں احادیث میں بھی ہیں جن کا قرائن سے معین کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔

پھر قرآن و حدیث میں جس طرح الفاظ معانی موضوع لہ میں مستعمل ہیں، غیر معانی موضوع لہ میں بھی مستعمل ہیں اور یہ معلوم کرنا بھی ہر کسی کا کام نہیں کہ کونسا لفظ حقیقی معنی میں مستعمل ہے اور کونسا مجازی معنی میں، پھر مقصود شارع یہ ہے کہ ہر کلام کے سمجھنے میں قرائن سے مدد لیجائے، گو الفاظ مساعدت نہ کریں چنانچہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے ''عن سالم عن ابیه قال بعث النبی صلی الله علیه وسلم خالد ابن الولید الی بنی جذیمة فدعاهم الی الاسلام فلم یحسنوا ان یقولوا اسلمنا فجعلوا یقولون صبأنا صبأنا فجعل خالد یقتل منهم و یاسر و دفع الی کل رجل منا اسیره حتی اذا کان یوم امر خالد ان یقتل کل

رجل منا اسیرہ فقلت واللہ لا اقتل اسیری و لا یقتل رجل من اصحابی اسیرہ حتی قدمنا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فذکرناہ لہ فرفع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدہ فقال اللھم انی ابرا الیک مما صنع خالد مرتین رواہ البخاری ''ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی خزیمہ کی طرف بھیجا' اُنہوں نے اُن کو اسلام کی دعوت دی مگر اُن لوگوں نے صاف طور پر یہ نہ کہا کہ ہم اسلام لائے بلکہ صبأ ناصبأ نا کہنے لگے یعنی ہم اپنے دین سے پھر گئے خالد رضی اللہ عنہ نے اُس کا خیال نہ کر کے اُن کو قتل کرنا اور قید کرنا شروع کیا' چنانچہ ایک ایک قیدی ایک ایک شخص کے حوالہ کیا پھر ایک روز حکم دیا کہ ہر شخص اپنے قیدی کو قتل کر ڈالے میں نے کہا : خدا کی قسم! میں اور میرے ساتھ والے ہرگز قتل نہ کریں گے، جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ واقعہ بیان کیا تو حضرت ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے الٰہی! خالد نے جو کیا ہے میں اُس سے بری ہوں، یہ الفاظ دو مرتبہ فرمائے انتہیٰ۔ اس سے ظاہر ہے کہ معنی سمجھنے میں قرائن سے مدد لینے کی سخت ضرورت ہے اور ظاہر الفاظ سے جو مضمون سمجھا جاتا ہے ہمیشہ وہی مقصود نہیں ہوا کرتا، اس لئے قرآن وحدیث کا پورا پورا مطلب سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں۔

پھر چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اوتیت جوامع الکلم'' اس سے ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کی عبارتوں میں کئی پہلو ہوا کرتے ہیں جن سے مسائل کا استنباط مختلف طور پر ہوسکتا ہے' اُن کا معلوم کرنا بھی ہر کسی کا کام نہیں۔

پھر اکثر احکام میں علّتیں ملحوظ ہوا کرتی ہیں جن سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ جہاں وہ علت پائی جائے قیاس سے وہ حکم ثابت کیا جائے اور علّت کا معین کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

فقیہ اور مجتہد

غرض اس قسم کے مختلف اسباب سے ایسے علماء کی ضرورت ہوئی کہ علاوہ آیات واحادیث یاد رکھنے کی ایسی بھی طبیعت رکھتے ہیں کہ شارع کے مقصود کو قرائن اور جودت طبیعت سے معلوم کرسکیں، انہیں کو فقیہ اور مجتہد کہتے ہیں اور اس قسم کے علماء بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے "**عن معاویة رضی الله عنه قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین و انما انا قاسم و الله یعطی رواه البخاری** "فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدائے تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے اُس کو دین میں سمجھ دیتا ہے۔ میں صرف قاسم ہوں اور دینے والا اللہ ہے ۔قسطلائیؒ نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ جس کو جیسی فہم دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔یعنی صحابہ احادیث سنتے تھے اور اُن سے صرف ظاہری معنی سمجھ لیتے تھے اور بعض بہتیرے مسائل اُن سے استنباط کرتے تھے۔اسی طرح مابعد کے قرون کے علماء کا حال رہا ہے انتہیٰ۔

قسطلائیؒ نے یہ مضمون اس حدیث شریف سے لیا ہے "**عن انس و ابن مسعود و زید ابن ثابت رضی الله عنهم قالوا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم نضر الله عبداً سمع مقالتی فوعاها و حفظها ثم اداها الی من لا یسمعها فرب حامل فقه غیر فقیه و رب حامل فقه الی من هو ا فقه منه رواه احمد و ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجه وغیر هم کذا فی کنز العمال** "یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدائے تعالیٰ تروتازہ رکھے اُس بندہ کو جس نے میرے اقوال سنے اور یاد رکھ کر اُن لوگوں کو پہونچایا جنہوں نے سنا نہیں کیونکہ بہت روایت کرنے والے سمجھدار نہیں ہوتے اور بعض سمجھدار تو ہوتے ہیں مگر جن کو وہ پہنچاتے ہیں اُن میں ایسے بھی لوگ ہوں گے

جواُن سے افقہ ہوں اور دارمی کی روایت میں ہے کہ فرب حامل فقه ولا فقه له جس کا مطلب یہ ہے کہ اکثر روایت کرنے والوں کو یعنی محدثین کو سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

محدثین وفقہاء کے فرائضِ منصبی

اس سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہر ہے کہ محدثین کا اتنا ہی کام ہے کہ روایتیں فقہاء کو پہونچادیں تا کہ وہ خوض وفکر کر کے مفید مفید مضامین نکالیں جن سے راویوں کی سمجھ قاصر ہو' کیونکہ جمیع مالہ وما علیہ کی رعایت کرنی ہر راوی کا کام نہیں جیسا کہ اِس روایت سے ظاہر ہے جو کنز العمال میں ہے''عن الحسن مرسلاً قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم همة العلماء الرعاية و همة السفهاء الرواية رواه ابن عساكر'' اور مختصر کتاب''النصيحة لاهل الحديث'' تصنیف حافظ ابوبکر خطیب بغدادیؒ میں لکھا ہے''و روى باسناده الى على ابن موسىٰ الرضىٰ عن جده عن آبائه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كونوا دراة ولا تكونوا رواة''یعنی ائمہ اہل بیت کی اسناد سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم سمجھ حاصل کرو روایت کرنے والوں میں مت ہو۔ غرضکہ متعدد روایتوں سے ثابت ہے کہ مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف روایت حدیث نہیں بلکہ احادیث میں غور کرنا اور فقیہوں کو پہونچانا ہے' جن کا کام یہ ہے کہ جیسی جیسی ضرورتیں پیش آئیں، وہ ہر امر کی رعایت کر کے اُن احادیث سے استنباط مسائل کیا کریں۔

فقہ کے معنی

ہر راوی حدیث کو فقیہ اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ لغت کی رو سے اطلاق اس لفظ کا

اُن پر ہوسکتا ہے نہ اصطلاح اور عرف شرعی سے اس لئے کہ فقہ کے لغوی معنی شق و فتح کے ہیں جیسا کہ علامہ زمخشری نے فائق میں لکھا ہے ''**الفقہ حقیقة الشق و الفتح والفقیہ العالم الذی یشق الاحکام و یفتش عن حقائقھا و یفتح ما استغلق منھا**'' یعنی فقہ کے اصلی معنی شق و فتح کے ہیں اور فقیہ اُس عالم کو کہتے ہیں جو احکام میں موشگافیاں کر کے اُن کے حقائق کو معلوم کرے اور مشکل اور مغلق امور کو کھولدے انتہی ۔ چونکہ راوی کو نہ شق احکام سے تعلق ہے نہ فتح مغلقات سے، غرض اس لئے وہ فقیہ نہیں ہوسکتا اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کا اطلاق فرمایا ہے وہاں یہ بھی تصریح فرما دی کہ بہتیرے راوی فقیہ نہیں ہوتے ،جس سے صاف معلوم ہوگا کہ ہر محدث کو فقیہ نہیں کہہ سکتے ۔

فضائلِ فقیہ

پھر اس کے بعد خاص طور پر فقہاء کی تعریفیں کیں، چنانچہ جامع الصغیر میں ہے ''**قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لکل شئ دعامة و دعامة ھذا الدین الفقہ و فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**'' یعنی ہر چیز کے لئے ایک ستون ہے جس پر اُس کا مدار ہوتا ہے اور اس دین کا ستون فقہ ہے اور ہزار عابد شیطان پر ایسے سخت نہیں جیسے ایک فقیہ اُس پر سخت اور سرکوب ہے ۔ اِس کے سوا اور بہت سی حدیثیں ،فقیہ کی تعریف اور فضائل میں وارد ہیں جن سے ظاہر ہے کہ محدثین میں فقہاء ممتاز اور مدارج عالیہ سے سرفراز ہیں ۔ کنز العمال کی **کتاب الطھارة** میں یہ روایت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: مجاہدؒ کہتے ہیں کہ ایک روز میں اور عطا اور طاؤس اور عکرمہ رحمہم اللہ بیٹھے ہوئے تھے ، اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نماز پڑھ رہے تھے ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ جب میں پیشاب کرتا ہوں تو ماء

دافق یعنی منی نکلتی ہے، کیا اُس سے غسل واجب ہوتا ہے؟ ہم نے کہا کہ کیا وہی ماء دافق نکلتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے، کہا: ہاں! ہم نے کہا جب تو غسل واجب ہے، وہ شخص انّا للہ پڑھتا ہوا چلا گیا۔ ابن عباسؓ نے جلد نماز سے فارغ ہو کر عکرمہ سے کہا اُس شخص کو بلا لاؤ چنانچہ جب وہ آیا تو پہلے ہم سے پوچھا کیا تم نے قرآن سے فتویٰ دیا؟ ہم نے کہا: نہیں ،فرمایا: حدیث سے؟ ہم نے کہا: نہیں ،فرمایا صحابہ کے اقوال سے؟ ہم نے کہا نہیں، پھر فرمایا : آخر کس کے قول پر فتویٰ دیا؟ ہم نے کہا اپنی رائے سے یہ سنکر فرمایا'' **لذلک یقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد** ''یعنی اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے اشد ہے، پھر اُس سائل سے پوچھا کہ پیشاب کے بعد جو چیز نکلتی ہے اُس کے نکلتے وقت تمہارے دل میں شہوت یعنی عورت کی خواہش ہوتی ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا اعضاء میں استرخا یعنی ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا اِس صورت میں وضو تمہارے لئے کافی ہے انتہی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب دیکھا کہ ماء دافق کے لفظ پر اُن محدثین کو دھوکہ ہوا اور صرف ظاہری معنی پر اُنہوں نے فتویٰ دے دیا اور علّت غسل پر غور نہیں کیا تو سمجھ گئے کہ اُن میں کوئی فقیہ نہیں اگر فقیہ ہوتے تو علّت غسل کی تشخیص ضرور کرتے، پھر جب دیکھا کہ علّت غسل یعنی خروج منی کے لوازم نہیں پائے جاتے، اِس لئے فتویٰ دیا کہ وہ منی ہی نہیں، اِس وجہ سے غسل بھی واجب نہیں۔ اِس سے ظاہر کہ فقیہ کی جو تعریف وتوصیف احادیث میں وارد ہے اُس کو اعلیٰ درجہ کی سمجھ اور موشگافیاں درکار ہیں اور مجاہد اور عطا اور طاؤس اور عکرمہ رحمہم اللہ جیسے اکابر محدثین کو (جو تقریباً کل محدثین کے اساتذہ اور سلسلہ اساتذہ میں ہیں) فقیہ نہیں سمجھا۔ اِس وجہ سے کہ اُنہوں نے علّت کی تشخیص نہیں کی اور کمال افسوس سے فرمایا کہ اِسی وجہ سے (کہ فقیہ اور سمجھدار لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور کم فہم فتویٰ کے لئے ظاہری

نصوص کو کافی سمجھتے ہیں)۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیہ کی تعریف کی کہ شیطان کے مقابلہ میں وہ ہزار عابد سے بہتر ہے، اس لئے کہ شیطان کا مقصود اصلی یہی ہے کہ خلاف شرع لوگوں سے کام کرائے اور بیچارہ عابد کو عبادت میں اتنی فرصت کہاں کہ معانی نصوص اور مواقع اجتہاد میں غور وفکر کر کے آپ ایسا حکم دے کہ خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق ہو جیسے محدثین کو ضبط اسانید اور تحقیق رجال وغیرہ فنون حدیث کے اشتغال میں اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ تو خاص فقیہ کا کام ہے کہ ہر مسئلہ میں تمام آیات واحادیث متعلقہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی طبیعت وقاد سے کام لیتا ہے اور ان میں موشگافیاں کر کے کوشش کرتا ہے کہ شارع کی مرضی معلوم کرے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ''ہر مردے و ہر کارے'' جامع ترمذی میں یہ روایت ہے ''**عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خصلتان لا يجتمعان فی منافق حسن سمت ولا فقه فی الدين** ''یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دو خصلتیں منافق میں نہیں جمع ہوتیں، اہل خیر کا طریقہ اختیار کرنا اور فقہ فی الدین یعنی دین کے معاملات و مسائل میں سمجھ۔ اور جامع الصغیر میں یہ روایت ہے ''**قال النبی صلى الله عليه وسلم افضل العبادة الفقه. طب عن ابن عمر رضی الله عنهما** ''یعنی تمام عبادتوں میں افضل فقہ ہے اس سے محدثین اور فقہاء کا فرق اور ہر ایک وظیفے بھی معلوم ہو گئے کہ محدثین کا کام صرف احادیث کی حفاظت ہے، صحیح حدیثیں تلف نہ ہوں اور کسی دوسرے کا کلام حدیث نہ بن جائے اور فقہاء کا کام ان احادیث محفوظہ میں خوض وفکر کرنا ہے۔

محدثین نے اپنے فرائضِ منصبی عمدگی سے انجام دیئے

ملاحظۂ فن رجال سے واضح ہے کہ محدثین نے اپنی خدمت اور فرائض منصبی جس خوبی

اور عمدگی سے ادا کئے، اُس کی نظیر نہ کسی اُمت میں مل سکتی ہے نہ اسلامی کسی دوسرے فرقہ میں اُن کے حافظے' تقویٰ' دیانت' تورع' صدق' جفاکشی وغیرہ ضروریات اِس درجہ کو پہونچے ہوئے تھے کہ اُن پر اطلاع ہونے کے بعد ہر منصف مزاج بے اختیار یہی کہے گا کہ جن احادیث کو محدثین اہل سنت و جماعت نے صحیح کہا ہے بے شک وہ صحیح ہیں۔ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو اِس دین کی حفاظت ایسے طور پر منظور تھی کہ اصلی دین شیطانی تصرف سے محفوظ رہے اور جس طرح دوسرے ادیان میں آسمانی کتابوں اور اقوال واحوال انبیاء میں تحریفیں ہوگئیں، اس میں نہ ہونے پائیں۔ اس لئے ہر زمانہ میں لاکھوں مسلمانوں کو توفیق دی کہ قرآن شریف پورا یاد کرلیا کریں، چنانچہ اس تدبیر سے اپنا کلام پاک ہم تک ایسا پہونچایا کہ اُس میں ایک لفظ کی غلطی اور تحریف کا ہم کو تو کیا مخالف کو بھی خیال نہیں آسکتا۔ اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی حفاظت کے لئے ان حضرات کو پیدا کیا جن کے تاریخی حالات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ان حضرات کو فقط حفاظت احادیث نبویہ کے واسطے پیدا کیا تھا اور جتنے ضروری امور اس سے متعلق تھے سب اُن کے حق میں ایسے کر دیئے جیسے فطرتی اور طبیعی امور ہوا کرتی ہیں، چنانچہ ان حضرات کی سعی سے احادیث نبویہ مخالفین اسلام کے تصرفات سے محفوظ رہ کر اصلی اور صحت کی حالت پر ہم تک پہونچیں۔ ہر چند تیرہ سو سال کے عرصہ میں ہر ملک اور قوم میں بڑے بڑے انقلاب واقع ہوئے ملاحدہ اور زنادقہ نے بہت کچھ کوششیں کیں کہ دین محفوظ نہ رہے اور عموماً مسلمانوں کے احوال میں تغیر آ گیا اور ہر زمانہ میں ان حضرات کو دھمکیاں دی گئیں، توہین وتذلیل کی گئی مگر انہوں نے اپنے استقلال کو نہ چھوڑا اور جس طرح امم سابقہ کے علماء تحریفیں کرتے تھے جس کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے ''**فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ**

ثمناً قلیلاً ''ان حضرات نے اُس کا خیال تک آنے نہ دیا اور جس طرح اس زمانہ کے بعض اہل علم طمع دنیوی یا توہین وتذلیل کے خیال سے معنوی تحریفیں کر کے قوم میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے نہیں کیا بلکہ اکثروں نے اسی وجہ سے قصداً افقر وفاقہ اختیار کیا کہ طمع دنیوی یا خیال توہین کسی ناشائستہ حرکت کا باعث نہ ہوجائے۔ آج کل جو دیکھا جاتا ہے کہ ہر طرف سے علماء پر حق ناحق اعتراضوں کی بوچھار ہے جس کے جی میں جو کچھ آتا ہے کہہ دیتا ہے، چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ قوم کو انہی لوگوں نے تباہ کیا، اس لئے کہ ان کے فائدہ کے مسئلے (مثلاً ربوا خواری کی حلت، عورتوں کو اجنبی مردوں کے ساتھ میل جول کی اجازت وغیرہ امور) اُن کو یہ لوگ نہیں بتلاتے، حالانکہ دنیوی ترقی اور آسائش ان امور سے متعلق ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ عربی خصوصاً دینی علوم پڑھا کر یہ لوگ مسلمانوں کو بیوقوف اور مفلس بناتے ہیں، پھر اُن کے القاب اور خطاب ایسے ایسے تراشے جاتے ہیں (مثلاً ملاٹے قلاعوذئے وغیرہ) جن کے سننے سے غیرت دار آدمی کبھی مولویت کا نام نہ لے سکے، چنانچہ اِسی وجہ سے بعضوں کو داڑھی قصر کرنے اور ترکی ٹوپی بلکہ کوٹ پتلون پہننے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ کوئی ملاٹا نہ سمجھ لے۔ اس زمانہ کے اکثر مولوی تو چند فقروں سے اتنے گھبرائے کہ وضع بدل ڈالی، اور اُن حضرات کو دیکھئے کیسی کیسی ذلتیں اور آفتیں انہوں نے اٹھائیں ادنیٰ ادنیٰ بات پر قید کئے جاتے تھے اُن کو سر بازار کوڑے مارے جاتے تھے، یہاں تک کہ قتل کئے جاتے تھے جن کی ہزار ہا نظیریں کتب سیر وتواریخ میں موجود ہیں، باوجود اس کے نہ اُن حضرات نے کبھی اپنی وضع بدلی نہ مولویت کو چُھپایا بلکہ عام مجلسوں میں بالاعلان احادیث کو صاف صاف بیان کر دیتے، خواہ قوم اپنے حق میں اُن کو مفید سمجھیں یا مضر اور جس طرح ہوسکتا شہر بشہر اُن کی اشاعت کرتے، کیوں نہ ہو یہ حضرات اشاعت دین میں جو مصیبتیں پیش آتیں اُن کو سرمایہ عزت اُخروی سمجھتے تھے، اُن کو اپنے نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہر امر میں پیش نظر رہتی تھی، وہ جانتے تھے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی بڑی مصیبتیں جھلینی پڑی ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث میں ایسی حدیثیں بھی بکثرت ہیں جن پر عمل کرنے سے سردست نقصان ہے اور مقتضائے طبیعت ہے کہ اِس قسم کے امور کو اور اُن کے پھیلانے والوں کو آدمی دشمن سمجھتا ہے اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ علماء اکثر قوم کے ہاتھوں اقسام کی سختیاں اٹھایا کئے، اِس سے یقینی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن رجال میں جس قدر اوصاف اِن حضرات کے لکھے گئے ہیں وہ سب صحیح ہیں، کیونکہ اُن میں تقویٰ، تدیّن، صدق، راستبازی، خوف خدا وغیرہ نہ ہوتے تو آخری زمانہ کے بعض مولویوں کی طرح وہ بھی ہاں میں ہاں ملاتے اور کم سے کم اتنا تو ضرور کرتے کہ جو روایتیں نفع دنیوی کے مانع ہیں اُن کو شائع ہی نہ کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خدا اور رسول کے احکام پہونچانے میں نہ عزت کی پروانہ کی نہ جان و مال کی اور جس طرح صحابہ سے انہیں حدیثیں پہونچی تھیں بلاکم وکاست پہونچا دیں۔

روایت ودرایت

اب اگر کوئی شخص اپنے پر قیاس کر کے کہے کہ محدثین کے تقویٰ اور زہد اور حفظ اور جفاکشی وغیرہ کی حد سے زیادہ تعریفیں جو فن رجال میں لکھی گئی وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ جو روایت درایت کے خلاف ہو وہ قابل تسلیم نہیں، تو اس کا علاج نہیں' دنیا میں اقسام کی طبیعتیں ہیں' بہتیرے طبیعتوں میں تسلیم کا مادہ ہی نہیں ہوتا، اس پر کھلی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صدق' راستبازی' معجزات وغیرہ اظہر من الشّمس تھے جس کی شہرت سے دور دور کے قبائل جوق جوق آ کر مشرف باسلام ہوتے تھے، مگر نزدیک

والے بہتیرے ایسے بھی تھے کہ اُن کو جنبش ہی نہ ہوئی اوران مشاہدات کو بھی درایت کے مخالف سمجھ کر نہ مانا، اس طبیعت کے لوگوں سے کسی بات کی تسلیم کی کیا توقع۔مگر یہاں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان دینی حیثیت سے روایت حدیث کی تصحیح کا مدار درایت پر رکھ سکتا ہے یانہیں؟ ہمیں قران وحدیث اور عقل سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ خدا کے کلام میں کذب کا احتمال ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں، اس وجہ سے خدا ورسول کے کلام میں جو خبریں قرون سابقہ کی یا دوسرے عالم کی مذکور ہیں اگر خلاف عقل بھی ہو تو دینی حیثیت سے اُن کا تسلیم کرنا مسلمان کا فرض ہے، ان خبروں کو اگر کوئی اس لحاظ سے کہ درایت کے مخالف ہیں نہ مانے اور تاویلیں کر کے اُن کا مطلب ہی دوسرا بنادے تو یہ سمجھا جائیگا کہ اُس نے نہ خدا کو خدا سمجھا نہ رسول کو رسول، ایسے لوگوں کا دعویٰ اسلام دینی حیثیت سے بلا دلیل ہوگا۔ البتہ قومی حیثیت سے ضرور قابل قبول ہے، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں منافق موجود تھے جن کو خود حضرت کی نبوت سے دلی انکار تھا جس کو حضرت بھی جانتے تھے اور قرآن میں بھی اُن کا حال بیان کیا جاتا تھا باوجود اِس کے وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے تھے ،تو اُس آخری زمانہ میں ایسے لوگوں کو مسلمان سمجھنے میں کیا تامل۔ بہرحال کوئی مسلمان اسلامی حیثیت سے خدا ورسول کے کلام کے مقابلہ میں درایت کا نام نہیں لے سکتا، رہا یہ احتمال کہ شاید راویوں نے کوئی بات اپنی طرف سے ملا دی ہوگی ،سو وہ بھی قابل توجہ نہیں، اس لئے کہ کلام اُن روایتوں میں ہے جن کے وہ راوی ہیں، جنہوں نے دین کی حفاظت اپنے ذمہ لی اور محدثین کے جم غفیر نے اُن کے صدق وتدیّن پر گواہی دی، کیا ان اکابردین کے صدق ودیانت کے بھروسے، مسلمان کو اُن کی روایتوں کے صدق کا ظن غالب بھی نہ ہوگا؟

عدالتِ راوی ثابت ہوتو امکانِ خبر دیکھنے کی ضرورت نہیں

اب غور کیا جائے کہ مولوی شمس العلماء شبلی صاحب نے جو لکھا ہے کہ راویوں کی جرح و تعدیل سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ جو خبر دی گئی فی نفسہ وہ ممکن ہے یا نہیں، اگر وہ ممکن ہی نہ ہوتو راوی کا عادل ہونا بیکار رہے، اور امکان بھی کونسا عادی یعنی اگر چہ کوئی چیز فی نفسہ ممکن ہو مگر عادۃً اُس کا وجود نہ ہوتا ہوتو ایسی چیز کے موجود ہونے کی خبر درایۃً قابل تسلیم نہیں اگر چہ راوی اُس کا عادل ہوسو یہ قاعدہ کس قدر خلاف عقل ہے۔ اِس قاعدہ کی بنا پر بہتیرے واقعات جو مشاہدہ سے ثابت ہیں، جھوٹے ثابت ہوں گے، کیونکہ عادتیں زمان ومکان بلکہ اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔ تجربہ سے اور اطباء کی تصریح سے ثابت ہے کہ سمالفار، زہر قاتل ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے مگر ایسے بھی لوگ موجود ہیں کہ انہوں نے اُس کے کھانے کی عادت کر لی ہے اور روزانہ تخمیناً ایک ایک تولہ کھاتے ہیں، اور بجائے ضرر اُس سے اُن کو نفع بھی ہوتا ہے۔

چندروز کا واقعہ ہے کہ ایک بائسیکل سوار ایک بڑے حلقہ میں جس کا قطر تخمیناً دس گز ہوگا، اس طور پر چکر لگاتا تھا کہ بائسیکل اوپر اور وہ نیچے یعنی اُس کا سر زمین کی طرف اور صرف حلقہ کو مس کرتے ہوئے بائسیکل پورا دور طے کرتی تھی اور نصف سے زیادہ حصہ اس طور پر طے ہوتا تھا کہ اُس شخص کا جسم بغیر کسی سہارے کے معلق اور معرض سقوط میں رہتا تھا، حالانکہ عادۃً بلکہ عقلاً محال ہے کہ آدمی ہوا میں بغیر کسی سہارے کے معلق رہے اور ثقل یا کشش زمین سے نہ گرے۔ اس میں شک نہیں کہ جب اس واقعہ کا وقوع ہوگیا تو اُس کے نہ گرنے کی کوئی علّت ضرور ہوگی، مگر کلام اس میں ہے کہ قبل مشاہدہ یہی کام محال معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ بصرف زر کثیر جوق جوق اُس کے دیکھنے کے لئے

جاتے تھے۔اس وقت حیدرآباد میں دولڑکیاں ایسی موجود ہیں کہ کمر کے نیچے اُن کا باہمی اتصال اس درجہ ہے کہ اگر جدا کئے جائیں تو ایک ضرور ہلاک ہوجائیگی۔اس قاعدہ کے مطابق اس مشاہدہ کی بھی تکذیب لازم ہوگی، کیونکہ عادۃً ایسے آدمیوں کا وجود نہیں ہوسکتا اس کے سوا صدہا بلکہ ہزارہا نظیریں مل سکتی ہیں کہ خلاف عادت بہتیری چیزیں وجود میں آتی ہیں۔اگرخلاف عادت امور کی خبریں جھوٹ سمجھ لی جائیں تو فن تاریخ اوراخبارات میں عجائبات اور نادر نادر خبریں جو تلاش کر کے بہم پہونچائی جاتی ہیں، سب فضول اور تضیع اوقات سمجھی جائیں گی، حالانکہ آدمی فطرۃً ایسی خبروں کا مشتاق رہتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ قاعدہ مذکورہ خلاف فطرت انسانی ہے۔اِس سے بڑھ کر سنیئے کہ دنیا میں ہزار ہامادرزاد اندھے اور بہرے ہیں، اگراُن سے روشنی اوراقسام کے رنگ اورحسن وجمال اور خط و خال اور بصارت کی خوبیاں اوردلکش نغمات اورسماعت کی دلفریبیاں بیان کی جائیں تو اُن کا بھی یہی جواب ہوگا کہ یہ امورامکان سے خارج ہیں، کیونکہ عقل انہی چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے جن کا احساس کبھی ہوا ہواور چونکہ ان امور کا احساس اندھوں اور بہروں کو ہونا محال ہے، اس لئے یہ امور اُن کے نزدیک عادۃً بلکہ عقلاً ہرطرح سے محال ہیں، اس قاعدہ کی رو سے چاہئے کہ یہ سب خبریں جھوٹی ہوجائیں حالانکہ کوئی عاقل اِس کو گوارا نہ کرے گا۔ہم نے یہ بات کتاب العقل میں بالتفصیل لکھی ہے جس پر عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ ہمارے نزدیک جو چیز محال ہو یہ ضرور نہیں کہ وہ واقع میں بھی محال ہو، جب محال عقلی کا یہ حال ہوتو محال عادی کس شمار میں۔

اہل حکمت جدیدہ خبر دیتے ہیں کہ آفتاب زمین سے دس لاکھ حصوں سے بھی زیادہ بڑا ہے اوراس کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے،مگر زمین بھی اُس کو اُس قوت سے دفع کرتی ہے کہ اُس کی کچھ چل نہیں سکتی، پھراس کے ساتھ ہی زمین اُس کو اُس قوت سے کھینچتی بھی

ہے جس قوت اور زور سے آفتاب کھینچتا ہے، حالانکہ دس پانچ ہاتھ کے فاصلہ سے اڑتی چڑیا کو بھی نہیں کھینچ سکتی۔ انصاف سے کہا جائے کیا کسی کی درایت اِس خبر کی تصدیق کرسکتی ہے؟ مگر سرسید صاحب نے اُس کو مان ہی لیا اور اسی بنا پر ایک رسالہ لکھ ڈالا کہ آسمان کوئی چیز نہیں اور جہاں جہاں قرآن میں آسمان کا ذکر ہے تاویلیں کر ڈالیں۔ معلوم نہیں انہوں نے یورپ کے کسی مدرسہ میں تعلیم پا کر آلات رصدیہ وغیرہ سے اس مسئلہ کی تحقیق کی تھی یا تقلیداً یہ مذہب اختیار کرلیا تھا یا کسی مصلحت سے برائے نام قائل ہوگئے تھے، مگر ایک گروہ کثیر نے تو صرف سرسید صاحب ہی کی تقلید کی اور ہم یقیناً جانتے ہیں کہ اُن کی درایت ہرگز اُس کو قبول نہیں کرسکتی، باوجود اِس کے اُن پر الزام نہیں لگایا جاتا کہ خلاف درایت ایسی باتیں کیوں مانی جاتی ہیں، پھر اگر مسلمانوں نے اِس قسم کے امور میں اپنے ائمہ کی تقلید کی تو اُن پر کیوں الزام لگایا جاتا ہے؟ اہل حکمت جدیدہ یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ ہر سال ہم ایک بار اُنیس کروڑ میل ثوابت کے نزدیک ہوجاتے ہیں اور پھر ہر چھ مہینے کے بعد اُنیس کروڑ میل اُن سے دور ہوجاتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ہر آنکھیں والا شخص برس کے بارہ مہینے ہر ستارہ کو ایک ہی مقدار و جسامت پر دیکھتا ہے، نہ کبھی اُن کی جسامت میں کمی و زیادتی محسوس ہوتی ہے نہ باہمی فاصلوں میں تفاوت، اگر سو پچاس میل کے فاصلہ پر یہ خیال کیا جائے تو طوعاً و کرہاً آدمی قبول بھی کرسکتا ہے۔ اُنیس کروڑ میل کا فاصلہ، پہلے خیال کیجئے! اُس کے بعد ہر ستارہ کی جسامت محسوسہ پر نظر ڈال کر عقل سے کام لیجئے کہ کیا اتنی جسامت محسوسہ والی چیز اُنیس کروڑ میل دور ہونے کے بعد بھی نظر آسکتی ہے یا نہیں۔ ہر شخص کی عقل گواہی دے گی کہ یہاں امکان عادی تو کیا امکان ذاتی بھی نہیں ہوسکتا۔ اِس قسم کی نظیریں حکمت جدیدہ میں بکثرت مل سکتی ہیں مگر اُن کی تصدیق کرنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا، معلوم نہیں مسلمانوں

نے کیا قصور کیا ہے کہ ہر طرح سے وہی نشانۂ ملامت بنائے جاتے ہیں۔غرضکہ درایت کوئی قابل وثوق چیز نہیں ،روایت اور درایت کا موقع ہوتو قوی روایت کو ماننے کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے اور درایت سے اُس کا رد کرنا گویا یہ کہنا ہے کہ اکابر دین جھوٹے تھے اور دین اسلام جھوٹی تعلیم کرتا ہے۔ **نعوذ باللہ من ذلک ۔**

جولوگ درایت کے مقابلہ میں روایت کوجھوٹی قرار دیتے ہیں اُن کوآخرت سے پہلے اِسی عالم میں شرمندہ ہونا پڑتا ہے ،چنانچہ بعض فلاسفر درایت کے بھروسے روح انسانی اور عالم روحانی کا انکار کر گئے تھے مگر بفضلہٖ تعالیٰ مسمریزم سے وہ مسئلہ پورے طور پر ثابت ہوگیا۔ اگر چیکہ مسمریزم کا ذکر یہاں بے موقع ہے،مگر چونکہ مسئلۂ درایت پیش ہے اور مسمریزم کے ضمن میں یہ ثابت ہوتا کہ وہ درایت میں اکثر خطا ہوا کرتی ہے'اس لئے مختصر طور پر اُس کا ذکر چنداں نامناسب نہ ہوگا۔

مسمریزم سے روحانیت کا ثبوت

کتب مسمریزم میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر انتونی مسمر جو 1834ء میں یورپ میں پیدا ہوا اُس کے خیال میں یہ بات جمی کہ عالم میں ایک رقیق مادہ ضرور ہے جس کی حرکت سے اجرام فلکیہ ایک دوسرے میں اور زمین میں تاثیرات پیدا کرتے ہیں، چنانچہ ایک مدت دراز کی کوشش میں یہ ثابت ہوا کہ آدمی اپنی قوت مقناطیسی کا اثر ڈال کر بیہوش کرسکتا ہے جس سے شخص معمول جس پر اثر ڈالا گیا،غیب کی باتیں بیان کرنے لگتا ہے،اور باوجودیکہ شخص معمول اس عالم سے ایسا بے خبر ہوتا ہے کہ اگر اُس کے کان کے پاس طپنچہ کی آواز کی جائے تو بھی اُس کو خبر نہیں ہوتی،مگر عامل اُس سے جو کچھ پوچھتا ہے فوراً اُس کا جواب دیتا ہے۔

حالانکہ درایۃً یہ محال ہے کہ سماعت باوجود معطل ہونے کے کام کرتی رہے اور درایت یہ

بھی قبول نہیں کرسکتی کہ اُس کی سماعت کسی کی نہ سنے اور بڑے سے بڑے صدمہ کا اور آواز کا اُس پر کچھ اثر نہ ہو اور ایک شخص کی آہستہ سی آواز سُن لے اور یہ بھی قبول نہیں کرسکتی کہ بیہوش شخص مشکل سوال کا فوراً ایسا جواب دے کہ کامل ہوش والا اُس سے عاجز رہے۔

لکھا ہے کہ اُس کے امورِ غیبیہ کے انکشاف کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کل موانع اُس کی نظر کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں، مقفل صندوق میں اگر خط رکھا ہو تو پڑھ لیتا ہے، اگلے مردوں اور اگلے زمانہ کے لوگوں کی حالتیں اِس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا اُن کو دیکھ رہا ہے اور جس طرح گذری ہوئی باتیں بتاتا ہے، اسی طرح آئندہ کی باتیں بھی بتاتا ہے، جس غائب کا حال اُس سے پوچھا جائے فوراً کہہ دیتا ہے کہ وہ فلاں شہر میں ہے اور یہ کررہا ہے، اگر کسی بیمار کا حال اُس سے پوچھا جائے تو اُس کی بیماری کے اسباب و علامات و علاج بتفصیل بیان کردیتا ہے، غرضکہ اُس کے حواس اس قدر تیز ہوجاتے ہیں کہ اُن کے احساس میں نہ مکان حائل ہوتا ہے نہ زماں۔ اِس قسم کے کئی حالات کی تصریح فن مسمریزم کے رسالوں میں موجود ہے جن کو مصنفوں نے اپنے ذاتی اور یورپ و امریکہ کے نامی ڈاکٹروں کے تجربوں سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھئے کہ درایت اِس کو ہرگز قبول نہیں کرسکتی کہ آنکھیں بند ہوں اور نظر کام کرتی ہو اور نہ اس کو مان سکتی ہے کہ صندوق کا جسم کثیف حائل ہو اور اندر کا خط پڑھ لیا جائے اور پڑھے بھی کون بیہوش شخص جس کو اپنی بھی خبر نہیں۔

اور نہ یہ مان سکتی ہے کہ گذشتہ لوگوں کی جو حالت پوچھے ایسے طور پر بیان کرے جیسے کوئی دیکھ کر کہہ رہا ہے، حالانکہ جب وہ شخص ہی معدوم ہوگیا تو اُس کی حالتیں کیسی اور حالتیں بھی کونسی جن کو زمانہ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور خود بھی مٹ گیا۔ اب بغیر اعادۂ معدوم کے اور کون چیز ہوسکتی ہے جو اُن کو محسوس کرائے، حالانکہ وہ محال ہے اور درایت یہ بھی قبول

نہیں کر سکتی کہ آئندہ ہونے والے اشیاء کا کوئی حال بیان کریں، اس لئے کہ عقل کی رو سے جب تک مادہ میں قابلیّت نہ پیدا ہو کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی، پھر جب کسی چیز کا مادہ ہی ہنوز وجود میں نہ آئے تو اُس کا وجود کہاں؟ اور احوال کیسے؟ بہرحال اِن تمام امور پر غور کرنے کے بعد یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ ہماری درایت ہرگز قابل اعتماد نہیں ہوسکتی، پھر ایسی چیز پر اعتماد کر کے خدا اور رسول کی خبروں کی تکذیب کرنی، کس قدر بعید از عقل ہے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایمان کا دعویٰ بھی ہو۔

اِس آخری زمانہ میں معجزات اور کشف و کرامات جو نہیں مانے جاتے تھے اُس کی وجہ یہی تھی کہ حکمت جدیدہ نے درایت کو اِن امور کی تصدیق سے روک دیا تھا، اب چونکہ ائمہ حکمت جدیدہ یعنی اہل امریکہ و یورپ نے بھی اُس کی اجازت دے دی ہے، اس لئے حکمت جدیدہ کے مقلد مسلمانوں کو چاہئے کہ نہایت مسرت اور کشادہ دلی سے خدا اور رسول کی خبروں پر پورا پورا ایمان لاویں، اور جو تاویلیں اِس خیال سے کی جاتی تھیں کہ عقلی طور پر ان امور کا ثبوت نہیں سب چھوڑ دیں، حکمت جدیدہ میں روح انسانی یا نفس ناطقہ نظر نہ آنے کی وجہ سے ادراک کا کل کارخانہ دماغ ہی کے تفویض کر دیا گیا تھا، چنانچہ فن فزیالوجی وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے کہ ادراک دماغ ہی کو ہوتا ہے، مگر مسمریزم نے اُس کو درہم برہم کر دیا۔ اِس لئے ریوری رنٹ چالس صاحب نے جو لکھا ہے کہ مرئی کی شبیہ جب شبکیہ پر منطبع ہوتی ہے تو عروق ناظرہ دماغ کو اُس پر مطلع کر دیتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کا بھیجا مدرک ہے اور اُس کا ادراک عروق ناظرہ کی خبر دینے پر موقوف ہے، سو وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اِس میں کلام نہیں کہ معمول مسمریزم کو ادراک ضرور ہوتا ہے، کیونکہ وہ عامل کا کلام سمجھتا ہے اور غیب کی باتوں کو دریافت کر کے اُس کا ایسا جواب دیتا ہے کہ کوئی اعلیٰ درجہ کا عقلمند ہوشیار بھی ہرگز نہیں دے سکتا اور اس ادراک کے وقت نہ اُس کی

آنکھیں کھلی ہوتی ہیں نہ پردۂ شبکیہ پر مرئی کی تصویر ہوتی ہے، نہ عروق ناظرہ کو اُس کی خبر اِس سے صاف ظاہر ہے کہ ادراک کا کارخانہ قوائے دماغیہ میں منحصر نہیں، بلکہ یہاں یہ کہنا ضرور پڑے گا کہ شخص معمول گو بے ہوش پڑا ہے۔ مگر اُس کی روح کو ہوش ضرور ہے اور ہوش بھی کیسا کہ جسمانی ہوش سے ہزاروں درجہ بڑھا ہوا، اِس لئے کہ جسمانی ہوش اُس کو ادراک میں اُسی حدتک مدد دیتا ہے جہاں تک حواس کی رسائی ہے اور ظاہر ہے کہ حواس کی جولانی کا میدان نہایت تنگ ہے، بخلاف اُس کے جب بیہوشی طاری ہوتی ہے تو نزدیک ودُور، کثیف ولطیف، عالم غیب وشہادت سب اُس کے روبرو یکساں ہوجاتا ہے اور اس وقت نہ اُس کو آنکھوں کی ضرورت ہے نہ کانوں کی حاجت، بلکہ اُس کے ذاتی حواس جن کو ہم نہیں جان سکتے کہ کیسے ہیں، اُس کے ساتھ ہیں اور وہ اپنے ادراک میں اِس کی بھی محتاج نہیں کہ جن چیزوں کا ادراک کرنا چاہتی ہے وہ اُس وقت خارج میں موجود ہوں، دوسرا عالم اُس کے پیش نظر ہوجاتا ہے جس کا عکس یہ ہمارا شہادت ہے، اِسی وجہ سے وہ اُن اشیا کی بھی خبر دی ہے جن کا وجود ہنوز ہوا ہی نہیں یا موجود ہوکر وہ فنا ہوگئی۔

مسمر صاحب کو جو ابتداءً ایک رقیق سے رقیق مادہ کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا تھا، وہ منجانب اللہ اِس غرض سے پیدا ہوا کہ آخری زمانہ کے مسلمانوں پر رحم فرما کر خدائے تعالیٰ عالم روحانی اور روح کو جن کے وجود میں مادہ کو دخل ہی نہیں، ان ہی لوگوں کی تحقیق سے ثابت کرادے، جو اُس کے منکر تھے اور پُرانے خیال والوں کو نئے خیال والوں کے مقابلہ میں کامیاب کرے، سو بفضلہٖ تعالیٰ ایسا ہی ہوا کہ ہر کس و ناکس مسمریزم اور اُس کے کرشموں کو جانتا ہے اور عالم روحانی کی تصدیق کرتا ہے۔

یہ بات یادرہے کہ جوں جوں فلسفۂ جدیدہ ترقی کرتا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے پُرانے دینی خیال وقتاً فوقتاً ثابت ہوتے جائیں گے، جس طرح عالم روحانی اور روح کا اثبات

ہوگیا اور جولوگ کم فہمی سے پُرانے خیالوں پر مضحکے اڑاتے ہیں، اُن کوشرمندہ ہونا پڑے گا۔

سرسید صاحب کو انکارِ جن کی ضرورت کیوں ہوئی؟

ہمارے اِس دعویٰ کی تصدیق اِس واقعہ سے بخوبی ہوسکتی ہے کہ سرسید صاحب نے دیکھا کہ قرآن شریف میں جنات کا ذکر ہے اور نئی روشنی والے ہر بات میں مشاہدہ طلب کرتے ہیں اور جنوں کو محسوس کر کے دکھلانا اپنے امکان سے خارج ہے، اِس لئے انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ اُن کے وجود ہی کا انکار کر دیا جائے اور ایک رسالہ لکھ دیا جس کا نام تفسیر الجن والجان ہے، اُس میں اُن تمام آیتوں کی تاویلیں لکھیں جن میں جنات کا ذکر ہے اور بڑی تلاش سے جاہلیت کے چند اشعار نقل کئے جن کا مضمون یہ ہے کہ بدو جو جنگل اور پہاڑوں میں رہتے تھے نظر بچا کر آئے۔ اِن اشعار میں بدو پر جن کا اطلاق کیا گیا جیسے آج کل سخت بخیل کو جن کہا کرتے ہیں، مگر سرسید صاحب نے اُس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جنگل اور پہاڑوں میں رہنے والے آدمیوں کو جن کہا کرتے ہیں اور یہی حقیقت جن ہے اور لکھا ہے کہ اہل لغت کو یہ بات معلوم نہ تھی، اِس لئے انھوں نے اُس کے معنی نہیں بتلائے اور سخت غلطی کی۔

اسپرتزم سے ارواح اور جنات کا ثبوت

یہ تقریر سرسید صاحب کی کمال مجبوری کی حالت میں تھی کہ حکمت جدیدہ سے عاجز ہوکر جواب کا یہ طریقہ سوچا مگر اب اُس کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ خود اہل یورپ وامریکہ نے جنّات کے وجود کو مان لیا ہے، چنانچہ علامہ محمد فرید وجدی نے کنز العلوم واللّغہ میں لفظ ''اسپرتزم'' کی تحقیق میں لکھا ہے کہ پیشتر حکماء مادئیین وغیرہم کا قول تھا کہ آدمی کی روح اسی

کی قسم کی ہے جو جانوروں میں ہوا کرتی ہے، کوئی خاص قسم کی چیز نہیں، جو مرنے کے بعد باقی رہے، بلکہ آدمی کے ساتھ وہ بھی فنا ہو جاتی ہے، مگر 1846ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ امریکہ کی ایک بستی میں جس کا نام ''بید سفیل'' ہے، ''فیکمان'' نام کے ایک شخص نے رات کے وقت اپنے گھر کی زمین پر متعدد کھٹکے سنے، بہتیرا تلاش کی مگر کسی کا پتہ نہ لگا اور اسی قسم کا واقعہ ''جان فوکس'' کے گھر میں بھی ہوا، اُس کی عورت نے کھٹکوں کی آواز پر غیبی شخص سے کہا کہ اگر تو کوئی روح ہے تو دس مار زمین پر مار، چنانچہ دس مار کے کھٹکوں کی آواز اُس نے سنی، پھر اُس عورت نے کہا: میری لڑکی ''کانرینہ'' کی عمر کتنی سال کی ہے، اُس نے اتنے ہی کھٹکے مارے جتنے سال کی عمر اُس کی تھی۔ غرض چند امتحانوں کے بعد اُس کو یقین ہوا کہ وہ کسی آدمی کی روح ہے پھر اِسی قسم کے متعدد واقعات پے در پے ہوئے اور اُس کی تحقیقات شروع ہوئی، ''ادمون'' جو وہاں کا مقنّن تھا اُس نے پوری تحقیق کر کے ایک ضخیم کتاب اثبات روح میں لکھی اور اُسی کی تائید میں استاد فن کیمیا ''مابس'' نے بھی ایک کتاب لکھی پھر تو متعدد کتابیں لکھی گئیں اور عام شہرت ہوگئی جب اس کے چرچے برطانیہ میں ہونے لگے تو ''کروکس صاحب'' جو پارلیمنٹ کے ممبر تھے انہوں نے بھی ایک کتاب اُس کی تائید میں لکھی جس میں اپنے چشم دید واقعات بیان کئے اور اِس مسئلہ کی یہاں تک شہرت ہوئی کہ اخباروں میں اُس کے متعلق مضامین شائع ہونے لگے مگر مادّئیین حکماء اِس خیال کے سخت مخالف تھے، بالآخر 1869ء میں خاص اِس کی تحقیق کے لئے ایک مجلس قائم ہوئی جس میں برطانیہ، امریکہ اور اطالیہ کے نامی فلاسفر' ڈاکٹر اور ماہرین فن فزیولوجی اور طبعیات اور ریاضی اور ہندسہ وغیرہ اُس کے ارکان مقرر ہوئے اور اٹھارہ مہینے برابر تحقیق ہوا کی، جس سے مثبتین روح کا دعویٰ ثابت ہوا، چنانچہ جتنے اراکین مجلس اس مسئلہ میں مخالف تھے سب نے بالاتفاق اپنے چشم دید خوارق عادات لکھ کر اقرار کیا کہ واقعی ارواح متشکل ہوتی ہیں،

وہم کو اُس میں کوئی دخل نہیں اور لکھا ہے کہ جب تدابیر سے روحیں بلائی جاتی ہیں تو پہلے ایک روشن ابر سا محسوس ہوتا ہے، پھر وہ بتدریج انسانی شکل قبول کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں ایک عربی بدوی کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے جس کا گوشت نہایت نرم ہوتا ہے کہ اگر اس کو دبایا جائے تو ہاتھ اُس میں دھس جاتا ہے۔ اس تحقیق سے روحوں کا متشکل ہونا ثابت ہے، اور ممکن ہے کہ اُن کو بھی یہ قدرت حاصل ہو، اسی طرح جنات کا اشکال بدلنا بھی ثابت ہے جس پر ہر زمانہ کے اخبار کا تواتر گواہ ہے۔ اِسی وجہ سے حکمائے مذکورین میں سے بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مُردوں کی روحیں ہیں یا اور کوئی چیزیں دوسرے عالم کی ہیں۔

علامہ موصوف نے لفظ جنون کی تحقیق میں مجلۂ روحیہ سے لکھا ہے جو فرانس سے شائع ہوتا ہے کہ استاد ''ہیزلوپ'' امریکی جو تحقیق نفس کی کمیٹی کا رکن رکین ہے، اُس نے ڈاکٹروں میں اشتہار شائع کئے کہ جنون ہمیشہ دماغی خلل سے نہیں ہوتا، بلکہ کبھی بعضے شریر ارواح کے مسلط ہونے سے بھی ہوا کرتا ہے جس کے لئے وہ علاج جو ڈاکٹروں کو معلوم ہے، مفید نہیں ہوسکتا۔

عاملوں کے متواتر مشاہدات سے ثابت ہے کہ ارواح خبیثہ اور جنات دونوں مسلط ہوا کرتے ہیں اور عملیات کے ذریعہ سے دفع ہو جاتے ہیں جس کو نئی روشنی والے وہم اور خیال کہا کرتے تھے، مگر جب جدید تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ وہ واقعی ہیں، وہم کو اُس میں کوئی دخل نہیں، تو اب عاملوں کی خبروں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بہر حال جنات کا وجود ہر طرح سے ثابت ہے۔

یہاں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ تحقیق سرسید صاحب کے زمانہ میں مشہور ہو گئی ہوتی، تو نہ اُن کو جنّات کے انکار کی ضرورت ہوتی نہ خوارق عادات کے ابطال کی حاجت، کیونکہ اُن کو یہ تو منظور ہی نہ تھا کہ خواہ مخواہ قرآن کو رد کریں، اب

اسی پر قیاس کر لیجئے کہ جس طرح اُن کی تاویلیں جنات کے وجود کے باب میں بے ضرورت اور خلاف واقع ثابت ہوئی، اسی طرح آسمان وغیرہ کے وجود کے مسئلہ میں بھی یقیناً خلاف واقع ثابت ہوں گی، کیونکہ خدا و رسول کے کلام میں خلاف واقع ہونے کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا، مگر اب یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کو اس انتظار کی کیا ضرورت، جب ہمیں یقیناً معلوم ہوگیا کہ ہماری درایت میں اکثر خطا ہوتی ہے، تو صحیح صحیح روایتوں میں کیوں کلام کیا جائے، بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ مخالف بعضے دینی مسائل پر ہنسیں گے، پھر اس سے کیا ہوتا ہے، کئی مسائل میں ہمیں بھی ان کی عقل بے اصل تحقیقات پر ہنسنے کا موقع حاصل ہوگیا ہے جس سے جواب ترکی بہ ترکی ہو جائیگا، اب اگر اس پر بھی کسی کو صحیح صحیح روایتوں پر ایمان لانے کی ہمت نہ، ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ سرے سے ایمان لانا ہی اُس کو منظور نہیں، حکمت جدیدہ کا صرف حیلہ ہے۔

درایت سے اغماض کرنا بھی فطرتی ہے

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ آدمی درایت سے تو کام لیتا ہے، مگر بہت سے مواقع میں درایت سے اغماض کرنا بھی اُس کی طبیعت کا مقتضیٰ ہے، چنانچہ لڑکے کو جب اُس کے ماں باپ کی خبر دی جاتی ہے تو یقیناً اُن کو اپنے ماں باپ سمجھ لیتا ہے، اسی طرح دادا وغیرہ اہل خاندان کی قرابت کی تصدیق مجرد خبر سے کر لیتا ہے، شاید بعضے لوگ ایسے بھی ہوں کہ ایک شخص کی گواہی کو کافی نہ سمجھ کر دل میں یہ خیال کرتے ہوں گے کہ بلا تحقیق اور ثبوت کافی کسی کو اپنا باپ کہنا، ننگ و عار اور خلاف درایت ہے، مگر اُن کو

بھی ایسے رکیک احتمالات سے اغماض ہی کرنا پڑتا ہے، اور اگر کوئی ایسے احتمالات پیش کر کے اُن کے نسب میں کلام کرے تو اُس سے غالبًا ناخوش ہوں گے، اس سے ظاہر ہے کہ بزرگوں کی بات کا یقین کر لینا آدمی کی فطرت میں داخل ہے، اب یہاں غور کیا جائے کہ کونسی چیز ہے کہ اس موقع میں احتمالات عقلیہ کو ہٹا کر مجرّد خبر کو قابل اعتماد بناتی ہے، بات یہ ہے کہ بزرگوں کی محبت اور وقعت آدمی کے دل میں ایسی متمکن ہوتی ہے کہ اُس کی خبر کی مخالفت کا خیال تک دل میں نہیں آتا، اسی طرح جس استاد اور پیر کی وقعت کسی کے دل میں ہوتی ہے، تو وہ جو کچھ کہتا ہے اُس کی تصدیق وہ کر لیتا ہے، اس وجہ سے محدثین جن استادوں کو معتمد علیہ سمجھتے تھے اُن کی حدیثوں کی صحت کا یقین اُن کو ہو جاتا تھا اور نہایت جزم اور وثوق سے اُن کی روایتیں بیان کرتے تھے، اگر یہ اعتماد اُن کو نہ ہوتا تو جس طرح غیر معتبر اُستادوں کی روایتوں کو ترک کر دیتے تھے، اُن کی روایتوں کو بھی ترک کر دیتے، غرضکہ اپنے بزرگوں کی بات کا یقین کر لینا آدمی کی فطرتی بات ہے اور جس کو وہ اپنا بزرگ اور مقتدا نہیں سمجھتا، اُس کی بات کو نہیں مانتا اور پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ وہ بات درایت کے خلاف تو نہیں، پھر درایت کے خلاف نہ بھی ہو تو اس شرط پر مانتا ہے کہ اپنے حق میں کسی طرح مضر نہ ہو اور اس ماننے میں بھی وہ جزم نہیں ہوتا جو معتمد علیہ کی خبر میں ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قاعدۂ مذکورہ کہ روایت پر درایت مقدم ہے، اپنے بزرگوں کی خبر کی نسبت خلاف فطرت انسانی ہے، البتہ اُس شخص کے حق میں یہ قاعدہ صحیح ہوگا جو بزرگان دین کو اپنے بزرگ نہیں سمجھتا، چنانچہ اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ وغیرہم ہمارے دین کی باتوں کو نہیں مانتے، گو کیسی ہی مطابق عقل و درایت ہوں اور اپنے دین کی باتوں کو خلاف

عقل و درایت (۱) ہی کیوں نہ ہوں مان لیتے ہیں، چنانچہ بائبل جس پر تمام یہود و نصاریٰ کا اعتقاد ہے اور جس کو کتاب آسمانی سمجھتے ہیں، اُس میں عجیب عجیب باتیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ ہمارے دین کی باتوں کے مقابلہ میں یہ قاعدہ پیش کرتے ہیں، وہ ہمارے دین سے اجنبی اور بیگانے ہیں، مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ بیگانوں کی باتوں کو سن کر خود بھی اپنے

(۱) ملاحظہ ہو کتاب مقدس مطبوعہ امریکن مشن پریس ایم ڈائیلی منیجر مطبوعہ 1897ء میں (باب 23 ص7748) اور خداوند کا کلام مجھے پہونچا اور اُس نے کہا کہ (۲) اے آدم زاد دو عورتیں اتھیں جو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں (۳) اُنہوں نے مصر میں زنا کاری کی ۲ وہ اپنی جوانی میں ۳ یار باز ہوئیں۔ وہاں اُن کی چھاتیاں ملی گئیں اور وہاں اُن کی بکر کی پستان چھوئے گئے (۴) اُن میں کی بڑی کا نام اہولہ اور اُس کی بہن اہولبہ اور وہ میری جوروآں ہوئیں اور بیٹے بیٹیاں جنیں ۴ انکے یہ نام۔ ۱۱ اہولہ سمرون ہے اور اہولبہ یروسلم (۵) اور اہولہ جن دنوں میں وہ میری تھی چھنالا کرنے لگی اور اپنے یاروں پر یعنی اسوریوں ۵ پر جو ہمسایہ تھے عاشق ہوئی (۶) کہ وہ سرلشکر اور حاکمان تھے اور سب کے سب دل پسند جوانمرد اور سوار تھے جو گھوڑوں پر چڑھے تھے اور ارغوانی پوشاک پہنے ہوئے تھے (۷) اس طرح اُس نے اُن سب کے ساتھ جو اسور کے برگزیدہ مرد تھے چھنالا کیا اور وہ اُن سب کے ساتھ جن سے وہ عشق بازی کرتی تھی اور اُن کے سارے بتوں سے ناپاک ہوگئی۔ (۸) اس نے ہرگز اس زنا کاری کو جو اُس نے مصر میں کی تھی نہ چھوڑا۔ ۶ کیونکہ انہوں نے اس کے جوانی میں اس سے خلوت کی تھی۔ انہوں نے اس کی بکر کی پستانوں کو ملا تھا اور اپنی زنا اس پر انڈیلی تھی (۹) اس لئے میں نے اُسے اُس کے یاروں کے ہاتھ میں وہاں اسوریوں کے ہاتھ میں جن پر وہ مرتی تھی کر دیا (۱۰) انہوں نے اُس کو بے ستر کیا۔ ۸ اس کے بیٹے اور بیٹیوں کو چھین لیا اور اسے تلوار سے مار ڈالا۔ سو وہ عورتوں کے درمیان انگشت نما ہوئی کیونکہ انہوں نے اسے عدالت سے سزا دی (۱۱) اور اُس کی بہن اہولبہ نے یہ سب کچھ دیکھا ۹ پر وہ شہوت پرستی میں اس سے بدتر ہوئی ۱۰ اور اُس نے اپنی بہن کی زنا کاری کی نسبت سے زیادہ زنا کاری کی (۱۲) وہ بنی اسور ۱۱ "یعنی ان سرلشکروں اور حاکموں پر جو اُس کے ہمسایہ تھے جو بھڑکیلی پوشاک پہنتے تھے اور گھوڑوں پر چڑھتے تھے۔ ۱۲ اور سب کے سب دل پسند جوانمرد تھے۔ عاشق ہوئی اور میں نے دیکھا کہ وہ بھی ناپاک ہوگئی۔ اُن دونوں کی ایک ہی راہ و رسم تھی۔ (۱۴) بلکہ اُس نے زنا کاری زیادہ کی۔ کیونکہ جب اس نے دیوار پر مردوں کی صورتیں دیکھیں کسدیون کی تصویریں جو شنگرف سے کھینچی ہوئی تھیں (۱۵) اور کہ اُن کے کمروں پر پٹکے کسے ہوئے تھے اور اُن کے سروں پر اچھے رنگین پگڑیاں تھیں اور کہ سب کے سب دیکھنے میں سرلشکر میں بابل کے بیٹوں سے مشابہ، جن کا وطن کسرستان ہے۔ (۱۶) تب دیکھتے ہی وہ اُن پر مرنے لگی ۱۳ اور قاصدوں کو کسدیونکے ملک میں اُن کے پاس بھیجا (۱۷) سو بابل کے بیٹے اس کے پاس آ کے عشق کے بستر پر چڑھے اور انہوں نے اس سے زنا کر کے اسے آلودہ کیا اور جب وہ اُن سے ناپاک ہوئی تو اس کا جی اُن سے پھر گیا۔ ۱۴ (۱۸) تب اُس کی زنا کاری علانیہ ہوئی اور اُس کی برہنگی بے ستر ہوئی تب جیسا میرا جی اُس کی بہن سے ہٹ گیا تھا ویسا میرا دل اُس سے بھی ہٹا ۱۵ (۱۹) تس پر بھی اس نے اپنے جوانی کے دنوں کو یاد کر کے جب وہ مصر کی سرزمین میں چھنالا کرتی تھی۔ ۱۶ زنا کاری پر زنا کاری کی (۲۰) سو وہ پھر اپنے اُن یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن ۱۷ گدھوں کا سا بدن اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا انزال تھا انتہی۔ اب غور کیجئے کہ خدا اور اُس کے جورواں اور یہ حالات نعوذ باللہ بھلا کس عقلمند کی درایت اس کو قبول کر سکتی ہے۔

دین سے بیگانے بن جائیں، بلکہ یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ایسے لوگوں کا وہی جواب ہوگا جو دوسرے دین والوں کا جواب ہوتا ہے اور اگر جواب نہ دے سکیں تو اُس کا ملال نہ کریں، اس لئے کہ ہر شخص کل مذاہب باطلہ کے جواب کہاں تک دے سکے اور یہ خیال کرلیں کہ تیرہ سو سال سے کروڑہا مسلمان جس طرح اپنے دین کی حفاظت کرتے آ رہے ہیں، ہمیں بھی اُسی طرح حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔

حفاظتِ دین میں محدثین پر مصائب

اب ہم بطور نمونہ چند اکابر دین کے حالات لکھتے ہیں جن سے اہل انصاف پر منکشف ہوجائیگا کہ یہ حضرات فقط حفاظتِ دین ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے اور جس دین میں ایسے حضرات کا وجود ہوا اُس کا قیامت تک محفوظ رہنا دوراز قیاس نہیں۔

مسئلۂ خلقِ قرآن

تاج الدین سبکیؒ نے طبقات شافعیہ میں اور امام سیوطی اور ابن اثیرؒ نے تاریخ الخلفاء اور تاریخ کامل میں مسئلہ خلق قرآن میں جو واقعات پیش آئے ان کو تفصیل سے لکھا ہے، جس سے ثابت ہے کہ محدثین رحمھم اللہ نے کیسی کیسی جانفشانیوں سے اسلامی عقائد کو محفوظ کر دیا۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ قاضی احمد ابن دوّاد (جو نہایت فصیح اور علم کلام میں متبحر اور معتزلہ کا صحبت یافتہ شخص تھا اور خلیفۂ مامون کے دل میں اُس کی بڑی وقعت تھی) اُس نے مامون کو سمجھایا کہ کلام اللہ مخلوق ہے، کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ’’انا جعلناہ قراٰناً عربیاً‘‘ اور جعل کے معنی پیدا کرنے کے ہیں جیسے ’’و جعل الظلمات والنور‘‘ سے ظاہر ہے لیکن بعضے جہال اُس کو غیر مخلوق کہہ کر خالق کے برابر بنا دیتے ہیں اور باوجود اس شرک کے اپنے آپ کو

اہل حق اور اہل سنت قرار دے کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، بادشاہ اسلام کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی تادیب کر کے دین کی حفاظت کرے، چنانچہ یہ بات بادشاہ کے سمجھ میں آ گئی اور اسحاق ابن ابراہیم حاکم بغداد کے نام حکم جاری کیا کہ تمام فقہاء اور محدثین کو بلا کر اُن کا عقیدہ دریافت کرو، اگر وہ علانیہ اقرار کریں کہ قرآن مخلوق ہے، تو بہتر ورنہ اُن کے اظہار قلمبند کر کے پیشگاہ میں روانہ کریں، چنانچہ حاکم نے اکابر علماء کو جمع کر کے حکم شاہی سنا دیا، اُن میں اکثر تو یہ کہہ کر ٹال گئے کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اس مسئلہ میں ہم کسی سے بحث نہ کریں گے اور بعضوں نے بالکل سکوت کیا اور بعضوں نے کہا کہ قرآن مجعول ہے، مگر چونکہ خدائے تعالیٰ نے اُس کو مخلوق نہیں کہا اِس لئے ہم مخلوق نہیں کہہ سکتے، بادشاہ نے اُن اقوال کو دیکھ کر حکم بھیجا کہ جو لوگ قرآن کو صاف طور پر مخلوق نہ کہیں اُن کو فتویٰ دینے اور روایت حدیث کرنے سے روک دیا جائے۔

امام احمد پر سختی

اور چند نامی گرامی محدثین کے نام لکھے کہ اگر وہ اقرار نہ کریں، تو اُن کے گردنیں مار کے اُن کے سر دربار شاہی میں روانہ کئے جائیں، جب یہ حکم سنایا گیا تو اکثر نے جان بچانے کی غرض سے کہہ دیا کہ قرآن مخلوق ہے، مگر امام احمد بن حنبل اور محمد ابن نوح رضی اللہ عنہما نے اُس سے صاف انکار کیا، حاکم نے اُن کو مقید کر کے بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا، بادشاہ سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ جن لوگوں نے اقرار کیا ہے وہ جان بچانے کی غرض سے صرف زبانی اقرار ہے، اُس پر حکم شاہی نافذ ہوا کہ سنا گیا کہ بعضوں نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے باب میں جو آیت نازل ہوئی " **اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ** " اس میں تاویل کر کے زبانی اقرار کر لیا ہے، حالانکہ وہ غلط ہے، بہر حال اُن کو بھی دربار شاہی میں بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ سب محدثین روانہ کئے گئے، مگر حُسن اتفاق سے راستہ ہی

میں یہ خبر پہونچی کہ خلیفۂ مامون کا انتقال ہوگیا، جس سے سب کی رہائی ہوئی لیکن، مامون نے مرتے وقت وصیت نامہ لکھا کہ میرے بعد جو خلیفہ ہو، اُس کو چاہئے کہ محد ثین کو مجبور کر کے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرائے، چنانچہ اُس کے جانشین معتصم باللہ نے بھی وہی کارروائی شروع کی، اور چونکہ امام احمدؒ اپنے انکار پر مصر تھے، اُن پر سختی شروع کی گئی، چنانچہ متعدد قید خانوں میں قید کئے گئے، کبھی اصطبل میں، کبھی عام قید خانوں میں، کبھی نہایت تنگ وتاریک مکان میں اور اُس اثنا میں اکثر مناظرے بھی ہوئے، مگر آپ کے مقابلہ میں جو آتا، اُس کو ساکت کر دیتے۔ آخر بادشاہ نے دو شخصوں کو مناظرے کے لئے بھیجا، آپ نے اُن سے پوچھا کہ تم خدائے تعالیٰ کے علم کو مخلوق کہتے ہو یا غیر مخلوق؟ اُنہوں نے کہا کہ مخلوق آپ نے فرمایا اس قول سے تم کافر ہوگئے، کسی نے کہا آپ یہ کیا کرتے ہو، یہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہیں، فرمایا: ہاں! یہی بھیجے ہوئے کافر ہوگئے، وہ دونوں تین روز تک مناظرہ کے لئے، آیا کئے ہر روز بے نیل مرام جاتے وقت ایک بیڑی امام احمدؒ کے پاؤں میں اضافہ کر دیتے، چنانچہ اب چار بیڑیاں آپ کے پاؤں میں ہوگئیں۔ چوتھے روز بادشاہ نے خود اپنے روبرو حاضر کرنے کا حکم دیا، حاکم بغداد نے آپ کو بلوا کر کہا کہ اگر آپ اقرار نہ کرو گے تو بادشاہ نے قسم کھائی ہے کہ ہر روز آپ کو کوڑے لگوائے جائیں گے، یہاں تک کہ آپ یا اقرار کریں یا اسی عذاب سے مرجائیں اور آپ کے قید کے لئے ایک نہایت تنگ وتاریک مکان تجویز کیا گیا ہے پھر اُن سے کہا: بھلا یہ تو خیال کرو کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ''انا جعلناہ قرانا عربیا''، یہ کیونکر صحیح ہوسکے کہ قرآن مجعول ہو اور مخلوق نہ ہو آپ نے فرمایا حق تعالیٰ نے ''**فجعلھم کعصف ماکول**'' بھی فرمایا ہے، کیا یہاں تخلیق کا معنی صادق آتے ہیں؟ مطلب یہ کہ جعل اور خلق مرادف نہیں، اِس کا کچھ جواب اُس سے نہ ہوسکا اور بادشاہ کے روبرو لیجانے کا حکم دیا چونکہ آپ کے ہر پاؤں میں

چار چار بھاری بیڑیاں تھیں، قدم قدم پر آپ گرتے تھے آخر کسی جانور پر سوار کئے گئے اور معتصم کے گھر پہنچے اور ایک نہایت تنگ و تاریک حجرہ میں آپ کو داخل کر کے باہر سے قفل لگا دیا گیا، آپ فرماتے ہیں جب رات کو میں تہجد کا ارادہ کیا اور چراغ تو تھا ہی نہیں، تیمّم کے لئے مٹی مل جاتی مٹی کے تلاش میں میں نے ادھر اُدھر ہاتھ دوڑائے، یکا یک میرا ہاتھ آفتابہ پر پڑا جو پانی سے بھرا ہوا طشت کے ساتھ رکھا تھا، میں نے وضو کر کے نماز پڑھ لی ،صبح کو بادشاہ نے مجھے بلوایا، چار بیڑیوں کو سنبھال کر چلنا مشکل تھا اور کوئی چیز نہ تھی جس سے اُن کو باندھ لیتا، اس لئے پائجامہ سے ازار بند نکال کر اُن کو اکٹھے کیا اور پائجامہ کو گرہ دے کر افتاں و خیزاں چلا، جب بادشاہ کے روبرو پہونچا تو خلق کا ہجوم تھا، جس میں ابن دواد اور اُس کے طرفدار بکثرت تھے، بادشاہ نے اپنے روبرو مجھے جگہ دی، تھوڑی دیر بیڑیوں کی مشقت سے دم لیکر بادشاہ سے پوچھا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟ بادشاہ نے اجازت دی، میں نے کہا: خدائے تعالیٰ بندوں کو کس چیز کی طرف بلاتا ہے بادشاہ نے کہا: لا الہ الا اللہ کی شہادت کی طرف میں نے کہا کہ میں لا الہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہوں اور یہ روایت آپ کے دادا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ جب وفد عبد قیس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے پوچھا تم جانتے ہو کہ ایمان کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا: اللہ ورسول اعلم ہیں حضرت نے فرمایا **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی شہادت اور اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور غنیمت کا پانچواں حصہ دینا، یہ سنکر بادشاہ نے کہا کہ اگر اپنے سے پہلے بادشاہ کے قید میں، میں تمہیں نہ پاتا تو تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبدالرحمٰن ابن اسحاق سے کہا کیا میں تجھ سے نہیں کہا تھا کہ ان سے سختی کو اٹھا دے، اُس نے کہا کہ اِن کی تعذیب مسلمانوں کی آسائش کا باعث ہے، بادشاہ نے کہا: کہ خیر اب مناظرہ کرو! اُس نے مجھ سے پوچھا قرآن کو تم مخلوق کہتے ہو یا غیر مخلوق؟ میں نے کہا:

خدائے تعالیٰ کے علم کو تم مخلوق کہتے ہو یا غیر مخلوق؟ وہ کچھ جواب نہ دے سکا، مگر ہر طرف سے دلائل اور اعتراضات ہونے لگے اور میں سب کو جواب دیتا گیا، یہاں تک کہ سب ساکت ہوگئے، اُس وقت ابن دواد نے بادشاہ سے کہا: خدا کی قسم! یہ شخص گمراہ اور گمراہ کرنے والا بدعتی ہے، بادشاہ نے کہا اور مناظرہ کرلو، چنانچہ اس بار کے مناظرہ میں بھی میں ہی غالب آیا، اسی طرح دو روز تک مناظرہ ہوتا رہا، اس اثناء میں اکثر بادشاہ مجھ سے اقرار کر لینے کی فرمائش کرتا اور میں یہی کہتا تھا کہ کوئی آیت یا حدیث اِس باب میں پیش کی جائے تو مجھے اُس کے قبول کرنے میں کچھ عذر نہیں۔ تیسرے روز ایک نہایت شاندار دربار کیا گیا جس میں مسلح فوج ایک طرف اور کوڑے لئے ہوئے بہت سے لوگ ایک طرف کھڑے کئے گئے تھے اور میں بلایا گیا، جب میں آیا تو حضار دربار سے خاص خاص لوگوں کو مجھ سے مناظرہ کرنے اور سمجھانے کا حکم دیا، چنانچہ بہت دیر تک مناظرہ ہوا جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو بادشاہ نے مجھے ہٹا کر اُن لوگوں سے تخلیہ کیا، اُس کے بعد اُن کو ہٹا کر مجھ سے تخلیہ کیا اور کہا: اے احمد! تم اقرار کرلو تو میں ابھی تمہیں رہا کر دیتا ہوں، میں نے وہی کہا کہ بغیر قرآن وحدیث کے میں کوئی بات نہیں مان سکتا، یہ سنکر بادشاہ نے نہایت غصہ سے کہا: اب اس کو کھینچو اور اس کا لباس اُتارلو، جب قمیص اُتارا گیا تو اُس کی آستین میں کچھ بندھا ہوا تھا، پوچھا یہ کیا ہے، میں نے کہا کہ اُس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک ہے، پھر بادشاہ اپنے مقام سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھا اور کوڑے والوں کو بلوایا اور اُن کے کوڑے دیکھ کر کہا کہ دوسرے کوڑے لاؤ، جب دوسرے کوڑے پسند آئے تو جلّادوں کو حکم دیا کہ خوب زور سے اِس کو مارو، چنانچہ ایک شخص آگے بڑھا اور زور سے دو کوڑے مار کر ہٹ گیا، پھر دوسرے نے دو مارے اسی طرح جلّاد نوبت بنوبت آتے اور اپنی پوری طاقت سے دو دو کوڑے مارتے، جب اُنیس کوڑے مارے گئے بادشاہ کو شاید کچھ رحم آ گیا

اور اتر کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: اے احمد! تم کیوں اپنے نفس کو قتل کرتے ہو؟ خدا کی قسم! مجھے تم پر شفقت ہے، کوئی تو ایسی بات کہو کہ مجھے تمہارے چھوڑنے کے لئے حیلہ ہو جائے، میں نے اُس وقت بھی یہی کہا کہ اے امیر المومنین کوئی بات مجھے کتاب اللہ سے معلوم کرائی جائے تو میں ابھی قائل ہو جاتا ہوں' اِس کے ساتھ ہی ہر طرف سے سختیاں شروع ہوئیں ۔کوئی تلوار کے قبضہ سے مار کر کہتا تھا، کیا تو اتنے لوگوں پر غالب آ جائیگا؟ کوئی کہتا کہ امیر المومنین کی بات کو تو نہیں مانتا، کوئی کہتا تھا کہ تیرے رفقاء سے کسی نے ایسا نہیں کیا جو تو کر رہا ہے بادشاہ کو غصہ میں لانے کیلئے کہا کہ امیر المومنین آپ روزہ ہو اور دھوپ میں اِس کے لئے کھڑے ہو اِس کو قتل کر ڈالئے اور اس کا خون میری گردن پر ہے۔ بادشاہ نے کہا: اے احمد! کچھ تو کہو، میں پھر وہی کہا کہ کوئی آیت یا حدیث مجھے بتلا دو تو میں قبول کر لیتا ہوں، بادشاہ نے پھر کرسی پر جا بیٹھا، اور جلاّدوں کو زیادہ سختی کرنے کا حکم دیا۔ لکھا ہے کہ جب امامؒ پر پہلا کوڑا پڑا آپ نے بسم اللہ کہا اور دوسرے کوڑے پر **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** اور تیسرے پر فرمایا قرآن، اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے اور چوتھے کوڑے پر ''**لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا**'' علی ہذا القیاس موقع موقع کی آیتیں پیش نظر ہوتی تھیں ۔ اِس اثناء میں ازار بند ٹوٹ گیا اور پائجامہ ناف تک اتر آیا، آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: الٰہی اگر تو جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں، تو میری بے ستری نہ ہو۔ لکھا ہے کہ پائجامہ وہیں رک گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آپ بیہوش ہو گئے اور وہاں سے اٹھا کر کسی مکان میں آپ کو لٹا دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب سختی سے کوڑے پڑنے لگے تو میں بیہوش ہو گیا اور مجھے کچھ خبر نہیں کہ اُس کے بعد کیا ہوا، جب ہوش آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں پیروں سے نکلی ہوئی ہیں، لوگوں نے کہا کہ جب آپ بیہوش ہو کر گر گئے تو لوگوں نے آپ کو پیروں سے خوب روندا، آپ نے کہا مجھے اِس کی کچھ خبر نہیں ۔غرض کہ کامل اٹھائیس

مہینے آپ پر اقسام کی مصیبتیں ڈالی گئیں، آخر بجبوری رہا کئے گئے۔ لکھا ہے کہ ہوش آنے کے بعد کسی نے ستو پیش کیا، آپ نے فرمایا کہ میں روزہ نہ توڑں گا، پھر نماز ظہر ایسی حالت میں پڑھی کہ زخموں سے خون جاری تھا، کسی نے کہا یہ نماز کیسی؟ خون آپ کے کپڑوں میں جاری ہے، فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک بار ایسی ہی حالت میں نماز پڑھی ہے، اُس کے بعد آپ رہا کئے گئے، امامؒ کے فرزند صالح کہتے ہیں کہ یہ واقعہ رمضان میں ہوا، کئی روز آپ پر ایسے گذرے کے بغیر سحر اور افطار کے روزے رکھا کئے اور کسی کو موقع نہ ملا کہ کھانا یا پانی آپ کو پہنچا سکیں اور روزانہ مار پڑتی تھی، ایک روز کمال تشنگی کی حالت میں بے اختیار آپ نے سقا سے پانی مانگا، اُس نے برف پڑا ہوا پانی دیا، آپ نے پیالہ لے لیا اور تھوڑی دیر تک پانی کو دیکھتے رہے، آخر خوف الٰہی غالب ہوا اور پانی نہ پی سکے۔ لکھا ہے جب تک آپ کو ہوش تھا ہر کوڑے پر آپ معتصم باللہ کے ذمہ کو بری کرتے اور اُس کی خطا معاف کرتے تھے۔ کسی نے اُس کی وجہ دریافت کی آپ نے فرمایا: میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ قیامت میں یہ کہا جائے کہ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی اولاد اور اہل بیت کا دعویدار ہے۔

حیوۃ الحیوان میں علامہ دمیریؒ نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے مصر میں خواب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہیں اور فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل کو جنت کی خوشخبری دو کہ وہ اُن مصیبتوں کے معاوضہ میں دی گئی، جو قرآن کو مخلوق کہلوانے کی غرض سے اُن پر ڈالی جائیں گی اور اُن سے کہدو کہ وہ ہرگز اُس کے قائل نہ ہو، بلکہ صاف کہدیں کہ قرآن غیر مخلوق نازل کیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے اُسی روز یہ واقعہ لکھ کر ایک خاص شخص کے ہاتھ میں خط دیا کہ امام احمد ابن حنبل کو بغداد میں پہونچا دے، آپ نے اُس خط کو دیکھ کر ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ پڑھا اور اُس نامہ بر کو بطور انعام اپنا خاص قمیص دیا، جو جسم کے ساتھ متصل تھا،

۔امام شافعیؒ کو جب قمیص کا حال معلوم ہوا تو اُس شخص پر فرمائش کی اُس کا دھووَن ہمیں لا دو، چنانچہ اُس متبرک قمیص کا دھووَن اپنے تمام جسم پر سے آپ نے بہایا، اور اُس میں لکھا ہے کہ محمد ابن خزیمہ کہتے ہیں کہ جب امام احمد رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر پہونچی تو مجھے نہایت غم ہوا، اُسی رات خواب میں دیکھا کہ امامؒ نہایت فاخرہ لباس پہنے متکبرانہ رفتار سے چلے آ رہے ہیں میں نے پوچھا: حضرت یہ تبختر کیسا؟ فرمایا دار السلام میں خدام کی رفتار کا انداز یہی ہوتا ہے، میں نے پوچھا حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ فرمایا مغفرت کی اور تاج اور فاخرہ لباس پہنا کر فرمایا کہ یہ اُس کا بدلہ ہے جو تم نے کہا تھا کہ قرآن میرا کلام غیر مخلوق ہے۔ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ابوالفرج ابن جوزی کا قول نقل کیا ہے کہ ابراہیم ابن حربیؒ نے ایک رات بشر حافیؒ کو خواب میں دیکھا کہ مسجد رصافہ کے قریب تشریف فرما ہیں اور آپ کی آستین میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے، پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا : شب گذشتہ احمد ابن حنبلؒ کی روح جب ہمارے یہاں آئی تو اُس پر موتی اور یاقوت نثار کئے گئے یہ اُسی میں سے ہیں، جن کو میں نے چنُ لیا ہے۔طبقات شافعیہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ مسئلہ خلق قرآن کی ابتدا مامون نے ۲۱۲ھ میں کی اور ۲۱۸ھ میں اُس پر زور دیا اور ۲۳۴ھ کی آخر تک اِس کا سلسلہ جاری رہا۔اگرچہ واثق کے زمانہ میں اس فتنہ کا زور ٹوٹا ،مگر جعفر متوکل نے اُس سے دست بردار ہو کر احکام جاری کئے کہ موافق سنت کے اس مسئلہ میں اعتقاد رکھا جائے، اِس مدت میں بہت سے محدثین شہید کئے گئے۔

طبقات شافعیہ اور حیوۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کو قید کر کے واثق کے دربار میں لایا گیا، ابن ابی دوّاد نے حسب عادت اُن سے پوچھا کہ تم قرآن کو مخلوق کہتے ہو یا غیر مخلوق؟ انہوں نے کہا میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہا وہ کیا؟ کہا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم

بھی جانتے تھے یا نہیں؟ کہا جانتے تھے، کہا جس طرح تم لوگوں کو اُس کی طرف بُلاتے ہو کیا وہ بھی بلاتے تھے یا انہوں نے سکوت کیا تھا؟ کہا سکوت کیا تھا۔ کہا پھر تم کیوں سکوت نہیں کرتے، اِس کا جواب اُس سے کچھ نہ ہوسکا اور بادشاہ کے سمجھ میں وہ بات آ گئی اور اُن کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

لطیفہ

طبقات شافعیہ میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مسخرہ جس کا لقب عبادہ مخنث تھا، ایک روز واثق باللہ کے پاس آ کر کہا ''**اعظم اللہ اجرک فی القرآن یا امیر المومنین**'' عرب کا دستور ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اُس کی تعزیت میں اعظم اللہ اجرک کہتے ہیں، بادشاہ نے کہا: کہ اے کمبخت کیا قرآن بھی مرتا ہے؟ کہا اے امیر المومنین قرآن آخر مخلوق ہے اور مخلوق کا مرنا ضرور ہے، پھر پوچھا اے امیر المومنین اگر قرآن مرجائے تو تراویح کون پڑھائے گا؟ بادشاہ نے کہا کمبخت چپ رہ۔

اب ہم چند امور یہاں بیان کرتے ہیں جو اِس واقعہ سے مستنبط ہوتے ہیں، ہر چند مقصود کتاب سے اُن کو چنداں تعلق نہیں مگر مناسب مقام ہیں۔

(۱) صحبت بد کا اثر

اِس واقعہ پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ غیر مذہب والوں کی مصاحبت اور مکالمت اور ادیان باطلہ کی کتابوں کے مطالعہ سے اعتقاد پر بُرا اثر پڑتا ہے، گو آدمی دیندار اور فاضل ہو، دیکھئے! خلیفۂ مامون کو محدثین اور اہل تاریخ نے جامع فضائل لکھا ہے، چنانچہ تاریخ الخلفاء وغیرہ میں لکھا ہے کہ وہ حافظ قرآن اور فقہ اور حدیث میں ماہر تھا

،ایک بار ہارون رشید نے اُس کوعیسیٰ ابن یونس کی خدمت میں بھیجا،انہوں نے سو حدیثیں اُس کو سنائیں، مامون نے کہا: حضرت میں چاہتا ہو کہ اعادہ کر کے اُن کی تصحیح کرلوں اور انہوں نے اجازت دی، مامون نے پوری سو حدیثیں لفظ بلفظ زبانی پڑھ کر سنا دیں اور باوجود اِس علم وفضل کے وہ عابد بھی تھا، چنانچہ لکھا ہے کہ بعضے رمضانوں میں قرآن کے تینتیس ختم کیئے ۔اوراہل بیت کرام کے ساتھ اُس کو دلی محبت اورعقیدت تھی، چنانچہ اِسی وجہ سے اپنی لڑکی حضرت علی موسیٰ رضا رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دی اورآپ کے نام کا سکّہ جاری کیا اوراپنے بھائی کو جو ولی عہد تھا،موقوف کر کے آپ کو ولی عہد مقرر کیا اوراس کی شہرت دی اورسیاہ رنگ جو خلفائے عباسیہ کا بانا تھا، چھوڑ کر سبز رنگ اختیار کیا اور مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اپنے آپ کومعزول کر کے حضرت ممدوح کومسند خلافت پر بٹھلا دے،مگر اُسی عرصہ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔غرضکہ خلفائے عباسیہ میں تو کیا دوسرے سلاطین میں بھی اُن صفات کا جامع شاید ہی کوئی ہوا ہو، ایسے متدین فاضل کوایک فاسدالاعتقاد ابن ابی دوّاد کی صحبت اورنیز فلسفہ کی کتابیں جو جزیرہ قبرس میں اُس کے ہاتھ آئیں،اُن کے مطالعہ نے اِس مسئلہ میں اُس کو بیباک اورجادہ اہل سنت سے منحرف کردیا۔

ابن ابی دوّاد کے تقرب کی وجہ یہ تھی کہ مامون ذی کمال اور فاضل شخص تھا اورابن ابی دوّاد بھی بڑا ہی فاضل باکمال تھا، چنانچہ ابن خلکانؒ نے اُس کی طبّاعی اور تبحر علمی کے کئی واقعے وفیات الاعیان میں لکھے ہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ مامون کی مجلس میں ایک بار ذکر آیا کہ لیلۃ العقبہ میں انصار نے جو بیعت کی ،اُن کے کیا نام ہیں؟ ہر شخص نے اپنے معلومات بیان کیئے ،مگر مقصود حاصل نہ ہوا، اِس عرصہ میں ابن ابی دوّاد آگیا،جب اُس سے پوچھا گیا تو فوراًایک ایک کا نام مع کنیت اورانساب بیان کردیا، بادشاہ نہایت خوش ہوا اورکہا کہ کسی فاضل کے ساتھ آدمی ہم نشینی چاہے تو ابن ابی دوّاد جیسے آدمی کواختیار کرے

اور قاعدہ کی بات ہے اہل کمال اہل کمال کو دوست رکھا کرتے ہیں ۔ اِس مناسبت سے مامون نے اُس کو اپنا مقرب بنایا اور اپنے تبحر علمی اور کمال تدین کے بھروسے، اُس کے مذہب ومشرب کی کچھ پروانہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں اُس فتنہ کی آتش مشتعل ہوئی اور ایک مدت تک اہل اسلام کا ایک منتخب گروہ حیران و پریشان رہا، یہ ہے اثر بری صحبت کا۔

بے ادب خود رانہ تنہا داشت بد   بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(۲) بادشاہوں کی مخالفت بھی حفاظتِ دین کی باعث ہوئی

یہ مسئلہ اُس زمانہ میں عقلی انداز پر پیش نہیں ہوا، بلکہ مذہبی رنگ میں دکھلایا گیا کہ قرآن غیر مخلوق ہو تو خالق کے ساتھ شرک ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے سلاطین اسلامیہ نے اُس کے انسداد کو اپنا فرض منصبی سمجھا، باوجودیکہ مامون نہایت رحم دل، حلیم بادشاہ تھا، مگر اِس مقدمہ میں حلم وعفو اُس سے نہ ہوسکا، حالانکہ اُس کی ذاتی کتنی ہی توہین کی جاتی، کچھ مواخذہ نہ کرتا، چنانچہ تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ ایک بار وہ دجلہ کے کنارے بیٹھا تھا، ایک ملاح یہ کہتا ہوا گذرا، کیا تم سمجھتے ہو کہ میری آنکھوں میں مامون کی کچھ وقعت ہے؟ ہرگز نہیں !اس لئے کہ اُس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرڈالا، بادشاہ تبسم کرتا ہوا حضار مجلس سے پوچھا کہ تم کوئی ایسا حیلہ جانتے ہو کہ میری وقعت اس بزرگ کی آنکھوں میں ہو۔ اُس کا قول تھا کہ مجھے کسی کا قصور معاف کرنے میں نہایت تلذذ ہوتا ہے، یہاں تک کہ اِس تلذذ کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ عفو کے ثواب سے کہیں محروم نہ رہ جاؤں اور کہا کرتا تھا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عفو کو میں کس قدر دوست رکھتا ہوں تو لوگ میرا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے مرتکب جرائم ہوا کریں گے، باوجود اِس کے اِس مذہبی معاملہ میں اُس نے نہ حلم کیا نہ عفو قصور، بلکہ حکم قطعی جاری کردیا کہ جو شخص اقرار نہ کرے اُس کی گردن مار ڈالی

جائے، چونکہ منشاء اُس کا حفاظت دین تھا، اس لئے وہ لوگ اُس کو باعث تقرب الٰہی سمجھتے تھے، چنانچہ طبقات شافعیہ میں لکھا ہے کہ احمد ابن نصر خزاعیؒ جو شیخ جلیل القدر تھے، واثق باللہ کے دربار میں حاضر کئے گئے، بادشاہ نے سوال کیا کہ قرآن کے باب میں تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اُس نے کہا: مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ کہا اللہ کا کلام ہے، ہر چند کسی ایک شق کو اختیار کرنے کے لئے اصرار کیا گیا، مگر آپ یہی کہتے کہ وہ اللہ کا کلام ہے، اہل دربار میں سے کسی نے کہا یہ شخص حلال الدم ہے اس کو قتل کرنا چاہئے، ابن ابی دوّاد نے کہا کہ اِن کو عقل میں فتور معلوم ہوتا ہے، بہتر ہے کہ چند روز ان کو مہلت دی جائے، شاید اس عرصہ میں توبہ کرلیں، بادشاہ نے کہا میری دانست میں یہ شخص اشد کافر ہے کہ اپنے اعتقاد سے ٹلتا ہی نہیں، یہ کہہ کر تلوار منگوائی اور کہا کہ میرے ساتھ کوئی نہ اُٹھے، میں خود اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کرتا ہوں، کیونکہ جتنے قدم اِس کام میں چلوں باعث اجر ہیں، چنانچہ اپنے ہاتھ سے اُن کو قتل کر کے اُن کا سر بغداد کے شرقی جانب میں چند روز اور غربی جانب میں چند روز لٹکانے کا حکم دیا، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ اِس عقیدہ والوں کی یہ سزا ہے اور اُن کے کان میں یہ پرچہ لٹکایا گیا، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ سر احمد ابن نصر ابن مالک کا ہے، اُس سے عبداللہ واثق باللہ امیر المومنین نے کہا کہ قرآن کو مخلوق کہے، مگر اُس نے سرکشی کی، اس لئے اللہ نے اُس کو دوزخ میں بھیجدیا''۔

لکھا ہے کہ اُن کی شہادت کے بعد تھوڑے عرصہ میں واثق کا انتقال ہوا اور اُس کا بھائی متوکل باللہ مسند خلافت پر بیٹھا۔ ایک روز عبدالعزیز بن یحییٰ کنانی نے عرض کیا کہ ایک عجیب واقعہ دیکھا گیا کہ جب واثق نے احمد بن نصر خزاعی کی گردن ماری تو اُن کے دفن تک قرآن اُن کی زبان سے اکثر سنا گیا، متوکل کو اس واقعہ کے سننے سے عبرت ہوئی اور فکر میں بیٹھا تھا کہ محمد ابن عبدالملک زیات حاضر ہوا، متوکل نے اُس سے کہا کہ احمد ابن نصر کے قتل

کا مجھے ملال ہے، اُس نے کہا اے امیر المومنین اگر واثق نے اُس کو کفر کی وجہ سے نہ مار ڈالا ہوتو اللہ مجھے آگ سے جلا دے' اُس کے بعد ہر ثمہ آیا، اُس سے بھی بادشاہ نے ملال ظاہر کیا، اُس نے کہا: اے امیر المومنین! اگر واثق نے اُس کو کفر کی وجہ سے نہ مار ڈالا ہوتو خدا ہر ایک عضو میرا جدا کر دے' اُس کے بعد ابن ابی دوّاد آیا، بادشاہ نے اُس سے بھی ویسا ہی کہا اُس نے بھی تسکین دی کہ اگر وہ کفر کی وجہ سے نہ مار ڈالا گیا ہوتو خدا مجھے فالج سے ہلاک کر دے۔ لکھا ہے کہ تھوڑے عرصہ میں وہ تینوں نے جسطرح کہا تھا، اُسی موت سے وہ مرے۔ حیوۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ احمد بن نصر خزاعیؒ کو بعد شہادت کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ خدائے تعالٰی نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہا کہ مغفرت کی، لیکن تین روز سے میں ایک غم میں مبتلا تھا، پوچھا غم کیسا؟ کہا دو بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے روبرو سے تشریف لئے گئے، مگر میری طرف توجہ نہیں کی، تیسرے روز جب تشریف فرما ہوئے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں حق پر اور وہ لوگ باطل پر نہیں تھے؟ فرمایا: ہاں! تم ہی حق پر تھے، میں نے عرض کیا! پھر حضرت جو مجھ سے اعراض فرماتے ہیں اس کی کیا وجہ؟ فرمایا: تم سے مجھے شرم آتی ہے کہ میرے اہل بیت میں سے تمہیں ایک شخص نے قتل کیا۔

اِس میں شک نہیں کہ مسئلہ قرآن میں بعضے سلاطین اِس تشدد اور قتل کو اپنے زعم میں گو تائید دین سمجھے تھے، لیکن باطل پر ضرور تھے، مگر اُن کے اِس تشدد کا یہ اثر تو ضرور ہوا کہ اہل باطل کے حوصلے پست ہوگئے، کسی کی مجال نہ تھی کہ دین میں کوئی نئی بات نکال سکے اور یہ خوف لوگوں کے دلوں میں طاری ہوگیا تھا کہ جب ایسے ایسے نامی وگرامی علماء جن کو عموماً محدثین اور اہل حق اپنے مقتدا مانتے ہیں، ایک مسئلہ میں خلاف کرنے سے اُن کے قتل عام کا حکم ہوگیا اور ہر طرف وار دگیر ہونے لگی تو ہر کس و ناکس، کس قطار و شمار میں؟ بہر حال ان

کارروائیوں سے ثابت ہے جس طرح اہل حق سے دین کی تائید اور حفاظت ہوئی، ان سلاطین کے رعب وادب سے بھی دین کی حفاظت ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ جس طرح اس آخری زمانہ میں جس کا جو جی چاہتا ہے قرآن وحدیث میں تاویلیں کر کے ایک گروہ اپنا علانیہ قائم کرلیتا ہے، کیا اِن سلاطین کے زمانہ میں یہ ممکن تھا؟ اُن کی طرز حکومت گواہی دے رہی ہے کہ جتنی آزادی ادیان باطلہ کو تھی، مسلمانوں کو نہ تھی۔ دیکھ لیجئے خلق قرآن کے مسئلہ میں صرف محدثین مجبور کئے جاتے تھے، کسی یہودی اور عیسائی سے اس مسئلہ کا سوال ہی نہ ہوا، حالانکہ وہ بھی کلام الٰہی کے قائل تھے۔ ہاں اسلامی مذاہب باطلہ کے موجد اور سرپرست مخفی طور پر جاہلوں کو بمناسبت طبیعی طلاقت لسانی سے اپنے ہم خیال بنا لیتے تھے اور کبھی کبھی موقع پا کر کسی مسئلہ میں عقلی دلائل سے بادشاہوں کو بھی دھوکہ دے دیتے، چنانچہ بعضے اصحاب غیلان نے یزید ناقص کو جو سلاطین بنی امیہ میں تھا، قدری بنالیا تھا، جس کی وجہ سے چندروز مذہب قدریہ کو تائید ملی، اسی طرح مامون کو معتزلی نے مسئلہ خلق قرآن میں دھوکہ دے دیا۔

مذہبِ اہلِ سنت اصلِ دین ہے اور دوسرے مذاہب اختراعی ہیں

اِس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں قدیم سے جو مذہب قرناً بعد قرن چلا آرہا ہے وہ مذہب اہل سنت وجماعت ہے اور اُس کے سوا جتنے مذاہب ہیں، سب حادث ہیں جن کا موجد ایک ہی ایک شخص ہوا کیا، مثلاً مذہب قدریہ کا موجد معبد جہنی ہے جو صحابہ کے زمانہ میں تھا اور جس صحابی نے اُس کی یہ بدعت سنی، اُس سے ابرائے ذمہ کر کے اُس کی مخالفت کا اعلان کیا، اِسی طرح مذہب اعتزال کا موجد واصل ابن عطا ہے جو تابعین کے زمانہ میں تھا، اسی طرح کل مذاہب باطلہ کا حال ہے، جو مذہب اہل سنت و جماعت سے علحدہ ہو کر

قرآن میں ایسی بدنما تاویلیں کرتے جو صراحۃً تحریف ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق بحسب ضرورت حدیثیں بنا لیتے اور جو حدیثیں اپنے مقصود کے مخالف تھے، اُن کو موضوع قرار دیتے یا تاویلیں کرتے، کیونکہ نئی بات کا موجد جو تمام امت موجودہ سے علحدگی اختیار کرتا ہے، جب تک ایسی کارسازیاں نہ کرے، کوئی شخص اُس کا ہم خیال نہیں بن سکتا، بخلاف اِس کے اہل سنت و جماعت کو جو ہر ایک موجد کے زمانہ میں موجود تھے، ایسی کارروائیوں کی ضرورت ہی نہ تھی، اس سے ظاہر ہے کہ صرف اہل سنت و جماعت کا مذہب ایسا ہے جس میں کسی کے ایجاد و اختراع کو دخل نہیں، اور یہ مسلم ہے کہ ہمارا آسمانی دین کسی کے ایجاد اور اختراع کو جائز نہیں رکھتا۔

تہتر مذہبوں میں سے اہل سنت و جماعت ناجی ہیں

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا کہ اس دین میں تہتر (۷۳) مذہب بنائے جائیں گے، مگر وہ کل مذاہب ناری ہیں اور ناجی ایک ہی مذہب ہے، کسی نے پوچھا وہ کونسا مذہب ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں ”**کما فی المشکوٰۃ عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و تفترق امتی علی ثلاثۃ و سبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول قال ما انا علیہ و اصحابی رواہ الترمذی و فی معناہ ما رواہ احمد و ابو داود**“ اسی وجہ سے تابعین نے احادیث اور اقوال صحابہ کو محفوظ کرلیا تا کہ وہ ناجی مذہب ہاتھ سے جاتا نہ رہے اور اُن کے بعد کے طبقات میں بھی اُن کی پوری پوری حفاظت ہوتی گئی ۔ ہر چند اہل مذاہب باطلہ نے بہت کچھ فکریں کیں کہ اپنے خیالات باطلہ کو دینی مسائل اور اعتقادات میں مخلوط کر دیں، چنانچہ طلاقت لسانی سے کام لیا، بعضے

سلاطین کو اپنے ہم خیال بنا کر مسلمانوں پر دباؤ ڈالا، جعلسازیاں کیں، مگر بفضلہٖ تعالیٰ اُن کی کچھ چل نہ سکی اور اُن کے تراشیدہ خیالات دین میں ایسے ممتاز رہے جیسے دودھ میں مکھی، جن کو مسلمانوں نے نکال کر پھینک دیا اور بفضلہٖ تعالیٰ وہی خالص دین ہم تک برابر پہنچ گیا۔ **نحمد الله علی ذلک۔**

وجہ اصرارِ امام احمد بر مسئلۂ خلقِ قرآن

(۳) اگر چہ شرعاً اجازت ہے کہ جبر واکراہ کے موقع میں زبان سے کوئی کلمۂ کفر کہہ دیا جائے تو مضائقہ نہیں جیسا کہ اِس آیۂ شریفہ سے ظاہر ہے ''**من کفر بالله من بعد ایمانه الامن اکرہ و قلبه مطمئن بالایمان و لکن من شرح بالکفر صدراً فعلیهم غضب من الله و لهم عذاب عظیم**'' اسی وجہ سے اکثر محدثین نے قرآن کے مخلوق ہونے کا زبانی اقرار کرلیا تھا اور امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ بھی اِس مسئلہ کو بخوبی جانتے تھے، باوجود اس کے آپ جو انکار کرتے رہے، اُس کی وجہ یہی تھی کہ اگر کل علماء مصلحۃً قرآن کا اقرار کر لیتے تو عوام الناس اس مصلحت کو نہ سمجھتے، بلکہ یہ خیال کر لیتے کہ اگر یہ اعتقاد باطل ہوتا، کوئی اس کی مخالفت کرتا اور اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ معلوم نہیں یہ طوفان بے تمیزی کب تک رہے گا، اگر ایک مدت تک یہی اعتقاد فاسد عوام الناس کے ذہن میں جما رہے، تو اہل حق کو آئندہ اُس کی اصلاح میں دشواریاں لاحق ہوں گی۔ غرضکہ اِن خیالات سے آپ اور آپ کے چند ہم خیال محدثین نے اقسام کی سختیاں اٹھائیں، بلکہ جان تک دے دی، مگر حق بات ظاہر کرتے رہے جس سے تمام مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ یہ مسئلہ دین میں ایسا ضروری اور مہتم بالشان ہے کہ اُس کے مقابلہ میں جان بھی کوئی چیز نہیں، چنانچہ اس کا یہ اثر ہوا کہ اسی مسئلہ پر اہل حق و باطل کا امتیاز قرار

پایا، نہایت شدومد سے احتیاط ہونے لگی، چنانچہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں ''وھو کلام اللہ فی صدور الحافظین والسن الناطقین و فی اکف الکاتبین و ملاحظة الناظرین و مصاحف اھل الاسلام والواح الصبیان حیثما رؤی ووجد فمن زعم انہ مخلوق اوعبارتہ أو التلاوة غیر المتلو أو قال لفظی بالقرآن مخلوق فھو کافر باللہ العظیم و لا یخالط و لا یواکل ولا یناکح و لا یحاور بل یھجرو ویھان ولا یصلی خلفہ ولا یقبل شھادتہ ولا یصح ولایتہ فی نکاح ولیہ و لا یصلی علیہ اذا مات فان ظفر بہ استتیب ثلاثاً کالمرتد فان تاب و الا قتل سئل الامام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ عمن قال لفظی بالقرآن مخلوق فقال کفر و قال رحمہ اللہ فیمن قال القرآن کلام اللہ لیس بمخلوق أو التلاوة مخلوقة کفر'' تلاوت اور متلو میں جو فرق ہے، اہل علم خوب جانتے ہیں، مگر چونکہ عوام ایسے امور میں فرق نہیں کر سکتے، اس لئے دونوں کا ایک ہی حکم قرار دیا گیا تھا تاکہ قرآن کے مخلوق ہونے کا کسی کو خیال بھی نہ آئے اور یہ تشدد اِس قسم کا تھا، جیسے تحریم خمر کے زمانہ میں ظروف خمر کا استعمال بھی حرام کر دیا گیا تھا، باوجود یہ کہ امام بخاریؒ کی جلالت شان تمام محدثین میں مسلّم ہے، مگر جب انہوں نے یہ کہا کہ قرآن تو غیر مخلوق ہے، مگر اُس کا تلفظ کرنا جو انسان کا فعل ہے وہ مخلوق ہے، اتنی بات پر اُس زمانہ کے محدثین اُن سے بگڑے، چنانچہ طبقات شافعیہ میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ جب امام بخاریؒ نیشاپور گئے تو علماء بغداد نے ذہلیؒ کو جو وہاں شیخ الشیوخ مانے جاتے تھے، لکھ بھیجا کہ محمد بن اسماعیل بخاری وہاں آتے ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ تلفظ بالقرآن مخلوق ہے، ہر چند ہم نے اُن کو اِس عقیدہ سے منع کیا، مگر وہ نہیں مانتے اس لئے سب سے کہہ دیا جائے کہ کوئی

اُن کے پاس نہ جائے، چونکہ امام بخاریؒ کی شہرت ہر ملک میں تھی، نیشاپور میں آپ کی تشریف فرمائی کا حال معلوم ہوا تو آپ کے استقبال میں خلق کا ایک ہجوم تھا۔

مذہبِ امام بخاری درمسئلۂ خلقِ قرآن

چنانچہ طبقات شافعیہ میں لکھا ہے کہ صرف وہ لوگ جو گھوڑوں پر سوار تھے، چار ہزار تھے اور جو لوگ خچروں اور گدھوں پر سوار تھے یا پیادہ تھے، اُن کی تو گنتی نہیں، ہر روز محدثین اور طلبہ جوق جوق بغرض استفادۂ تلمذ حاضر ہوتے، ایک روز جب خوب مجمع ہوا، ایک شخص نے کھڑے ہوکر پوچھا کہ حضرت! تلفظ بالقرآن کو آپ مخلوق کہتے ہو یا غیر مخلوق؟ ہر چند آپ نے ٹالا مگر اُس نے پیچھا نہ چھوڑا، آخر آپ نے اپنی تحقیق بیان کی کہ قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور بندے کے کل افعال مخلوق ہیں یعنی تلفظ بندے کا فعل ہے، اس لئے وہ مخلوق ہے، یہ کہنا ہی تھا کہ مجلس میں شور مچ گیا اور کل حضار مجلس چلے گئے اور اُدھر ذہلیؒ نے اعلان دیا کہ جو شخص بخاری کے پاس جائے وہ ہمارے پاس نہ آئے، کیونکہ جو شخص تلفظ بالقرآن کو مخلوق کہے وہ بدعتی ہے، اُس کے ساتھ بیٹھنا اور اُس سے بات کرنی درست نہیں، غرض امام بخاریؒ اس مسئلہ میں اس قدر مطعون اور دل تنگ ہوئے کہ ایک کتاب اِس باب میں لکھنے کی ضرورت ہوئی، جس کا نام ''**خلق افعال عباد**'' رکھا اس میں بہت سی آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کیا اور بہت سے دلائل قائم کئے منجملہ اُن کے چند یہ ہیں ''**قرائة القرآن العمل و من قال عمل العباد ليس بخلق فهو كافر**'' اور لکھا ہے ''**ان الابلاغ منه صلى الله عليه وسلم و ان كلام الله من ربه**'' اور لکھا ہے ''**القراءة فعل العبد و لا يخفى معرفة هذا القدر الاعلى من اعمى الله قلبه و لم يوفقه ولم يهده سبيل الرشاد**'' اور لکھا ہے ''**جميع القرآن**

هو قوله والقول صفة القائل وهو موصوف به فالقرآن قول الله عزّ و جل والقراء ة والكتابة والحفظ للقرآن من فعل الخلق'' اور ہرایک استدلال میں احادیث بکثرت پیش کئے ہیں۔

تهذيب التهذيب سے ظاہر ہے کہ حسین بن علی کرابیسی کو محدثین معتبر سمجھتے تھے، چنانچہ خطیب بغدادی نے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ ''كان فهيمًا عالماً فقيهًا وله تصانيف كثيرة في الفقه و في الاصول تدل على حسن فهمه و غزارة علمه'' باوجوداس کے جب انہوں نے امام احمد بن حنبلؒ کی مخالفت کی اور مخالفت بھی اسی قدر کہ لفظی بالقرآن مخلوق کہتے تھے ورنہ قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے وہ بھی قائل تھے، تو محدثین نے ان کو ترک کر دیا اور لکھا ہے کہ امام بخاریؒ اُن کی صحبت میں رہتے تھے، اُن ہی سے یہ مسئلہ انہوں نے لیا ہے۔

تہذیب التہذیب میں ابوبکر احمد رمادی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ کسی نے ابوداؤد سے پوچھا کہ آپ رمادی کی روایتیں کیوں نہیں بیان کرتے؟ کہا ''رأيته يصحب الواقفة فلم احدث عنه'' یعنی میں نے اُس کو دیکھا کہ اُن لوگوں کے ساتھ رہا کرتا ہے جو قرآن کو غیر مخلوق کہنے میں توقف کرتے ہیں، اس لئے اُس سے روایت نہیں لی، حالانکہ تہذیب التہذیب سے ظاہر ہے کہ رمادی کے حفظ وغیرہ کی توثیق محدثین نے کی ہے۔ تذکرۃ الحفاظ میں اسحاق ابن ابی اسرائیل کا حال لکھا ہے کہ محدثین نے اُن کی توثیق میں یہاں تک کہا ہے کہ حفظ وورع میں اُن کا نظیر نہیں، مگر جب انہوں نے قرآن کو غیر مخلوق کہنے میں توقف کیا تو محدثین نے اُن کو ترک کر دیا اور تہذیب التہذیب میں اُن کے ترجمہ میں ابوحاتم رازی کا قول نقل کیا ہے کہ پیشتر ہم لوگ اُن سے روایت لیتے تھے، مگر جب انہوں نے قرآن کے مسئلہ میں توقف کیا تو ہم نے اُن سے حدیث لینے میں توقف کیا اور محدثین نے ان کو ترک

کردیا، چنانچہ میں کبھی کبھی اُن کی مسجد میں جاتا تو دیکھتا کہ وہ اکیلے بیٹھے ہیں اور کوئی اُن کے پاس نہیں جاتا۔ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابن شرقی کہتے ہیں کہ میں محمد ابن یحییٰ کے حلقہ میں گیا، انہوں نے اہل حلقہ کی طرف خطاب کر کے کہا کہ تلفظ بالقرآن کو جو شخص مخلوق کہے وہ ہماری مجلس میں نہ آئے۔ کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ مسئلہ خلق قرآن میں چھ مہینے تک ابوحنیفہؒ کے ساتھ میں مناظرہ کرتا رہا، آخر میری اور اُن کی رائے کا اتفاق اس پر ہوا کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے اور محمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

مقصود ہمارا اس بیان سے اسی قدر ہے کہ اس مسئلہ میں محدثین نے اس قدر احتیاط کی کہ امام بخاریؒ جیسے مستند، شیخ وقت کی کسی نے نہ مانی اور مدتوں وہ مطعون رہے اور بہت سے محدثین متروک کردیئے گئے اور سلاطین کی وہ جابرانہ کارروائیاں سب **کان لم یکن** ہوگئیں، بلکہ بمصداق ''عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد'' جس قدر انہوں نے تشدد کیا تھا، اُس سے زیادہ محدثین کی طرف سے اس مسئلہ میں تشدد ہوا اور سلطنت نے جس بات پر اپنا پورا زور لگایا تھا، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی مخالفت نہایت شد و مد سے کی گئی اور سلطنت سے کچھ نہ ہوسکا، غرضکہ سلاطین کی پوری مخالفت سے بھی دین کا ایک مسئلہ نہ بگڑ سکا، محدثین نے اِس مسئلہ میں اس قدر تشدد اس وجہ سے کیا کہ ایک حدیث شریف میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن غیر مخلوق ہے، جس کی حفاظت ان جانبازان اسلام نے کی اب غور کیجئے کہ کس قدر اِن حضرات کو استقامت تھی کہ ہر چند سلطنت مخالف ہوگئی، مگر ایک حدیث کو بھی انہوں نے تلف ہونے نہ دیا، یہ لوگ ہیں جن سے دین کی حفاظت ہوئی، اگر خالص دین پوچھئے تو وہی ہے جو اِن حضرات کے ذریعہ سے پہونچا ہے، ایسے ہی افراد سے دین لینے کی ضرورت عقلاً اور شرعاً ثابت ہے، کنز العمال میں ہے'' **عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابن آدم دینک دینک انما ہو**

لحمک و دمک فانظر عمن تاخذ خذالدین عن الذین استقامو ولا تاخذ عن الذین قالوا ''(عد) یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اے ابن آدم! دین کو خوب مستحکم کر، وہ تیرا گوشت وخون ہے، یعنی قوام روحانی اُسی سے ہے، دین کو دیکھ سمجھ کے لے، ایسے لوگوں سے لے جن کو دین میں استقامت حاصل ہے اور اُن لوگوں سے مت لے جو کہتے ہیں یعنی باتیں ہی باتیں ہیں اور عمل ندارد اور عقل بھی اسی کو مقتضی ہے، اس لئے کہ جو لوگ صرف طمع دنیوی سے دین کے مسائل میں تصرف کرتے ہیں یا عقل کی پیروی کر کے قرآن وحدیث کے معنی میں تحریف کرتے ہیں، اُن سے جو بات لی جائیگی اُس کو دین سے کیا تعلق، وہ تو اُن کی رائے ہوئی اور دین کسی کی رائے کا نام نہیں، وہ خاص خدا ورسول کا مقرر کیا ہوا ہے، جس کا ثبوت آیات واحادیث سے صراحۃً ہوا ہو۔

محدثین کی ہمت وغیرہ

غرضکہ محدثین کی جانفشانیاں، اولوالعزمیاں اور وہ امور، جن سے حفاظت حدیث متعلق ہے مثل حافظہ، تدین اور احتیاط وغیرہ دیکھے جائیں تو اہل انصاف کا وجدان خود گواہی دے گا کہ یہ حضرات خاص احادیث کی حفاظت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، اب ہم چند حالات بھی ان حضرات کے بطور'' دو مشتے نمونہ از خروارے'' تبرکاً ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس سے ہمارے قول کی تصدیق ہوجائیگی۔

مقدمۂ فتح الباری میں شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ کے والد مالدار شخص تھے، پچیس ہزار درہم انہوں نے کسی کو مضاربت کی غرض سے دیئے تھے، اُن کے انتقال کے بعد اُس شخص نے چاہا کہ وہ مال غصب کرے، لوگوں نے امام بخاری سے کہا کہ والی سے اسباب میں مدد لیجئے، آپ نے فرمایا کہ اگر میں والی سے کوئی درخواست

کروں تو وہ مجھ سے بھی کچھ خواہش کرے گا اور میں دین کو دنیا کے عوض ہرگز بیچنا نہیں چاہتا، اُس کے بعد اُس شخص نے اس بات پر صلح کی کہ ہر مہینے دس درہم دیا کرونگا، آپ اُسی پر راضی ہو گئے اور خود امام بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جب میں آدم ابن ایاس کے یہاں تحصیل حدیث کے لئے گیا، اُس وقت میرے پاس کچھ خرچ نہ تھا، کئی روز گذران اِس طور پر رہی کہ جب زیادہ بھوک لگتی تو جنگل کو جا کر کچھ پتے بوٹیاں کھا لیتا۔ طبقات شافعیہ میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ عمر بن حفص کہتے ہیں ہم بصرہ میں بخاریؒ کے ساتھ حدیث لکھتے تھے، ایک بار کئی روز اُن سے ملاقات نہ ہوئی، اتفاقاً ایک روز کسی حجرہ میں اُن کو دیکھا کہ برہنہ بیٹھے ہیں، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ لباس نہ ہونے کی وجہ سے باہر نہ نکل سکے اور خرچ بھی ہو گیا تھا، ہم نے چندہ کر کے اُن کو لباس بنا دیا، اُن کی اولوالعزمی کا خیال کیجئے کہ کھانیکی وہ حالت اور کپڑے کی یہ حالت، باوجود اس کے اُن کی ہمت میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور کمال حاصل کر ہی لیا اور لکھا ہے کہ حامد بن اسماعیل وغیرہ کہتے ہیں کہ بخاریؒ لڑکپن میں ہمارے ساتھ اساتذہ کے یہاں جاتے، مگر چپ چاپ بیٹھے رہتے، کبھی کوئی حدیث نہیں لکھی، ہم اکثر کہا کرتے کہ جب ہر روز تم آتے ہو، کیوں نہیں لکھا کرتے؟ اِس تضییع اوقات سے کیا فائدہ؟ یہ سنکر چپ ہو جاتے، ایک روز جب ہم نے بہت ملامت کی تو کہا کہ تم نے مجھے تنگ کر دیا، اچھا جو حدیثیں تم نے لکھی ہیں وہ سب نکالو، جب ہم نے نکالا تو پندرہ ہزار سے زیادہ ہو گئی تھیں، کہا یہ سب مجھ سے زبانی سن لو! چنانچہ وہ پڑھتے گئے اور ہم اُن سے سنکر تصحیح بھی کرتے گئے اس کے بعد جب وہ کسی شیخ کے یہاں جاتے تو طالب علموں کا ان کے ساتھ مجمع رہتا، چونکہ وہ کم عمر تھے، کسی جگہ راہ میں زبردستی اُن کو بٹھا لیتے اور اُن سے احادیث کی تصحیح کرتے اور ہزاروں شائقین کا وہاں مجمع ہو جاتا اور اکثر ان ہی سے روایت کرتے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابن ابی حاتم کا حال لکھا ہے کہ وہ مصر میں سات مہینے رہے، وہ کہتے ہیں کہ اِس عرصہ میں سالن کھانے کی کبھی نوبت نہ آئی، دن کو اساتذہ کی خدمت میں جاتے اور رات کو سبق لکھ لیتے یا لکھے ہوئے کا مقابلہ کرتے۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک روز میں اور میرے ہم سبق رفیق ایک شیخ کے یہاں گئے، معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں، واپسی کے وقت بازار میں ایک مچھلی نظر آئی، چونکہ فرصت تھی اُس کو ہم نے خریدا، جب گھر پہونچے تو دوسرے شیخ کی تدریس کا وقت ہو چکا تھا، ہم وہاں چلے گئے اور وہ مچھلی رکھی رہی اور تین روز تک اُس کے پکانے کی نوبت نہ آئی، آخر بھوک کی حالت میں جس قدر کھائی گئی کچی کھالی۔

علمائے سلف میں مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی نے لکھا ہے کہ ابن مقری بیان فرماتے ہیں کہ میں نے صرف ایک نسخہ ابن فضالہ کی خاطر ستر منزل کا سفر کیا تھا، اُس نسخے کی ظاہری حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی نان بائی کو دیا جائے تو وہ ایک روٹی بھی اُس کے عوض میں دینا گوارا نہ کرے گا، اِس کے علاوہ امام موصوف نے چار مرتبہ مشرق (ممالک ایشیا) اور مغرب (ممالک افریقہ و اسپین) کا سفر کیا تھا اور دس دفعہ بیت المقدس گئے تھے۔

اُسی میں ابن طاہر مقدسی کا حال تذکرۃ الحفاظ سے لکھا ہے کہ انہوں نے جتنے سفر طلب حدیث میں کیئے، کبھی سواری کا سہارا نہیں لیا، سواری اور باربرداری دونوں کا کام وہ اپنے ہی نفس سے لیتے تھے، سفر پیادہ کرتے تھے اور کتابوں کا پشتارہ پشت پر ہوتا تھا مشقت پیادہ روی کبھی کبھی یہ رنگ لاتی کہ پیشاب میں خون آنے لگتا، اسی جفاکشی سے جو سیاحت حافظ ممدوح نے کی، اُس میں حسب ذیل مقامات منجملہ اور مقاموں کے تھے۔ بغداد' مکہ مکرمہ' جزیزہ تنیس (واقع بحیرۂ روم) دمشق' حلب' جزیرہ اصفہان' نیشاپور' ہرات' رحبہ' لوقان' مدینہ طیبہ' نہاوند' ہمدان' واسط' ساوہ' اسدآباد' انبار' اسفرائن' آمل' اہواز' بسطام'

خسروجرد' جرجان' آمد' استرآباذ' بوسنج' بصرہ' دینور' ری' سرخس' شیراز' قزوین' کوفہ، اس کے سوا محدثین کے شوق اور علو ہمت اور استقلال وغیرہ کے وقائع بکثرت ہیں جن میں سے اکثر علماء سلف میں مذکور ہیں۔

محدثین کا حافظہ

اب اُن حضرات کے حافظہ کا بھی تھوڑا سا حال سُن لیجئے! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حافظہ کا تو حال کسی قدر ابھی معلوم ہوا، اِس کے سوا اور بہت سے حالات کتابوں میں مذکور ہیں۔ بستان المحدثین میں شاہ عبدالعزیزؒ نے امام ترمذیؒ کے حافظہ کا حال لکھا ہے کہ کسی شیخ سے آپ نے دو جزء روایتیں لکھ لی تھیں، مگر اُس کی تصحیح کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ایک عرصہ کے بعد مکہ معظّمہ کی راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی، آپ نے اُن روایتوں کی تصحیح کی درخواست کی، شیخ نے فرمایا اچھا وہ جزء نکالو، آپ نے نکالے، شیخ نے پڑھنا شروع کیا اور آپ سنتے جاتے تھے اور جزء برائے نام ہاتھ میں تھے، اتفاقاً وہ جزء سادے تھے، جن پر شیخ کی نگاہ پڑ گئی، غصہ سے شیخ نے کہا: کیا تم استہزاء کرتے ہو؟ آپ نے کہا مجھے اجزاء کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، وہ کل حدیثیں مجھے یاد ہیں، شیخ نے فرمایا اگر یاد ہیں تو پڑھو، آپ نے پوری حدیثیں مع اسناد، سنا دیں شیخ نے امتحاناً چالیس حدیثیں اپنی غرائب پڑھیں جو دوسروں کے پاس نہیں تھیں، آپ نے وہ حدیثیں بھی مع اسناد، سنا دیں۔

جب امام محمد صاحب، امام صاحب کی خدمت میں گئے، آپ نے فرمایا پہلے قرآن شریف یاد کرلو! یہ سُنکر وہ چلے گئے اور ایک ہفتہ میں یاد کرلیا۔ طبقات شافعیہ میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ ابوالفضل ہمدانی جب نیشاپور گئے تو اُن کے حافظہ کی وہاں بڑی شہرت ہوئی اور فی الواقع حافظہ تھا بھی ایسا ہی سو شعر ایک بار کے سُننے میں اُن کو ایسے یاد ہو جاتے کہ

آخری شعر سے شروع کر کے ایک ایک شعر، اول تک سنا دیتے، چنانچہ اُسی پر اُن کو بدیع الزماں کا لقب وہاں ملا۔ ایک روز انہوں نے کمال فخر سے کہا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فن حدیث میں حافظ ہے اور اکابر محدثین کا ذکر اس لقب سے کیا جاتا ہے، سو وہ کوئی نادر بات نہیں، یہ کیفیت حافظ ابوعبداللہ حاکم کو پہونچی، انہوں نے حدیث کا جزء اُن کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ ایک ہفتہ کی آپ کو مہلت ہے، اُس کو خوب یاد کر کے سنا دیجئے! مدت گذرنے کے بعد انہوں نے یہ کہہ کر وہ جزء واپس کر دیئے کہ یہ کون یاد کرے؟ محمد ابن فلاں اور جعفر ابن فلاں اور عن فلاں مختلف نام اور ایسے الفاظ کہ جن میں کوئی مناسبت نہیں حاکمؒ نے کہلایا بس اپنے حافظہ کا مقدار سمجھ رکھئے! یعنی اشعار کا یاد ہوجانا اور ہے اور حدیثوں کا یاد رکھنا اور اشعار کے مضمون میں مناسبت ہوتی ہے اور احادیث کے اسنادوں میں اور ناموں میں کوئی ربط مناسبت نہیں ہوتی، یہاں صرف حافظہ کا کام ہے جو خاص موہبت الٰہی ہے۔

تہذیب التہذیب میں اسحاق ابن ابراہیم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ایک بار انہوں نے گیارہ ہزار حدیثیں مع اسناد زبانی لکھوا دیں، پھر جب شاگردوں نے دوبارہ پڑھنے کو کہا تو بلاکم و کاست اعادہ کر دیا اور ایک حرف کی کمی و زیادتی نہیں کی۔ اِس قسم کے واقعات کتب رجال میں بکثرت مذکور ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے نامی گرامی محدثین ہیں، سب کو اعلیٰ درجہ کا حافظہ عنایت ہوا تھا، اسی وجہ سے اُن کا لقب حافظ ہوا کرتا تھا، چنانچہ امام ذہبیؒ نے خاص ان حضرات کے حالات میں ایک کتاب چار جلدوں میں لکھ کر اُس کا نام تذکرۃ الحفاظ رکھا، چونکہ حفاظت حدیث کا مدار حافظہ پر ہے، اس وجہ سے راویوں کے حافظہ کی تحقیق و تفتیش خاص طور پر ہوا کرتی تھی، اگر پیرانہ سری کی وجہ سے کسی کے حافظہ میں ضعف آ جاتا تو وہ کیسی ہی مستند شیخ الشیوخ مانے گئے ہوں، متروک کر دیئے جاتے تھے۔ تہذیب

التہذیب میں ابن حجر عسقلانیؒ نے جریر ابن حازم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ اعمش اور ایوب اور ابن مبارک اور وکیعؒ وغیرہ کے استاد ہیں جن میں کسی قسم کا کلام نہیں ہوسکتا، مگر جب اُن کے حافظہ میں ضعف آ گیا تو خود اُن کے فرزندوں نے اُن کو ترک کر دیا۔ ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ جس قوم میں شوق تحصیل حدیث اور علو ہمت اور استقلال اور قوت حافظہ مافوق العادت حق تعالیٰ نے دی ہو تو بدلیل اِنّی یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ کو منظور ہے کہ مثل قرآن کے احادیث نبویہ بھی محفوظ رہیں، کیونکہ اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ جس قوم کو خدائے تعالیٰ کوئی فضیلت دینا چاہتا ہے تو اس میں لائق اور قابل افراد پیدا کر کے ایسے صفات اُن کو عطا فرماتا ہے کہ اُن کو کام میں لائیں تو اُس فضیلت کے مستحق ہو جائیں، پھر عمل کی توفیق بھی دی جاتی ہے جس سے وہ کوششیں کر کے وہ فضیلت حاصل کر لیتے ہیں۔ غرضکہ حضرات محدثین کو تمامی اہل اسلام میں اس فضیلت کا افتخار ضرور حاصل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو انہوں نے محفوظ کر دیا۔

پھر علاوہ صفات مذکورہ کے ان حضرات کی طبیعتوں میں احتیاط انتہاء درجہ کی تھی، وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی ایسی بات دین میں شریک ہوجائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہ ہو، یہ احتیاط صحابہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگئی تھی۔ منشا اُس کا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **"من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار"** جس سے ظاہر ہے کہ حضرت کے اقوال وافعال سے متعلق کوئی خلاف واقع بات بیان کی جائے تو اُس کا انجام دوزخ ہے۔ اِس وجہ سے صحابہ کو کسی حدیث میں ذرا بھی شک ہوتا تو اُس کو بیان نہ کرتے، اِس خیال سے کہ کہیں اس وعید کے مستحق نہ ہو جائیں، اسی احتیاط نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو احادیث کے جمع کرنے سے روک دیا تھا۔ تذکرہ الحفاظ میں لکھا ہے کہ آپ نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں، مگر اس خیال سے کہ اُن میں

کوئی حدیث شاید خلاف واقع ہو، سب کو جلا دیا اور باوجود اُس ملازمت اور تقرب کے صرف تخمیناً سو روایتیں آپ سے مروی ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جس طرح میں اس وقت حدیثیں بیان کرتا ہوں، اگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بیان کرتا تو مجھے دُرّے مارتے اور لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود اور ابوالدرداء اور ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہم کو تین روز قید رکھا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت ساری حدیثیں روایت کیں اور جب آپ نے قرظہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو عراق بھیجا تو اُن کو تاکید کی کہ حدیث کی روایت بہت کم کریں۔

شیخین کا روایتِ حدیث سے روکنا اور اُس کا سبب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا **''فلیبلغ الشاھد الغائب''** وغیرہ فرمایا جس سے ظاہر ہے کہ صحابہ کو ضرور تھا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا اور دیکھا ہے اُمت کو پہنچادیں اور نیز احادیث میں علم کی اشاعت کی ترغیبیں اور چھپانے کی وعیدیں وارد ہیں اور اُس زمانہ میں سوائے قرآن وحدیث کے کوئی دوسرا علم نہ تھا ،غرضکہ کئی طرح سے ثابت ہے کہ احادیث کی اشاعت صحابہ کا فرض منصبی تھا، پھر صدیق اکبر اور عمر رضی اللہ عنہما کا اُس سے منع کرنا کیسا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اُن حضرات نے روایت حدیث کرنے سے ہرگز منع نہیں کیا اور نہ اُن کو یہ منظور تھا کہ تمامی امت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادوں سے محروم رہ جائے اور نہ اُن کا یہ خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل ارشادات صحابہ ہی کے واسطے تھے اور بعد آنے والی اُمت اُن خطابات اور احکام کی مامور نہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قیامت تک حضرت ہی کی نبوت ہے اور نبی کے ارشادات اُمت کو معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شارع تھے

ہر موقع اور اشخاص کے لحاظ سے جو احکام مناسب ہوتے بذریعۂ الہام آپ کو معلوم ہوجاتے اور آپ اُن کو بیان فرمادیتے، جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے **کما قال تعالی: و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یو حی**, یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کہتے، وہ ایک قسم کی وحی ہے جو اُن کو ہوا کرتی ہے، اور سنن دارمی میں روایت ہے" **عن حسان رضی اللہ عنه قال کان جبریل ینزل علی النبی صلی اللہ علیه وسلم بالسنة کما ینزل علیه بالقرآن**" اِس سے تو جبریل علیہ السلام ہی کا سنت کو لانا ثابت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے ارشادات میں اختلاف ضرور ہوگا، پھر اگر وہ سب بیان کردیئے جائیں تو لوگ حیرانی میں پڑجائیں گے۔ اِن وجوہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اختلافی روایات بیان کرنے سے منع کیا تھا، چنانچہ یہی بات آپ کے اِس قول سے ظاہر ہے جو تذکرۃ الحفاظ میں منقول ہے" **ان الصدیق جمع الناس بعد وفاۃ نبیھم فقال انکم تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم احادیث تختلفون فیھا والناس بعد کم اشد اختلافاً فلا تحدثوا عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم شیئاً فما سالکم فقولوا بیننا و بینکم کتاب اللہ فاستحلوا حلاله و حرموا حرامه**". یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بعد وفات نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ جو روایتیں تم لوگ کرتے ہو، اُن میں اختلاف ہوتا ہے، اور جب تم ہی میں اختلاف ہو تو تمہارے بعد والے اور بھی سخت اختلاف میں پڑجائیں گے، اس لئے اختلافی روایتیں مت بیان کیا کرو، اگر کوئی تم سے پوچھے تو یہی کہہ دینا کہ ہم میں اور تم میں قرآن موجود ہے، جو چیزیں اُس میں حلال ہیں اُن کو حلال اور جو حرام ہیں اُن کو حرام سمجھو۔ اس سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اختلاف سے روکنا منظور تھا، وہ بھی صرف حلال وحرام میں اور دوسرے حدیثوں سے کوئی

تعرض نہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ حلت وحرمت سے متعلق حدیثیں بہ نسبت تمام حدیثوں کے عشر عشیر بھی نہیں۔ النکت میں ابن حجر عسقلانیؒ نے امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حلال و حرام کے باب میں احادیث مرفوعہ کل آٹھ سو ہیں اور عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے کہ نوسو ہیں۔ بہرحال اِن آٹھ نوسو کے سوا لاکھوں حدیثیں ہیں جن میں خدائے تعالیٰ کی صفات اور وعظ ونصیحت اور اخلاق اور احوال برزخ اور قیامت اور جنت اور دوزخ اور اخبار امم سابقہ اور پیشین گوئیاں اور موجودات عالم کے حقائق وغیرہ امور مذکور ہیں، جس طرح آیات قرآنیہ جو احکام میں وارد ہیں، صرف پانچ سو ہیں، حالانکہ کل آیتیں چھ ہزار چھ سو سولہ ہیں، جیسا کہ امام سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے۔

غرضکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو کل احادیث کی روایت کی اجازت دی اور صرف احکام کے باب میں یہ خیال کیا کہ قرآن شریف میں وہ کل موجود ہیں اور احادیث میں اختلاف ہونے کی وجہ سے امت میں اختلاف پڑ جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے صرف اُن حدیثوں کی روایت سے روکا جو احکام میں وارد ہیں اور وہ بھی ایسی کہ اختلافی ہوں۔ اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر بھی یہی مصلحت تھی۔ اگر یہ حضرات نفس حدیث کو بے ضرورت سمجھتے تو ہر بات میں خود حدیثیں کیوں تلاش کرتے جس کا ثبوت متعدد روایتوں سے ملتا ہے۔ یہ بات درایت کے بالکل خلاف ہے کہ صحابہ کبار نے مطلقاً روایت حدیث کو جائز نہیں رکھا، یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ وہ حضرات جانتے تھے کہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافق اور تفرقہ انداز موجود تھے، تو بعد کے زمانوں کا کیا حال ہوگا؟ اور تاویل کے لئے کوئی حد نہیں، اگر احادیث بھی نہ رہے تو جس کا جو جی چاہے گا قرآن کے معنی بنا لیگا اور اُن معنی کو غلط ثابت کرنے کے لئے اہل حق کے پاس کوئی دلیل نہ رہے گی۔

بے دینوں کی تاویلیں قرآن میں

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بے دینوں نے قرآن کے جو معنی کئے دین سے اُن کو کوئی تعلق نہیں۔ منہاج السنۃ میں ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ابومنصور جو فرقہ منصوریہ کا بانی تھا، اُس کی یہ تعلیم تھی کہ قرآن میں جنت اور دوزخ کا جو ذکر ہے وہ دو شخصوں کے نام ہیں۔ مطلب یہ کہ اچھے بُرے افعال پر جزا و سزا کچھ نہیں، جس کا جو جی چاہے کرے، مگر حاکموں کے مواخذے سے بچ کر اور میتہ اور خنزیر وغیرہ جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی چند اشخاص کے نام ہیں جن کی محبت حرام کی گئی تھی ورنہ گوشت تو آدمی کی غذا اور باعث تقویت ہے، ایسی چیز کیوں حرام ہونے لگی۔ اسی طرح صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ بھی لوگوں کے نام ہیں جن کی محبت ہر مسلمان پر واجب ہے۔ غرضکہ قرآن میں تاویلیں کر کے کل تکلیفات شرعیہ کو اُس نے اُٹھا دیا اور باوجود اس کے اُس فرقہ کا دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن پر ہمارا ایمان ہے، توحید و رسالت کے قائل ہیں۔ مگر فرق اِس قدر ہے کہ قرآن کے جو معنی اور لوگ کیا کرتے ہیں، ہم نہیں کرتے۔ عبدالکریم شہرستانیؒ نے ملل و نحل میں لکھا ہے کہ مغیرہ ابن سعید عجلی جو فرقہ مغیریہ کا سرگروہ ہے۔ اُس کی تعلیم یہ تھی کہ حق تعالیٰ جو فرماتا ہے ''**انا عرضنا الامانة علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً**'' اِس کا مطلب یہ ہے کہ امانت یہ بات تھی کہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو امام نہ ہونے دینا یہ بات آسمان و زمین اور جبال نے قبول نہ کی اور ڈر گئے (کیونکہ علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت شہرۂ آفاق ہے) پھر وہ بات انسان پر پیش کی گئی تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اُن کو امام ہونے نہ دو اور میں تمہاری تائید میں موجود ہوں اِس شرط پر کہ مجھے اپنا خلیفہ بنانا،

اُنھوں نے قبول کیا، چنانچہ اُن دونوں نے اُس امانت کو اٹھالیا سو یہی بات ہے جو حق تعالیٰ فرماتا ہے۔''**و حملها الانسان انه كان ظلوماً جهولاً**''یعنی وہ دونوں ظلوم وجہول ہیں، اگر فرَقِ سابقہ اورموجودہ کی کتابیں دیکھی جائیں تو یہ صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ اِن لوگوں نے قرآن کو کھلونا بنالیا ہے۔کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ جو معنی اِن لوگوں نے اپنی مرضی کے مطابق بنالئے ہیں، وہ خدائے تعالیٰ کی مراد ہے؟ کیا انہی تراشیدہ خیالات کا نام، آسمانی دین ہوسکتا ہے؟ اگر کسی شخص کو حقیقت صوم وصلوٰۃ وغیرہ حدیث سے معلوم نہ ہوا اور اُس سے کہا جائے کہ وہ چند آدمیوں کے نام تھے تو اُس کو اِس اعتقاد سے انکار کرنے کا کیا ذریعہ؟ آخر ایک گروہ نے مان ہی لیا، اگر احادیث اُن کے پیش نظر ہوتیں تو کیا اُس کی دغابازی چل سکتی؟ ہرگز نہیں۔اسی وجہ سے ربیعہ رضی اللہ عنہا کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، مگر حدیثوں کی ضرورت باقی رکھی''**كما فى الدر المنثور اخرج ابن ابى حاتم من طريق مالك ابن انس**ؒ **عن ربيعة قال ان الله تبارك و تعالىٰ انزل الكتاب و ترك فيه موضعاً للسنة**''مطلب یہ کہ قرآن شریف میں جو کچھ اجمالی طور پر مذکور ہے جس کی تفصیل کی ضرورت ہے، سو وہ حدیثوں میں مذکور ہے۔دیکھ لیجئے قرآن شریف میں فقط نمازوں کا حکم ہے اور اُن کی تعداد اور تعین اوقات اور طریقہ حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے۔

حدیث سے قرآن، تحریفوں سے محفوظ ہوگیا

ہم نے مانا کہ حسب بیان مولوی شبلی صاحب احادیث غیر متواترہ قطعی الثبوت نہیں ہیں، مگر عدل، ضابط، محتاط راویوں کی روایت سے ظن غالب تو ہو جاتا ہے، پھر جب اُن الفاظ کے لغوی اور شرعی معنوں میں جو احادیث سے ثابت ہیں، مناسبت معلوم ہو جائے

اور مسلمانوں کا عمل بھی اُس کے مؤید ہو تو مسلمان کے دل پر اتنا تو اثر ضرور ہوگا کہ جو خود غرض، بے تدین لوگ تصرف کر کے اپنی رائے سے قرآن کے معنی گھڑ لیتے ہیں، اُن کو وہ ہرگز نہ مانے گا پھر اس سے بڑھ کر اور کیا فائدہ حدیث سے ہونا چاہئے، اُس کی بدولت خود قرآن جو اصل دین ہے، محفوظ ہو جاتا ہے۔

کنزالعمال میں یہ روایت ہے ''**عن عقبة ابن عامر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اتخوف علی امتی اثنتین یتبعون الاریاف والشهوات و یترکون الصلوٰة والقرآن یتعلمه المنافقون یجادلون به اهل العلم رواه الطبرانی** '' جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے خوف اِس بات کا ہے کہ منافق لوگ قرآن کو سیکھ کر اہل علم سے جھگڑے کریں گے، جس بات کا خوف حضرت کو تھا، وہی بات پیش آئی چونکہ منافقوں کو صرف جھگڑے کرنا اور اسلام میں رخنے ڈالنا منظور ہوتا ہے، اس لئے وہ فقط قرآن ہی کی طرف متوجہ ہو کر اُس کو سیکھ لیتے ہیں اور علماء کے ساتھ مجادلے اور رسالہ بازیاں کرتے ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ حدیث بھی سیکھیں تو اُن کو ایسے جھگڑوں کا موقع ہی نہ ملے، کیونکہ حدیثوں میں قرآن کے پورے پورے معنی بیان کر دیئے گئے ہیں، اس وجہ سے منافق حدیثوں سے گھبراتے ہیں اور سرے سے اُن کو بے اعتبار بنانے کی فکر کرتے ہیں، بخلاف اہل سنت کے کہ ہر مسئلہ میں قرآن اور تمام حدیثوں سے جو اِس باب میں وارد ہیں جو بات ثابت ہو اُس پر عمل کرتے ہیں۔

درمنثور میں دارمی سے یہ روایت منقول ہے۔ ''**عن عمر ابن الخطاب رضی الله عنه قال انه سیاتیکم ناس یجادلونکم بشبهات القران فخذوهم بالسنة فان اصحاب السنن اعلم بکتاب الله** '' یعنی عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا قریب ہے کہ تمہارے پاس لوگ آ کر قرآن کے شبہات میں جھگڑے کریں گے، سو اُن کو

حدیثوں سے الزام دو! اِس لئے کہ احادیث کو جاننے والے قرآن کو زیادہ جانتے ہیں، دیکھ لیجئے جو ہم نے کہا تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ جانتے تھے کہ جھگڑنے والے پیدا ہوں گے، سو اِس حدیث سے اُس کی تصدیق ہوگئی اور جو فرمایا کہ حدیث جاننے والے قرآن کو زیادہ جانتے ہیں، اُس کی یہی وجہ ہے کہ حدیث ہمیشہ قرآن کی تائید میں ہوتی ہے، غرض اس سے صاف ظاہر ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو حدیثوں کی روایت موقوف کرنی، ہرگز منظور نہ تھی **ھو المطلوب** ۔کنزالعمال میں ہے **''عن یحییٰ ابن ابی اسید ان علی ابن ابی طالب رضی الله عنه ارسل عبدالله ابن عباس رضی الله عنهما الی اقوام خرجوا فقال له ان خاصموک بالقرآن فخاصمه بالسنة''** یعنی علی کرم اللہ وجہہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوراج کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ اگر وہ قرآن سے استدلال کریں تو تم سنت یعنی حدیث سے استدلال کرو! اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں حسب مرضی مخالفین تاویلیں کر سکتے ہیں، مگر جب احادیث سے قرآن کے معنی متعین ہو جائیں تو پھر کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہتی ۔غرضکہ احادیث اور صحابہ کے اقوال اور عمل اور نیز درایت سے ثابت ہے کہ دین میں احادیث کی سخت ضرورت ہے، ورنہ دین حالت اصلی پر باقی نہیں رہ سکتا۔

صحابہ نے سب حدیثیں پہونچادیں

انہیں اسباب سے صحابہ کو جتنی حدیثیں یاد تھیں حسب ارشاد **''فلیبلغ الشاھد الغائب''** سب طالبین حدیث کو پہنچادیں۔ یہاں تک کہ بعض صحابہ نے جن روایتوں کو کسی مصلحت سے عمر بھر چھپا رکھا تھا، وہ بھی انتقال کے قریب بیان کر کے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ باوجود یہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کی رائے

اور دھمکیوں کو جانتے تھے، مگر اُن کے بعد ان حضرات نے احتیاط اسی میں سمجھی کہ جو روایتیں اپنے کو یاد ہیں، خواہ اختلافی ہوں یا غیر اختلافی سب بیان کر دیئے جائیں، رہا اختلاف سو فقہاء اُس کو نمٹ لیں گے۔

احادیث کی اشاعت میں صحابہ کا اختلاف بعینہ ایسا تھا جیسا کہ قرآن شریف کے جمع کرنے میں ہوا تھا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جمع نہ کرنے میں احتیاط سمجھتے تھے، اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جمع نہیں ہوا تھا اور عمر رضی اللہ عنہ جمع کرنے میں احتیاط سمجھتے تھے تاکہ تلف نہ ہو جائے۔ الحاصل جس طرح عمر رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل ہونے کی وجہ سے قرآن شریف محفوظ ہو گیا، اسی طرح اکثر صحابہ کی رائے پر عمل ہونے سے احادیث محفوظ ہو گئیں، الحمد للہ علی ذلک۔

وضعِ روایات

جب روایتیں ہر طرف بکثرت ہونے لگیں، تو منافقوں اور زندیقوں کو موقع مل گیا اور ملتے جلتے مضامین کی حدیثیں بنا بنا کر روایتیں کرنے لگے۔ اس طوفان بے تمیزی کی دفع کرنے کے غرض سے محدثین نے راویوں کی تحقیق شروع کر دی اور ایک جم غفیر محدثین کا اُن کے پیچھے پڑ گیا، اور شہر بشہر کو نچہ بکو نچہ اُن کی تلاش و تفتیش ہونے لگی، ان ہزاروں محققین سے وہ کہاں چھپ سکتے تھے، آخر ان کی جعلسازیاں طشت از بام ہو گئیں اور اُن مفتریوں کی فہرستیں نام بنام اسلامی دنیا میں شائع ہوئیں اور اب تک کتب رجال میں چھپ کر شائع ہوتی جاتی ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ اور تہذیب التہذیب میں ابراہیم ابو اسحاق کوفی کے حال میں لکھا ہے کہ ایک زندیق کو گرفتار کر کے رشید کے دربار میں لایا گیا، جب اُس کے قتل کی تجویز ہوئی تو

اُس نے بادشاہ سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ میں نے ایک ہزار حدیثیں بنائی ہیں؟ بادشاہ نے کہا: اے عدو اللہ! تو نہیں جانتا کہ ابو اسحاق فزاری اور ابن مبارک ایک ایک حرف کو چھان کر جدا کریں گے ۔ دیکھئے مرتے دم تک اُس کو یہی خیال تھا کہ کسی طرح احادیث میں شبہ ڈالدے، ورنہ اُس کو کسی نے پوچھا تھا کہ تو نے کتنی حدیثیں بنائیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگوں کے پیش نظر یہی بات رہی کہ حدیثوں میں کسی طرح شبہات پیدا کردیں، چنانچہ مرزا صاحب قادیانی نے بھی ازالۃ الاوہام میں کیسی کیسی تدبیریں کیں کہ کسی طرح احادیث ساقط الاعتبار ہو جائیں، جس کا حال ہم نے افادۃ الافہام میں لکھا ہے۔ غرضکہ ہر زمانہ میں نئی نئی تدابیر اور دلائل سوچے گئے، لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اُن کا مقصود کبھی پورا نہ ہوا چنانچہ بادشاہ کے جواب سے ظاہر ہے کہ علماء کے مقابلہ اُن کی کارروائیاں کبھی نہیں چل سکتیں ۔

مولوی شمس العلماء شبلی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھا ہے، زبانی روایت سے گذر کر تحریروں میں بھی ''جعل'' شروع ہوگیا تھا۔ مسلم نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلہ کی نقل لے رہے تھے، بیچ بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ واللہ علی رضی اللہ عنہ نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔ اِسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک تحریر دیکھی، تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی ۔ دیکھئے روافض نے جو باتیں علی کرم اللہ وجہہ کے فیصلوں اور تحریروں میں زیادہ کی تھیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سب کو مٹا کر اصل کو محفوظ کر دیا، اسی طرح ہر قرن کے محققین نے جعلسازیوں کی زیادتیوں کو دور کر کے اصل احادیث کو محفوظ کر دیا۔

یوں تو ان حضرات نے موضوع حدیثوں کو مختلف تدبیروں اور طریقوں سے پہچانا، مگر

اُن میں معرفت موضوع کا ایک طریقہ ایسا بھی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا جیسا کہ اِس حدیث شریف میں ہے۔ ''**عن سمرۃ ابن جندب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین حم م ہ**'' یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص ایسی حدیث میری طرف سے روایت کرے، جس کو وہ جھوٹ گمان کرتا ہے وہ بھی ایک جھوٹا ہے چونکہ محدثین کو سوائے حدیثوں کے پڑھنے پڑھانے کے کوئی دوسرا کام نہ تھا، اس مزاولت اور ممارست سے اُن کو ایک خاص ملکہ اور درایت حاصل ہوگئی تھی، جس سے احادیث نبویہ کو اور اُن کے کلام سے ممتاز کر لیتے تھے اور جس میں گمان ہوتا کہ وہ کسی دوسرے کا کلام ہے، اُس کو روایت ہی نہ کرتے تا کہ کہیں کاذبوں میں شریک نہ ہو جائیں۔

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب، سیرۃ النعمان میں لکھتے ہیں کہ بعض محدثین کا قول ہے ''**اثر یھجم علی قلوبھم لا یمکنھم ردّہ و ھیأۃ نفسانیۃ لا معدل لھم عنھا** '' یعنی وہ ایک اثر ہے جو ائمۂ حدیث کے دل پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کو رد نہیں کر سکتے اور نفسانی اثر ہے جس سے گریز نہیں ہوسکتا۔ محدثین کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے بے شبہ فن روایت کی ممارست سے ایک ملکہ یا ذوق پیدا ہوتا ہے، جس سے خود تمیز ہو جاتی ہے کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوسکتا ہے یا نہیں انتہی ۔ اسی ملکہ اور ذوق کو ہم اسلامی درایت سے تعبیر کریں گے ۔ غرضکہ اسلامی درایت کے مخالف جتنی حدیثیں تھیں سب صحت کے دائرہ سے خارج کر دی گئیں، رہیں وہ حدیثیں جن کو دوسری ملت والے یا معمولی عقلیں خلاف درایت سمجھتے ہیں، اُن کو بلا تکلف روایت کی اس لئے کہ اجنبی لوگوں کی درایت میں جو چیز امکان عادی کے خلاف ہو، وہ قابل قبول نہیں اور ہمارے دین میں

امکان عادی تو کیا بلکہ امکان ذاتی کے مخالف جو امور سمجھے جاتے ہیں، اُن کا وقوع بلکہ ضرورت قرآن شریف سے ثابت ہے، مثلاً بعد فنا ہڈیاں بوسیدہ بلکہ خاک ہونے کے بعد پھر مردوں کا زندہ ہوکر قبروں سے نکلنا، اور ایک لکڑی کا اژدہا بن جانا وغیرہ امور اس طور پر ثابت ہیں کہ جب تک اُن کا یقین نہ ہو آدمی مسلمان نہیں ہوسکتا اس کے سوا ہزاروں مسلمان ایسے امور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ دیکھا کئے کہ جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی ان یقینی اور متواتر شہادتوں نے مسلمانوں کی درایت کو دوسری اقوام کی درایت سے ممتاز کردیا تھا، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، درایتوں میں فرق ہوا ہی کرتا ہے۔ دیکھ لیجئے جس زمانہ میں ریل اور تار وغیرہ عجائب روزگار کی خبریں سنی جاتی تھیں، تو ان کو عقلاً مخالف درایت سمجھ کر قبول نہیں کرتے تھے، اور اب تک یہی بات جاری ہے کہ اس قسم کی کوئی نئی خبر سنی جاتی ہے تو بعضوں کی درایت قبول کرلیتی اور بعضوں کی نہیں قبول کرتی، پھر مشاہدہ یا تواتر سے معلوم ہونے کے بعد طوعاً وکرہاً ماننا پڑتا ہے۔ غرضکہ اسلامی درایت کے مخالف جتنی حدیثیں تھیں، وہ سب موضوع قرار پائیں اور جتنی حدیثیں صحیح سمجھی گئی مثلاً معراج وغیرہ کی، جن کے سمجھنے میں عقل حیران ہوتی ہے وہ سب اسلامی درایت کے موافق ہیں اُن کی صحت میں کوئی مسلمان کلام نہیں کرسکتا۔

تخالفِ درایت

اگر کہا جائے کہ درایت ایک قسم کی چیز ہے، جس میں تمام افراد انسانی برابر ہیں اس لئے درایت اسلامی کوئی علیحدہ چیز نہیں ہوسکتی۔

تو اِس کا جواب یہ ہے کہ ہر فن کی کثرت مزاولت سے ایک ایسی قوت، آدمی میں پیدا ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوسکتی، اس لئے اُس کی درایت بھی الگ ہوجاتی ہے۔

درایتوں کا متفاوت ہونا اس سے ظاہر ہے کہ امریکہ اور یورپ کے صناع، جن عجائبات کا ایجاد کرتے ہیں اُن کا سمجھنا، اوروں کو دشوار ہوتا ہے۔ اکثر ایجادیں تو ایسی ہیں کہ ناواقف شخص جب تک نہیں دیکھتا، اُن کے وجود کو نہیں تسلیم کرتا، دیکھئے ایسے شخص کی اور موجد کی درایت میں کس قدر فرق ہے۔

فیثا غورث اور حکمائے جدیدہ کے مقلدوں کی درایتیں بالکل الگ ہیں۔ اُن کی درایت جن باتوں کو قبول کرتی ہے، دنیا میں کسی عقلمند کی درایت اُن کو قبول نہیں کرسکتی اور نہ سابق کے حکماء نے اُن کو قبول کیا تھا، مثلاً اُن کے یہاں مسلم ہے کہ آدمی پر تین سونوے من ہوا کا وزن ہے اور وہ دابتی بھی ہے مگر آدمی کو عادت ہونے کی وجہ سے اُس کی حس نہیں ہوتی۔

آدمی ہر چیز کو الٹی دیکھتا ہے مثلاً سر نیچے اور پاؤں اوپر اور عادت کی وجہ سے سیدھی سمجھتا ہے۔

ہم ہر سال ایک بار اُنیس کروڑ میل ثوابت کے نزدیک ہوجاتے ہیں اور پھر چھ مہینے کے بعد اُنیس کروڑ میل اُن سے دور ہوجاتے ہیں اور ہر ستارہ اُنیس کروڑ میل نزدیک ہونے پر بھی اتنا ہی نظر آتا ہے جو اُنیس کروڑ میل دور ہونے پر نظر آتا تھا۔ اس قرب و بعد میں نہ اُن کی جسامت محسوسہ میں کچھ تفاوت آتا ہے نہ اُن کے باہمی محسوس فاصلوں میں، حالانکہ دو چار میل کے قُرب و بعد میں محسوسات کے مقدار محسوس میں تفاوت، ظاہر طور پر محسوس ہوتا ہے۔

آفتاب اور زمین و کواکب میں کشش ہے، ایک دوسرے کو ہر وقت کھینچتے رہتے ہیں، اگر دم بھر یہ کام نہ کریں، تو تمام عالم تباہ ہوجائے۔ آفتاب زمین کے دس لاکھ حصوں سے بھی زیادہ بڑا ہے اور ساڑے نو کروڑ میل سے زیادہ زمین سے دور ہے، اتنی دور سے زمین باوجود لاکھوں حصے چھوٹے ہونے کے، آفتاب کو اُسی قوت اور زور سے کھینچتی ہے جس قوت سے آفتاب زمین کو کھینچتا ہے اور اسی طرح ایک دوسرے کو دفع بھی کرتے ہیں ورنہ کشاکشی میں ایک دوسرے سے ٹکرائے جاتے۔

ساڑے نو کروڑ میل کے فاصلے سے زمین آفتاب کو کھینچتی ہے، جو اُس سے دس لاکھ حصّے بڑا ہے مگر ایک چڑیا کو جو دس پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر اُڑتی ہے، نہیں کھینچ سکتی۔ حالانکہ قوت جاذبہ اُس کی اس فاصلہ پر، نہایت قوی ہوتی ہے۔ کیونکہ قوت جاذبہ اُسی قدر گھٹتی ہے، جس قدر دوری کا مربع بڑھتا ہے۔ الحاصل مقلدین فیثا غورث کی درایتیں ایک خاص قسم کی ہیں، جن کے موافق دوسرے عقلاء کی درایتیں نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقلدوں کی درایتیں بھی ایک خاص قسم کی ہیں اور جس طرح فیثا غورثی درایتوں پر الزام مخالفت نہیں لگایا جاتا! اسی طرح اسلامی درایتوں پر بھی الزام مخالفت کوئی لگا نہیں سکتا۔

مولوی شمس العلماء صاحب نے جو سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ جو روایت درایت کے مخالف ہے، موضوع ہے اور درایت کی چند صورتیں بیان کر کے لکھا ہے کہ اِس قسم کے قواعد حدیث کی تحقیق وتنقید میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور انہیں کا نام اصول درایت ہے۔ علامہ ابن جوزی جو فن حدیث میں بڑا ہی پایہ رکھتے تھے، لکھتے ہیں کہ جس حدیث کو تم دیکھو کہ عقل کے مخالف یا اصول کے مناقض ہے، تو یہ سمجھ لو کہ وہ حدیث موضوع ہے، اس میں راویوں کی تحقیق حال کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح وہ حدیث بھی موضوع ہے جو حِس و مشاہدہ سے باطل ہوانتھی۔ اس سے بھی وہی ثابت ہوتا ہے کہ جو ہم نے کہا ہے کہ درایت سے مراد، درایت اسلامی ہے، کیونکہ خود ابن جوزیؒ نے ایک کتاب موضوعات دو جلدوں میں لکھی ہے، جس میں اکادحدیث بخاری ومسلم بھی خطاءً لکھدی ہے اُس میں نہ معراج کی حدیثوں کو موضوع بتایا، نہ معجزات وغیرہ کی حدیثوں کو، جو صحاح میں ہیں حالانکہ معمولی درایت والا عقلمند آدمی نہ معراج کے واقعہ کی تصدیق کرسکتا ہے نہ معجزات کی؟ جن میں جمادات کا باتیں کرنا اور انگلیوں سے چشمہ پانی کا جاری ہوجانا اور قلب حقائق وغیرہ

امور، خارق عادت ثابت ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ عقل و اصول سے اُن کی مراد اسلامی عقل و اصول ہے ورنہ صحاح میں جتنی روایتیں اس قسم کی ہیں، سب کو موضوعات میں داخل کر دیتے کیونکہ انہوں نے اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جو روایت اُن کی تحقیق میں موضوع ثابت ہوتی ہے، اُس کے پورے الفاظ بلکہ اسناد بھی بیان کر دیتے ہیں ۔

یہ بات ادنی تامل سے معلوم ہوسکتی ہے کہ ابن جوزی تو بڑے محدث ہیں ایک معمولی آدمی بھی یہی کہے گا کہ ہمارا دین نقلی ہے ۔ ابتداء سے دیکھئے تو یہی ثابت ہوگا کہ عقل کو اُس میں دخل ہی نہیں دیا گیا، مثلاً جبریل علیہ السلام جب وحی لائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عقلی ثبوت اُن سے نہیں طلب کیا اور یہ نہیں فرمایا کہ کیونکر معلوم ہو کہ تم فرشتے ہو اور خدائے تعالٰی نے اپنا کلام تمہارے ساتھ بھیجا ہے؟ بلکہ خود آنحضرت کے سینۂ مبارک میں ایک انشراحی کیفیت پیدا ہوگئی، جس سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تصدیق فرمالی ۔ پھر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضرت نے خبر دی ، اُنہوں نے بھی کوئی عقلی ثبوت نہیں طلب کیا بلکہ اُن کا بھی شرح صدر ہوا اور تصدیق کر لی ، اور بعضوں نے جو دلیل طلب کی کہ انہوں نے بھی کوئی عقلی دلیل نہیں طلب کی کہ شکل اول اور کسی شکل سے نبوت ثابت کی جائے ۔ بلکہ ایسے امور طلب کئے جن کا وقوع خلاف عقل اور خارق عادت ہو، مثلاً چاند کا دو ٹکڑے ہونا یا جمادات کا گواہی دینا وغیرہ امور، چنانچہ جو کچھ انہوں نے چاہا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کر دکھایا، ہر چند ہر ایک واقعہ کا ثبوت تواتر سے نہیں ہے ۔ مگر جو حدیثیں اس باب میں وارد ہیں ، اُن سے نفس معجزہ پر تواتر معنوی ثابت ہے ۔ امام سیوطیؒ نے خاص معجزات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک کتاب دو جلدوں میں لکھی ہے، جس کا نام خصائص کبری ہے اور کئی کتابیں اس باب میں بنام **شواھد النبوۃ** وغیرہ قدماء نے لکھی ہے ، جن کے دیکھنے کے بعد کوئی مسلمان نفس معجزہ کے وقوع کا انکار نہیں کرسکتا ۔

غرضکہ جہاں تک غور کیا جائے ہمارے دین کی بنیاد اُن اصول پر قائم ہے، جو معمولی عقلوں کے خلاف ہیں، اسی وجہ سے یہ دین' آسمانی تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا دین بالکل مخالف عقل ہے، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو اصول اور مسائل اس میں بیان کئے گئے ہیں، وہ عقل کے بھی مطابق ہیں۔ چنانچہ اکثر علماء نے اُن کو مدلل بدلائل عقلیّہ کر دیا ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خوارق عادات کا وقوع نہیں ہوا۔ بلکہ خوارق کے وقوع کے بعد بھی عقل کی ضرورت باقی رہتی ہے، کیونکہ یہ عقل ہی سے سمجھنا پڑے گا کہ جن کو خوارق عادات دکھانے کی قدرت دی گئی، وہ بیشک خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام عالم کو پیدا کیا اور جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرسکتا ہے۔ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جب تک معجزات کی تائید نہ ہو، کوئی دین آسمانی نہیں ہوسکتا، کیونکہ عقلی، اخلاقی اور تمدنی اصول حکماء نے بھی قائم کئے اور ہر سلطنت بحسب ضرورت قائم کیا کرتی ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ معجزات کو باطل ٹھہرا کے صدہا کتابوں اور ہزارہا صحابہ اور تابعین کو جھوٹے قرار دینے میں دین کا کیا فائدہ سوچا گیا؟ یہود، نصاریٰ مجوس، ہنود وغیرہ جو تقریباً کل روئے زمین پر بستے ہیں، ان میں کوئی فرقہ ایسا نہیں جو خوارق عادات کا منکر ہو۔ یہ لوگ تو ہم پر معجزات کے بارے میں الزام نہیں لگا سکتے۔ رہا ایک فرقہ حکماء جو یورپ میں ترقی کررہا ہے، سو اُس کے مقابلہ میں ہم اعتراف بھی کرلیں کہ ہمارے اسلاف نے غلطی کی جو خوارق کے قائل ہوگئے، یا وہ جتنی روایتیں ہیں، غلط ہیں اور اُس کے بعد اپنے دین کے عقلی اصول جو موجود ہیں پیش کریں بلکہ اور بھی کچھ اضافہ کردیں، تو بھی امید نہیں کہ یہ فرقہ اسلام قبول کرے، سر سید صاحب نے انہیں کے خیال سے غالباً یہ تدبیر نکالی تھی مگر اب تک نہیں سُنا گیا کہ اس تدبیر نے کسی حکیم یا جاہل کو مسلمان بنایا؟ بلکہ یہی سنا جاتا ہے کہ

جو نصاریٰ مسلمان ہوتے جاتے ہیں اُن کے رہبر، وہی پُرانی کتابیں ہیں اور دراصل اُن کے ایمان کا سبب ہی کچھ اور ہے وہ اس آیۂ شریفہ میں مذکور ہے، قولہ تعالیٰ ''**فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام و من یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون**'' ترجمہ: جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ اُسے راہ راست دکھائے اُس کے سینہ کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دیتا ہے، اور جس شخص کو چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اُس کے سینہ کو تنگ (اور) بھجا ہوا کر دیتا ہے۔ گویا اُس کو آسمان میں چڑھنا پڑتا ہے، جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن پر اسی طرح اللہ کی پھٹکار پڑتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نہ معجزات کی کتابیں پیش کرنے سے کوئی ایمان لاتا ہے نہ عقلی دلائل قائم کرنے سے، جب تک شرح صدر، من جانب اللہ نہ ہو۔ پھر محض ایک موہوم خیال پر، وہ بھی ایسا کہ جن کا غیر مفید ہونا عملاً ثابت ہو گیا، ایک حصّہ دین کا باطل ٹھہرانا اور اپنی کتابوں اور اپنے اسلاف کو جھوٹے قرار دینا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ دین کی مصلحت اور خیر خواہی تو اِس میں ہے کہ اصول نقلیّہ اور عقلیہ دونوں ثابت رکھے جائیں اور بحسب ضرورت اور مصلحت وقت ہر ایک کو کام میں لایا جائے! یہ بات مشاہد ہے کہ جب کوئی واعظ اپنی پرزور تقریر میں خوارق عادات کا ذکر کرتا ہے تو دلوں پر ایک خاص قسم کا اثر پڑتا ہے، چنانچہ اس قسم کی تقریروں سے کروڑ ہا بے دین لوگ مسلمان ہوئے جن کے یادگار، اب بھی کروڑ ہا موجود ہیں۔

یہ بحث ضمناً آ گئی، ابتدائے بحث یہ تھی کہ زنادقہ وغیرہ مخالفین اسلام نے جو حدیثیں بنائی تھیں، محدثین نے درایت اسلامی اور دوسرے قرائن و دلائل سے مدد لیکر اُن حدیثوں کو موضوع قرار دیا۔ مگر اس سے بڑھ کر اور ایک آفت کا سامنا محدثین کو ہوا وہ یہ کہ بعض بزرگوں نے بھی کمال خوش اعتقادی سے حدیثیں بنائیں چنانچہ ابن جوزی نے موضوعات

میں لکھا ہے کہ ابوعصمہ نوح ابن مریم مروزی سے پوچھا گیا کہ حضرت آپ نے ہر ایک سورہ کی فضیلت میں جو روایتیں کی ہیں کہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ آپ کو کہاں سے مل گئیں؟ عکرمہ کے شاگردوں کے پاس تو ان روایتوں کا وجود نہیں؟ کہا بات یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ابوحنیفہؒ کی فقہ اور ابن اسحاق کے مغازی میں ہمہ تن مشغول ہیں، اس لئے حسبۃً للہ یہ حدیثیں بنائیں تا کہ ان فضائل کو دیکھ کر تو بھی لوگ قرآن شریف زیادہ پڑھا کریں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ قاضی تھے، ابن حبان سے اُن کا حال پوچھا گیا تو کہا صرف ایک صدق تو اُن میں نہیں، باقی کل فضائل کے جامع ہیں۔ ابن مبارکؒ سے اُن کا حال پوچھا گیا کہا لا الہ الا اللہ کہا کرتے تھے، یعنی مسلمان ہیں یہ سب صحیح، مگر تھے بڑے جوشیلے کہ فقہ حنفیہ کی شہرت اور درس وتدریس کو دیکھ نہ سکے اور حسبۃً للہ حدیثیں بناڈالیں۔

یحییٰ ابن سعید قطانؒ جو تنقیح وتنقید حدیث میں مستند مانے جاتے ہیں، اُن کا قول ابن جوزیؒ نے موضوعات میں نقل کیا ہے کہ کذب میں اُن لوگوں سے زیادہ میں نے کسی کو نہیں پایا، جو خیر و زہد کی طرف منسوب ہیں۔ ان بزرگوں نے کچھ تو خیر خواہی کے جوش میں حدیثیں بناڈالیں اور کچھ اوروں سے سنکر بیان کر دیا اور اُس کی کچھ تحقیق نہیں کی کہ راوی مستند ہے یا نہیں؟ کیونکہ حسن ظن ان حضرات کا اِس درجہ بڑا ہوا تھا کہ کسی مسلمان کو جھوٹا سمجھتے ہی نہ تھے اس لئے جس نے جو کچھ روایت کی اُس کو صحیح مان لیا۔

تہذیب التہذیب میں رواد بن الجراح کے حال میں ابن عدی کا قول نقل کیا ہے کہ اکثر روایتیں اُن کی ایسی ہوتی ہیں کہ دوسرے راویوں سے اُن کی تصدیق نہیں ہوتی، مگر وہ شیخ صالح ہیں، اور صالحین کی روایتوں میں کچھ نہ کچھ نکارت ہوتی ہے۔

میزان الاعتدال میں عبدالرحمٰن بن ثابت کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ زاہد اور مستجاب

الدعوات تھے، مگر امام بخاری اور نسائی وغیرہ نے ان کی حدیثوں میں کلام کیا ہے۔
عبدالواحد بن زید کے ترجمہ میں میزان میں لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ زاہد اور صوفیہ کے شیخ تھے، چالیس سال انہوں نے عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی اور مستجاب الدعوات تھے مگر محدثین نے اُن میں کلام کیا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ کہتے ہیں کہ اُن کو محدثین نے ترک کر دیا اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ اُن کی احادیث موضوع ہوا کرتی ہیں۔
میزان الاعتدال میں امام ذہبیؒ نے انہیں لوگوں کو ذکر کیا ہے، جن میں محدثین نے کلام کیا ہے اُس میں اویس قرنیؒ کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ میں نے اُن کو اس کتاب میں صرف اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ بخاری نے اُن کو ضعفاء میں ذکر کیا ورنہ اس کتاب میں اُن کو ہرگز ذکر نہ کرتا، کیونکہ وہ اولیاء اللہ صادقین سے ہیں۔
اویس قرنیؒ وہ شخص ہیں کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی فضیلت بیان کی ہے اور عمر رضی اللہ عنہ اُن سے خواستگار دعا ہوئے، اُن کے فضائل مسلم شریف وغیرہ میں موجود ہیں۔
تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی روایتوں کو ساری اُمت نے مستند سمجھا ہے مگر بخاری نے کہا کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔

احتیاطِ محدثین

ابن معینؒ کا قول ہے کہ ہم اُن اقوام میں کلام کرتے ہیں جو جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ صلحاء میں جو کلام کیا جاتا ہے اُس سے یہ بتلانا منظور نہیں کہ اُن کے دین میں کوئی نقص تھا، بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے مقدس مستجاب الدعوات اور جنتی ہیں۔ یہاں تک کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی فضیلتیں بیان کیں، مگر چونکہ تنقیح وتنقید حدیث کی

خدمت میں مفوض ہے اس لئے جب تک پوری شرطیں نہ پائی جائیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ جس سے حدیث لیتے ہیں اُس کی تحقیق کی جائے کہ وہ عدل وضابط ہے، کسی کی رعایت نہیں کی جاتی۔ گو، فی نفسہ ولی اور مستجاب الدعوات ہو یہاں تک کہ خود اپنے باپ کی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔

جریرابن حازم کا حال ابھی معلوم ہوا کہ وہ شیخ الشیوخ تھے، اعمش' ایوب' ابن مبارک اور وکیع جیسے اُن کے شاگرد تھے، اُن کے فرزندوں نے جب دیکھا کہ حافظہ میں فرق آرہا ہے، تو اُن کو چھوڑ کر تلاش حدیث میں دوسرے اساتذہ کے یہاں گئے۔ دیکھئے جب اُن کے صاحبزادے تلاش حدیث میں نکلے ہوں گے تو محدثین نے ضرور پوچھا ہوگا کہ آپ اپنے گھر کی دولت کو چھوڑ کر گدائی کو کیوں نکلے تو انہوں نے ضرور اپنے والد کا نقص بیان کیا ہوگا۔ دیکھئے جس کے پدر بزرگوار ایسے ہوں کہ عمر بھر، نیک نام اور شیخ الشیوخ اور مرجع انام بنے رہے کیا اُس کی طبیعت گوارا کرے گی کہ اپنے والد کا نقص اور بے اعتباری ظاہر کر کے خود بھی ذلیل بنے؟ مگر سبحان اللہ نفس قدسی اسے کہتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں نہ ذلت کی پرواہ نہ عزت کا خیال، کل اکابر محدثین کا یہی حال رہا ہے۔

تہذیب التہذیب میں ابن السقا کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ دارقطنی وغیرہ محدثین کے اُستاذ ہیں اور حدیث میں امام سمجھے جاتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے ایک حدیث پڑھی جو اوروں کے خلاف تحقیق تھی، وہ سنتے ہی لوگوں نے اُن کو اُٹھا دیا اور جس جگہ بیٹھے تھے اُس کو دھوڈالا۔ میزان الاعتدال میں جارودی کے ترجمہ میں حاکمؒ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے محمد یعقوب سے بارہا سُنا ہے کہ ابوبکر جارودیؒ جب کبھی اپنے دادا کی قبر پر سے گذرتے تو کہتے کہ اے جد پدر بزرگوار! اگر آپ بہزابن حکیم کی روایت بیان نہ کرتے تو میں آپ کی زیارت ضرور کرتا۔

تعصب کی انتہاء ہوگئی ،اگر جدامجد نے کوئی روایت غلط بھی کی تھی تو اُس سے کافر نہیں ہوگئے تھے، جوزیارت سے احتراز کیا گیا ،زیارت سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا کہ کچھ پڑھ کر بخش دیتے ،جس سے اُس خطا کی معافی کی توقع تھی ۔مگر بہزابن حکیم کی اُس روایت کے ساتھ اتنا بغض تھا کہ اگر کبھی خون جوش بھی کھاتا ہوگا تو اُس حدیث کا خیال اُن کو زیارت سے روک دیتا تھا۔اگراُن کی اس حرکت کوجنون سے تعبیر کریں تو بےموقع نہ ہوگا، مگرایسے جنون پر ہزار عقلوں کوقربان کرنا چاہئے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پاک کی حمایت وحفاظت میں اُن کی یہ حالت تھی ۔غرضکہ محدثین کی حالت احتیاط حدیث میں عجب قسم کی ہوگئی تھی گوبعض حرکات اُن کے ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے ،مگراصل منشا اُن کا کمال احتیاط تھی ،جس قدر حدیثیں بنانے میں لوگوں نے جرأت کی اُس سے زیادہ ان حضرات نے احتیاط میں زیادتی کی اگرکسی سے ایک بات خلاف دیکھتے تو اُس کی صحیح حدیثیں بھی ترک کردیتے ۔

تہذیب التہذیب میں ابراہیم ابن محمد کے حال میں لکھا ہے کہ نعیم ابن حماد کہتے ہیں کہ اُن کی کتابوں کی نقل میں پچاس اشرفیاں میں نے خرچ کیں ،جب سب کی نقل ہوگئی تو انہوں نے ایک روزاورایک کتاب نکالی،جس میں قدر کا مسئلہ تھا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اور دوسری کتاب نکالی جس میں جہم کی رائے تھی ،جس کے قائل **جهمیه** ہیں۔میں نے کہا کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟ کہاہاں، یہ سنتے ہی وہ تمام کتابیں جونہایت شوق سے بصرف زرکثیر نقل کرائی تھیں،سب پھاڑ کر پھینک دیں۔

تہذیب التہذیب میں محمد ابن حمید کا قول نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی جعفر سے میں نے دس ہزار حدیثیں لکھیں ۔ایک روزانہوں نے کہا کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جوصحابی ہیں،

فاسق تھے یہ سنتے ہی میں نے وہ کل حدیثیں جو لکھی تھیں پھینک دیں۔

مولانا واستاذ نا مولوی محمد عبدالحی صاحب مرحوم نے الرفع و التکمیل میں لکھا ہے کہ شعبہؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے فلاں شخص کی حدیث کو کیوں ترک کر دیا؟ کہا: میں نے اُس کو دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہے اور اُس کو ایڑیں مار رہا ہے۔ فقط ایڑ مارنا تو عیب کی بات نہیں، جس کو شعبہؒ جیسے جلیل القدر شیخ الشیوخ نے قابل ترک سمجھا ہو البتہ کوئی ناشائستہ خلاف شان حرکات اُس میں ضرور تھے، جس سے اُنہوں نے اُس کو ترک کر دیا۔

اُس میں مولانائے موصوف نے لکھا ہے کہ شعبہؒ، منہال ابن عمر کے یہاں طلب حدیث کے لئے گئے دیکھا کہ گھر میں سے طنبور کی یا خوش الحان قرأت کی آواز آ رہی ہے، یہ سنتے ہی باہر ہی سے لوٹ گئے اور پھر اُس سے حدیث نہیں لی(۱)۔ معلوم نہیں مقامی خصوصیات کیا تھیں جن سے اُن کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے، بہر حال اتنا تو معلوم ہوا کہ احتیاطیں اس درجہ کی تھیں۔

اسی میں لکھا ہے کہ ابن عیینہؒ(۲) سے پوچھا گیا کہ زاذان سے آپ روایت کیوں نہیں کرتے۔ کہا وہ باتیں بہت کیا کرتے تھے۔

اُسی میں لکھا ہے کہ جریرؒ نے سماک ابن حرب کو دیکھا کہ کھڑے ہوئے پیشاب کر رہے ہیں اِس لئے اُن کو ترک کر دیا اُسی میں لکھا ہے کہ جو محدثین اعمال کو جز وایمان سمجھتے تھے، اہل کوفہ سے روایت نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ وہ اعمال کو جز و ایمان نہیں سمجھتے ہیں۔ بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت نہیں کی اس وجہ سے کہ اُن کو اہل رائے سمجھتے تھے۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ مکی ابن ابراہیم نے حمید طویل سے حدیث نہیں لی،

(۱) ایسے محتاط شخص امام صاحب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اس سے امام صاحب کی جلالت شان معلوم ہو سکتی ہے ۱۲

(۲) ایسے محتاط شخص امام صاحب کے مداح ہیں جیسا کہ معلوم ہوگا۔

اس وجہ سے کہ وہ سیاہ لباس پولیس والوں کا سا پہنتے تھے۔
ہمیں یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ اُن کی احتیاطیں کیسی تھیں، نہ ولی کی ولایت اُن کے فرض منصبی ادا کرنے میں مانع ہوتی تھی، نہ قرابت واحباب کی محبت نہ اپنی کسر شان کا خیال، غرضکہ ان حضرات نے احتیاط کا حق ادا کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ ضرورت سے زیادہ کام میں لائی گئی سو اُس میں وہ حضرات معذور ہیں اس لئے کہ جب آدمی کسی طرف ہمہ تن مشغول ہوتا ہے تو وقتاً فوقتاً نئی نئی باریکیاں اور نزاکتیں، اُس کے خیال میں آتی جاتی ہیں، جن کو ہر کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ادنیٰ ادنیٰ بات جس کو اور لوگ قابل توجہ نہیں سمجھتے اُس کو بڑی معلوم ہونے لگتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن لوگوں کو حفظان صحت کا خیال زیادہ ہوتا ہے، وہ کھانے پینے میں بلکہ ہر ایک کام میں کیسی کیسی احتیاطیں کرتے ہیں کہ اُن کی صحت بجائے خود ایک سخت بیماری ہو جاتی ہے، اِسی طرح جن کو طہارت کا زیادہ خیال ہوتا ہے اُن کی احتیاط وسواس کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ آبدست اور غسل وغیرہ میں اتنا پانی خرچ کرتے ہیں کہ شریعت میں وہ اسراف اور حرام ہے اور باوجودیکہ خود بھی وہ اُس کی برائیاں جانتے ہیں، مگر طبیعت سے مجبور ہیں اُس احتیاط کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح محدثین کو ہمیشہ احتیاط کا خیال لگا رہتا تھا اور ہمیشہ اِس خیال میں رہتے کہ جو حدیث لیجائے کسی متدین اور محتاط شخص سے لیجائے، پھر تدین کی نزاکتوں میں جس قدر خیال ترقی کرتا گیا، تدین کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ گھوڑے کو زیادہ ایڑیں مارنا بھی خلاف تدین محسوس ہونے لگا، چونکہ ہر معاملہ میں طبیعت کو بڑا ہی دخل ہے اس لئے جن اہل احتیاط کی طبیعتوں میں حرارت زیادہ تھی، وہ لوگ مغلوب الغیظ ہونے کی وجہ سے اس امر میں بہت افراط کرتے تھے۔ جیسا کہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ جن علماء کی طبیعتوں

میں حرارت اور غصہ زیادہ ہوا کرتا ہے، اپنی طبیعت کے مخالف ادنیٰ ادنیٰ بات میں بھی بُرا بھلا کہہ دیتے ہیں، بلکہ فاسق اور کافر کہنے میں بھی تامل نہیں کرتے اور تکفیر کی روایتوں کو چسپاں کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں اور کسی طرح چسپاں کر بھی دیتے ہیں، اس طبیعت کے لوگ محدثین میں بھی بہت گذرے ہیں۔

ابن حزم کا حال

ایک ابن حزم ہی کو دیکھ لیجئے کہ کس قدر اُن کی مزاج میں تشدد ہے ملل ونحل میں عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور حوارین کا جہاں ذکر کرتے ہیں، تو سطروں کی سطریں نئی نئی گالیوں اور لعنتوں کی لکھ ڈالے ہیں، اسی طرح معتزلہ وغیرہ فرق اسلامیہ پر بھی ہمیشہ لعنت کرتے رہتے ہیں، اکثر مقامات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فرقہ کے عقائد کو نقل کرکے قبل اسکے کہ اُن کو رد کریں، خوب سی گالیاں دے لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نقل مضمون کے وقت انہوں نے نہایت ضبط سے کام لیا، ورنہ جوش طبیعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اثناء نقل میں بھی دو چار لعنتیں لکھ دیتے۔ محلیٰ اور اُس کی شرح میں انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ کسی مسئلہ میں ایک صحیح حدیث لکھ دیتے ہیں، اُس کے بعد کسی مجتہد کا نام لکھتے ہیں کہ اُس نے اِس کے خلاف کیا اور ساتھ ہی لعنت، غرضکہ اُن کی اکثر تصانیف لعنت سے بھری ہوئی ہیں اور تحقیق کی یہ حالت کہ امام سخاویؒ نے فتح المغیث میں لکھا ہے کہ ابن حزمؒ کا قول ہے کہ ابو عیسیٰ ترمذی اور ابو القاسم بغوی مجہول ہیں۔ لیجئے اسلامی تمام دنیا میں ترمذی معروف ومشہور ہیں مگر حضرت اُن کو پہچانتے ہی نہیں۔ پھر طریقہ یہ کہ جس کے مخالف ہوتے ہیں تو اُس کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں کہ اُس کے حاشیہ خیال میں نہیں، چنانچہ طبقات الشافعیہ میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ ملل ونحل میں انہوں نے ابوالحسن

اشعریؒ کا مذہب بیان کیا ہے کہ اُن کے نزدیک ایمان صرف معرفت بالقلب کا نام ہے خدا کو دل سے پہچان لے تو بس ہے۔ پھر اگر زبان سے اقسام کے کفریات بکے اور یہ بھی کہے کہ میں یہودی ہوں یا نصرانی ہوں تو بھی وہ مسلمان اور جنتی ہے۔ حالانکہ کل اشاعرہ بلکہ تمام مسلمانوں کا مذہب یہ ہے ''کہ جو کفریات بکے یا کفار کے سے کام کرے تو وہ کافر مخلد فی النار ہے'' اور لکھا ہے کہ محققین نے اُن کی کتابوں کو دیکھنے سے منع کیا ہے، اس لئے کہ اہل سنت کی وہ بہت تحقیر کیا کرتے ہیں انتہیٰ۔ ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ ایسے مغلوب الغیظ حضرات تحقیق مسائل یا جرح و تعدیل کی خدمت اپنے ذمہ لیں تو مسلمانوں کو مقتول نہیں تو مجروح تو ضرور کر دیں گے، بہرحال اِس قسم کی تحریرات میں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ مرفوع القلم سمجھے جائیں۔

ابن جوزی کا حال

اسی طرح ابن جوزیؒ کا بھی حال ہے، ان کی طبیعت کا انداز تلبیس ابلیس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کسی مذہب اور فرقہ کو انہوں نے چھوڑا ہی نہیں، سب پر کچھ نہ کچھ الزام لگا دیا۔ علاوہ فرق باطلہ کے صوفیہ کے تو وہ دشمن ہی ہیں، ہاتھ دھو کر اُن کے پیچھے پڑھ گئے، یہاں تک کہ مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت غوث الثقلین محی الدین جیلانی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی تھی اور فقہاء تو بیچارے کس شمار میں؟ محدثین کو بھی انہوں نے نہیں چھوڑا۔ اس طبیعت کے لوگ کب کسی کے مقلد ہوسکتے ہیں؟ جہاں انہوں نے دیکھا کہ حدیث کی اسناد میں ایسا شخص ہے کہ سابق کے محدثین نے اُس کو کاذب وغیرہ کہا تو اب وہ جامہ کے باہر ہیں نہ، بخاری کو مانیں نہ مسلم کو، صاف کہدیتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ امام سیوطیؒ نے اللآلی المصنوعة فی الاحادیث الموضوعة میں لکھا ہے کہ حاکم ابن حبان اور عقیلی وغیرہ

حفاظ کی عادت ہے کہ کسی حدیث کی سند میں کوئی راوی مخدوش ہوتو اُس کو وہ باطل لکھتے ہیں، ابن جوزی اُس سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ متن حدیث ہی موضوع ہے اوراس متن حدیث کو اس کتاب موضوعات میں داخل کر دیتے ہیں حالانکہ متن سے اُن حفاظ کو کوئی تعلق نہیں ہوتا ، بلکہ اکثر دوسری صحیح سندوں سے وہ متن ثابت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے تمام علماء نے یہاں تک کہ آخر میں ابن حجر عسقلانیؒ نے ابن جوزی پر الزام لگایا ہے کہ یہ اُن میں سخت عیب تھا اوراُسی میں لکھا ہے کہ ابن جوزیؒ نے حدیث ''**اذا بلغ العبد اربعین سنة امنه الله من البلایا الثلث** '' کو اپنی کتاب موضوعات میں داخل کیا ہےاور وجہ یہ لکھی کہ اُس کی اسناد میں عباد ابن عباد ہیں، جن کی نسبت ابن حبان نے **یروی المناکیر** کہا ہے، اس لئے وہ مستحق ترک ہیں اور حدیث صحیح نہیں ۔ امام سیوطیؒ نے ابوالفضلؒ عراقی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جوزی نے جو عباد ابن عباد کو ضعیف قرار دیا، وہ خبط ہے۔ ابن حبانؒ نے جن عباد ابن عباد کی نسبت **یروی المناکیر** کہا وہ فارسی ہیں۔ اوراس روایت میں عباد ابن عباد مُہلی ہیں اور یہ وہ شخص ہیں کہ شیخین نے اُن کی حدیثوں سے احتجاج کیا۔اوراحمداورابن معین اور ابوداؤد ونسائی وغیرہم نے اُن کی توثیق کی انتہیٰ ۔ اِس قسم کے دھوکوں سے انہوں نے بعض صحاح کی حدیثوں کو بھی موضوع قرار دیا۔اس لئے اُن کا مجرد قول قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ محدث ابن جوزیؒ نے بہت سی حدیثوں کو موضوعات میں داخل کیا ہے، جن کو دوسرے محدثین صحیح اور حسن کہتے ہیں۔ ابن جوزی نے تو قیامت کی کہ صحیحین کی بعض حدیثوں کو موضوع لکھ دیا، بیشک ابن جوزی نے اس افراط میں غلطی کی انتہی ۔نہایت درست ہے جب اُن کی طبیعت اوراتفاق علماء سے معلوم ہوگیا کہ بلاتحقیق ایسی باتیں لکھدیتے ہیں تو اُن کی تحریر سے کوئی حدیث موضوع نہیں ہوسکتی اور نہ دوسرے محدثین کی تحقیق پراُن کی تحریر کا اثر ہوسکتا ہے۔ البتہ امام

بخاریؒ جیسے مستند محدث کی تحقیق قابل وثوق ہے۔

مجملاً حالِ جرح وتعدیل

اِس موقع میں جرح وتعدیل سے متعلق تھوڑا سا حال معلوم کر لینا بھی مناسب ہوگا۔ فتح المغیث میں امام سخاویؒ نے لکھا ہے کہ صحابہ ہی کے زمانہ میں بعض ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے، جن پر انہوں نے لعن وطعن کی لیکن وہ بہت کم اور ممتاز تھے۔ پھر تابعین کے زمانہ میں بھی اُن کی ایسی کثرت نہ ہوئی، جو قابل توجہ ہو اس لئے کہ اکثر متبوع اور مقتدا صحابہ موجود تھے، جو کل عدول ہیں۔ اور جو غیر صحابہ تھے، وہ اکثر ثقات تھے۔ اُن کے ہوتے اہل بدعت کے یہاں کون جاتا؟ قرن اول جس میں صحابہ اور کبار تابعین تھے، اُن میں کوئی مقتدائے دین ضعیف نہیں پایا گیا، اُن کے بعد اوساط تابعین میں اگر چہ ضعفاء پائے گئے، مگر اُن میں صرف تحمل اور ضبط حدیث کی نسبت کلام ہوا، البتہ جب تابعین کا زمانہ قریب الختم ہوا یعنی سنہ ڈیڑھ سو کے حدود میں اس وقت توثیق اور جرح کی ضرورت ہوئی، چنانچہ ابوحنیفہؒ نے کہا کہ جابر جعفی سے بڑھ کر جھوٹا میں نے نہیں دیکھا اور اعمش اور امام مالکؒ شعبہ اور اوزاعی وغیرہم نے بھی جرح وتعدیل کی، اُن کے بعد یحییٰ ابن سعید قطان، ابن مہدی وغیرہ اُن کے بعد امام شافعیؒ اور ابو عاصم نبیل وغیرہ، اُن کے بعد حمیدی اور یحییٰ، ابن یحییٰ وغیرہ ائمہ جرح وتعدیل ہوئے، اُن کے بعد جرح وتعدیل کی کتابیں تصنیف ہونے لگیں، اس کے بعد کے بھی بہت سے طبقات ائمہ فن کے سخاویؒ نے ذکر کیئے، جن کے بیان کی یہاں ضرورت نہیں۔

احتیاطِ صحابہ واکابر

مطالعہ کتب رجال سے معلوم ہوتا ہے کہ جرح وتعدیل کا عام قاعدہ یہی رہا ہے کہ حتی

الامکان مشتبہ لوگوں سے احتراز رہا، خصوصاً صحابہ میں تو نہایت ہی اس کا تشدد رہا، چنانچہ سنن دارمی میں روایت ہے۔ ''عن نافع عن عمر رضی اللہ عنہما انہ جاء ہ رجل فقال ان فلاناً یقرؤعلیک السلام فقال بلغنی انہ قد احدث فان کان قد احدث فلا تقرأ علیہ السلام '' یعنی ایک شخص ابن عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں آ کر کہا کہ فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ اُس نے کوئی نئی بات ایجاد کی ہے، اگر یہ واقعی ہے تو اُس کو ہمارے طرف سے جواب سلام نہ کہنا، جب جواب سلام میں یہ احتیاط تھی تو اُس کی اور باتوں کی کیا وقعت ہوگی۔ تقریباً یہی طریقہ اکابر تابعین میں بھی جاری رہا۔ چنانچہ دارمی میں یہ روایت ہے ''عن اسماء بن عبید قال دخل رجلان من اصحاب الاھواء علی ابن سیرینؒ فقالا یا ابابکر نحدثک بحدیث قال لا قالا فنقرأ علیک آیة من کتاب اللہ قال لا لتقومان عنی اولاقومن قال فخرجا فقال بعض القوم یا ابابکر وما کان علیک ان یقرا علیک آیة من کتاب اللہ تعالیٰ قال انی خشیت ان یقرا علیّ آیةً فیحرفانھا فیقرذلک فی قلبی ''یعنی اسما کہتے ہیں کہ دو شخص اہل ہوا یعنی فرق باطلہ کے ابن سیرین کے پاس آئے اور کہا کہ ہم ایک حدیث آپ کو سنانا چاہتے ہیں، کہا: میں نہیں سنتا، کہا قرآن کی ایک آیت سناتے ہیں، کہا: میں نہیں سنتا، اب تم یہاں سے جاتے ہو یا میں چلا جاؤں یہ سُنکر وہی چلے گئے، لوگوں نے پوچھا حضرت! اگر قرآن کی آیت آپ اُن سے سنتے تو کیا حرج تھا؟ فرمایا اس بات کا خوف تھا کہ اُس کے معنی کو اپنے مطلب کی جانب پھیر دیں اور وہی بات میرے دل میں جم جائے۔ ابن جوزیؒ نے تلبیس ابلیس میں لکھا ہے کہ ایوبؒ سے ایک بدعتی نے کہا کہ میں آپ سے ایک کلمہ کہوں؟ فرمایا نہیں بلکہ آدھا کلمہ بھی مت کہہ۔

اُسی میں لکھا ہے کہ معمر کہتے ہیں کہ طاؤس جو اعلیٰ درجہ کے تابعی ہیں، بیٹھے تھے اور اُن کے پاس اُن کے فرزند بھی تھے، اتنے میں ایک شخص معتزلی آیا اور کسی مسئلہ میں گفتگو شروع کی، طاؤسؒ نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں رکھ لیں اور فرزند سے کہا کہ تم بھی کانوں میں اُنگلیاں رکھ لو تاکہ اُس کی بات سننے میں نہ آئے کیونکہ یہ دل ضعیف ہے پھر کہا اے فرزند خوب زور سے کان بند کرلو اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اگرچہ ظاہراً یہ حرکت ہمارے زمانہ کے لحاظ سے بدنما معلوم ہوتی ہے مگر چونکہ اُن حضرات کو خوف خدا بیحد تھا اور دین کی قدر تھی وہ خیال کرتے تھے کہ عقلی باتوں کو عقل جلد قبول کر لیتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بات دل میں جم جائے یا دل کا میلان بھی ہو جائے، جس پر خدائے تعالیٰ مطلع ہوتا ہے۔

اُسی میں لکھا ہے کہ عیسٰی بن علی الضبیؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص ہمارے ساتھ ابراہیم کے یہاں جو تابعی تھے جایا کرتا تھا، ابراہیمؒ کو خبر ملی کہ وہ شخص فرقہ مرجیہ میں شامل ہوا ہے، اُنہوں نے اُس سے فرمایا: اب جو تم ہمارے یہاں سے جاتے ہو پھر ہمارے یہاں نہ آنا، فرقہ مرجیہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن شریف میں عذاب کی آیتیں فقط دھمکانے کے لئے ہیں ورنہ جس نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیا وہ قطعی جنتی ہے، چاہے نماز وغیرہ پڑھے یا نہ پڑھے اور اُس کے گناہ کچھ نہیں لکھے جاویں گے بلکہ نیکیاں لکھی جائیں گی۔

اُسی میں لکھا ہے کہ محمد ابن داؤد الحداد کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ابن عیینہؒ سے کہا کہ ابراہیم بن یحیٰی، تقدیر کے معاملہ میں کلام کرتا ہے۔ فرمایا کہ لوگوں کو اُس کے حال سے ہوشیار کردو اور اپنے رب سے عافیت مانگو۔ ہم کو دین کی اصلی صورت جو نظر آ رہی ہے سو صحابہ اور تابعین ہی کی ان احتیاطوں کا نتیجہ ہے، ورنہ اہلِ ہوا اور بدعتیوں کے خیالات، اگر اس وقت سے روایتوں میں شامل ہو جاتے تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اصل دین کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

مولوی شمس العلماء صاحب نے سیرۃ النعمان میں مقدمہ صحیح مسلم سے لکھا ہے کہ بشر عدوی ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور حدیث بیان کرنی شروع کی، انہوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ بشر نے کہا: ابن عباس! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کر رہا ہوں آپ سنتے نہیں؟ فرمایا ایک زمانہ میں ہمارا یہ حال تھا کہ کسی کو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے سنتے تو فوراً ہماری نگاہیں اُٹھ جاتی تھیں لیکن جب سے لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی، ہم صرف اُن حدیثوں کو سنتے ہیں جن کو ہم خود جانتے ہیں۔ غرضکہ اُس زمانہ میں صحیح حدیثیں محفوظ تھیں اِس لئے تقریباً کل مقتدا اساتذہ متدین تھے اور احادیث کے لینے میں احتیاطیں زائد کی جاتی تھیں۔

امام سخاویؒ کے قول سے ابھی معلوم ہوا کہ یہ وہی زمانہ ہے جس کے متصل امام ابوحنیفہؒ ہیں خوش قسمتی سے آپ کو تدوین فقہ کے وقت نہایت آسانی سے صحیح صحیح حدیثیں مل گئیں۔ جس میں موضوع ہونے کا احتمال اگر نکالا بھی جائے تو بہت سے قرائن سے رد ہوسکتا ہے۔

اِس کے بعد جب تدین کم ہوتا گیا اور کذاب اور وضّاع، نئی نئی باتیں بنانے لگے جس کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث شریف میں دی ہے ''**عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی اٰخر الزمان دجالون کذابون یاتونکم من الاحادیث بما لم تسمعوا انتم و لا آباؤکم فایّاکم و ایاھم لا یضلونکم و لا یفتنونکم رواہ مسلم**'' یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آخر زمانہ میں دجال اور کذاب ہوں گے، ایسی ایسی حدیثیں بیان کریں گے کہ نہ تم نے (اے امتیو) سنیں، نہ تمہارے آباء واجداد نے، سو اُن سے بہت بچو، اُن کو نزدیک نہ آنے دو، کہیں وہ تم کو گمراہ نہ کر دیں، اور فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ اِس پیشن گوئی کے ظہور کی ابتدا اِسی زمانہ میں ہو چکی تھی اس لئے اُس زمانہ کے محدثین کو بڑی بڑی محنتیں اٹھانی پڑیں۔ جس قدر انہوں نے موضوعات کے رواج دینے کی فکریں کیں محدثین نے احتیاط سے اُن کا مقابلہ کیا،

مثلاً دیکھا کہ راویان حدیث کے احوال مختلف ہیں۔فن رجال مدون کر دیا جس میں ہر ایک راوی کی نسبت جو کچھ محدثین کے خیال تھے، بیان کر دیئے تا کہ مشتبہ راویوں سے حدیث لینے میں احتیاط کی جائے۔بعض محدثین ایسے بھی تھے کہ ضعفاء سے روایت کر کے اُن کے نام نہیں بتلاتے تھے جس کو تدلیس کہتے ہیں ایسے لوگوں کی تحقیق کر کے خاص اُن کے ناموں کی کتابیں لکھدیں جیسا کہ تدریب الراوی امام سیوطیؒ نے لکھا ہے۔اسی طرح بعض محدثین مستند تو تھے مگر آخر عمر میں اُن کے حافظہ میں نقصان آ گیا تھا اور بعض لوگ آخر عمر میں اُن سے پڑھ کر چاہتے تھے کہ اُن کے پہلے شاگردوں کے ساتھ مساوات حاصل کریں حالانکہ اُن کی حدیثوں میں ضعف ہوتا تھا۔اِس لئے محدثین نے تحقیق کر کے ایسے اساتذہ کے نام اور اُن کے اوائل و آخر کے شاگردوں کے نام اور اُن کے حالات کے کتابیں مدون کر دیں تا کہ لوگوں کو اُن اساتذہ کے ناموں سے دھوکا نہ ہووے۔غرضکہ کسی بات میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو ایک جماعت متوجہ ہو کر اس قدر تحقیق کرتی کہ شبہ نام کو نہ رہنے پائے ،شدہ شدہ ان تحقیقوں سے فن حدیث کے سوفن ہو گئے ، چنانچہ شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے النکت میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ علم حدیث سو انواع پر مشتمل ہے ، ہر نوع ایک مستقل علم بن گئی ہے اگر کوئی طالب علم ،ان علوم میں اپنی تمام عمر صرف کر ڈالے ، جب بھی اُن کی انتہاء کو نہیں پہونچ سکتا۔

مطلب یہ کہ ایک شخص ان تمام علوم حدیثیہ کا جامع نہیں ہوسکتا اہل علم غور کر سکتے ہیں کہ سوائے حدیث شریف کے کونسا ایسا علم ہے کہ جس کے سو حصے اس غرض سے کئے گئے ہوں کہ ہر ایک حصہ کی طرف ایک جم غفیر علماء کا متوجہ ہو کر ، اُس کی تحقیق اور تکمیل کرے کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ ہزاروں مستند علماء نے جس کام میں اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا کیا وہ ایسا فضول اور بے اصل ہوسکتا ہے کہ اُن کی اوقات ضائع ہوئی یا اُن کی وہ کوشش اور جانفشانیاں بالکل فضول تھیں ۔اب اگر کوئی اجنبی شخص ،جس کو فن حدیث سے کوئی تعلق نہ ہو

چند مختلف ضعیف اقوال نقل کر کے اس فن کو بے اعتبار قرار دے تو کیا عقلاء اُس کی تصدیق کر سکتے ہیں؟ عقل کی رو سے تو ہرگز نہیں کر سکتے ۔ یہ تو کمال فخر کا موقع تھا کہ اپنے اسلاف کے کارنامے پیش کر کے اوروں سے پوچھتے کہ کوئی اُمت ایسی بھی ہے کہ اپنے نبی کے اقوال اورافعال اور دین کی باتوں کو ایسی جانفشانیوں سے محفوظ رکھا ہو افسوس ہے کہ اُمت کے منتخب افراد نے جو اپنی گراں بہا عمریں صرف کر کے قابل افتخار خزانے ہمیں دے گئے ہیں ۔ اُس کا شکریہ کیا جا رہا ہے کہ چند ناقصوں کی کارروائیاں پیش کر کے اُن کی تمام جانفشانیاں خاک میں ملائی جارہی ہیں ۔انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

جوابِ مولوی شمس العلماء شبلی صاحب

اب ہم چند اقوال شمس العلماء صاحب کے سیرۃ النعمان سے نقل کرتے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ ہمارے امام صاحب کی طرفداری کے جوش میں فن حدیث اور محدثین پر انہوں نے حملے کئے ہیں، شاید بعض احناف اِس سے خوش ہوگئے ہوں گے ۔مگر میں اِس خیال کے بالکل مخالف ہوں ہمیں اتنے تعصب کی ضرورت نہیں کہ جن حضرات نے قوم پر اعلیٰ درجہ کا احسان کیا ہو اُن کو برائی سے یاد کریں اور اُن کی نکتہ چینیاں کر کے معاذ اللہ اُن کو رسوا کریں اور علاوہ اُس کے اگر حدیث ہی بے اعتبار ہو جائے گی تو فقہ بطریق اولیٰ بے اعتبار ہو جائیگی ۔ اِس لئے کہ فقہ کا دار و مدار حدیث پر ہے، کسی حنفی کا یہ خیال نہیں کہ امام صاحب ایک عقلمند متقن شخص تھے، اپنی عقل کی رہبری سے قاعدے ایجاد کرتے ، اور مسائل تراشتے تھے ۔ چنانچہ خود شمس العلماء صاحب نے سیرۃ النعمان میں چند دلائل وقرائن سے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب اعلیٰ درجہ کے محدث تھے اور حدیث کو قیاس پر مقدم کیا کرتے تھے۔

قولہ ص ۱۵۱: زبانی روایت سے گذر کر تحریروں میں جعل شروع ہو گیا تھا مسلم نے روایت کی

ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی نقل لے رہے تھے بیچ میں الفاظ چھوڑتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ واللہ علی نے ہرگز یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔ اسی طرح ایک اور دفعہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک تحریر دیکھی تو تھوڑے سے الفاظ کے سوا باقی سب عبارت مٹا دی۔

یہ بات پوشیدہ نہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کے شیعہ اور اعداء میں افراط وتفریط بہت کچھ ہوئی۔ روافض، خوارج کی ابتداء اسی وقت سے ہوئی مگر دونوں جماعتیں الگ الگ اور اہل سنت اُن سے ممتاز رہے۔ کسی نے اُن کو اپنا استاد بنا کر اُن سے روایتیں اُس وقت نہیں لیں کیونکہ صحابہ اور اکابر تابعین کے ہوتے اُن سے روایت کرنے کی ضرورت ہی کیا؟ دیکھئے جہاں مسلم شریف میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مذکورہ لکھی ہے، اُسی کے متصل یہ دو روایتیں بھی لکھی ہیں، ایک یہ ہے **"لما احدثوا تلک الاشیاء بعد علی علیہ السلام قال رجل من اصحاب علی قاتلھم اللہ بای علم افسدوا"** یعنی شیعہ نے جب نئی نئی باتیں بنائیں تو علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے کہا: خدا اُن کو غارت کرے کیسے اعلیٰ درجہ کے علم کو انہوں نے تباہ کر دیا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب اُس وقت ممتاز تھے اور جانتے تھے کہ شیعہ نے آپ کے علوم واحادیث میں جعلسازیاں کی ہیں، اس وجہ سے کوئی روایت اُن سے نہیں کرتے تھے۔

دوسری حدیث مسلم شریف میں یہ ہے کہ جس کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ کی وہی روایت قابل تصدیق سمجھی جاتی تھی جو اصحاب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے پہونچے۔ انتہی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شیعہ، اہل سنت و جماعت سے خارج تھے اور اُن کی روایتیں نہیں لی جاتی تھیں۔ الحاصل گو اس زمانہ میں جعل شروع ہو گیا تھا۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے محدثین نے جعلسازوں کو ایسے پھٹکار کر رکھا تھا کہ اُن کی کوئی جعلی بات اُن کے پاس نہ آسکے۔

قولہ(۱)ص ۱۵۱: لوگوں کو وضع حدیث کی زیادہ جرأت اِس وجہ سے ہوتی تھی کہ اِس وقت تک اسناد و روایت کا طریقہ جاری نہیں ہوا تھا جو شخص چاہتا **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کہہ دیتا تھا اور اثبات سند کے مواخذہ سے بری رہتا تھا۔ ترمذی نے کتاب العلل میں امام ابن سیرینؒ سے روایت کی ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ اسناد نہیں پوچھا کرتے تھے جب فتنہ پیدا ہوا تو اسناد کی پوچھ گچھ ہوئی تا کہ اہل سنت کی حدیثیں لی جائیں اور اہل بدعت کی ترک کی جائیں۔ لیکن حدیث کی بے اعتباری اہل بدعت پر موقوف نہ تھی۔ اس لئے یہ احتیاط چنداں مفید نہ ہوئی اور غلطیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا انتہی۔

افسوس ہے اس مقام میں مولوی صاحب محققانہ انداز سے بہت دُور ہو گئے جس سے ناواقف لوگ خیال کرنے لگے کہ ایک زمانہ دراز تک جو شخص چاہتا حدیثیں بنا کر **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کہہ دیتا اور اُس کو کوئی نہ پوچھتا کہ فی الواقع وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے یا نہیں، حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے اس لئے کہ ابن سیرینؒ کی ولادت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ہے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ میں مصرح ہے جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اسناد کے پوچھنے کا زمانہ بھی پایا ہے اور صرف **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کہنے کا بھی۔ اس لئے کہ صرف **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** جس زمانہ میں کہا جاتا تھا وہ صحابہ کا زمانہ ہے جس کا اکثر حصہ انہوں نے پایا ہے۔ چونکہ صحابہ کل عدول ہیں اُن کی کوئی خبر غلط نہیں ہوسکتی اور جس قدر تابعین کے زمانہ میں رہ گئے تھے، وہ ممتاز تھے اور ہر شخص جانتا تھا کہ یہ صحابی ہیں جب وہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تو اُن کی صحابیت خود ایک اعلیٰ درجہ کی سند تھی جس کے مقابلہ میں سند کا مطالبہ کمال درجہ کی گستاخی تھی۔ پھر صحابہ ہی کے زمانہ میں جب فتنہ پیدا ہوا

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

اورمفسدوں نے تقلیداًقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا شروع کیا تو اُن کا خود یہ کہنا باعث مواخذہ ہوا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ صحابی نہیں بلکہ اُن کا سن وسال خود گواہی دیتا تھا کہ اُنہوں نے وہ حدیث بنالی ہے یا کسی سے سنکر کہا اس لئے اُن سے اسناد کا مواخذہ کیا جاتا اور اُن کا مجرد قول قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ بشر عدوی نے جب حدیث پڑھی تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اُس کی طرف التفات بھی نہیں کیا اور یہ انتظام ہوگیا کہ وہی روایتیں لی جائیں جو اہل سنت کے ذریعہ سے پہونچیں جیسا کہ علی کرم اللہ وجہہ کی وہی روایتیں لی جاتی تھیں جو اصحاب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے پہونچتیں اور اہل بدعت سے حدیث تو کیا،قرآن بھی نہیں سنا جاتا تھا۔جیسا کہ ابن سیرینؒ کی روایت سے ابھی معلوم ہوا۔اب بتایئے ایسا کونسا زمانہ آیا کہ ہر بدعتی اور جلعساز قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور اُس کی روایتیں خوش اعتقاد سنکر شائع کردیتے۔

مولوی صاحب (۱) نے ابن سیرینؒ کے قول کو نہیں سمجھا۔انہوں نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ پہلے زمانہ میں صحابی ہو یا غیر صحابی،قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا اور اُس کی روایت مقبول اور مشہور ہوجاتی تھی۔اُن کے قول کا صحیح مطلب وہی ہے،جو ہم نے لکھا ہے جس پر تاریخی شہادت بھی موجود ہے۔

اب غور کیجئے کہ مولوی صاحب جو کہہ رہے ہیں کہ (حدیث کی بے اعتباری،اہل بدعت پر موقوف نہ تھی یعنی پہلے ہی سے ہوچکی تھی اور غلطیوں کا سلسلہ جاری رہا) کیسی سخت غلطی ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔

ابن سیرینؒ کا قول جو مولوی صاحب نے نقل کیا ہے اُس کی اصل عبارت یہ ہے۔**فلما وقعت الفتنة سألوا عن الاسناد لکی یاخذوا حدیث اهل السنة و**

---

(۱) مولوی شبلی نعمانی۔

یدعوا حدیث اھل البدع ۔

معلوم نہیں مولوی صاحب نے **سالوا** کا ترجمہ(کچھ پوچھ ہوئی) کس قرینہ سے کیا ہے۔ابن سیرینؒ کا مقصود تو یہ ہے کہ اِس غرض سے (کہ حدیثیں صرف اہل سنت کی لیں اور اہل بدعت کی چھوڑ دیں) اسناد کو پوچھنے لگے اِس قرینہ سے تو صاف ظاہر ہے کہ اسناد کی تحقیق میں نہایت اہتمام اور کوشش کی جاتی تھی تا کہ غرض حاصل ہو نہ یہ کہ سرسری طور پر تبرکاً کچھ پوچھ لیتے۔

قولہ(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت شروع ہی سے پرآشوب رہی۔ان اختلافات اور فتن کے ساتھ وضع احادیث کی ابتدا ہوئی اور اگرچہ کثرت اور انتشار زیادہ تر زمانۂ مابعد میں ہوا۔ لیکن خود صحابہ کے عہد میں اہل بدعت نے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں ایجاد کرلیں تھیں انتہی ۔

یہ وہی بات ہے جو ابن سیرینؒ نے کہی تھی کہ فتنہ کے زمانہ سے اسناد کی تحقیق شروع ہوئی۔اس میں شک نہیں کہ صحابہ ہی کے عہد میں اہل بدعت نے حدیثیں بنانی شروع کردی تھیں۔مگر اُس سے اسلام کو کچھ ضرر نہیں پہونچا۔اِس لئے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نئے خیالات اور نئی باتیں دین میں ایجاد کرنے اور اُن کو رواج دینے سے ہمیشہ منع فرمایا کئے چنانچہ کتب حدیث پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس باب میں کس کثرت سے روایتیں وارد ہیں۔منجملہ اُن کے چند ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں لکھے جاتے ہیں۔''**شــــر الامور محدثاتھا و کل بدعة ضلالة** ''یعنی تمام کاموں میں بدتر محدثات ہیں یعنی نئی نئی باتیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

''**مـن احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد**''یعنی جو کوئی ہمارے دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اُس میں نہیں سو وہ مردود ہے۔

مـن یـعـش مـنـکـم بعدی فسیری اختلافاً کثیرًا فعلیکم بسنتی و سنة

---

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا و عضوا علیھا بالنواجذ ''یعنی جوکوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا۔ بہت اختلاف دیکھے گا تو تم کو لازم ہے کہ میرے طریقہ کواور خلفائے راشدین کے طریقہ کوخوب مضبوط پکڑو۔ **اتبعوا السواد الاعظم من شذ شذ فی النار** یعنی بڑی جماعت کے پیرو رہو جواس سے علٰحدہ ہو گیا وہ دوزخی ہے۔

''**ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاذة القاصیة والناحیة و ایاکم و الشعاب و علیکم بالجماعة و العامة**'' یعنی شیطان آدمیوں کا بھیڑیا ہے جس طرح سب سے الگ چرنے والی بکری کو بھیڑیا لے جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں سے علٰحدہ ہوجانے والے کو شیطان ہلاک کرتا ہے تو تم کو لازم ہے جماعت کو نہ چھوڑو۔ ''**من وقّر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام**'' یعنی جوکوئی بدعت والے شخص کی توقیر کرے تو اُس نے اسلام کے ڈھانے پر مدد کی۔

''**من فارق الجماعة شبرًا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه**''یعنی جوکوئی جماعت سے ایک بالشت بھر دور ہو جائے اُس نے ربقۃ الاسلام کو اپنی گردن سے نکال دیا۔ اِن کے سوا اور روایتیں بھی بکثرت ہیں جن کو سب صحابہ خوب جانتے تھے اور امتثال امر نبوی میں صحابہ جس قدر مستعد اور سرگرم اور راسخ قدم تھے ہر شخص جانتا ہے کہ وہ حضرات صرف اشارہ پر جان دینے کو سعادت ابدی سمجھتے تھے۔ پھر جب صراحتً ہمیشہ بدعت کے قلع وقمع کا ارشاد فرمایا گئے تو غور کیا جائے کہ اہل بدعت کے ساتھ اُن کا معاملہ کس قسم کا ہوگا۔ کیا وہ اس بات کو گوارا کر سکتے تھے کہ کسی بدعتی کو منصب روایت کی توقیر حاصل ہو جس سے اسلام کے منہدم کرنے والوں میں نام لکھا جائے۔

ابن سبا، جو اصل میں یہودی تھا اُس نے مسلمانوں میں شامل ہو کر بحیلہ محبت اہل بیت، تشیع

کی بنیاد ڈالی، اور سچی جھوٹی حدیثوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت کو شیخین رضی اللہ عنہما پر بیان کرنا شروع کیا۔ آپ کو وہ سخت ناگوار ہوا اور فرمایا کہ جو شخص مجھ کو شیخین پر فضیلت دے اُس کو افتراء کی حد، اسی دُرّے ماروںگا، اسی طرح اور بہت سی نئی نئی باتیں ایجاد کر کے خفیہ تعلیم سے ایک گروہ اپنا ہم خیال بنالیا۔ جب آپ کو اطلاع ہوئی تو اُس گروہ کو مع ابن سبا جلا وطن کر دیا جیسا مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے تحفہ میں اس گروہ کا حال مفصّل لکھا ہے۔

غور کیجئے ایسا گروہ جو محبت کا دم بھرتا اور جان نثاری کو اپنی سعادت سمجھتا تھا، اُس کو صرف نئے خیالات اور بدعتوں کی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جلا وطن کر دیا تو اور بدعتیوں کے ساتھ آپ کا اور دوسرے صحابہ کا کیا حال ہوگا۔ جب مجلسوں میں اہل بدعت کا ذلیل ہونا اور جلا وطنی کی سزا پانی شہرۂ آفاق ہوئی ہوگی تو ایسا کون بیوقوف ہوگا جو اُن سے حدیثیں لے کر دائمی رسوائی حاصل کرے؟ ہاں نو خیز، ضعیف الایمان، جدت پسند طبائع اُن کے ابلہ فریبوں کے دام میں آجاتے تھے جس سے مذاہب باطلہ کے گروہ بن گئے جس طرح اس زمانہ میں قادیانی وغیرہ مذاہب باطلہ کا شیوع ہو رہا ہے مگر یہ بات مشاہد ہے کہ اُن کے خیالات اور بنائی ہوئی باتیں اہل حق ہرگز قبول نہیں کرتے یہی حال اُس زمانہ میں تمام جعل سازوں کا تھا اور اگر دھوکہ دے کر کوئی جعلساز موضوع حدیثیں بیان کر دیتا تو اس سے سند پوچھی جاتی جس کی تحقیق ہونے پر وہ رسوا ہوتا جیسا کہ ابن سیرینؒ کے قول سے مستفاد ہے۔

الحاصل صحابہ کے زمانہ میں اہل بدعت کا موضوع حدیثیں بنانا، اسلام کے حق میں مضر نہ ہوا بلکہ اہل بدعت کی قلعی کھل گئی اور اُن کی روایتیں اور خیالات انہیں فرقوں میں محدود رہے ورنہ اُن کے بعد طوفان بے تمیزی اور خلط وملط کے زمانہ میں اگر اُن کے موضوعات پیش ہوتے تو اُن کی پوری کامیابی ہو جاتی اور احادیث صحیحہ اور موضوعہ میں کوئی امتیاز نہ رہتا۔

قولہ(۱): غرض تمام ممالک اسلامیہ میں گھر گھر حدیث و روایت کے چرچے پھیل گئے اور سینکڑوں، ہزاروں درسگاہیں قائم ہوگئیں۔لیکن جس قدر اشاعت کو وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوتا جاتا تھا۔ارباب روایت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اُس میں مختلف خیال، مختلف عادات، مختلف عقائد، مختلف قوم کے لوگ شامل تھے۔اہل بدعت جابجا پھیل گئے تھے اور اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف تھے سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گزر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا۔ان اسباب سے روایتوں میں اس قدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوگیا۔یہاں تک کہ امام بخاریؒ نے اپنے زمانہ میں صحیح صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ میں سے انتخاب کر کے جامع صحیح لکھی، جس میں کل ۷۳۹۷ حدیثیں ہیں۔اُس میں سبھی مکررات نکال ڈالی جائیں تو صرف ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہتی ہیں انتہی۔

یہ دُرست ہے کہ اہل بدعت اپنے مسائل کی ترویج میں مصروف ہوئے جس طرح ہمارے زمانہ کے اختراعی مذاہب والے مصروف ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہب حقہ میں اُن کی روایتیں ہرگز نہیں لی جاتی۔اختلاف زمانہ کے اعتبار سے اتنا فرق ضروری ہے کہ ہمارے زمانہ کے علماء اُن کی طرف توجہ نہیں کرتے اور چونکہ وہ ابتدائے اسلام کا زمانہ تھا نئی باتیں پرجوش طبائع کو ناگوار ہوتی تھیں، اس لئے اُن کے رد میں زیادہ تر اہتمام ہوتا تھا، بہرحال جس قدر مخالفوں کی کوششیں زیادہ ہوئیں محدثین نے احتیاط اور حفاظت میں زیادہ تر اہتمام کیا جس پر فن رجال گواہی دے رہا ہے۔

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

موضوع حدیثوں کا دین پر کوئی اثر نہ پڑا

اب رہی یہ بات کہ اُن کے اثر تعلیم سے مذاہب باطلہ کے فرقے بن گئے سو یہ بات دوسری ہے۔اس میں طبائع کی مناسبت اور انفعال کو دخل تام ہے۔ جدت پسند طبیعتیں ہمیشہ مذاہب باطلہ کو مدد دیتے آئے اسی کو دیکھ لیجئے کہ قادیانی مذہب کے خیالات کو نہ کوئی عقلمند مطابق عقل سمجھتا ہے نہ کوئی دیندار مناسب دین ،جن کا حال افادۃ الافہام سے معلوم ہوسکتا ہے۔ پھر مرزا صاحب کی زندگی میں یہ کہنے کو گنجائش تھی کہ جب وہ عیسیٰ موعود ہیں تو دجال کو کبھی نہ کبھی قتل ضرور کریں گے مگر اُن کے مرنے سے تو ثابت ہوگیا کہ وہ عیسیٰ موعود ہر گز نہیں تھے کیونکہ نہ انہوں نے مسلمانوں کے دجال کو قتل کیا جس کا حال احادیث میں مذکور ہے اور نہ اپنے تاویلی دجال یعنی پادریوں کو باوجود اس کے ان کے پیرو اب بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ وہ عیسیٰ موعود ضرور تھے ۔ بلکہ کرشن جی بھی تھے بلکہ سب کچھ تھے اور ان خیالات کے رد میں کتابیں لکھی گئیں۔ ماہانہ پرچے شائع ہوئے ،اخباروں میں مضحکے اڑائے گئے ۔مگر اُن کو جنبش نہیں اور کچھ بھی کہدے کر اُس کو جواب فرض کر لیتے ہیں ۔ غرضکہ اس قدر پُر اثر تعلیم اور پُر زور ترویج پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس مذہب کے نئی باتوں کا ذرا بھی برا اثر مذاہب حقہ پر نہیں پڑا۔اس سے ظاہر ہے کہ کسی مذہب کے شیوع سے اور دوسرے مذاہب پر اثر نہیں پڑتا بہرحال کئی اسباب سے ہم یقیناً کہتے ہیں کہ اہل سنت کا مذہب' اہل بدعت کی کارروائیوں سے محفوظ رہا اور صحیح حدیثوں میں اُن کا کوئی تصرف نہیں ہونے پایا۔

مختلف خیالات ،مختلف عادات ،مختلف عقائد ،مختلف قوم کے لوگ جو ہمارے دین میں داخل ہوتے گئے ، اُن سے ہمارے دین میں کوئی تغیر نہیں آیا بلکہ خود اُن کے خیالات اور عادات بدلتے گئے ۔ باوجود یکہ اس وقت ہماری قوم میں افلاس ہے مگر یوروپین ، ہنود وغیرہ

جومسلمان ہوتے ہیں تو اسلام کا طریقہ اختیار کر کے اپنے طریقہ کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اُس وقت تو اسلام کی حالت ظاہری بھی دوسری اقوام سے بدرجہا بہتر تھی۔غرضکہ ان اسباب کو احادیث کے ضعف میں کوئی دخل نہیں۔البتہ اُس زمانہ میں جعلساز دھوکے بھی دیا کرتے تھے تو اُن کی وجہ سے محدثین نے بھی اسناد میں بہت سے شروط لگا کر تشدد کر دیا اور عدم واقفیت سے کسی نے ایسے لوگوں سے روایت لی بھی ،تو اطلاع کے بعد لکھے ہوئے اجزاء تلف کر دیئے جاتے تھے۔جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ بصرف زر کثیر جو کتابیں لکھوائی گئیں تھیں مخالفت اعتقاد کی وجہ سے سب پھاڑ دی گئیں۔

پھر جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا مخالفت بڑھتی گئی اور منافرت گھٹتی گئی۔یہاں تک کہ ہر مذہب کے لوگ ،مستند شیوخ کے حلقوں میں شریک ہو کر بحسب لیاقت و قابلیت فن حدیث میں کمال حاصل کرنے لگے۔اور بعض افراد اُن میں ایسے سر برآوردہ بھی نکلے کہ شہرۂ آفاق ہوئے۔ایسے لوگوں سے بعد اس کے کہ اُن کا صدق مسلم اور مکرر تجربوں سے ثابت ہوا۔ہمارے محدثین نے بھی روایت کی ہے اور اُن کو مستند بھی جانتے تھے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ میں ترجمہ ابن ربیح میں لکھا ہے کہ ابن معین کا قول ہے ،اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تو ہم اُن کی حدیث کو نہ چھوڑیں گے۔وجہ یہ ہے کہ صدق ایک علحدہ مستقل صفت ہے اُس کو کبھی مذہب سے تعلق نہیں۔اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض یوروپین اور ہندو ایسے راستگو ہوتے ہیں کہ عموماً اُن کا اعتبار ہوتا ہے اور بعض مسلمان بلکہ ذی علم ایسے جھوٹے ہوتے ہیں کہ خود اُن کے دوستوں کو اُن کے قول کا اعتبار نہیں ہوتا۔چونکہ ابن معینؒ کو مکرر تجربوں سے عبدالرزاق کے صدق کا یقین ہو گیا تھا ،اِس لئے انہوں نے اُن لوگوں کے جواب میں جو عبدالرزاق پر شیعیت کا الزام لگاتے تھے کہا کہ وہ شیعی تو کیا ،اگر مرتد بھی ہو جائیں تو جھوٹ نہ کہیں گے اس لئے ہم اُن کی حدیث نہ چھوڑیں گے۔غرضکہ اہل

بدعت سے جو روایتیں لی گئی ہیں وہ غفلت سے نہیں لی گئیں جس سے بے احتیاطی کا الزام عائد ہو۔ یہ بات مشاہد ہے کہ جن کو اپنی ہوشیاری اور تجربہ کاری پر پورا بھروسہ ہوتا ہے، وہ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ مگر جہاں دھوکے کا اندیشہ ہوتا ہے، احتیاط سے زیادہ تر کام لیتے ہیں بہر حال دھوکا نہیں کھاتے اسی طرح نقادان حدیث نے اہل بدعت وغیرہم سے حدیثیں لیں پھر جن میں شرائط صحت پورے پائے، اُن کو صحیح کہا اور جن میں نہیں پائے علی حسب مدارج ضعیف، منکر، موضوع وغیرہ میں داخل کر دیا۔ بہر حال جن پر صحت کا اتفاق ہے وہ یقیناً صحیح ہیں۔

مولوی صاحب نے اشاعت حدیث پر جو حکم لگا دیا کہ اُس سے اعتماد اور صحت حدیث کا معیار کم ہوتا گیا۔ اس میں نظر غائر اور واقعہ سے مدد نہیں لی، ورنہ یہ بھی نہ کہتے۔

احتیاطِ محدثین

اصل واقعہ یہ ہے کہ جس قدر اہل بدعت پھیلتے گئے، محدثین احتیاط زیادہ کرتے گئے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ متاخرین نے بہ نسبت متقدمین کے حدیث کی تحقیق زیادہ کی۔ یہاں تک کہ ایک ایک حدیث سو سو طریقوں بلکہ اُس سے بھی زیادہ سے حاصل کی ہر چند ظاہراً یہ کام فضول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو مقتضائے احتیاط یہی تھا کہ اس کی توضیح اس مثال سے ہوسکتی ہے کہ کسی بیمار کو کسی دوا کی ضرورت ہو اور ایسا مشتبہ شخص اُس کو لا وے جس کا حال معلوم نہ ہو کہ وہ اُس کا دشمن ہے یا دوست۔ تو وہ اُس دوا کو لے تو لیگا مگر اُس وقت تک اُس کا استعمال نہ کرے گا جب تک کئی حکیموں کی زبانی معلوم نہ ہو کہ وہ وہی دوا ہے جو اُس کے مرض کے لئے مفید ہے اسی طرح محدثین نے بھی جب دیکھا کہ

اشاعت حدیث کرنے والے اہل بدعت بھی بکثرت ہیں اور خلط ملط کی وجہ سے اُن کا امتیاز مشکل ہے اس لئے ایک ایک حدیث کو متعدد طریقوں سے حاصل کرتے جس سے اطمینان ہو جاتا کہ حدیث صحیح ہے اب دیکھئے اشاعت حدیث اعتماد اور صحت کا معیار کم ہوا یا زائد۔

عدمِ کتابتِ حدیث کی وجہ

قولہ(۱): سب سے زیادہ یہ کہ پوری ایک صدی گذر جانے پر بھی کتابت کا طریقہ مروج نہیں ہوا تھا بات یہ ہے کہ وہ اسلام کی ترقی کا زمانہ تھا ہر طالب علم کی ہمت ہمہ تن مصروف تھی کہ کمال حاصل کر کے جن حضرات کے حافظے قوی تھے، وہ اِس فکر میں رہتے تھے جس قدر سبق زیادہ حاصل ہو بہتر ہے، چنانچہ ابھی معلوم ہوا کہ تحصیل حدیث کے زمانہ میں کھانا پکانا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے لکھنے کے وقت کو بھی تحصیل حدیث ہی میں وہ صرف کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر حدیثوں کو لکھ لیں اور دفتر گم ہو جائے تو کل محنت برباد ہو جائیگی اس لئے وہ ہمیشہ حدیثوں کو ازبر کرنے کی کوشش میں رہتے اور طبیعت کو لکھنے کی عادی ہی نہیں بناتے تھے۔ اس وقت کے محدثین نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے کہ جب تک لکھنے کا طریقہ نہیں تھا حافظے قوی تھے۔ اور جب سے اس طریقہ کی بنیاد پڑی حافظوں میں ضعف آ گیا۔ اور تعجب نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا ''لا تکتبوا عنی'' یعنی احادیث مت لکھا کرو اُس میں جہاں اور مصلحتیں تھیں ایک مصلحت یہ بھی ہو کہ حدیثیں کل محفوظ رہیں۔ کیونکہ **لا تحفظوا عنی** تو فرمایا ہی نہیں۔ بلکہ بجائے اس کے **فلیبلغ الشاهد الغائب** کہہ کر تاکید فرمادی کہ حدیثیں یاد رکھ کر اُن

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

کی اشاعت کرو ۔ اس حفظ کی بدولت علاوہ احادیث کے جرح و تعدیل میں جو کچھ اساتذہ سے سنتے تھے، ہر وقت اُن کے پیش نظر رہتا تھا جس محدث اور راوی سے کوئی حدیث سنتے تو حافظہ اُس راوی کے حالات اور اُس حدیث سے جو امور متعلق ہیں، سب پیش کر دیتا پھر اپنی ذاتی تحقیق علاوہ اُس کے ہوتی غرضکہ شدہ شدہ اُن کے حافظے کتب خانے اور وہ حضرات خود ناطق کتابیں ہو گئے تھے جیسا کہ ابن تیمیہ نے رفع الملام میں لکھا ہے ''**فکانت دواوینهم صدورهم التی تحوی اضعاف ما فی الدواوین و هذا امر لا یشک فیه من علم القضیة** ''یعنی قدماء کے پاس اگرچہ کتابیں نہ تھیں مگر اُن کے سینوں میں ان کتابوں سے کئی حصے زیادہ حدیثیں جمع تھیں ۔اور یہ ایسی بات ہے کہ کوئی واقف شخص اس میں شک نہیں کرسکتا انتہی ۔اس سے بہت بڑا فائدہ ہوا کہ جو روایت وہ کسی سے سنتے فوراً سمجھ جاتے کہ وہ روایت صحیح ہے یا ضعیف و موضوع وغیرہ ۔اس وجہ سے جعلساز اُن کے روبرو اپنی روایتیں پیش کرنے سے خوف کرتے تھے ۔ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ اُن حضرات کے حافظہ سے تصحیح احادیث میں جس قدر مدد ملی ممکن نہیں کہ کتابت سے مل سکتی ۔اُس سے اتنا ہی ہوتا کہ ہر قسم کی روایتوں کا ذخیرہ فراہم ہو جاتا جس کو صحت و غیر صحت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ کتابت کی وجہ سے حافظوں میں ضعف آ جاتا جس سے روایت لینے کے وقت نہ راوی کے حال کا علم، نہ رجال اسناد کی خبر، نہ یہ معلوم کہ دوسرے اساتذہ کن الفاظ سے اس حدیث کو راویت کرتے ہیں الحاصل اسباب حفاظت احادیث صحیحہ میں ایک قوی سبب یہ بھی ہے کہ اوائل میں صرف حافظہ ہی سے یہ کام متعلق رہا گویا من جانب اللہ یہ حفاظت ہوئی کہ مدتوں کسی کو لکھنے کا خیال ہی نہ آیا اور جب ایک سو سال کی کوششوں سے صحیح صحیح حدیثیں جمع ہوگئیں تو اُس وقت لکھنے کی اجازت ملی ۔

اب دیکھئے باوجودیکہ حفاظت احادیث صحیحہ جو قوت حافظہ سے ہوئی، کتابت سے ممکن نہ تھی مگر مولوی صاحب اُسی کو سب سے زیادہ مضر بتلاتے ہیں۔

قولہ(۱): ان اسباب سے روایتوں میں اس قدر بے احتیاطیاں ہوئیں کہ موضوعات اور اغالیط کا ایک دفتر بے پایاں تیار ہوگیا انتہی۔

موضوعات سے ہمارا مذہب محفوظ ہے

یہ درست ہے اگر کل فرق باطلہ سے قطع نظر کر کے صرف روافض ہی کی کتابیں دیکھ لی جائیں تو ایک دفتر بے پایاں پیش نظر ہو جائیگا۔ مگر اُس سے ہمارے محدثین کو کیا تعلق ہر ایک فرقہ کے یہاں اُن کے مخترعات کا دفتر رکھا ہوگا ہماری یہاں تو وہی حدیثیں محفوظ چلی آ رہی ہیں جن کی حفاظت میں ہزارہا محدثین قرناً بعد قرنٍ مصروف رہے۔ البتہ اہل بدعت کے خلط ملط سے متاخرین کی کتابوں میں چند موضوع حدیثیں داخل ہوگئیں۔ جس کو محدثین نے چھانٹ کر الگ بھی کر دیا۔ چنانچہ موضوعات کی کتابوں میں وہ لکھی جاتی ہیں اوران میں بھی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں کہ محققین نے اُن کو موضوعات سے خارج کر دیا۔ اگر یقینی موضوعات دیکھی جائیں تو سو دوسو سے زیادہ نہ ہوں گی۔

غرضکہ موضوعات اور اغالیط کا دفتر بے پایاں اہل سنت و جماعت کے یہاں تیار ہو جانا غلط محض ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود جامع سے

قولہ (۲): امام بخاری نے صحیح حدیثوں کو جدا کرنا چاہا تو کئی لاکھ حدیثوں میں صرف دو ہزار کئی سو ملیں انتہی۔

---

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔ (۲) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

یہ عجیب بات ہے کہ صحابہ نے بڑے اہتمام سے تمام حدیثیں پہونچا دیں اور تابعین نے نہایت شوق سے اُن کو لیا اور تبع تابعین وغیرہم قرناً بعد قرن بڑی جانفشانیوں سے اُن کو حاصل کر کے حفاظت کرتے رہے اور خود امام بخاری بھوکے پیاسے تمام اسلامی دنیا میں تحصیل کی غرض سے ایک مدت دراز تک پھرا کئے اور مرمر کے جو حاصل کیا سو دو ہزار کیونکہ دوسری حدیثیں تو بیکار ہو گئیں۔

معلوم نہیں مولوی صاحب سے کس نے کہد یا کہ جامع لکھنے سے مقصود امام بخاری کا صحیح حدیثوں کو جدا کرنا تھا فتح الباری میں امام بخاری کا قول نقل کیا ہے کہ جامع میں' میں نے وہی حدیثیں داخل کیں جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو اِس خیال سے چھوڑ دیا کہ کتاب بڑی ہوجائیگی۔ اگر اُن کا یہ مقصود ہوتا جو مولوی صاحب نے سمجھا ہے تو اپنے جامع کو لاکھ حدیثوں کا مجموعہ بناتے کیونکہ فتح الباری وغیرہ میں اُن کا قول مصرح نقل کیا ہے کہ لاکھ صحیح حدیثیں مجھے یاد ہیں۔ یہ تو اُن کو یاد تھیں اور اُن کے استاد امام احمدؒ کو سات لاکھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں جیسا کہ تدریب الراوی وغیرہ میں لکھا ہے۔

قولہ(۱): سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں حدیثیں دانستہ لوگوں نے وضع کرلیں۔ حماد بن زید کا بیان ہے کہ چودہ ہزار حدیثیں صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کرلیں۔ عبدالکریم وضاع نے خود تسلیم کیا تھا کہ چار ہزار حدیثیں اُس کی موضوعات سے ہیں انتہی۔

ابھی معلوم ہوا کہ جتنی حدیثیں فرق باطلہ کے لوگوں نے وضع کیں، وہ انہیں میں رہیں یا تلف ہو گئیں۔ ہمارے محققین نے اُن کو رد کر دیا اور صاف کہد یا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ حماد جو چودہ ہزار کی تعداد بتلا رہے ہیں، اسی سے معلوم ہوتا ہے اُن موضوعات کو علماء نے متعین اور ممتاز کر کے گن لیا تھا ایسے موضوعات لاکھوں' ہوں تو ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ رہا عبدالکریم کا اقرار کہ چار ہزار حدیثیں اُس کی بنائی ہوئی ہیں۔ سو وہ قابل اعتبار نہیں

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

اس لئے کہ اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مخرب اور بدخواہ دین ہے، ایسے شخص کی خبر خصوصاً اس قسم کی کہ جس سے دین میں رخنہ پڑ جائے ہرگز قابل اعتبار نہیں، یہ تو مفسدوں کی عادت ہے کہ اقسام کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طور سے دین میں احتمالات پیدا کردیں، کبھی محدثوں کے لباس میں آ کر فساد پھیلاتے ہیں، کبھی فقہاء کے طرفدار ہو کر حدیثوں کو ساقط الاعتبار کرنا چاہتے ہیں، کبھی حکم بن کر دونوں کو تباہ کرنے کی فکر کرتے ہیں؟

عبدالکریم نے جب دیکھا کہ محققین کے روبرو موضوع حدیثوں کی قلعی کھل جائے گی اس لئے حدیثیں بنانے کی زحمت کو بے فائدہ خیال کر کے کہدیا کہ چار ہزار حدیثیں میں نے وضع کی ہیں، تاکہ کم مایہ اور کم عقل مسلمانوں کے دل میں کچھ نہیں تو شبہ ہی پیدا ہو جائے اور بے دینوں کو دستاویز مل جائے، کہ اسلام میں کوئی بات قابل اعتبار نہیں۔ اگر فی الواقع اُس نے حدیثیں بنائی تھیں تو علماء کے روبرو پیش کر دیتا کہ یہ روایتیں جو محدثین کے یہاں دائرو سائر ہیں، میری بنائی ہوئی ہیں اور اُس کو محدثین تسلیم بھی کر لیتے تو ایک بات تھی۔ ابھی معلوم ہوا کہ ایک ایک حدیث اُس زمانہ میں سوسو طریقوں سے لی جاتی تھی، تو بتایئے کہ ایک غیر متدین شخص کی بنائی ہوئی حدیثوں کو کس نے مانا ہوگا۔ غرضکہ عبدالکریم کی طرف سے کوئی شہادت پیش نہیں ہوئی کہ فی الواقع اُس کی طرف سے دین میں رخنہ پڑ گیا، پھر ایسے مخالف شخص کا یہ اقرار کہ میں نے دین میں رخنہ ڈالدیا، مسلمانوں کے ضرر پر کیوں کر قابل سماعت ہوسکتا ہے بلکہ وہ درحقیقت مجرد دعوے ہے، جو نہ شرعاً قابل قبول ہے نہ قانوناً نہ عرفاً۔

قولہ (۱) بہت سے ثقات اور پارسا تھے جو نیک نیتی سے فضائل اور ترغیب میں حدیثیں وضع کرتے تھے۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں کہ ان حدیثوں نے بہت ضرر پہونچایا، کیونکہ اِن واضعین کے تفقہ اور تورع وزہد کی وجہ سے یہ حدیثیں اکثر مقبول ہوگئیں، اور رواج پا گئیں۔

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

بعض نیک نیت بزرگوں نے جوفضائل اعمال میں حدیثیں بنالی گو وہ فعل بُرا تھا مگر اُس سے دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑا، اس لئے کہ بہت سے بہت اُس کا اثر ہوا، سو یہ ہوا کہ جو سورہ مہینے میں مثلاً ایک بار پڑھا جاتا تھا لوگ اُس کو روز پڑھنے لگے، جس کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں، پھر اُن حضرات نے راز میں کہہ بھی دیا کہ فلاں فلاں حدیث ہم نے بنائی ہے اس سے اُن احکام شرعیہ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا، جو حلت وحرمت سے متعلق ہیں اور نہ یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ اسی طرح اور حدیثیں بنائی ہوں گی۔ کیونکہ وہ حضرات اپنی طرف سے احکام ثابت کرنے کو حرام سمجھتے تھے۔

غلط فہمی محدثین

قولہ(۱): وضع کے بعد مساہلات' غلط فہمیاں' بے احتیاطوں کا درجہ تھا، جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرف بے قصد منسوب ہو گئے۔ بعض محدثین کا قاعدہ تھا کہ حدیث کے ساتھ حدیث کی تفسیر بھی بیان کرتے جاتے تھے اور اکثر حروف تفسیر حذف کردیتے تھے جس سے سامعین کو دھوکہ ہوتا تھا، اور وہ اُن کے تفسیری جملوں کو بھی حدیث مرفوع سمجھ لیتے تھے، تعجب یہ ہے کہ اس قسم کے مسامحات بڑے بڑے ائمہ فن سے صادر ہوئے۔ امام زہریؒ جو امام مالکؒ کے اُستاد اور حدیث کے ایک بڑے رکن تھے اُن کی نسبت علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں کہ ''**وکذا کان الزهری یفسر الحدیث کثیراً و ربما اسقط اداة التفسیر** یعنی اسی طرح زہری اکثر حدیث کی تفسیر کرتے تھے اور وہ حروف جن سے اُس عبارت کا تفسیر ہونا ظاہر ہو' چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وکیع کا بھی یہی حال تھا وہ اکثر حدیث کے بیچ بیچ میں ''یعنی'' کہکر بیان کرتے جاتے اور اکثر ''یعنی'' کا لفظ چھوڑ دیتے تھے جس سے سامعین کو اشتباہ ہوتا تھا۔ کتب رجال واصول حدیث میں اس قسم کی اور بہت مثالیں ملتی ہیں۔

اہل انصاف پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ احادیث کے ضعیف اور موضوع قرار دینے کی غرض سے جس قدر احتمالات پیدا کئے گئے تھے بفضلہٖ تعالیٰ سب بے اصل ثابت ہوئے۔ **والحمد لله علی ذلک۔**

---

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

اب مساہلات اور غلط فہمیوں کا درجہ ہے، یہاں بھی مولوی صاحب نے پر کا کبوتر بنا دیا، بات اتنی تھی کہ بعض احادیث کے معنی ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اس لئے بعض محققین نے تدریس کے وقت اُن کی تفسیر کی اور اُس کو لفظ ''یعنی'' کہہ کر ممتاز بھی کر دیا اور جہاں قرینہ اُس کی تفسیر ہونے پر تھا لفظ ''یعنی'' کو کبھی حذف بھی کر دیا، جیسا کہ سخاوی ؒ کی عبارت مذکورہ میں مصرح ہے ''و ربما اسقط اداة التفسير''۔ اس تفسیر کی ضرورت اِس وجہ سے ہوئی کہ بعض طلبہ مضمون حدیث غلط سمجھتے تھے، جیسا کہ مسلم شریف میں ہے کہ حدیث'' نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يتخذ الرَّوح غرضاً '' کو ایک محدث نے ''ان يتخذ الروح عرضا'' روایت کی لوگوں نے مطلب پوچھا، تو کہا کہ ہوا لینے کے لئے دریچہ عریض نہ رکھا جائے، حالانکہ مطلب اُس کا یہ ہے کہ کسی جاندار کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ ایسے موقع میں روح کی تفسیر میں يعنى الحيوان الذى فى الروح اور عرض کی تفسیر میں يعنى الهدف کہا جائے تو سوائے توضیحِ مطلب کے معنی میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، خواہ لفظ یعنی مذکور ہو یا محذوف، البتہ اہل احتیاط کو یہ بھی گوارا نہ تھا، اس لئے انہوں نے بیان کر دیا کہ فلاں فلاں محدث کبھی ایسی زیادتی کیا کرتے ہیں۔ اس سے اُن کا مقصود یہ نہیں کہ اس قسم کی تفسیروں سے حدیثوں میں اشتباہ پیدا ہو گیا، کیونکہ ان امور سے اصلِ حدیث میں اشتباہ ممکن نہیں، اس لئے کہ مثلاً وکیعؒ نے لفظ یعنی کو حذف کر دیا بھی تو وکیع اس حدیث کے موجد تو تھے ہی نہیں آخر کسی شیخ سے انہوں نے لی تھی پھر شیخ سے وہی اکیلے راوی نہ تھے اور بھی صدہا محدثین اُن کے شاگرد تھے، جنہوں نے وہ روایت اُن سے کی، علی ہذا القیاس ہر درجہ کے شیخ سے وہ روایت راویوں میں محفوظ چلی آئی۔ جس سے محدثین کو صاف معلوم ہو گیا کہ وہ زیادتی صرف وکیع کی روایت میں ہے۔

فتح المغیث میں لکھا ہے کہ حدیث بدءَ الوحی میں التحنث کا لفظ وارد ہے، زہری کی

روایت میں التحنث التعبد ہے، چونکہ تحنث کے معنی تعبد ہیں اس قرینہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بطور تفسیر، یہ لفظ بڑھایا گیا ہے، اس قسم کی زیادتی سے ظاہر ہے کہ معنی میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ چونکہ یہ حضرات اکابر دین ہیں جن کی جلالت شان پر تمام محدث متفق ہیں اس لئے ممکن نہیں کہ کوئی زیادتی انہوں نے ایسی کی ہو کہ جس سے معنی میں تغیر واقع ہوا، گر ایسی زیادتی ہوتی تو محدثین اُس کی تصریح ضرور کر دیتے۔

مولوی صاحب(۱) کو اکا دلفظ جو کہیں مل گیا اُس پر انہوں نے طوفان برپا کر دیا کہ ہزاروں اقوال، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے قصد منسوب ہو گئے۔ بھلا دس بیس قول ان اکابر دین کے ایسے پیش کریں جن سے معنی حدیث میں تغیر واقع ہوا ہو اور وہ حدیث میں شامل ہو گئے۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ وہ پیش نہیں کر سکتے۔

الحاصل اول تو غیر ممتاز زیادتیاں مستند محدثین نے نہیں کیں اور اگر بادی النظر میں غیر ممتاز ہیں تو محققین نے دوسری روایتوں سے تحقیق کر کے ایک ایک لفظ کو ممتاز کر دیا کہ حدیث میں داخل نہیں۔ بطور تفسیر بڑھا ہوا ہے۔

تدلیس

قولہ(۲) ''بڑی آفت تدلیس کی تھی، جس کا ارتکاب بڑے بڑے ائمہ فن کرتے تھے، اس تدلیس نے اسناد کے اتصال کو بالکل مشتبہ کر دیا تھا، ان کے سوا اور بہت سی بے احتیاطیاں تھیں جن کی تفصیل اصول حدیث کی کتابوں میں مل سکتی ہے''۔

بیشک مدلسین بھی گذرے ہیں، مگر محققین نے ہر ایک مدلس کا نام لکھ دیا ہے، جیسا کہ فن رجال سے ظاہر ہے۔ اور تدریب الراوی میں امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ خطیب نے ایک کتاب خاص مدلسین کے ناموں کی لکھی ہے اور نیز ابن عساکر نے بھی ایک کتاب اسی

(۱) مولوی شبلی نعمانی۔ (۲) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

باب میں لکھی ہے۔

غرضکہ جس بات میں ذری بھی بے احتیاطی ہوئی محدثین نے تحقیق کر کے تصریح کر دی کہ فلاں حدیث میں فلاں قسم کی بے احتیاطی ہوئی اوراس کوضعیف یا موضوع میں داخل کر دیا، جیسا کہ اصول حدیث اور دوسرے فنون حدیث سے ظاہر ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ جتنی حدیثیں موضوع تھیں سب موضوعات کی کتابوں میں داخل کر دی گئیں، اوراُن کے سوا سب حدیثیں نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کے ارشادات ہیں تو اُس کے بعد اگر کوئی شخص کسی حدیث کے معنی سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اُس کو موضوع کہدے تو مسلمانوں کے نزدیک اُن کا یہ قول ہرگز قابل اعتبار نہیں ہوسکتا، کیونکہ ناسمجھی سے حدیث تو کیا، قرآن کو بھی بعضوں نے موضوع کہدیا، چنانچہ ''ملل ونحل'' میں عبدالکریم شہرستانی ؒ نے لکھا کہ خوارج میں ایک فرقہ ہے کہ سورۂ یوسف کو وہ خدا کا کلام نہیں سمجھتا، اس وجہ سے کہ اُس میں عشق کا قصہ مذکور ہے جس کا بیان کرنا خدا کی شان سے بعید ہے۔ اگر ایسے لوگوں کی بات چل جائے تو ہر خود غرض اپنے مضر مطلب حدیثوں کو موضوع کہدیگا جس سے ہزارہا محدثین کی جانفشانیاں اکارتھ ہوجائیں گی۔

مولوی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ اس قسم کی حدیثیں ایجاد ہونے لگیں کہ میری امت میں ۷۳ فرقے پیدا ہوں گے جن میں صرف ایک جنتی ہوگا باقی سب دوزخی۔

حدیثِ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ

اوراُس کے بعد لکھے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی نکتہ شناسی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے دائرہ کو جو من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ کی وسعت رکھتا ہے اصلی وقعت پر قائم رکھا انتہی۔

یہ بات بالکل غلط ہے کہ امام صاحب کا یہ قول ہے کہ صرف لا الہ الا اللہ کے

کہہ دینے سے آدمی قطعی جنتی ہو جاتا ہے۔ اگر یہی بات ہو تو یہ ماننا پڑیگا کہ امام صاحب معاذ اللہ قرآن کی مخالفت کرتے تھے، کیونکہ قرآن شریف میں ہے ''ان **المنافقین فی الدرک الاسفل من النار**'' کچھ شک نہیں کہ منافق دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے منافق لا الہ الا اللہ بلکہ محمد رسول اللہ بھی کہتے اور نماز روزہ بلکہ جہاد وغیرہ میں شریک رہتے تھے اور قرآن شریف میں ہے ''و **من یقتل مومناً متعمداً فجزاؤ جھنم خالداً فیھا** ''اور جو مسلمان کو عمداً مار ڈالے تو اُس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیگا۔ اس میں یہ ارشاد نہیں کہ قاتل کافر ہو تو اُس کی یہ سزا ہوگی اور **لا الہ الا اللہ** کہنے والا جنت میں چلا جائے گا اور قرآن شریف میں ہے ''ان **الذین فتنوا المؤمنین والمومنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جنھم ولھم عذاب الحریق** ''یعنی جو دین سے بچلانے لگے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کی تو اُن کو عذاب ہے دوزخ کا' اور اُن کو عذاب ہے آگ لگنے کا۔

ان کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ آدمی گناہوں کی وجہ سے دوزخ کا مستحق ہوتا ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ خود مولوی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ امام صاحب' قرآن کے مقابلہ میں حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں تو اب بتائیے کہ اتنی آیتوں کے مقابلہ میں ایک حدیث پر انہوں نے کیونکر عمل کیا ہوگا۔

بہر حال حدیث ''**من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ**'' کے قرینہ سے ۷۳ مذہب والی حدیث کو موضوع قرار دینا باطل ہے، اس لئے کہ قرآن شریف میں جو عقائد بیان کئے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تصریح کر دی، جن کو صحابہ نے سُنکر یاد رکھا اور ان ہی اعتقادوں پر عمر بھر رہے ایسے اعتقادوں کو خلاف عقل کہہ کر کوئی شخص نہ مانے اور اقوال صحابہ اور احادیث کو موضوع قرار دے اور قرآن کے معنی کو بگاڑ کر اپنی مرضی کے

مطابق بنالےتو اُس کے گہنگار اور خطا کار ہونے میں کیا تامل؟ کیونکہ نہ اُس نے خدا کی بات مانی، نہ رسول کی نہ مسلمانوں کا طریقہ اختیار کیا۔حق تعالیٰ فرماتا ہے'' **و من یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الهدیٰ و یتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولّی و نصله جنهم و ساء ت مصیرا** ''جو شخص راہ راست ظاہر ہوئے؟ پیغمبر کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کے رستے کے سوا دوسرے رستے ہولےتو جو رستہ اُس نے اختیار کرلیا ہم اُس کو اُسی رستے چلائے جائیں گے اور آخر کار اُس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بُری جگہ ہے انتہی ۔ اور گہنگار اور خطا کار کا دوزخی ہونا اِس آیت سے ثابت ہے قولہ تعالیٰ'' **بلی من کسب سیئةً واحاطت به خطیئته فاولئک اصحاب النار هم فیها خالدون** ''یعنی کیوں نہیں! جس نے کمایا گناہ اور گھیرلیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں لوگ دوزخی وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

غرضکہ جتنے اسلام میں فرق باطلہ ہیں جن کا مخالف قرآن وحدیث وطریقۂ صحابہ ہونا' ثابت ہے اُن کا دوزخی ہونا قرآن سے ثابت ہے اور یہی بات اُس حدیث شریف سے بھی ثابت ہے۔ رہا یہ کہ تہتر فرقوں کی تعین حدیث میں ہے سو جب اس پیشن گوئی کے مطابق فرقوں کی کثرت مشاہد ہے تو اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے فرقوں پر حق تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرمادیا تھا اور وہ کل تہتر تھے اور چونکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تفصیل نہیں بتائی اس لئے علماء کے تخمین میں فرق آجائے تو حدیث سے اُس کو تعلق نہیں۔

ہر ذی علم اس بات کو جانتا ہے کہ قرآن وحدیث میں اکثر مقامات ایسے ہیں کہ ہر شخص اُن کو کما حقہ سمجھ نہیں سکتا اسی وجہ سے فقہاء کی ضرورت ہوئی، جن میں عمر بھر کی محنت اور جانفشانی کے بعد توضیح مشکلات اور توفیق اختلافات کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اب اگر کوئی

اجنبی بجز داس کے کہ کوئی حدیث سمجھ میں نہ آئے اور اختلافات میں توفیق نہ دے سکے' اُس کو موضوع قرار دیدے تو اُس کا قول قابل التفات نہیں ہوسکتا۔

روایت بالمعنیٰ

قولہ(۱) ''تابعین اور صحابہ نے بالمعنی حدیثیں روایت کیں اور روایت بالمعنی سے اصل روایت کا اصلی حالت پر قائم رکھنا قریباً ناممکن ہے''۔

صحابہ کی حالت تمام مسلمان جانتے ہیں کہ دین میں وہ کیسے محتاط تھے، جس قسم کی احتیاطیں خدا و رسول نے اُن کو سکھلائی تھیں اُسی مطابق اُن کا عمل تھا، بعض صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے سے منع فرمایا تھا، انہوں نے اس درجہ کی احتیاط کی کہ اگر سواری کی حالت میں کوڑا گر جاتا تو خود اُتر کر لیتے اور کسی سے نہ مانگتے۔ علی ہذا القیاس حضرت نے فرمایا ''دع مایریبک الی ما لا یریبک'' یعنی جس بات میں شک ہو اُس کو چھوڑ دو اور اُس بات کو اختیار کرو کہ جس میں کوئی شک نہ ہو اسی پر ان حضرات کا عمل رہا ہے۔

اب غور کیا جائے کہ اگر روایت بالمعنی جائز نہ ہوتی تو ایسے محتاط حضرات جنھوں نے اپنی جانوں کو دین کے کاموں میں وقف کر دیا تھا اس کو کیونکر جائز رکھتے؟ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو بات فرماتے' اول تو وہ عام فہم ہوتی، کیسا ہی غبی جنگلی آدمی ہوتا سمجھ جاتا پھر عادت شریف یہ تھی کہ جو ضروری بات ہوتی اُس کو مکرر تین تین بار فرماتے، تاکہ اُس کا مطلب بخوبی ذہن نشین ہو، جیسا کہ کتب سیر سے ظاہر ہے، چونکہ صحابہ مامور تھے کہ جو بات سنیں اوروں کو پہونچادیں اس لئے موافق، عرف و عادت کے اُس مضمون کو پہونچا دیا کرتے تھے، کیونکہ ہر ملک وقوم کے لوگ جانتے ہیں کہ کوئی پیام کسی کو کہلایا جاتا ہے تو ہر شخص

(۱) مولوی شبلی نعمانی کا قول۔

یہی سمجھتا ہے کہ مضمون پہونچانے کی ضرورت ہے، نہ کہلانے والے کا یہ مقصود ہوتا ہے کہ بعینہ سب الفاظ پیام نقل کئے جائیں، نہ پیام لے جانے والا اس کا خیال کرتا ہے۔ ہاں کبھی مقصود یہ ہوتا ہے کہ الفاظ بعینہ نقل کئے جائیں مگر اُس وقت تصریح کردی جاتی ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں لفظ بلفظ اُس کو سنا دیا جائے۔ غرضکہ صحابہ اپنے عرف کے موافق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو نقل کیا کرتے تھے۔ اگر اس عرف کے خلاف حضرت کا مقصود ہوتا تو لفظ بلفظ کلام مبارک کو نقل کرنے کی تاکید فرمادیتے حالانکہ اس قسم کا تشدد کسی روایت میں دیکھا نہیں گیا، بلکہ بعض روایات میں بتصریح وارد ہے کہ روایت بالمعنی کا مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ کنزالعمال میں ہے ”عن يعقوب بن عبدالله ابن سليمان ابن اكيمة الليثى عن ابيـه عن جده قال اتينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت بابينا انت و امنـا يـا رسـول الـلـه انـا نسمع منک الحديث و لا نقدر على تأديته كما سـمـعـنـا منک فقال النبى صلى الله عليه وسلم: اذا لم تحلوا حراماً و لا تـحـرموا حلالا و اصبتم المعنى فلا باس به“ ”کر“ یعنی سلیمان ابن اکیمہ کہتے ہیں: کہ میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر سے فدا ہوں، یارسول اللہ ہم آپ سے کوئی حدیث سنتے ہیں تو ہم سے نہیں ہوسکتا کہ جس طرح سنتے ہیں بلاکم وکاست روایت کر دیں، فرمایا: جب حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کرو اور معنی برابر بیان کردو تو کوئی مضائقہ نہیں اور دوسری روایت بھی کنزل العمال میں طبرانی اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی میری طرف سے کوئی جھوٹی روایت کرے تو وہ دوزخی ہے اُس پر صحابہ نے پوچھا کہ بعض حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی وزیادتی ہوجاتی ہے کیا اس پر بھی عذاب ہوگا؟ فرمایا: میرا مقصود یہ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ایسی بات میری طرف سے بیان نہ کی جائے جس میں اسلام پر عیب لگایا جائے۔

غرضکہ روایت بالمعنی میں اقسام کے احتمالات پیدا کر کے حدیثوں کو ساقط الاعتبار کرنا خلاف حدیث وطریقۂ صحابہ ہے۔ ہاں تابعین کے بعد جب اہل مذاہب باطلہ اور خودغرض' روایت بالمعنی کے ضمن میں اپنی اغراض پورے کرنے لگے' اُس وقت امام صاحب نے روایت بالمعنی میں کلام کیا، جیسا کہ سیرۃ النعمان میں مولوی شمس العلماء صاحب نے لکھا ہے "لیکن امام ابوحنیفہ نے اس اجازت کو صحابہ اور تابعین تک محدود کر دیا اور اور لوگوں کے لئے روایت بالالفاظ کی قید لگائی"۔

احتمالاتِ اسقاطِ حدیث از پایۂ اعتبار

مولوی صاحب نے احادیث کو ساقط الاعتبار کرنے کی اور بھی تدبیریں بتائی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے تو یہ یقین نہیں کہ رواۃ اسناد فی الواقع ثقہ ضابطۃ القلب ہیں یا نہیں اور اگر ہیں بھی تو روایت متصل ہے یا نہیں، خصوصاً معنعن میں تو ثبوت اتصال بہت ہی مشکل ہے اور اگر اتصال ثابت بھی ہو تو صحابہ کے کل اقوال' حدیث مرفوع ہونے پر دلالت نہیں کرتے مثلاً اس قسم کے الفاظ کہ یہ امر سنت ہے اُن سے مرفوعیت ثابت نہیں ہوسکتی اور اگر مرفوع ہونا بھی ثابت ہو گیا تو خبر آحاد سے یقین پیدا نہیں ہوسکتا۔

عقلاء کی عادت ہے کہ جب کسی بات کو ماننا یا کوئی کام کرنا منظور نہیں ہوتا تو اقسام کے احتمالات پیش کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک رات کسی صاحب کا عزیز بیمار ہوا، انہوں نے اپنے ملازم سے حکیم کے یہاں جانے کو کہا، چونکہ تھا وہ بڑا ہوشیار' لگا باتیں بنانے کہ حضرت رات بہت ہو گئی ہے، معلوم نہیں حکیم صاحب میرے لئے دروازہ کھولتے ہیں یا نہیں، اور اگر کھولا بھی تو معلوم نہیں دوا تیار ہے یا نہیں اور اگر تیار بھی ہو تو دیتے ہیں یا نہیں، اگر دیئے بھی تو معلوم نہیں کہ مفید ہو گی یا نہیں، اس لئے بہتر یہی ہے کہ یہ تجویز موقوف رکھی جائے۔ مگر اس قسم کی باتیں اجنبیت اور بے تعلقی میں سوجھتی ہے اگر وہ

خود ملازم یا اُس کا کوئی عزیز بیمار ہوتا تو اُس وقت بجائے اس کے کہ احتمالات پیدا کرے ادنی احتمال پر توجہ کرتا۔ دیکھیئے جب کسی کے سر یا اور کسی عضو میں شدت سے درد ہو تو وہ ہر کسی سے دوا پوچھتا ہے، پھر اگر کوئی دوا کسی نے بتلا دی تو اُس کا نہایت ممنون ہو کر اُس دوا کا استعمال کرتا ہے اور نہ یہ پوچھتا ہے کہ بھائی تمہارے پاس طبابت کی کوئی سند بھی ہے یا نہیں؟ اور نہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ دوا مفید ہوگی یا مضر۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ شاہی حکم' کسی کی طلبی کا آ جائے تو اُس کی تعمیل کس قدر ضروری سمجھی جاتی ہے اور یہ نہیں پوچھا جاتا کہ حکم نامہ لانے والا چپراسی سرکاری آدمی ہے یا کوئی دغا باز ہے جو کسی خاص غرض سے یہ کام کیا ہے، اس لئے کم از کم دو گواہوں سے اُس کا سرکاری آدمی ہونا ثابت کیا جائے، اور نہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت کہ وہ حکم نامہ خاص ہمارے نام سے ہے؟ ممکن ہے کہ کسی دوسرے شخص کے نام سے ہو، کیونکہ ایک نام کے کئی آدمی ہوتے ہیں، اور نہ یہ پوچھا جاتا ہے کہ دستخط اور مہر جعلی ہے یا اصلی کیونکہ جعلساز جعلی سکے تک بنایا کرتے ہیں۔ غرضکہ اُس حکم نامہ کی تعمیل کئے بغیر چارہ نہیں۔ صرف قرائن سے جو ظن غالب ہو جاتا ہے' اُس کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے، اگر بات بات میں علم قطعی کی ضرورت سمجھی جائے تو دنیا کے بہت سے کاروبار ملتوی اور درہم و برہم ہو جائیں گے۔ یہ امر مشاہد ہے کہ لاکھوں روپیوں کے معاملے تار کے ذریعہ طے ہوتے ہیں، حالانکہ تار کی خبر قطعی نہیں ہو سکتی، ممکن ہے کہ کوئی دوسرے شخص نے تار دے دیا ہو، مگر قرائن سے جب ظن غالب ہو جاتا ہے تو اُس پر عمل کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا اسی طرح دین میں بھی ظن غالب قابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو کہ دو شخصوں کی گواہی سے حقوق ثابت ہو جاتے ہیں، حتی کہ قصاص کا حکم صرف دو گواہوں سے ثابت ہوتا ہے، حالانکہ عقلاً اور شرعاً آدمی کی جان قابل حفاظت ہے۔

اب غور کیجئے کہ وہ حضرات جن پر اسلام کی اشاعت اور ابقاء کا مدار سمجھا جائے تو بے موقع نہ ہوگا' ہر زمانہ میں ہزار ہا تھے، جنہوں نے اپنے سب کاروبار دنیوی چھوڑ کر صرف اِس بات میں کوشش کی کہ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد' تلف نہ ہونے پائیں، کیا ایسے ضعیف احتمالوں سے اُن کی جانفشانیاں بیکار ہوجائیں گی؟ کیا ان ہزار ہا مقتدیان اہل اسلام کی متواتر خبروں سے ظن غالب بھی نہ ہوگا کہ یہ احادیث جن کی خبر ہر قرن کے علماء نے دی ہے، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں؟

غرضکہ جس مسلمان کے دل میں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور اُن کے کلام مقدس کی وقعت ہوگی' اُس کا یہ خیال ہوگا کہ بجائے اس کے کہ معتبر حدیثوں میں احتمال پیدا کرے ضعیف حدیثوں پر عمل کرنے کو بھی اپنی سعادت اور نجات سمجھے گا۔ ہاں احادیث متعارضہ اور ضعیفہ وغیرہ میں اُس کو ظن غالب حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی سو اگر وہ مجتہد ہو تو قرائن وغیرہ سے مدد لیکر اجتہاد کرے گا، ورنہ کسی مستند مجتہد کی تقلید کر کے اِس ظن غالب پر عمل کرے گا کہ مجتہد نے جو تمام آیات و احادیث پر غور کر کے اجتہاد سے حکم دیا ہے وہ موافق قرآن و حدیث ہے۔

یہ ضمنی بحث تھی، کلام اس میں تھا کہ محدثین **رحمھم اللہ** نے بڑی بڑی جانفشانیوں سے احادیث نبویہ کی حفاظت کی ۔ سو آپ نے دیکھ لیا کہ اُن کی اولوالعزمیاں اور حافظے اور جانبازیاں کس قسم کی تھیں۔ تعصب کو دور کر کے ان حضرات کے کارناموں کے ساتھ دوسرے تمام ادیان اور اسلامی فرقوں کے کارناموں کا مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اپنے نبی کے کلام پاک کی حفاظت کا افتخار جو اہل سنت و جماعت کو حاصل ہے، وہ کسی کو حاصل نہیں۔ دراصل یہ صرف تائید آسمانی ہے کہ حق تعالیٰ نے بمصداق ''**واللہ یختص برحمتہ من یشاء**'' ایک جماعت کو اس کام کے لئے خاص فرما کر ہر طرح سے اُن کی مدد کی، ''**ذلک**

فضل اللہ یوتیہ من یشاء'' اور اپنے سچے دین کو قیامت تک محفوظ کردیا

مقابلۂ اہلِ اسلام با اہلِ ادیان درحفاظتِ دین

اس میں شک نہیں کہ دوسرے ادیان حقہ میں بھی دیندار لوگ تھے مگر اُن سے حفاظت دین نہ ہوسکی اور اپنے خالص دین کو کھو بیٹھے۔ اِس کی تصدیق میں ہم چند امور پیش کرتے ہیں جن سے اہل اسلام اور اہل ادیان سابقہ کا موازنہ ہو جائیگا اور اہل انصاف سمجھ جائیں گے کہ قسام ازل نے دین کی حفاظت مسلمانوں ہی کی قسمت میں رکھی تھی۔

دیکھئے موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے صحابہ کو عمالقہ کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے صاف کہدیا کہ حضرت! وہ ایک زبردست قوم ہے ہم اُن سے لڑ نہیں سکتے، اس کام کے لئے آپ اور آپ کا خدا تشریف لے جائیں، ہم یہاں ٹھہرے رہتے ہیں، جیسا کہ قرآن شریف میں ہے ''**قالوا یا موسیٰ انا لن ندخلھا ابداً ماداموا فیھا فاذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون** ''۔ یہ بنی اسرائیل کا حال ہے جن پر موسیٰ علیہ السلام نے یہ احسان کیا تھا کہ فرعون کی غلامی سے اُن کو آزاد کرادیا اور طرفہ یہ کہ تفسیر ابن جریر میں لکھا ہے کہ وہ لوگ چھ لاکھ مقاتل یعنی سپاہی تھے۔ اب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا حال سنیئے کہ ہنوز کسی قسم کی دنیوی ترقی انہوں نے نہیں دیکھی اور بے سامانی کی یہ حالت کہ جنگ بدر میں صرف تین سو تیرہ شخص تھے جن میں صرف دو تین گھوڑے اور ستر اونٹ اور کل لشکر میں آٹھ تلواریں اور چھ زرہ تھے اور مقابلہ ایک ایسے شجیع، نبرد آزما قبیلۂ قریش کا تھا جس کی دھاک ملک عرب پر بیٹھی ہوئی تھی، ایک ہزار لشکر جرار زرہ پوش مسلح لیکر معرکۂ جنگ میں آن پہونچے تھے، ایسی حالت میں حضرت نے صرف اُن سے رائے لی انہوں نے مرضی مبارک پا کر بالاتفاق کہدیا کہ حضرت ہمیں آپ بنی

اسرائیل تصور نہ فرماویں جنھوں نے ''اذھب انت و ربک'' کہا تھا، ہم ہر طرح سے رفاقت پر آمادہ اور جانبازی کے لئے مستعد ہیں، چنانچہ اس سچی عقیدت اور جاں نثاری کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف اُن کافروں کو ہزیمت ہوئی بلکہ تمامی ملک عرب پر مسلمانوں کا رعب چھا گیا۔ پھر یہ جانبازیاں حضرت ہی کے زمانہ تک محدود نہیں تھیں بلکہ خلفاء کے زمانہ میں بھی دین کے لئے وہ جانفشانیاں کیں کہ جن کی نظیر ملنی دشوار ہے۔

اب عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے کہ اُنہی میں وہ شخص بھی تھا جس نے آپ کو گرفتار کرا دیا، جیسا کہ انجیل متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا میں ہے کہ ''یہوداہ عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب میں تھا وہ سپاہیوں اور سرداروں کو لیکر وہاں آیا جہاں عیسیٰ علیہ السلام تشریف رکھتے تھے اور اُن سے کہہ رکھا تھا کہ میں جسے چوموں وہی عیسیٰ ہے تم اُسے گرفتار کرلو اور عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر کہا اے ربی سلام اور یہ کہہ کر چوم لیا، یہ دیکھتے ہی سپاہیوں نے فوراً آپ کو گرفتار کرلیا۔ لیجئے یہوداہ جو اعلیٰ درجہ کے مقرب صحابی تھے اور نہایت خوش اعتقادی سے ربی کا اعتراف بھی کر رہے ہیں اور سلام بلکہ قدم بوسی بھی ہو رہی ہے اُن کی حالت یہ تھی۔ برخلاف اس کے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس رات مکہ معظّمہ سے ہجرت فرمائی کفار مکہ نے حضرت کے قتل کا مصمم ارادہ کرلیا تھا، ایسی پرخطر حالت میں آپ نے علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ تم میری جگہ سو رہو اور آپ روانہ ہوگئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اُس وقت یہ بھی خیال نہ کیا کہ قاتلوں کے محاصرہ میں رات کیسی گزرے گی اور بے فکری سے حضرت کے بستر مبارک پر آرام کیا اور اس قسم کے صدہا واقعات کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہیں۔

اُمتوں کا موازنہ اور مقابلہ

موسیٰ علیہ السلام کی اُمت بارہا مرتد ہوتی گئی، چنانچہ ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ

موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ساٹھ سال ہی کے اندر کل بنی اسرائیل مرتد ہو کر علانیہ بُت پرستی کرنے لگے اور آٹھ سال تک بت پرستی جاری رہی پھر عسال کے زمانہ میں چالیس سال تک ایمان پر رہے، اُس کے بعد پھر مرتد ہو کر اٹھارہ سال بت پرستی کرتے رہے، غرضکہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ تک پوری قوم سات بار مُرتد ہوئی، اسی طرح ہر زمانہ میں کسی بادشاہ کے دباؤ سے ایمان لاتی پھر مرتد بھی ہو جاتی جس کی تفصیل ابن حزم نے لکھی ہے اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر کوئی زمانہ ایسا آیا تھا، بلکہ بفضلہٖ تعالیٰ ہر زمانہ میں اُمت کی زیادتی اور ترقی ہی ہوتی رہی۔

اب عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور اُمت کا بھی حال سن لیجئے۔ آپ کے رفع کے وقت کل آپ کے اصحاب ایک سو بیس تھے، جیسا کہ ابن حزم وغیرہ نے لکھا ہے، مگر اُن کی سعی سے چند روز میں سات سو کی تعداد ہو گئی تھی۔ لیکن بولس جو یہودیوں کا بادشاہ تھا اُس نے اُن کو گمراہ کرنے کی غرض سے ترک دنیا کر کے اُن میں جا ملا اور اُن کا معتمد علیہ بن کر اپنے الہاموں کے ذریعہ سے اُن کو اُن کے قبیلہ سے منحرف کیا اور تمام حرام چیزوں کو حلال کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کے اعتقاد میں خدا بنا دیا اور سوائے ایک شخص کے جو اپنے چند رفقاء کے ساتھ علیحدہ ہو گیا' سب نے اُس کی پیروی کر کے آسمانی خالص دین کو خیر باد کہہ دیا۔ یہ واقعہ ہم نے افادۃ الافہام میں بالتفصیل لکھا ہے۔ الجواب الفسیح میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سے چار ہی سال میں یہاں تک نوبت پہونچ گئی۔

اب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا حال سنیئے کہ وفات شریف کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ تھے، جیسا کہ امام نوویؒ نے لکھا ہے اور روز افزوں ترقیوں سے خالص دین کو ان حضرات نے شرق سے غرب تک پہونچا دیا۔ مسیلمہ کذاب نے شرکت فی النبوۃ کا دعویٰ کر کے تدابیر سے کس قدر ترقی کی مگر چند ہی روز میں وہ مع اعوان و رفقاء ایسا نیست و نابود کر

دیا گیا کہ اُس کا نام لیوا کوئی نہ رہا۔شرک کا تو کیا دخل صحابہ کو بدعت سے اس قدر احتراز تھا کہ گو بدعت حسنہ اور عمدہ ایجاد کی اجازت حضرت نے دی تھی مگر اس خیال سے کہ آخر وہ بھی بدعت ہے‘ ضروری امور میں بھی ذرا غور و تامل سے کام لیا جاتا تھا، چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کرنے کی جب درخواست کی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دیر تک یہی فرماتے رہے کہ یہ کام حضرت کے زمانہ میں نہیں ہوا تو اب کیونکر کیا جائے۔غور کرنے کا مقام ہے کہ جب بدعت حسنہ میں یہ احتیاط ہو تو بدعت سیئہ سے انہیں کس قدر احتراز ہوگا۔

کتبِ سماویہ کی حفاظت کا حال

کتاب آسمانی کی حفاظت نہ یہود کر سکے نہ نصاریٰ کیونکہ یہود ابتداء سے بت پرستی پر فریفتہ اور شیدا تھے، چنانچہ خود موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ ہمیں بھی ایک بُت بنا دیجئے’’ **کما قال تعالیٰ و قالوا یا موسی اجعل لنا الھاً کما لھم الھة** ‘‘اور خود ہارون علیہ السلام کے روبرو بالاعلان گوسالہ پرستی کی، جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے جب انبیاء کے زمانہ میں اُن کا یہ حال تھا تو بعد کی کیا حالت ہوگی؟ اسی وجہ سے جب موقع پاتے سب کے سب مرتد ہو کر بُت پرستی کرنے لگتے۔اب بتایئے ایسی طبیعت والوں سے اُس مقدس آسمانی کتاب کی حفاظت کیوں کر ہو سکے جو بُت پرستی کی دشمن ہو۔آخر یہ ہوا کہ ایک نسخہ‘ توارت کا جو کاہن ہارونی کے پاس تھا اُس کو بھی لیکر جلا دیا جیسا کہ ابن حزم نے لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ توراۃ کے کل ایک سودس ورق تھے، اُس کی بھی حفاظت اُن سے نہ ہو سکی۔

اور انجیل کی نسبت لکھا ہے کہ خود نصاریٰ معترف ہیں کہ یہ چار انجیلیں جو متی، مرقس، لوقا، یوحنا کی مشہور ہیں یہ انہیں لوگوں کی تصنیفیں ہیں جن میں تاریخی حالات جمع کئے ہیں۔چونکہ انہی اناجیل اربعہ پر اُن کے دین کا مدار ہے اِس سے ظاہر ہے کہ انجیل آسمانی کو انہوں نے

کھو دیا۔ اب قرآن شریف کی حفاظت کا حال دیکھئے کہ اس چودھویں صدی میں بھی اُس کا زیر وزبر تک کوئی غلط نہیں پڑھ سکتا۔

فضائلِ صحابہ وامت

غرضکہ ان امور کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین موسوی اور عیسوی وغیرہ چونکہ منسوخ ہونے والے تھے اس لئے غیب سے سامان ہی ایسا ہوا کہ اقسام کی خرابیاں اور بدنمائیاں اُن میں پیدا ہوگئیں۔ یہاں تک تو ہوا کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو، جس کی وجہ سے ایک ناسخ' دین کی ضرورت ہوئی جو خالص توحید ثابت کرے اور چونکہ یہ ناسخ' دین محمدی قیامت تک رہنے والا تھا، اس لئے اس میں قدرتی اہتمام اور انتظام کی ضرورت تھی، اسی وجہ سے ایسے لوگ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب بنائے گئے جو تمام عالم میں منتخب اور برگزیدہ تھے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے ''**قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله اختار اصحابى على جميع العالمين** ''اور فرماتے ہیں ''**ان الله اختارنى و اختار اصحابى كذا فى كنز العمال** ''اور اُمت بھی ایسی بنائی گئی کہ بہ نسبت دوسری اُمتوں کے اس اُمت مرحومہ کا یقین بڑھا ہوا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔''**قال النبى صلى الله عليه وسلم مااعطيت امة من اليقين افضل مما اعطيت امتى رواه ابو نعيم فى الحليه كذا فى كنوز الحقائق** ''اُن کے بعد ہر زمانہ میں ایسے متدین علماء پیدا کئے کہ انبیاء کی طرح انہوں نے دین کی حفاظت کی ''**كما قال النبى صلى الله عليه وسلم علماء امتى كانبياء بنى اسرائيل**''۔

ضرورتِ اعتبارِ حدیث

غرض اہل انصاف کوضرور ماننا پڑے گا کہ محدثین رضی اللہ تعالی عنہم و شکر سعیھم نے اپنی جان پر کھیل کراس دین کی حفاظت کی اور خالص دین کوایسا محفوظ کردیا کہ قیامت تک اُس میں باطل کی آمیزش نہ ہوسکی، یہی وجہ ہے کہ باطل فرقوں کے لوگ محدّثین اورفن حدیث کے دشمن ہیں اور چاہتے ہیں کہ اقسام کے احتمال پیدا کر کے مسلمانوں کی نظروں میں حدیث کو بے وقعت کردیں۔مگر یادرہے کہ یہ بات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف مرضی ہے،جیسا کہ اِس حدیث شریف سے ثابت ہے''عن ابی رافع قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ألفیّن احدکم متکیا علی اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت او نھیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ رواہ احمد و ابوداود والترمذی و ابن ماجہ والبیھقی کذا فی المشکوۃ ''یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم امتیوں سے کسی کو میں ایسی حالت پر نہ پاؤں کہ اُس کوحدیث پہونچے جس میں میں نے کسی کام کے کرنے کا حکم کیا ہے یاکسی چیز سے منع کیا ہےاوروہ کوچ پر ٹیکا لگائے ہوئے کہے کہ یہ کچھ میں نہیں جانتا، جو کچھ قرآن میں ہم پاتے ہیں اُس کی اتباع کرتے ہیں۔اورایک روایت یہ ہے''عن المقداد ابن معدیکرب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم لھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ و ما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ و حرم رسول اللہ کما حرم اللہ الحدیث رواہ' ابو داؤد والدارمی و ابن ماجہ کذا فی المشکوۃ'' یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے

اللہ نے قرآن دیا اور اُسی کے برابر اُس کے ساتھ دیا۔ آ گاہ رہو کہ قریب ہے کہ ایک شخص پیٹ بھرا ہوا کوچ پر ٹیکا لگائے ہوئے کہے گا کہ اس قرآن کو تم لازم پکڑو، جو چیز اُس میں حلال ہے اُس کو حلال سمجھو اور جو چیز حرام ہے اُس کو حرام سمجھو، حالانکہ جو اللہ کے رسول نے حرام کیا وہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا انتہی۔ اور ایک روایت یہ ہے "**عن العرباض بن سارية قال قام رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ايحسب احدكم متكئا على اريكته يظن ان الله لم يحرم شيئاً الا ما فى القرآن الا انى والله امرت و وعظت و نهيت عن اشياء انها كمثل القرآن او اكثر رواه ابوداود كذا فى المشكوة**" یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بعضے لوگ اپنی کوچ پر تکیہ لگائے ہوئے گمان کرتے ہیں کہ اللہ نے صرف انہی چیزوں کو حرام کیا جو قرآن میں ہیں آ گاہ رہو خدا کی قسم میں نے حکم بھی کیا ہے، نصیحتیں بھی کی ہیں، اور بہت سی چیزوں سے منع بھی کیا ہے یہ امور قرآن کے برابر یا اُس سے بھی زیادہ ہیں انتہی۔
غرضکہ متعدد حدیثوں سے یہ پیشن گوئی ثابت ہے کہ بعض مرفہ الحال کوچوں پر بیٹھے ہوئے یہ کہیں گے کہ حدیث کو ماننے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، صرف قرآن ہمیں کافی ہے چنانچہ اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اب مسلمانوں کو چاہئے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے قول کو رد کر دیا اسی طرح وہ بھی رد کر دیں اور یہ خیال کر لیا کریں کہ مرفہ الحال لوگ اس قسم کی باتیں کریں تو اُن کو زیبا اور سزاوار ہے، اس لئے کہ آخر سعادت کا ایک حصہ اُن کو دنیا میں مل چکا ہے اگر غرباء بھی اُن کی سی کہنے لگیں تو "**خسر الدنيا والاخرة**" کا مضمون اُن پر صادق آ جائے گا۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشن گوئی کی کہ بعض لوگ کوچوں پر بیٹھے ہوئے کہیں گے کہ ہم حدیث کو نہیں جانتے قرآن ہمارے لئے کافی ہے، اور فرمایا کہ قرآن سے زیادہ اوامرو

نواہی وغیرہ مجھے دیئے گئے ہیں جس سے مقصود حضرت کا ظاہر ہے' جس طرح قرآن مانا جاتا ہے احادیث کے ماننے کی بھی ضرورت ہے، اس سے یہ پیشن گوئی بھی ثابت ہوگئی کہ قیامت تک مسلمانوں کو صحیح حدیثیں پہونچتی رہیں گی، جن کے ماننے کی اُن کو ضرورت ہے۔ خدائے تعالیٰ نے یہ پیشن گوئیاں پوری کیں، کہ ایسے محدثین پیدا کئے جنہوں نے جان دے دے کر صحیح حدیثوں کو محفوظ کردیا، جو قیامت تک انشاءاللہ تعالیٰ محفوظ رہیں گی، کیونکہ آخری زمانہ میں جب علوم دینیہ کی حفاظت میں مسلمانوں کی ہمتیں قاصر ہوئیں تو ایک ایسی تدبیر بتلادی کہ ایک ایک کتاب کے ہزاروں نسخے بلا زحمت، اسلامی دنیا میں ہر وقت موجود رہ سکتے ہیں، چنانچہ لاکھوں نسخے کتب حدیث کے، اس وقت مسلمانوں کے پاس موجود ہیں اور وقتاً فوقتاً اُن کی کثرت ہوتی جاتی ہے ۔ یہ ثمرہ اور نتیجہ محدثین کی جانفشانیوں کا ہے جنہوں نے صحیح حدیثوں کو کتابوں میں محفوظ کردیا ہے۔

غرضکہ اپنے دین کی حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے ایک اولوالعزم قوم کو پیدا کیا، جن کی سعی اور جانفشانی کا پورا حال لکھنا امکان سے خارج ہے، اُن کو حق تعالیٰ نے حدیثوں کے یاد رکھنے کے لئے حافظے ایسے قوی دیئے تھے کہ اُن کے خیال کرنے سے عقل حیران ہوتی ہے۔

امتیازِ فقہاء از محدثین

الحاصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محدثین کو جو فرمایا تھا کہ احادیث یاد رکھ کر فقہاء کو پہونچائیں' سو اِن حضرات نے اُس کی پوری پوری تعمیل کی اور فقہاء نے اُس ارشاد مبارک کی یہ تعمیل کی کہ مقصودِ شارع معلوم کرنے میں جو دقتیں واقع ہوئی تھیں جن کا حال اوپر مذکور ہوا' اپنی کوشش اور اجتہاد سے اُن کو رفع کر کے ہر مسئلہ میں تمام آیات واحادیث متعلقہ سے جو مقصود شارع ثابت ہوتا ہے' اُس کو بیان کردیا، اس کا ثبوت اس طرح ہوسکتا

ہے کہ ہر زمانہ میں محدثین بکثرت موجود رہتے تھے مگر جن سے فتویٰ لیا جاتا تھا یعنی فقہاءؔ تعداد میں بہت کم ہوتے تھے کیونکہ اُن سے دوکام متعلق تھے ایک قرآن واحادیث کا ذخیرہ ہر مسئلہ میں فراہم کرنا، دوسرا اُس میں غور واجتہاد کر کے مسلمانوں کو ایسی بات بتلانا جو قابل عمل اور شارع کی مرضی کے مطابق ہو اور ظاہر ہے کہ ہر محدث میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسا کہ حدیث شریف ''**فرب حامل فقه غير فقيه**'' سے ظاہر ہے۔

قرونِ ثلثہ کے فقہاء اور اہلِ فتوی

اسی وجہ سے سب صحابہ فتویٰ نہیں دیتے تھے بلکہ چند حضرات اس کام کے لئے مخصوص تھے جیسا کہ امام ذہبی نے تذکرہ الحفاظ میں لکھا ہے

''عن مسروق قال كان اصحاب الفتوىٰ من الصحابة عمر و على و عبدالله و زيد و اُبى و ابو موسىٰ .و عن سليمان ابن يسار قال ما كان عمر و عثمان يقدمان على زيد احدا فى الفتوىٰ و الفرائض والقراء ة ''

ابن جوزیؒ نے تلقیح میں لکھا ہے کہ حاکم نے عباس دوری کا قول نقل کیا ہے کہ کل صحابہ کا علم ان چھ صحابہ کو پہونچا' عمر، علی، ابن مسعود، ابی ابن کعب، معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور یہی طبقہ فقہاء صحابہ کا ہے اور امام ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار خطبہ میں فرمایا کہ جس کو فقہ کی کوئی بات پوچھنی ہو معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھے۔ دیکھئے صحابہ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ فتویٰ دینا ہر محدث کا کام نہیں بلکہ اُس کے لئے منتخب افراد درکار ہیں، اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما نے یہ بات بتلا دی کہ فتویٰ کے لئے ایک ماہر شخص کی ضرورت ہے اور ایسا شخص موجود ہو تو وہ کام دوسرے سے متعلق نہ کیا جائے۔ اور ابوداؤد میں یہ روایت ہے'' **عـــن**

ابـن مسعودؓ قال لا رضاع الا ما شد العظم و انبت اللحم قال ابو موسیٰ لا تسالونا و هذا الحبر فیکم ''یعنی جب ابن مسعودؓ نے مسئلہ رضاعت میں فتویٰ دیا کہ رضاعت اُن ہی ایام میں معتبر ہے کہ اس سے ہڈی مضبوط ہو اور گوشت پیدا ہو یعنی ایامِ شیر خوارگی اور طفولیّت میں اُس پر ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ جب تک یہ عالم یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ تم میں موجود ہیں ہم سے کوئی مسئلہ نہ پوچھو۔ تذکرۃ الحفاظ میں شعبیؒ کے حال میں اُن کا قول نقل کیا ہے ''**ما کنت اعرف فقهاء الکوفة الا اصحاب عبدالله** ''یعنی شعبی کہتے ہیں کہ کوفہ کے فقہاء میں صرف عبداللہ بن مسعود کے اصحاب کو میں پہچانتا ہوں۔ قیس نے اُن سے پوچھا کیا علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب کو آپ نہیں جانتے ؟ کہا: نہیں، کہا: حارث اعور کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں ! اُن سے میں نے فرائض کا علم سیکھا تھا مگر اُس سے مجھے وسواس کا خوف تھا، معلوم نہیں انہوں نے کس سے سیکھا تھا۔ کہا: ابن صبوہ کو آپ پہنچانتے ہو؟ کہا ہاں لیکن وہ فقیہ نہ تھے۔ پوچھا صعصعہ کو آپ پہچانتے ہو؟ کہا وہ خطیب تھے فقیہ نہ تھے انتہی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اکابر دین ہر محدث کو فقیہ نہیں سمجھتے تھے۔

تذکرۃ الحفاظ میں مسروق کوفیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ شعبیؒ کا قول ہے کہ مسروق، شریح سے زیادہ فتویٰ دینا جانتے تھے۔ **توالی التأسیس بمعالی ابن ادریس** میں شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ فضل فرا کہتے ہیں کہ ایک بار میں امام احمد ابن حنبل کے ہمراہ حج کو گیا اور اُنہیں کے ساتھ مکہ معظّمہ میں ایک مکان میں فروکش ہوا ، صبح ہوتے ہی وہ فِرودگاہ(ا) سے نکلے اور تھوڑی دیر کے بعد میں بھی نکلا اور اِس خیال سے کہ اُن کی رفاقت میں رہوں، اُن کو مسجد میں ڈھونڈا مگر نہ ابن عیینہ کے حلقہ میں ملے نہ اور کسی محدث کے حلقہ میں، بہت تلاش کے بعد دیکھا کہ ایک اعرابی کے ساتھ بیٹھے ہیں، میں نے کہا: حضرت

(ا) اترنے کی جگہ۔

ابن عیینہ کو چھوڑ کر آپ کہاں بیٹھے ہو؟ فرمایا خاموش! اگر تمہیں حدیث سند عالی کے ساتھ نہ ملے گی تو سند نازل کے ساتھ مل جائیگی، مگر اُن کی عقل کو تم فوت کرو گے تو پھر نہ پاؤ گے۔ افقہ فی کتاب اللہ یعنی ان سے زیادہ قرآن سمجھنے والا میں نے نہیں دیکھا میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا: محمدؐ ابن ادریس شافعیؒ۔ اور اُسی میں لکھا ہے کہ جب امام شافعیؒ بغداد میں آئے تو امام احمد ابن حنبلؒ نے اُن کی ملازمت اختیار کی یہاں تک کہ اگر وہ سوار ہو کر کہیں جاتے تو اُن کی سواری کے ساتھ ہو لیتے اور محدثین کے حلقہ کو جس میں یحیٰی بن معین وغیرہ ہمیشہ جاتے تھے' چھوڑ دیا' اس پر یحیٰی بن معین نے عتاب آمیز کلمات اُن کو کہلائے، امام احمد نے جواب میں کہلایا کہ تم بھی اگر اُس سواری کی دوسری جانب رہو گے تو اُس حلقہ سے زیادہ نافع ہے، اور کہا کہ اگر فقہ چاہتے ہو تو شافعی کی بغلہ کی دُم تھامے رہو انتہی۔

دیکھئے اکابر محدثین کے نزدیک فقہ کی یہ قدر و منزلت اور یہ وقعت تھی کہ اکابر محدثین کی صحبت اور سند عالی پر فقہاء کی صحبت کو ترجیح دیتے تھے۔ اور ہر محدث کو فقیہ نہیں کہتے تھے بلکہ خاص خاص محدثین پر فقیہ کا اطلاق کیا جاتا تھا، جیسے مسروق، جابر بن زید، حسن بصری، شعبی، عمرو بن دینار، علی ابن مسہر' حماد' امام مالک، سفیان ثوری' عبداللہ ابن مبارک وغیرھم رحمہم اللہ جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ وغیرہ سے ظاہر ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں فقیہ عراق علقمہؒ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ابن مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ قابوس ابن ابی طبیان کہتے ہیں: کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ صحابہ کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس کیوں جاتے ہو؟ کہا: میں نے بہت سے صحابہ کو دیکھا ہے کہ اُن کے پاس جاتے اور اُن سے فتوی پوچھتے تھے انتہی۔ دیکھئے صحابہ باوجود اُس جلالت شان کے' جو لازمۂ صحابیت ہے' علقمہؒ سے فتویٰ پوچھتے تھے حالانکہ وہ تابعی ہیں، وجہ اُس کی یہی تھی کہ وہ فقیہ تھے۔ تذکرۃ الحفاظ میں عبدالرحمٰن ابن غنم کے حال میں

لکھا ہے کہ وہ فقیہ شام ہیں، عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو اس غرض سے شام بھیجا تھا کہ لوگوں کو فقہ سکھائیں چنانچہ تابعین شام نے اُن سے فقہ سیکھی انتہی ۔ دیکھئے عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فقہ کا یہ اہتمام تھا۔

تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ طلحہ بن عبداللہ المدنی اور خارجہ ابن زید اپنے زمانہ میں مفتی تھے، لوگ انہیں کے قول پر عمل کرتے تھے۔ اور ایاس ابن معاویہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر تم فتویٰ چاہتے ہو تو حسن بصری کے پاس جاؤ۔ اور ابوبکر ابن عیاش کا قول نقل کیا ہے کہ اصحاب فتویٰ تین شخص تھے؛ خبیب بن ابی ثابت، حکم اور حماد۔

م خ۔ یحییٰ ابن یمین کہتے ہیں کہ فقہاء چار ہیں ؛ ابوحنیفہ، سفیان، مالک اور اوزاعی رحمهم اللہ۔ اس قسم کی اور روایتیں بکثرت ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ قرون ثلثہ میں یعنی زمانہ صحابہ سے ائمہ مجتہدین کے وقت تک فقہاء خاص خاص حضرات ہوتے تھے اور کمال وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور زمرۂ محدثین میں وہ اعلیٰ درجہ کے محدث سمجھے جاتے تھے۔ اُس زمانہ میں محدث اور فقیہ میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت نہ تھی، جیسا کہ فی زماننا خیال کیا جاتا ہے بلکہ عموم وخصوص مطلق کی نسبت تھی یعنی ہر محدث فقیہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایسے محدث کو فقیہ سمجھتے تھے جس میں اعلیٰ درجہ کی سمجھ اور قوت اجتہادی ہو۔

خ۔ کسی نے اعمشؒ سے کوئی مسئلہ پوچھا انہوں نے فرمایا: اس کا جواب ابوحنیفہؒ خوب جانتے ہیں، میرا ظن غالب ہے کہ اُن کے علم میں برکت دی گئی۔

احتیاجِ محدثین بطرفِ فقہاء

اس سے ظاہر ہے کہ اکابر محدثین خود فتویٰ نہیں دیتے تھے، بلکہ فقہاء کو اس کام کے اہل سمجھتے تھے۔ یہاں یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح فقہاء کو محدثین کی

طرف سے اِس بات میں احتیاج ہے کہ احادیث اُن کے ذریعہ سے حاصل کریں، اسی طرح محدثین کو فقہاء کی طرف سے معانی حدیث معلوم کرنے میں احتیاج تھی، کیونکہ محدثین کو تحصیل احادیث اور تحقیق رجال میں اتنی فرصت نہیں تھی کہ تحقیق معنی بھی کرتے۔ یہ کام انہوں نے فقہاء کے ذمہ کر دیا تھا جیسا کہ جامع ترمذی سے معلوم ہوتا ہے۔ ''**قال الفقهاء وهم اعلم بمعانی الحديث**'' اور حافظ مزیؒ نے تہذیب الکمال میں لکھا ہے کہ ''**قال البخاری سمعت علی ابن المدينی يقول التفقه فی معانی الحديث نصف العلم و معرفة الرجال نصف العلم**'' یعنی امام بخاری، علی ابن المدینی کا قول نقل کرتے ہیں کہ فہم معنیٔ حدیث، نصف علم ہے اور معرفت رجال، نصف علم ہے اور ابھی معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن غنم کو صرف فقہ سکھانے کے لئے شام کو بھیجا تھا ''**توالی التاسيس**'' میں لکھا ہے کہ ایک بار کسی نے کوئی مسئلہ امام احمدؒ سے پوچھا، آپ نے فرمایا: فقہاء سے پوچھو، ابوثور سے پوچھو! یعنی ابراہیم ابن خالد ابن یمان کلبی سے جو مشہور فقیہ تھے، اس سے ظاہر ہے کہ محدثین کے نزدیک مسلّم ہے کہ مسائل فقہاء ہی سے پوچھے جائیں۔ ''**مختصر كتاب النصيحة**' مولفہ خطیب بغدادیؒ میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص صرف حدیثوں ہی کو جمع کرتا ہے، اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی رات کو لکڑیاں جمع کرتا ہے، کبھی ایسا بھی اتفاق ہوگا کہ سانپ کو لکڑی سمجھ کر اٹھا لیگا، اور وہ اُس کو ضرر پہونچائے گا، اور اُس میں ابوالعباس ابن عقدہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ احادیث کی روایت کم کرو، وہ انہی کے لئے سزاوار ہے جو احادیث کے تاویلات کو جانتے ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ تاویلات کو جاننے والے فقہاء ہیں محدثین کا وظیفہ صرف نقل متن حدیث ہے۔

اور اُس میں اعمشؒ کا قول نقل کیا ہے کہ بہت ساری حدیثیں یاد کر لینے سے آدمی فقیہ

نہیں ہوتا۔ فقیہ وہی ہوتا ہے جو معانی میں غور وفکر اور استنباط کرے۔ اور اُس میں نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ نے اپنے بھانجے ابوبکر اور اسماعیل سے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں حدیث کا بہت شوق ہے اور اُس کو طلب کرتے ہو کہا: ہاں، فرمایا: اگر تم دوست رکھتے ہو کہ خدائے تعالیٰ اُس کا نفع تمہیں دے تو حدیث کی روایت کم کرو اور فقہ حاصل کرو، اور اعمشؒ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں حدیث سُن چکا یعنی تحصیل حدیث سے فارغ ہوا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ اب فتویٰ دینے کے لئے مسجد میں بیٹھ جانا چاہئے، چنانچہ مسجد کے ایک ستون کے پاس بیٹھ گیا، مگر پہلا ہی سوال جو پیش ہوا مجھے اُس کا جواب نہ ہو سکا انتہی۔

اِس قول سے آپ کا کمال تدین ثابت ہے، ورنہ ممکن تھا کہ کچھ نہ کچھ دل سے جواب دے دیتے۔ مقصود یہ کہ صرف حدیث شریف سے کام نہیں چل سکتا، فقہ کی ضرورت ہے اور اُس میں نقل کیا ہے کہ ایک جگہ محدثین کا مجمع تھا' جس میں یحییٰ ابن معین اور ابوخیثمہ اور خلف ابن سالم وغیرھم موجود تھے اور ہر طرف سے تحقیقات پیش ہو رہے تھے کہ فلاں حدیث کا فلاں راوی ہے اور فلاں حدیث صرف ایک ہی راوی سے مروی ہے' کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور اُس نے پوچھا کہ ایک غسالہ حائضہ ہے، وہ میت کو غسل دے سکتی ہے یا نہیں؟ کسی نے اُس کا جواب نہ دیا اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اسی حیرانی میں تھے کہ ابوثور (جو فقیہ تھے) اتفاقاً آ گئے، اُن کو دیکھتے ہی سب نے اُس سے کہا کہ اُن سے پوچھ، انہوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ ہاں غسل دے سکتی ہے اور عائشہؓ کی وہ حدیث پڑھی۔ ''ان حیضتک لیست فی یدک'' اور یہ حدیث ''کنت افرق راس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و انا حائض '' یہ سنتے ہی سب نے کہا: ہاں بہت ٹھیک، یہ حدیث فلاں فلاں راویوں سے ہمیں پہونچی ہے اور اُس کے اتنے طریق ہیں اور یہ حدیث معروف ہے، اُس عورت نے کہا: حضرات اب تک آپ کہاں تھے۔

غرضکہ حدیثوں کا یاد رکھنا اور ہے، اور اُن سے مسائل کا استخراج اور ہے۔ اس کام کے لئے فقہاء موضوع ہیں، اور خود محدثین اُن کی طرف محتاج ہیں۔ اور طبقات الحفاظ وغیرہ کتب رجال سے ظاہر ہے کہ بعض بعض محدثین خاص طور پر فقہ سیکھتے تھے۔

احتیاجِ محدثین بطرفِ امام صاحب

م ص۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ اگر ابوحنیفہؒ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو تابعین بھی اُن کی طرف محتاج ہوتے۔

م ص۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ علماء، ابوحنیفہؒ سے مستغنی نہیں ہو سکتے، کچھ نہیں تو تفسیرِ حدیث میں تو ضرور محتاج ہیں، اور لکھا ہے کہ ابن مبارکؒ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ آثار واحادیث کو ضروری سمجھو، مگر اُن کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے، کیونکہ وہ احادیث کے معنی جانتے ہیں۔

م ص ک۔ عبداللہ بن ابی لبید کہتے ہیں کہ ایک روز یزید ابن ہارون کی مجلس میں ہم بیٹھے تھے، مغیرہؒ نے ابراہیم کا قول بیان کرنا چاہا، ایک شخص نے کہا! حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اقوال بیان کیجئے، یزید ابن ہارون نے کہا کہ اے احمق! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اقوال کی تفسیر ہے، اگر تجھے معنی معلوم نہ ہوں تو حدیث کو لیکر کیا کرے گا، تم لوگوں کی ہمت صرف احادیث کے سن لینے کی طرف متوجہ ہے، اگر علم کی طرف تمہاری ہمت مبذول ہوتی تو ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے، اور اُن کے اقوال کو دیکھتے پھر اُس معترض کو مجلس سے اٹھا دیا۔

"خلاصۃ التہذیب" میں یزید بن ہارون کا حال لکھا ہے کہ وہ امام احمد وغیرہ اکابر محدثین کے استاد ہیں، اور اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ دیکھئے یزید بن ہارون جیسے جلیل

القدر محدث کس تصریح سے فقہ کی طرف احتیاج، محدثین کی ثابت کر رہے ہیں۔

امام موفق ابن احمدؒ نے مناقب امام ابی حنیفہؒ میں ثابت زاہد کا قول نقل کیا ہے کہ جب سفیان ثوریؒ سے کوئی دقیق مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے کہ اس مسئلہ میں سوائے اُس شخص کے جس پر ہم حسد کرتے ہیں (ابوحنیفہؒ) کوئی شخص عمدہ تقریر نہیں کرسکتا۔ پھر امام صاحب کے شاگردوں سے پوچھتے کہ اس مسئلہ میں تمہارے استاد کا کیا قول ہے، اور وہ جو جواب دیتے اُسی کے موافق فتویٰ دیتے۔

سفیان ثوریؒ وہ شخص ہیں کہ امیر المومنین فی الحدیث سمجھے جاتے تھے، اور عبداللہ ابن مبارکؒ اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ میرے علم میں فن حدیث میں روئے زمین پر کوئی اُن سے زیادہ نہیں۔ ''**ذکرہ الامام الذھبی فی تذکرۃ الحفاظ**''۔

جب سفیان ثوری جیسے شخص فتویٰ دینے میں امام صاحب کے قول کی طرف محتاج ہوں، تو ظاہر ہے کہ محدثین کو فقہ کی طرف کس قدر احتیاج ہے۔

ک۔ ایک روز ایک حدیث پیش ہوئی جس کا مضمون غامض تھا، وکیعؒ کھڑے ہو گئے اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: اب ندامت سے کیا فائدہ؟ وہ شخص یعنی (ابوحنیفہؒ) کہاں ہیں جن سے یہ اشکال حل ہوتا اور وہ محدثین سے کہا کرتے تھے اے قوم! تم حدیثیں طلب کرتے ہو اور اُن کے معنی نہیں طلب کرتے' اس میں تمہاری عمر اور دین ضائع ہو جائیگا' مجھے آرزو آتی ہے کہ کاش! ابوحنیفہ کی فقہ کا عُشر مجھ میں ہوتا۔ ایک روز انہوں نے حضار مجلس سے کہا: کہ اے لوگو! حدیث سننا بغیر فقہ کے تم کو کچھ نفع نہ دے گا اور تم میں سمجھ پیدا نہ ہوگی، جب تک اصحاب ابوحنیفہ کے ساتھ نہ بیٹھو اور وہ اُن کے اقوال کی تفسیر نہ بیان کریں۔

''خلاصۃ التہذیب'' میں وکیعؒ کا حال لکھا ہے کہ وہ امام احمد وغیرہ اکابر محدثین کے استاد ہیں، اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

دیکھئے وکیعؒ کے قول سے کس قدر احتیاج فقہ کی طرف ثابت ہوتی ہے۔

م ت ص ۔عبداللہ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے مسعرؒ کو ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں دیکھا ہے کہ روبرو بیٹھے ہوئے اُن سے سوال اور استفسار کر رہے ہیں۔ مسعر ابن کدام کا حال ''خلاصہ تذھیب'' میں لکھا ہے کہ شعبہ اور سفیان ثوری وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

باوجود تبحر کے مسعرؒ کا امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھنا اور استفسار کرنا کیسی کھلی دلیل احتیاج پر ہے۔

م۔داؤد طائی کہتے ہیں خدا کی قسم ابوحنیفہ حلال وحرام ونجات اُخروی کے مسائل سب سے زیادہ جانتے ہیں، باوجود اُس کے وہ متورع اور عابد ہیں۔

م۔علی بن عاصم کا قول ہے کہ ابوحنیفہ کے اقوال علم کی تفسیر ہیں اگر کوئی اُن کے اقوال کو نہ دیکھے تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے گا۔

خلاصہ میں علی ابن عاصم کا قول لکھا ہے کہ وہ امام احمد ابن حنبل وغیرہ اکابر محدثین کے استاد ہیں، اُن کی مجلس میں تیس ہزار سے زیادہ لوگ جمع ہوتے تھے، حلال وحرام کا سمجھنا جب فقہ پر موقوف ہے تو اس سے بڑھ کر کیا احتیاج ہوگی۔

م۔یزید ابن ہارونؒ کا قول ہے کہ ابوحنیفہ کی کتابوں کے مطالعہ سے آدمی مستغنی نہیں ہوسکتا۔

''خلاصہ''میں یزید ابن ہارون کا حال لکھا ہے کہ وہ امام احمد واسحاق وغیرہ اکابر محدثین کے استاد ہیں، ستر ہزار تک شائقین حدیث اُن کی مجلس میں جمع ہوتے تھے اور کل صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں، دیکھئے مستغنی نہ ہونا عین احتیاج ہے۔

م ص ک۔عفان بن سیار کہتے ہیں کہ مثال ابوحنیفہ کی، طبیب حاذق کی سی ہے جو ہر بیماری کی دوا جانتا ہے۔خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں نسائی میں موجود ہیں۔ ہر شخص

سمجھ سکتا ہے کہ بیمار کو طبیب حاذق کی طرف احتیاج کس درجہ کی ہوتی ہے۔

م ص ک۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اگر میں سفہاء کی بات سنتا تو ابوحنیفہ کی ملاقات فوت ہو جاتی۔ جس سے میری مشقت اور خرچ جو تحصیل علم میں ہوا تھا سب ضائع ہو جاتا، اگر میں اُن سے ملاقات نہ کرتا اور اُن کی صحبت نصیب نہ ہوتی تو میں علم میں مفلس رہ جاتا۔ اور فرماتے کہ وہ شخص محروم ہے، جس کو ابوحنیفہ کے علم کا حصہ نہ ملا، اور شاگردوں سے فرمایا کرتے کہ آثار و احادیث کو لازم پکڑو مگر اُس کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے۔

''تہذیب الکمال'' میں ابن مبارکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر حق تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیان سے میری مدد نہ فرماتا تو میں ایک معمولی آدمی رہ جاتا۔

ک م۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی ہے، مگر جب تک ابوحنیفہ سے ملاقات نہ ہوئی، حلال وحرام کے اصول مجھے معلوم نہ ہوئے۔

اِن اقوال سے فقہ کی طرف جو احتیاج ثابت ہوتی ہے محتاج بیان نہیں۔ اسی وجہ سے ابن مبارکؒ امام صاحب کے انتقال تک آپ ہی کی خدمت میں رہے، جیسا کہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے ''بستان المحدثین'' میں لکھا ہے کہ عبداللہ ابن مبارک اول از شاگردان امام اعظمؒ بودند وطریق تفقہ از ایشاں می آموختند و چوں امام اعظم وفات یافتند در مدینۂ منورہ نزد امام مالک تفقہ می نمودند۔

م ک ص۔ عبدالعزیز ابن ابی رواد پر جب کوئی مسئلہ دین کا مشتبہ ہو جاتا، تو لکھ کر امام صاحب سے پوچھ لیتے اور ہر امر میں اُن کی اقتدا کرتے۔ عبدالعزیز ابن ابی رواد کا حال خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ یحییٰ قطان وغیرہ کے استاد ہیں، اور صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں، اور الانتصار میں لکھا ہے، وہ امام صاحب کے بھی استاد ہیں۔

م ص ک۔ عثمان ابن عفان سجزی کہتے ہیں کہ میں نے ابوعاصم نبیل سے سنا ہے، وہ کہتے

تھے کہ مجھے امید ہے کہ ابوحنیفہؒ کے اعمال ہر روز ایک صدیق کے اعمال کے برابر آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، میں نے کہا کہ کس وجہ سے؟ کہا: اس لئے کہ لوگ اُن سے اور اُن کے اقوال سے نفع اٹھاتے رہتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ لوگ اُس زمانہ میں امام صاحب کے اقوال پر عمل کرتے اور نفع اُٹھاتے تھے، اور فقہ سے اُن کی احتیاج رفع ہوتی۔

الحاصل ان تمام شہادتوں سے ثابت ہے کہ محدثین کو فقہاء کی طرف اُس زمانہ میں بھی احتیاج تھی، اور فقہ وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔

امام بخاریؒ امام صاحب کے معتقد تھے

''طبقات کبریٰ'' میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ بخاریؒ نے حمیدیؒ سے فقہ سیکھی ہے، اور مقدمہ فتح الباری میں شیخ الاسلام نے بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے'' **ماجلست للتحدیث حتی عرفت الصحیح من السقیم حتی نظرت فی کتب اهل الرأی**''، یعنی وہ فرماتے ہیں کہ میں جب تک حدیث صحیح کو سقیم سے ممتاز نہیں کرلیا، اور اہل الرائے کی کتابیں نہیں دیکھ لیں، تدریس کے لئے نہیں بیٹھا۔ اہل الرائے کی کتابیں پیش از پیش دیکھنے کی ضرورت اس وجہ سے انہوں نے سمجھی تھی کہ امام شافعیؒ جو اُن کے استاذ الاساتذہ تھے فرماتے ہیں کہ ''**الناس عیال ابی حنیفة فی الفقه**'' اور نیز دوسرے محدثین کے اقوال پیش نظر تھے جو امام صاحب کے افقہ ہونے کے باب میں وارد ہیں۔ غرضکہ جب اُن کو فقہ میں بھی کمال حاصل کرنا منظور تھا، اس وجہ سے فقہ حنفیہ کی طرف احتیاج ہوئی۔ اور خاص وجہ اُس کی یہ بھی تھی کہ امام صاحب کے ساتھ اُن کو تعلق خاص تھا۔ اس لئے کہ اُن کے والد ابن مبارکؒ کی صحبت میں رہا کرتے تھے، جیسا کہ خود اُنہوں نے تاریخ کبیر میں اپنے والد بزرگوار کا حال لکھا ہے کہ'' **اسمٰعیل ابن ابراهیم ابن المغیرة سمع من**

مالک و حماد و ابن زید و صحب ابن مبارک ذکرہ فی مقدمۃ فتح الباری''اور قاعدہ کی بات ہے کہ جولوگ اپنے والد کے معتقد علیہ ہوتے ہیں، اُن سے خاص طور پر عقیدت ہوا کرتی ہے اسی وجہ سے انہوں نے ابن مبارکؒ کی کل کتابوں کو یاد کرلیا تھا۔ چنانچہ ان کا قول مقدمہ فتح الباری میں نقل کیا ہے۔''**فلما طعنت فی ست عشر سنۃ حفظت کتب ابن مبارک و وکیع و عرفت کلام ھؤلاء یعنی اصحاب الرأی**''۔

پھر ابن مبارک اور وکیع رحمھما اللہ امام صاحب کی تحقیقات اور تفقہ کے جس قدر دلدادہ ہیں، پوشیدہ نہیں، اسی وجہ سے امام صاحب کے اقوال کو دیکھنے کا امام بخاریؒ کو شوق ہوا جو کتب اہل الرائے میں مذکور ہیں۔ اوراُن سے خوب واقف ہوئے، جیسا کہ لفظ **عرفت** سے ظاہر ہے۔ ان قرائن سے ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ امام صاحب کے معتقدوں میں ضرور تھے، گو مقلد نہ تھے اس وجہ سے کہ خود مجتہد تھے۔

اِس سے بھی ثابت ہوا کہ فقہ اہل الرائے سے اُس زمانہ میں مطعون نہ تھی، ورنہ ایسی بات وہ کبھی نہ کہتے جس سے محدثین کے نزدیک مطعون ہوں، اوراُس کو معرفت احادیث کے ہم پلہ ہرگز نہ کرتے۔ الحاصل اس میں شک نہیں کہ امام بخاریؒ فقہ کو ضروری سمجھتے تھے، اور چونکہ احادیث بکثرت یاد تھیں اور فقہ حنفیہ سے مدد لیکر بلکہ اجتہاد بہم پہونچایا تھا، اس لئے چاہا کہ اپنی اجتہادی فقہ میں کوئی خاص کتاب تصنیف کریں جو مدلل بآیات واحادیث واقوال صحابہ وتابعین وغیرہم ہو، اس کی ابتداء یوں کی کہ بخاری شریف کے تمام تراجم ابواب پہلے لکھے جس میں اپنے اجتہادی مسائل بیان کرنا منظور تھا، اوراُس میں روحانی مدد کی غرض سے یہ اہتمام کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف اور منبر منیف کے مابین تمام تراجم ابواب کا مبیضہ کیا اور ہر ترجمۃ الباب کے لکھنے کے وقت دو رکعت نماز پڑھتے،

جیسا کہ مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے پھر اُن مسائل فقہیہ پر جن کا استنباط اپنے ذہن میں پہلے سے کیا تھا ہر باب میں حدیث داخل کرنی شروع کیں، اور کسی مسئلہ پر حدیث سے استدلال نہ ہوسکا تو قرآن شریف کی آیت یا اقوال صحابہ یا تابعین وغیرہم سے استدلال کیا، جیسا کہ فقہاء کی عادت ہے، اور اُس باب میں حدیث لکھی ہی نہیں غرضکہ بخاری شریف فقہ اور حدیث کی جامع کتاب ہے چنانچہ مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے ''ولھــــذا اشتھر من قول جمع من الفضلاء فقه البخاری فی تراجمه'' ۔ دیکھئے ''باب جھر الامام بالتامین'' میں انہوں نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ ''عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰه تعالی عنه ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا امن الامام فامنوا فانه من وافق تامینه تأمین الملئکة غفرله ما تقدم من ذنبه''۔ یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ موافق ہوجائے تو اُس کے پچھلے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ دیکھئے اِس حدیث میں کوئی لفظ اِس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ امام بآواز بلند آمین کہا کرے، بلکہ امام آہستہ ہی آمین کہے، تو جن لوگوں نے پوری سورۂ فاتحہ امام سے سن لی ہے، امام کے ساتھ آمین کہنے میں شریک ہوجائیں گے۔ مگر انہوں نے ترجمۃ الباب میں جہرالامام کا لفظ اپنے اجتہاد سے بالتصریح لکھدیا، یہی فقہاء کا کام ہے کہ اپنے فہم سے کام لیکر نصوص کے معنی میں اس قسم کے تصرفات کیا کرتے ہیں، پھر چونکہ افہام میں تفاوت ہوا کرتا ہے، اس لئے جس کی فہم تیز اور عقل زیادہ رسا ہو اُسی کی رائے صائب سمجھی جاتی ہے۔ ہر چند محدثین بھی اہل فہم ورائے تھے مگر اُن میں جو فقہاء تھے وہ قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے کہ ابوحنیفہ عقل اور فراست اور فہم وتفقہ میں بے نظیر شخص ہیں۔

تفاوتِ افہام بفہمِ معانی

اب ہم بغرض توضیح چند مثالیں لکھتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں افہام کیسے متفاوت ہیں:

بخاری شریف کی کتاب التفسیر میں مروی ہے کہ جب آیۃ شریفہ ''**کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود الایۃ**'' جو سحر سے متعلق ہے نازل ہوئی تو ایک صحابی نے ظاہرِ مضمون آیت کے لحاظ سے اپنے تکیہ کے نیچے سیاہ اور سفید دھاگے اس غرض سے رکھ لئے کہ جب تک اُن کے رنگ اچھی طرح محسوس اور ممتاز نہ ہوں کھاتے پیتے رہیں گے پھر جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اگر خیط ابیض واسود تمہارے تکیہ کے نیچے آ گئے تو وہ تکیہ بڑا ہی عریض ہے، پھر فرمایا کہ اُس سے مراد شب کی سیاہی اور صبح کی سفیدی ہے۔ دراصل عموماً فہم خصوصاً دینی فہم جو ایک اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے، جس سے ابدی سعادت متعلق ہے نہایت کم یاب ہے۔

مسلم شریف میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ یہ حدیث ہے کہ ''**نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتخذ الروح غرضاً**'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کسی جاندار کو باندھ کر نشانۂ تیر وغیرہ بنایا جائے۔ ایک محدث صاحب نے روح کو روح بالفتح اور غرض کو عرض بعین مہملہ روایت کی۔ لوگوں نے جب مطلب پوچھا تو کہا کہ ہوا لینے کے لئے دریچہ عریض نہ رکھا جائے بلکہ طویل رکھنا چاہئے۔

ابن جوزیؒ نے تلبیس ابلیس میں لکھا ہے کہ بعض محدثین نے یہ روایت پڑھی ''**روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی ان یسقی الرجل ماءہ زرع**

غیـره ''یعنی منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بات سے کہ آدمی اپنا پانی دوسرے کی زراعت کو پلائے۔ حضار مجلس سے اکثروں نے کہا کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ جب ہمارے باغ میں پانی زیادہ ہوگیا تو ہم نے ہمسایہ کی زراعت میں چھوڑ دیا، اب ہم اس فعل سے استغفار کرتے ہیں، حالانکہ اس حدیث شریف سے مقصود یہ ہے کہ حاملہ لونڈیوں کے ساتھ وطی درست نہیں، مگر اُس کو نہ مدرس صاحب نے سمجھا نہ حضار مجلس نے۔

ابن جوزیؒ نے اُسی میں خطابیؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شیخ نے یہ حدیث روایت کی۔'' **نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن الحلق قبل الصلوة يوم الجمعة** ''جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا اس سے کہ جمعہ کے روز قبل نماز اصلاح بنوائی جائے اور اُس کے بعد کہا کہ چنانچہ چالیس سال سے میں نے قبل جمعہ کبھی حلق نہیں کیا، میں نے کہا کہ حضرت حلق بسکون لام نہیں حلق بفتح لام وکسر حا ہے جو جمع **حلقة** ہے اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ علم اور مذاکرہ کے حلقے جمعہ سے پیشتر درست نہیں۔ اس لئے کہ وہ نماز پڑھنے اور خطبہ سننے کا وقت ہے، یہ سنکر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے مجھ پر نہایت آسانی کی۔

کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ ایک محدث کی عادت تھی کہ استنجےٰ کے بعد وتر پڑھا کرتے تھے، جب پوچھا گیا تو یہ دلیل پیش کی کہ حدیث شریف میں وارد ہے'' **من استنجى فليوتر** '' اس کا مطلب انہوں نے یہ سمجھا کے استنجےٰ کے بعد وتر پڑھے، حالانکہ مطلب یہ ہے کہ استنجےٰ کے لئے جو ڈھیلے لئے جائیں وہ وتر ہوں یعنی تین یا پانچ یا سات۔

بخاری شریف ص ۴۲۸ میں ہے کہ ابوجحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا کیا آپ کے پاس قرآن مجید کے سوا بھی کوئی وحی آسمانی ہے؟ فرمایا:'' **ما اعلمه الا فهما يعطيه الله رجلاً فى القرآن** ''یعنی قرآن کے سوا میں کوئی وحی نہیں جانتا،

البتہ فہم ہے جو خدائے تعالیٰ کسی ایک شخص کو قرآن سمجھنے کے لئے دیتا ہے اور بخاری شریف ص ۶۱۵ میں یہ بھی روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہٗ کو شیوخ بدر کے ساتھ بٹھایا کرتے تھے، بعضوں کو یہ ناگوار ہوا اور کہا کہ اس لڑکے کو ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے لڑکے اُن کی عمر کے ہیں، آپ نے یہ سن کر ایک روز بطور امتحان حاضرین سے پوچھا کہ سورۂ **اذا جاء نصر اللہ** کے کیا معنی ہیں؟ ہر ایک نے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کئے اور بعض ساکت رہے، پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم بھی یہی معنی کہتے ہوں انہوں نے کہا: مجھے تو اس سورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات معلوم ہوتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں میں بھی یہی جانتا ہوں۔ دیکھئے وہ اکابر صحابہ عمر بھر یہ سورہ پڑھا کئے مگر اُن کی سمجھ میں وہ معنی نہ آئے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صاحبزادگی کی حالت میں طبیعت خداداد سے بتلا دیئے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے کہ نہ تعلیم سے حاصل ہوسکتی ہے نہ اکتساب سے۔ اسی خداداد صفت نے فقہاء کو محدثین میں ممتاز کر دیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''**من یرد اللہ بہ خیرا یفقه فی الدین رواہ البخاری**''، یعنی خدائے تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے، اُس کو دین میں سمجھ دیتا ہے۔

م ص ک۔ ایک روز یزید بن ہارون سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، اُس مجلس میں یحییٰ بن معین اور علی ابن المدینی اور امام احمد وغیرہم محدثین حاضر تھے آپ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ اہل علم سے پوچھو۔ ابن المدینی نے کہا: کیا آپ اہل علم اہل حدیث سے نہیں؟ فرمایا اہل علم اصحاب ابوحنیفہ ہیں اور تم لوگ عطار ہو۔ ''**النصیحة لاهل الحدیث**'' میں اور ''**الخیرات الحسان**'' میں لکھا ہے کہ ایک بار اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے چند مسئلے پوچھے، اُس مجلس میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی حاضر تھے، اعمشؒ نے امام صاحب سے فرمایا ان مسائل میں تمہارا کیا قول ہے؟ امام صاحب نے اپنے اقوال بیان کئے۔ اعمشؒ نے کہا:

اس پر کیا دلیل امام صاحب نے کہا: وہی احادیث جو آپ سے مجھے پہونچی ہیں ۔اور چند حدیثیں مع اسناد پڑھ کر سنا دیں اور استخراج کا طریقہ بھی بیان کر دیا۔اعمشؒ نے نہایت تحسین کی اور فرمایا: سو دن میں جو میں نے روایتیں کی تھیں ،تم نے ایک ساعت میں وہ سب سنا دیں، میں نہیں جانتا تھا کہ تم ان احادیث پر عمل کرتے ہو گے۔پھر فرمایا''یا معاشر الفقهاء انتم الاطباء و نحن الصيادلة '' یعنی اے گروہ فقہاء تم طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں، جن کے پاس دوائیں ہر قسم کی موجود رہتی ہیں مگر کسی بیماری میں اُن کا استعمال نہیں کر سکتے یہی وجہ تھی کہ ایک حج میں اعمشؒ اور امام صاحب کا اجتماع ہوا، انہوں نے امام صاحب کو کہلایا کہ مناسک حج ہمارے لئے لکھ بھیجیں۔اور اپنے شاگردوں سے کہا مناسک اُن سے لکھ لو، میری دانست میں حج کے فرائض اور نوافل کو اُن سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں'' كذا فی الخيرات الحسان''

م ص ک۔میں اعمش اور امام صاحب کے مناظرہ مذکورہ میں چند حدیثیں بھی ذکر کی ہیں،جن کو امام صاحب نے پڑھیں اور اعمشؒ نے سُن کر کہا''يا معشر الفقهاء انتم الاطباء ونحن الصيادلة وانت ايها الرجل اخذت بكلا الطرفين'' یعنی محدثین عطار اور فقہاء طبیب ہیں اور تم دونوں کو جامع ہو یعنی محدث بھی ہو اور فقیہ بھی ۔ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ اعمشؒ انس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کے شاگرد اور شعبہ اور سفیان ثوری وغیرہما کے استاد ہیں، محدثین نے اُن کے صدق کی وجہ سے اُن کا نام ہی مصحف رکھ دیا تھا۔ دیکھئے جب مصحفِ ناطق کے ارشاد سے فقہاء طبیب اور محدثین دواساز ٹھیرے تو کیا کسی رائے سے یہ کلیہ منسوح ہوسکتا ہے اور امام صاحب کو جو انہوں نے محدث اور فقیہ فرمایا کیا یہ گواہی خلاف واقع ہوسکتی ہے؟ ہر گز نہیں ۔

ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوۃ میں نقل کیا ہے کہ اوزاعیؒ نے چند مسائل امام اعظمؒ سے

پوچھے، انہوں نے سب کے جواب دیئے۔ اوزاعیؒ نے کہا: یہ کس دلیل سے کہتے ہو؟ آپ نے کہا: اُن ہی احادیث اور اخبار وآثار سے جو آپ حضرات روایت کرتے ہیں۔ پھر وہ احادیث پڑھ کر استدلال کے طریقے بیان کئے اوزاعیؒ نے سب سنکر کہا کہ ''**نحن العطارون و انتم الاطباء**'' یعنی ہم کو حدیثیں سب یاد ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ اُن سے کن مسائل پر استدلال ہوسکتا ہے اور مسلمانوں کو اُن سے کیا کیا منافع حاصل ہوسکتے ہیں۔ جیسے عطاروں کے پاس اقسام کی دوائیں موجود ہوتی ہیں، مگر اُن کو یہ نہیں معلوم کہ کس بیماری میں کونسی دوا مفید ہے، جس کو اطباء جانتے ہیں۔ ش تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ اوزاعیؒ امام وقت تھے۔ اہل شام اور اہل اندلس ایک مدت تک انہیں کے مذہب پر اور انہیں کے مقلد رہے اور دحیم عبدالرحمٰن کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ جب وہ بغداد گئے تو امام احمد اور ابن معین اور خلف ابن سالم اُن کی مجلس میں آتے اور اُن کے روبرو ایسے بیٹھتے جیسے لڑکے بیٹھا کرتے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ دحیم اوزاعیؒ کے مذہب پر تھے۔

اب غور کیا جائے کہ اوزاعی جیسے محدث امام الوقت جب امام صاحب کی نسبت یہ فرمائیں کہ ہم لوگ عطار ہیں اور آپ طبیب، تو علم میں امام صاحب کا کیسا رتبہ ہوگا؟ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے حافظ ابن زبر ابوسلیمان کے ترجمہ میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابوجعفر طحاوی کو میری تصانیف پسند آئیں، چنانچہ اپنے گھر لیجا کر انہوں نے اُن کا مطالعہ کیا، اور یہ کہا کہ اے ابوسلیمان! تم لوگ عطار ہو اور ہم لوگ طبیب ہیں۔ مقصود یہ کہ اُن تصانیف میں ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں جیسے عطار کے یہاں ہر قسم کی دوائیں موجود ہوتی ہیں، اور چونکہ وہ فقیہ تھے اس لئے یہ بھی کہدیا کہ اُن کا استعمال ہم فقہاء جانتے ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابوجعفر طحاوی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ''**کان ثقة فقیها عاقلاً لم یخلف مثله**''۔ اور لکھا ہے کہ پیشتر وہ شافعی المذہب تھے اور بعد حنفی ہوگئے۔ یہ بات

معلوم رہے کہ عطار وطبیب کی مثال جو دی جاتی تھی اُس میں کسی کی توہین اور تعلیٰ نہیں ہوتی تھی بلکہ بیان واقعی تھا جس کو محدثین بھی بطیّب خاطر تسلیم کرلیا کرتے تھے۔ اور فقہ کی طرف اس وجہ سے وہ متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ اُن کی توجہ کثرت طرق کی طرف مبذول تھی، کسی حدیث کے لئے وہ ایک دو استادوں پر قناعت نہ کرتے بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ جہاں تک ہوسکے ایک ایک حدیث متعدد اساتذہ اور مختلف طریقوں سے حاصل کریں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ ایک ایک حدیث سو سو طریقوں سے لی جاتی تھی۔ غرضکہ اسانید کے اہتمام میں معانی حدیث میں غور وتامل کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کہ محقق اساتذہ تفسیر حدیث سے متعلق اقوال فقہاء بیان کرنا چاہتے تو اُس کا سننا بھی ناگوار تھا۔ بخلاف فقہاء کے کہ وہ مستند اساتذہ سے بقدر ضرورت احادیث فراہم کرکے اُن کے معنی میں غور وتامل کرتے۔ اور ہمیشہ اسی فکر میں رہتے کہ کونسی حدیث سے کن کن مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔

الحاصل قرون ثلثہ میں جو حضرات اہل حدیث میں اس قابل سمجھے جاتے ہیں کہ اُن کے قول پر عمل کیا جائے، وہ معدودے چند تھے جو فقہا کے نام سے مشہور تھے۔ اور جو اہل حدیث صرف حدیث ہی میں توغل پیدا کرنا چاہتے تھے اُن کو اکابر محدثین خیر خواہانہ یہ معلوم کرادیتے تھے کہ بغیر فقہ کے صرف حدیث ہی کو طلب کرنا بے فائدہ اور عمر اور دین کو ضائع کرنا ہے۔ وہ حضرات خاص کر فقہ حنفیہ کو حدیث کی تفسیر سمجھتے، اور صاف کہتے تھے کہ امام صاحب کے اقوال سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا، بلکہ جو اُن کے اقوال پر مطلع نہ ہو وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنادیگا۔ اور جو لوگ فقہ حنفیہ سے انکار کرتے اُن کو احمق کہتے، اور زجر وتوبیخ کرکے اپنی مجلس سے اٹھا دیتے تھے، اور خود امام صاحب کے حلقہ میں شریک ہوکر مستفید ہوتے، اور براہ انصاف صاف کہدیتے کہ ہم لوگ مثل عطار ہیں اور آپ مثل

طبیب حاذق۔ اس سے ظاہر ہے کہ جولوگ فقہ حنفیہ کو گمرہی بتاتے ہیں در پردہ وہ اُن اکابر دین پر الزام لگاتے ہیں جن کے نزدیک فقہ حنفیہ تفسیر حدیث مسلم ہو چکی تھی۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرات کمال درجہ کے محتاط تھے، اُن کا مقصود یہ تھا کہ ہر مسئلہ میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جو مقصود ہے اُس پر عمل کیا جائے اور اس مقصود کا معلوم کرنا سوائے فقہاء کے دوسروں سے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ احادیث بکثرت ہیں اور ظاہر نصوص پر عمل کرنا خلاف مرضی شارع ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوا خصوصاً ایسے موقع میں کہ باہم احادیث میں تعارض بھی ہو اور محدثین نہ مواقع استدلال جانتے ہیں نہ استنباط مسائل کا طریقہ اُن کو معلوم ہے۔ اس صورت میں اگر مجتہدوں کی طرف رجوع نہ کیا جائے تو مقصود شارع کا یقیناً فوت ہو جائے گا۔ اس لئے فتویٰ کا کام انہوں نے فقہاء کے ذمہ کر دیا تھا۔ اُن کے نزدیک یہ ہرگز ثابت نہ ہوا اور نہ ہوسکتا تھا کہ چند حدیثیں بخاری یا صحاح ستہ کی جو بہ نسبت کل حدیثوں کے عشر عشیر بھی نہیں واجب العمل ہوں اور باقی واجب الترک۔

کثرتِ احادیث

کثرت احادیث یوں ثابت ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائے زمانہ نبوت سے تینتیس (۳۳) سال تک احکام الٰہی پہونچاتے رہے اور نبوت کا لازمہ کلام ہے۔ اگر اقل درجہ دن رات کے کلام دس گیارہ ہی فرض کئے جائیں تو ایام نبوت کے صرف اقوال تخمیناً ایک لاکھ ہو جاتے ہیں اور یوں تو صحابہ ایک لاکھ سے زیادہ ہیں مگر صرف دس ہی صحابہ سے ہر ایک قول مروی ہو تو بحسب اصطلاح محدثین دس لاکھ حدیثیں صرف اقوال ہی کی ہو جاتی ہیں، کیونکہ محدثین متن اور اسناد کے مجموعہ کو اکثر حدیث کہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ حدیث ''**لایومن احدکم**

حتی اکون احب الیه من ولده الحدیث'' ی دو اسنادیں ہیں ایک روایت قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ دوسری روایت عبدالعزیز عن انس رضی اللہ عنہ یہ دو روایتیں دو حدیثیں سمجھی جاتی ہیں۔ بلکہ غور کیا جائے تو محدثین کے نزدیک حدیث اسناد ہی کا نام ہے۔ جیسا کہ ابن صلاحؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے''متی قالوا هذا حدیث صحیح فمعناه اتصل سنده مع سائر الاوصاف المذکورة و لیس من شرطه ان یکون مقطوعاً به فی نفس الامر الی ان قال و کذلک متی قالوا فی حدیث انه غیر صحیح فلیس ذلک قطعاً بانه کذب فی نفس الامر اذ قد یکون صدقاً فی نفس الامر و انما المراد انه لم یصح اسناده علی الشرط المذکور.'' یعنی محدثین جس حدیث کو صحیح یا غیر صحیح کہتے ہیں تو اُس سے مراد اسناد ہوتی ہے، حدیث کے صحیح ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ متن حدیث بھی نفس الامر میں صحیح ہے اور نہ غیر صحیح ہونے کا یہ مطلب ہے کہ متن نفس الامر میں غلط ہے۔ اسی طرح ابن حجر مکیؒ نے ''الجواهر المنظم فی زیارة قبر نبیّ المکرم'' صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھا ہے ''قال السبکی و مما یجب ان یبین ان حکم المحدثین بالانکار و الاستغراب قد یکون بحسب تلک الطرق و لا یلزم من ذلک رد متن الحدیث بخلاف اطلاق الفقیه ان الحدیث موضوع فانه حکم علی المتن من حیث الجملة'' یعنی محدثین جب کسی حدیث کا انکار کرتے ہیں تو اُس سے صرف اسناد کا انکار مقصود ہوتا ہے، بخلاف اس کے اگر فقیہ کسی حدیث کو موضوع کہدے تو اُس سے متن حدیث موضوع سمجھا جائیگا۔ اور امام نوویؒ نے ''کتاب التقریب و التیسیر'' میں لکھا ہے''و اذا قیل (هذا حدیث) غیر صحیح فمعناه لم یصح اسناده''. غرضکہ دس دس صحابیوں سے ہر ایک متن مروی ہو تو بحسب اصطلاح محدثین

دس لاکھ حدیثیں ہو جاتی ہیں۔ پھر جس طرح حدیث کا اطلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر ہوتا ہے اسی طرح حضرت کے افعال اور تقریر اور نیز صحابہ کے اقوال اور افعال اور تقریر پر ہوتا ہے: جیسا کہ سید شریف علامہؒ نے مختصر الجرجانی میں لکھا ہے۔ ''**والحدیث اعم من این یکون قول الرسول صلی الله علیه وسلم او الصحابة أو التابعی و فعلهم و تقریرهم**'' جب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی حدیثوں کا اندازہ دس لاکھ ہو تو حضرت کے افعال وتقریر اور اصحاب و تابعین کی کثرت کے لحاظ سے ان کے اقوال وافعال وغیرہ کا اندازہ کیا جائے تو کروڑں کی نوبت پہونچ جائے گی۔ حالانکہ روئے زمین پر اتنی حدیثوں کا وجود اب باقی نہیں۔ البتہ امام احمدؒ کے قول سے کروڑ حدیثوں کا پتہ لگتا ہے، جیسا کہ طبقات کبریٰ میں شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ نے لکھا ہے ''**قال عبدالله ابن احمد رضی الله عنه کتب ابی عشرة الاف الف حدیث لم یکتب سوادا فی بیاض الا حفظه**'' مگر وہ بھی مفقود ہیں۔ پھر اُن میں سے صحیح کچھ اوپر سات لاکھ حدیثیں امام احمدؒ کے قول سے ثابت ہیں جیسا کہ تدریب الراوی میں امام سیوطیؒ نے لکھا ہے ''**قال ابن الجوزیؒ حصر الاحادیث یبعد امکانه غیر ان جماعة بالغوا فی تتبعهما و حصروها . قال الامام احمد صح سبع مائة الف و کسر**'' اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک لاکھ صحیح حدیثیں مجھے یاد ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح جیسا کہ مقدمہ فتح الباری میں شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے لکھا ہے۔

اب صحیحین کی حدیثوں کو بھی دیکھ لیجئے کہ کتنی ہیں۔ جواہر الاصول میں شیخ ابوالفیض محمد ابن علی الفارسیؒ نے لکھا ہے بخاری ومسلم میں بحذف مکررات صرف چار ہزار حدیثیں ہیں، وہ بھی صرف احادیث مرفوعہ نہیں، اُن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال وتقریر بھی شامل ہیں۔ پھر وہ بھی

صرف احکام سے متعلق نہیں بلکہ اُن میں فضائل اور قصص وحکایات وغیرہ بھی شریک ہیں۔اب غور کیجئے کہ کہاں ایک کروڑ یا سات لاکھ حدیثیں اور کہاں چار ہزار۔وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ جن اہل احتیاط محدثین واکابر دین کے پیش نظر وہ لاکھوں حدیثوں کا ذخیرہ ہو کیا ممکن ہے کہ وہ دین کو ان دو چار ہزار حدیثوں میں منحصر کردیں گے؟ ہرگز نہیں۔غرضکہ اُن حضرات نے جن کے سلسلۂ تلامذہ میں ہونے پر امام بخاری ومسلم وغیرہما کو ناز ہے،جب دیکھا کہ فقہاء خصوصاً امام اعظمؒ فن حدیث میں کامل اور قوت اجتہادیہ اور تورع میں بے نظیر ہیں اس لئے اُن کے اجتہاد کو تسلیم کرکے مدت العمر اُن کے ممنون رہے،جس کا حال انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا۔

ضرورتِ اجتہاد

یہ بات اہل علم جانتے ہیں کہ اجتہاد ایک مشکل کام ہے۔چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے عقد الجید میں لکھا ہے کہ اجتہاد کے لئے بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔مثلاً علم تفسیر، حدیث، اقوال علمائے سلف، ناسخ ومنسوخ، لغت، طریقہ استنباط احکام، مجمل، مفسر وغیرہ۔ جن کی فہرست اگر لکھی جائے تو ایک چھوٹا سا رسالہ ہوجائیگا، انہی امور کے مباحث میں ایک بڑا فن اصول فقہ مدون ہے۔ان امور میں کامل دستگاہ حاصل کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ اسی وجہ سے صحابہ میں بھی دس پانچ ہی مجتہد ہوئے، جن سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔انہیں حضرات کے اجتہاد کو دیکھ کر مجتہدین نے اجتہاد کے طریقہ مدون کئے اور طبیعت خداداد سے ایسے اجتہاد کئے کہ عموماً محدثین نے بھی ان کو اپنے مقتدا مان لئے۔

اجتہادِ صحابہ

اب ہم چند نظائر اجتہادات صحابہ واکابر دین کے پیش کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا

کہ ائمہ مجتہدین نے جو اجتہاد کئے ہیں وہ انہی حضرات کی اتباع تھی۔ ''مننتقی الاخبار'' میں ابن تیمیہ نے روایت کیا ہے۔ ''عن عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ انه لما بعث فی غزوة ذات السلاسل قال احتلمت فی لیلة باردة شدیدة البرد فاشفقت ان اغتسلت ان اهلک فتیممت ثم صلیت باصحابی صلاة الصبح فلما قدمنا علی رسول الله صلی الله علیه وسلم ذکروا ذلک له فقال یا عمر واصلیت باصحابک و انت جنب ؟ فقلت ذکرت قول الله تعالیٰ و لا تقتلوا انفسکم ان الله کان بکم رحیماً فتیممت ثم صلیت فضحک رسول الله صلی الله علیه واٰله وسلم ولم یقل شیئاً رواه احمد و ابوداؤد و الدار قطنی''۔ یعنی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب غزوہ ذات السلاسل میں لشکر بھیجا گیا تو ایک رات مجھے احتلام ہوا، چونکہ سردی نہایت شدت سے تھی اور غسل کرنے میں خوف ہلاک تھا اس لئے میں نے تیمّم کرلیا۔ اور نماز صبح میں اپنے رفقاء کی امامت کی، جب ہم واپس آئے تو لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا، حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ اے عمرو تم نے جنابت کی حالت میں امامت کی؟ میں نے عرض کی کہ مجھے خدائے تعالیٰ کا یہ کلام یاد آیا۔ ''و لا تقتلوا انفسکم ان الله کان بکم رحیماً''. یعنی مت قتل کرو تم اپنی جانوں کو اللہ کا تم پر رحم ہے۔ اس لئے میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھی، یہ سنکر حضرت نے تبسم کیا۔ اور کچھ نہ فرمایا۔ دیکھئے جب اِس واقعہ میں صحابہ کی شکایت بارگاہ نبوی میں پیش ہوئی اور حضرت نے کسی قدر سختی سے سوال فرمایا کہ کیا تم نے جنابت کی حالت میں امامت کی؟ اُس وقت انہوں نے جواب میں اپنا اجتہاد پیش کیا کہ گو صراحۃً ایسے موقع میں تیمّم کی اجازت نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں مگر میں نے اپنے اجتہاد سے یہ رائے قائم کرلی کہ قوله تعالیٰ ''و لا

تـقـتـلـوا انفسکم" کی نہی عام ہے،اس لئے اس موقع میں غسل جائز نہیں۔اور پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمّم کی اجازت ہے،اس لئے خوف ہلاک کی صورت کو اُسی پر قیاس کر کے تیمّم کرلیا۔ پھراس اجتہاد اور قیاس پر یہ وثوق اور اعتماد کہ اپنی ہی نماز نہیں، سب کی نمازوں کا بار اپنے ذمہ لیا اور یہ بھی نہ کہا: کہ صاحبو! مجھے امامت سے معذور رکھو، میں ضرورۃً اپنی نماز ادا کرلیتا ہوں۔ اور اُس اجتہاد کی تقلید سب صحابہ نے کی اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حضرت ایسے اشتباہی استدلال کو ہم نہ مانیں گے۔اور یہ قیاس "اول من قاس ابلیس" کی رو سے صحیح نہیں ہوسکتا،اس لئے آپ اپنی نماز کے مختار ہو ہمیں اقتداء سے معاف رکھئے۔ پھراسی اجتہاد کو کمال استقلال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ،کیا جس کو کمال خوشنودی سے حضرت نے منظور اور مقبول فرمایا: جس سے مجتہدوں کے حوصلے بڑھے اور معلوم ہوگیا کہ اہل رائے کا اجتہاد اور قیاس بھی دین میں ایک باوقعت چیز ہے۔

"عن زید بن ارقم رضـی الله عنه قـال اُتـی علی رضی الله عنه بثلاثة وهـو بـالیمن وقعوا علی امراة فـی طهـر واحد فسأل اثنین اتقران لهذا بـالـولـد قـال لا حتـی سالهم جمیعاً فجعل کلما سال اثنین قالا لا فاقرع بیـنهـم فـالـحق الولد بالذی صارت علیه القرعة و جعل علیه ثلثی الدیة قـال فـذکـر ذلک لـلـنبـی صـلـی الـله علیه وسلم فضحک حتی بدت نـواجـذه رواه ابـوداؤد" یعنی جب علی کرم اللہ وجہہ یمن میں تشریف رکھتے تھے یہ مقدمہ پیش ہوا کہ تین شخص ایک عورت کے ساتھ ایک ہی طہر میں مرتکب ہوئے اور بچہ پیدا ہونے کے بعد دعوی پیش ہوا، آپ اُن میں سے دو دو شخصوں سے پوچھتے تھے کہ کیا تم منظور کرتے ہو کہ وہ لڑکا اُس تیسرے شخص کا ہے؟ جب کسی نے منظور نہ کیا تو آپ نے قرعہ ڈالا اور جس کے نام قرعہ نکلا بچہ اُس کے حوالہ کر کے دوثلث دیت اُس سے دونوں کو دلا دیا۔

جب یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبروعرض کیا گیا آپ نہایت خوش ہوئے۔
بخاری اور مسلم میں ایک روایت ہے جس کا حاصل مضمون یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو بعض عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن سے جہاد کرنا چاہا، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اُن کے ساتھ جہاد کیونکر جائز ہوگا؟ وہ تو لا الہ الا اللہ کے قائل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا الله فمن قال لا اله الا الله فقد عصم منی ماله و نفسه الا بحقه و حسابه علی الله تعالیٰ**'' ۔یعنی جو شخص لا الہ الا اللہ کا قائل ہو گیا اُس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچالیا اور اندرونی معاملہ اور محاسبہ اُس کا خدا کے ساتھ ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اُن لوگوں سے جہاد کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں، حالانکہ دونوں حقوق اللہ ہیں۔ یہ بات عمر رضی اللہ عنہ کے بھی سمجھ میں آ گئی، چنانچہ اس پر فیصلہ ہوا اور کل صحابہ نے بھی اس کو مان لیا۔ یہ حدیث آئندہ نقل کی جائیگی۔

دیکھئے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا نہ قرآن سے ثابت ہے نہ حدیث سے بلکہ ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ درست نہیں، مگر اجتہاد سے یہ مسئلہ ثابت ہوا اور کل صحابہ کے مان لینے سے جواز اجتہاد پر صحابہ کا اجماع بھی ثابت ہو گیا۔

بخاری شریف میں روایت ہے۔''**عن عبدالله بن عبید الله ابن ابی ملیکة قال توفیت ابنة لعثمان رضی الله عنه بمکة و جئنا لنشهدها و حضرها ابن عمرو ابن عباس رضی الله عنهم و انی لجالس بینهما او قال جلست الی احدهما ثم جاء الآخر فجلس الی جنبی فقال عبدالله ابن عمر رضی الله عنه لعمرو بن عثمان الاتنهی عن البکاء فان رسول الله**

صلی اللہ علیه وسلم قال ان المیت لیعذب ببکاء اهله علیه فقال ابن عباس رضی الله عنهما قد کان عمر رضی الله عنه یقول بعض ذلک ثم حدث فقال صدرت مع عمر رضی الله عنه من مکة حتی اذا کنا بالبیداء اذا هو برکب تحت ظل سمرة فقال اذهب فانظر من هؤلاء الرکب قال فنظرت فاذا صهیب فاخبرته فقال اوعه لی فرجعت الی صهیب فقلت ارتحل فالحق بامیر المومنین فلما اصیب عمر دخل صهیب یبکی یقول وا اخاه وا صاحباه فقال عمر رضی الله عنه یا صهیب اتبکی علی و قد قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان المیت لیعذب ببعض بکاء اهله علیه قال ابن عباس رضی الله عنهما فلما مات عمر ذکرت ذلک بعائشة رضی الله عنها فقالت یرحم الله عمر والله ما حدث رسول الله صلی وسلم ان الله لیعذب المومن ببکاء اهله علیه لکن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان الله لیزید الکافر عذاباً ببکاء اهله علیه و قالت حسبکم القرآن ولا تزر وازرة وزرا اخریٰ قال ابن عباس رضی الله عنهما عند ذلک والله هو اضحک و ابکی قال ابن ابی ملیکة والله ما قال ابن عمر رضی الله عنهما شیئاً'' ماحصل اس کا یہ ہے کہ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں، کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ میں حاضر ہوئے جن میں ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے، زنانہ سے رونے کی آواز آئی، عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کے فرزند سے کہا: کیا آپ عورتوں کو رونے سے نہیں منع کرتے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہل میت کے رونے سے میت پر عذاب کیا جاتا ہے۔ اُس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عمر

رضی اللہ عنہ بھی کچھ ایسا ہی کہا کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ زخمی ہوئے تو صہیب رضی اللہ عنہ آئے اور ''وا اخاہ اور واصاحباہ'' کہتے ہوئے زارزار رونے لگے' عمر رضی اللہ عنہ نے اُس حالت میں اُن سے کہا: اے صہیب کیا تم مجھ پر روتے ہو؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب میت کے علاقہ دار اُس پر روتے ہیں تو بعض اسباب سے اُس پر عذاب کیا جاتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا تذکرہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا، انہوں نے فرمایا: خدائے تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے، خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ کسی کے رونے سے مسلمان پر عذاب ہوتا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ رونے سے کافر پر عذاب زیادہ ہوتا ہے اور اُسی پر کافی استدلال یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔''ولا تزر وازرۃ وزر اخری'' یعنی کسی پر دوسرے کے گناہ کا بوجھا نہیں ڈالا جاتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کر کے کہا رلانا اور ہنسانا خدا ہی کا کام ہے۔ ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ دیکھئے عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث سے استدلال کیا تھا اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجتہاد کر کے فرمایا کہ پہلے تو اس حدیث میں مسلمان کا ذکر ہی نہیں' پھر قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے گناہ کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاتی' اس لئے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رونے کی وجہ سے کافروں پر عذاب زیادہ ہوتا ہے اس لئے کہ اُن کو عذاب کرنا ہر طرح مقصود ہے، جب رونے والے اُس کی نسبت کوئی تعظیمی الفاظ وغیرہ کہتے ہیں تو فرشتوں کا غضب زیادہ ہو جاتا ہے اور سخت عذاب کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ آیات و احادیث کا مطلب سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں، اُس کے سمجھنے کے لئے دوسرے احادیث و آیات سے مدد لینے کی ضرورت ہے اور اُس کے لئے فہم کامل اور رائے صائب کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ہر کلام کے وقت کوئی ایک مقصود پیش نظر رہتا ہے،

جس کے اظہار کے لئے وہ کلام کہا جاتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ جمیع پہلو اور جوانب پر نظر ڈال کر اُس کو مثل تعریف کے جامع و مانع بنا دیا جائے، مثلاً اگر کہا جائے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اہل الرائے میں ہیں تو اُس سے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ سمجھدار اور صاحب رائے تھے یہ نہیں سمجھا جائیگا کہ اُن کو حدیث آتی نہ تھی اور نہ یہ کہ اپنی رائے سے وہ خلاف قرآن وحدیث مسئلے نکالتے تھے اور نہ یہ کہ سوائے اُن کے کسی محدث کو رائے صائب نصیب ہی نہ ہوئی، پھر اگر اُس کے ساتھ کچھ قرائن بھی ہوتو بحسب قرائن دوسرے مقاصد بھی معلوم ہوں گے، مثلاً یہی جملہ مدح کے مقام میں دوسرے محدثوں کے ذکر کے ساتھ کہا جائے تو اُس سے متکلم کا مقصود یہ معلوم ہوگا کہ تمام محدثین میں وہ اعلیٰ درجے کے شخص تھے احادیث کو خوب سمجھتے تھے، چنانچہ اکابر محدثین نے اسی غرض سے اُن پر اس لفظ کا اطلاق کیا تھا، جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے مگر حاسدوں کو صرف لفظ سے موقع مل گیا اور دوسرے قرائن کو نظرانداز کر کے کہنے لگے کہ اُن کو حدیث آتی ہی نہ تھی، صرف عقل سے باتیں بنایا کرتے تھے۔ غرضکہ ہر کلام میں ایک خاص مقصود پیش نظر ہوتا ہے جو قرائن سے معلوم ہوتا ہے تمام مضامین کا احتواء اُس سے مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے اہل رائے اور مجتہدین قرائن اور معانی اور دوسرے احادیث و آیات پر نظر ڈال کر اُس کا حکم اُسی حصہ کے ساتھ خاص کرتے ہیں جو وہاں مقصود ہوتا ہے اور دوسرے احکام پر اُس کا اثر نہیں ڈالتے۔ بخلاف اس کے جن کو اس درجہ کی قوت نہیں ہوتی اُس کو ظاہر پر حمل کر کے مقصود فوت کر دیتے ہیں، جیسا کہ اس حدیث شریف سے جو مسلم میں ہے' یہی بات ظاہر ہے۔ مضمون اس حدیث کا یہ ہے کہ عروہؓ کہتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے میں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اگر کوئی شخص صفا و مروہ میں سعی نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا، انہوں نے فرمایا: کیا وجہ؟ میں نے کہا: اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ''ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ

فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما'' یعنی صفا ومروہ نشانیاں ہیں، اللہ کی جو کوئی حج کرے اُس گھر کا یا زیارت' تو گناہ نہیں اُس کو کہ طواف کرے اُن دونوں میں ۔ اِس سے ظاہر ہے کہ سعی نہ کرنا چاہئے اور اگر کوئی کرلے تو مضائقہ بھی نہیں ۔ انہوں نے فرمایا بات یہ ہے کہ جاہلیت میں وہاں دو بُت تھے جن کا نام اساف اور نائلہ تھا، انصار کی عادت تھی کہ سمندر کے کنارے سے احرام باندھ کر آتے اور اُن کا طواف کرتے اور بعض منات کے نام سے احرام باندھتے ،تو وہ صفا ومروہ کے طواف کو حرام سمجھتے تھے پھر جب وہ مسلمان ہوئے اور حج کرنا چاہا تو اُن بتوں کے خیال سے صفا و مروہ کی سعی کو مکروہ سمجھنے لگے ۔ اُس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر سعی کریں تو کچھ مضائقہ نہیں اس لئے کہ اب نہ وہ بُت رہے نہ وہ نیت ، پھر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعی کی اور تمام مسلمانوں نے اقتداء کی ،جس سے سعی مسنون اور ضروری ہوگئی ۔ اگر یہ مقصود ہوتا کہ طواف نہ کریں تو مضائقہ نہیں ،جیسا کہ تم نے خیال کیا ہے تو ''**فلا جناح علیہ ان لا یطوف بھما**'' ہوتا ۔ اب دیکھئے کہ ظاہر قرآن سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ طواف نہ کرنا بہتر ہے ،مگر چونکہ عائشہ رضی اللہ عنہا شان نزول پر مطلع اور اُس واقعہ سے واقف تھیں ،اس لئے اُسی آیت سے جواب دے دیا کہ آیت میں یہ کہاں ہے کہ طواف نہ کریں تو مضائقہ نہیں ۔ جیسا کہ تم سمجھتے ہو اور یہ بات ثابت کردی کہ اس موقع میں اسی قدر ضرورت تھی کہ طواف کو جو مکروہ سمجھتے تھے اُن کے ذہن سے نکل جائے اب رہی یہ بات کہ وہ ضروری ہے یا نہیں؟ اور اُس کا وقت کونسا ہے؟ اور اُس کے نہ کرنے میں مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا؟ سو یہ امور دوسرے ہیں ان سب کا فیصلہ ایک ہی بات میں کردیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماویں اُس کو قبول کرلو **کما قال تعالیٰ** '' **ما اٰتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا**'' ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر چند قرآن شریف میں سب کچھ ہے اور

بحسب آیۂ شریفہ ''الیوم اکملت لکم دینکم'' دین کی تکمیل بھی ہوچکی، مگر بغیر قبول احادیث کے کسی کا دین کامل نہیں ہوسکتا۔ غرضکہ فہم مضامین ہر کسی کا کام نہیں۔ درمنثور میں ہے ''و اخرج احمد و عبد ابن حمید والبخاری و مسلم و ابن المنذر و ابن مردویه عن علقمة قال قال عبدالله ابن مسعود رضی الله عنهما لعن الله الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات لخلق الله فبلغ ذلک امراة من بنی اسد یقال لها ام یعقوب فجاء ت الیه فقالت انه بلغنی انک لعنت کیت و کیت قال و مالی لا العن من لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم و هو فی کتاب الله قالت قرأت ما بین الدفتین فما وجدت فیه شیئاً من هذا قال لئن کنت قرأته لقد وجدتیه اما قرأت و ما اٰتاکم الرسول فخذوه و ما نهاکم عنه فانتهوا . قالت بلی قال فانه نهی عنه ''یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خدا کی لعنت ہے اُن عورتوں پر جو چٹلا لگاتی ہیں اور لگواتی ہیں اور چہرہ کے بال چنواتی ہیں اور دانتوں کو ریت کے حسن کی غرض سے تخلیق الٰہی میں تغیر کردیتی ہیں۔ یہ سنکر قبیلہ بنی اسد سے ایک عورت آئی، جس کو ام یعقوب کہتے تھے اور کہا کہ مجھے یہ بات پہونچی ہے کہ آپ فلاں فلاں قسم کی عورتوں پر لعنت کرتے ہیں۔ فرمایا: جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اور خود قرآن میں موجود ہو تو مجھے لعنت کرنے میں کیا تامل؟ کہا میں نے پورا قرآن پڑھا اُس میں تو یہ بات کہیں نہیں۔ فرمایا: اگر تو نے قرآن پڑھا ہوتا تو اُس کو ضرور پاتی، پھر فرمایا کہ یہ آیت نہیں ہے؟ ''ما اٰتاکم الرسول فخذوه الایة''یعنی رسول جو حکم تمہیں دیں اُس کو قبول کرو اور بجالاؤ، اور جس بات سے منع کریں اُس سے باز رہو اُس نے کہا ہاں یہ تو ہے فرمایا: حضرت نے ان کاموں سے منع فرمادیا ہے۔ دیکھئے قرآن

میں ان عورتوں پر لعنت ہونے کا کہیں ذکر نہیں، مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے استنباط کر کے صاف کہہ دیا کہ وہ قرآن میں مذکور ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اگر تمام صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے اجتہاد لکھے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائیگی۔ یہ سلسلہ امام بخاریؒ تک بھی جاری رہا، چنانچہ انہوں نے بھی بہتیرے مسائل میں اجتہاد کئے، جو بخاری شریف میں مذکور ہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ آدمی کے بال جس پانی سے دھوئے جائیں وہ پانی پاک ہے۔ اگرچہ صراحۃً یہ بات نہیں لکھی مگر ایک باب مدون کیا، جس کا عنوان یہ ہے ''**باب الماء الذی یغتسل بہ شعر الانسان**'' اور اُس میں اس حدیث کو نقل کیا ''**عن ابن سیرین قال قلت لعبیدۃ عندنا من شعر النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصبناہ من قبل انس او من قبل اھل انس فقال لان تکون عندی شعرۃ منہ احب الی من الدنیا و ما فیھا**'' یعنی ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے کہا کہ ہمارے یہاں چند موئے مبارک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو انس رضی اللہ عنہ کے یہاں سے ہمیں ملے ہیں، انہوں نے کہا کہ اگر اُن میں سے ایک موئے مبارک بھی میرے پاس ہوتا تو وہ دنیا اور اُس میں جتنی چیزیں ہیں۔ سب سے زیادہ تر محبوب ہوتا۔ قسطلانیؒ نے اس کی شرح میں لکھا: ہے ترجمۃ الباب سے اس حدیث کو یہ مناسبت ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے موئے مبارک کی حفاظت کی اور عبیدہؒ نے اُس کی آرزو کی اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً بال پاک ہیں۔ اور جب وہ پاک ہیں تو جس پانی سے وہ دھوئے جائیں وہ بھی پاک ہوگا۔ مگر اُس پر یہ اعتراض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک فی نفسہ مکرم ہیں، اُن پر دوسرے بالوں کا قیاس کیونکر صحیح ہوگا؟ اور اُس کا جواب دیا گیا کہ خصوصیت بغیر دلیل کے نہیں ثابت ہوسکتی اور اصل عدم خصوصیت ہے، مگر اُس کا بھی معارضہ کیا گیا جس کا بیان

طویل ہے انتہی ۔

یہ بحث دوسری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک دنیاومافیہا سے بہتر ہیں ۔اُن پر ہرکس وناکس کے بالوں کا قیاس کرنا اور اُس سے یہ مضمون پیدا کرنا کہ اُن کا دھویا ہوا پانی پاک ہے ۔عقلاً اوراعتقاداًدرست ہے یانہیں؟ حالانکہ نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیشاب پی لیا مگر حضرت نے سوائے اس کے کچھ نہ فرمایا کہ تمہارے پیٹ میں اب کوئی بیماری نہ ہوگی ۔غرضکہ حضرت کے فضلات وغیرہ کے خصوصیات کچھ اور ہی تھے ان پر قیاس نہیں ہوسکتا ۔مگراس سے یہ تو ضرور ثابت ہے کہ امام بخاریؒ نے بھی اجتہاد کیا ۔

قیاسِ جائز وناجائز

غرضکہ اجتہاد کے باب میں جو احادیث وروایات وارد ہیں بکثرت ہیں ۔ ہر چند اجتہاد کا مفہوم ایسا وسیع ہے کہ قیاس مجتہدین بھی اُس میں داخل ہے، مگر چونکہ قیاس کے جواز وعدم جواز میں جھگڑے پڑے ہوئے ہیں چنانچہ بعض ''اول من قاس ابلیس'' کے لحاظ سے قیاس کو جائز نہیں رکھتے ۔اور بعض اُس میں یہاں تک توسیع کردیتے ہیں کہ ابلیسانہ قیاس کی بھی کچھ پروانہیں کرتے ،اس لئے اس میں بحث کی ضرورت ہے تا کہ حدافراط وتفریط پیش نظر رہے اور معلوم ہوجائے کہ کس قسم کا قیاس جائز ہے اور کس قسم کا ناجائز ۔سنن دارمی میں روایت ہے ۔'' **عن الحسن انه تلا هذه الاية خلقتنى من نار وخلقته من طين قال قاس ابليس وهو اول من قاس**'' یعنی حسن بصریؒ نے یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس نے حق تعالیٰ سے کہا: تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو کیچڑ سے، حسن بصریؒ نے یہ آیت پڑھ کر کہا کہ ابلیس نے قیاس کیا اور سب سے پہلے جس نے

قیاس کیا وہی ابلیس ہے۔ یہاں غور و تامل کر کے اِس قیاس کی حقیقت کو پہلے سمجھ لیجئے، تاکہ آئندہ تطبیق کے وقت پیروانِ ابلیس اور پیروانِ سنت میں فرق کرنا آسان ہو۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ابلیس نے جو قیاس کیا اُس سے مقصود اُس کا یہ تھا کہ خدائے تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے سجدہ کا حکم جو اُس کو فرمایا تھا، وہ باطل کردے اور الٹی اپنی فضیلت اُن پر ثابت کرے۔ اس غرض سے اُس نے یہ قیاس پیش کیا کہ جس طرح نارؔ خاک سے افضل ہے، میں بھی آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جو بات قرآن و حدیث سے صراحۃً ثابت ہو، اُس کے ابطال کی غرض سے قیاس پیش کیا جائے تو وہ پیروی ابلیس ہوگی۔ سلف صالح نے جس قیاس کی مذمت کی ہے، وہ یہی قیاس ہے۔ دارمی میں شعبیؒ سے روایت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شریحؒ سے کسی نے پوچھا کہ انگلیوں کی دیت کیا ہے؟ انہوں نے کہا: دس دس درہم، اس نے کہا کیا خنصر اور ابہام برابر ہیں شریحؒ نے کہا: کہ کان اور ہاتھ کی دیت بھی برابر ہے۔ حالانکہ کان کو سر کے بالوں سے اور عمامہ سے ڈھانپ سکتے ہیں، پھر کہا کہ تمہارے قیاس پر سنت سابق ہے، اسی کی اتباع کرو اور بدعت سے بچو اور جب تک سنت کی اتباع کرتے رہو گے گمراہ نہ ہوگے، پھر شعبیؒ نے کہا اگر احنف جو عقل و تدبیر میں ضرب المثل ہے مارا جائے، تو اُس کی دیت اور اُس لڑکے کی دیت برابر ہوگی، جو ہنوز گہوارہ میں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے سائل کا مقصود تھا کہ بحسب عقل خنصر اور ابہام کی دیت برابر نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ اِن دونوں کی قوت اور مصالح و فوائد میں فرق بیّن ہے۔ یہی قیاس ابلیسانہ ہے۔ اس لئے کہ اُس سے حکم شرعی کا ابطال یا اُس پر اعتراض مقصود ہے، اس قسم کے قیاس کا مقتضیٰ یہی ہے کہ حلال چیزیں حرام ہوجائیں اور حرام حلال، جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ ''**عن الشعبی قال واللہ لئن اخذتم بالمقائس لتحر من الحلال و لتحلن الحرام رواہ الدارمی**'' یعنی اگر

تم قیاس کرنے لگو گے تو حلال کوحرام اور حرام کو حلال کردو گے۔اس لئے کہ جب احکام شرعیہ کے مقابلہ میں اپنی عقل سے کام لیا جائے‘ تو وہی دین بن جائیگا، جوتراشیدہ عقل ہے اور خدا کا مقرر کیا ہوا دین باقی نہ رہے گا پھر اس تراشیدہ دین سے دین اسلام کو تعلق ہی کیا؟ اور جب اُس دین کو اسلام سے تعلق نہ ہوتو اُس دین کو تراشنے والے اور عمل کرنے والے کو کیا تعلق؟ غرضکہ جو کوئی ابلیسانہ قیاس کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دے اُس کو مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ چہ جائے کہ سید الفقہاء وغیرہ القاب جو محدثین نے امام اعظمؒ کی نسبت استعمال کئے ہیں۔

مفاسدِ انکارِ قیاساتِ امام صاحب علیہ الرحمتہ

اب اور سنیئے بجائے اس کے کہ امام صاحب کے قیاسات سے حرام حلال اور حلال حرام ہونے کا خیال کیا جائے، اکابر محدثین کی تصریح سے ثابت ہے کہ اگر اُن کے اقوال کو کوئی نہ دیکھے تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے گا۔ اور ان ہی قیاسات اور تفقہ پر وہ حضرات اعتراف کررہے ہیں کہ ہم عطار اور آپ طبیب ہو اور امیر المونین فی الحدیث کہہ رہے ہیں کہ جب تک ابوحنیفہ سے مجھے ملاقات نہ ہوئی حلال وحرام کے اصول مجھے معلوم نہ ہوئے اور اس کے سوا جو جو تعریفیں اُن کے علم وتفقہ وغیرہ کی محدثین نے کی ہیں، وہ تو بے حساب ہیں۔اگر فی الواقع آپ کے قیاس مخالف حدیث ہوتے تو جتنے محدثین نے آپ کی توثیق اور مدح کی ہے، وہ معاذ اللہ ایک کافر یا فاسق کی توثیق اور مدح سمجھی جاتی اور اس تقدیر پر بحسب اصولِ فن حدیث اُن اکابر دین کی جرح وتعدیل بے اعتبار محض ثابت ہوتی۔ اور اس بے اعتباری کا اثر جرح وتعدیل ہی تک محدود نہ ہوتا، بلکہ اُن کی کل احادیث مرویہ بھی بے اعتبار ہوجاتے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ ضرورت واقع ہوگی کہ بخاری شریف سے وہ

حدیثیں خارج کر کے ایک نئی بخاری بنائی جائے ۔اور چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ جن حضرات پر احادیث صحیحہ کی اسنادوں کا مدار ہے' وہ سب امام صاحب کے مداح ہیں ۔اس وجہ سے تعجب نہیں کہ پوری بخاری شریف ہاتھ سے جاتی رہے ۔غرضکہ امام صاحب کے قیاسوں اور رائے میں کلام کرنے کا یہ اثر ہوگا کہ بخاری بلکہ کل صحاح بے اعتبار ہو جائیں گے ۔اِس لئے اہل حدیث کو طوعاً و کرہاً یہ ماننا پڑیگا کہ امام صاحب کے قیاس اور رائے ہرگز مخالف شرع شریف نہیں ۔روایت ہے کہ کسی نے امام صاحب کے قیاس پر اعتراض کر کے ''اول من قاس ابلیس '' کہا تھا، آپ نے جواب دیا کہ ابلیس نے اپنے قیاس سے خدا کے کلام کو رد کیا تھا، جس سے کافر ہوا اور ہم قیاس کو کتاب وسنت اور اقوال صحابہ کی طرف پھیرتے ہیں جس سے اتباع مقصود ہے اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب اُس قسم کے قیاس کو کفر سمجھتے تھے۔

قیاس' قرآن وحدیث میں موجود ہے

پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ قیاس کا طریقہ خود قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔''**یا ایها الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض و لا تیمموا الخبیث منه تنفقون و لستم باٰخذ یه الا ان تغمضوا فیه** '' اس میں ارشاد ہے کہ اپنے پاکیزہ مال کو خرچ کرو، کیونکہ جس طرح تم بری چیز کے لینے کو ناپسند کرتے ہو دوسرا بھی اُس کے لینے کو ناپسند کرے گا۔ دیکھئے اس میں مال خبیث کے دینے کا قیاس اُس کے لینے پر کیا گیا۔

اوراس حدیث شریف سے بھی یہی ظاہر ہے۔''**عن ابن عباس رضی الله عنهما ان امراة من جهینة جاء ت الی النبی صلی الله علیه وسلم و قالت ان**

امی نذرت ان تحج فلم تحج حتی ماتت افاحج عنها قال نعم حجی عنها ارایت لو کان علی امک دین اکنت قاضیة اقضوا الله فالله احق بالوفاء رواه البخاری. ''یعنی ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میری ماں نے حج کی نذر کی تھی اور بغیر ایفائے نذر کے مرگئی، کیا میں اُس کی طرف سے حج کروں؟ فرمایاہاں! اگر تیری ماں پر کسی کا قرض ہوتا تو کیا تو اُس کو ادا نہ کرتی؟ پھر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے حق کو ادا کرو، وہ زیادہ تر اس کا مستحق ہے کہ اُس کے حقوق ادا کئے جائیں۔

دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر کا قیاس قرضہ پر فرما کر مجتہدوں کو اجتہاد کا طریقہ بتلا دیا۔ ورنہ نظیر پیش کرنے اور قیاس کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ''نعم حجی عنها'' فرما دینا کافی تھا۔ اسی طرح حضرت کا قیاس فرمانا اس روایت سے ثابت ہے۔

''عن ابی هریرة رضی الله عنه ان اعرابیا اتی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال ان امرأتی ولدت غلاماً اسود وانی انکرته فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم هل لک من ابل قال نعم قال فما الوانها قال حمر قال هل فیها من ازرق قال اِنّ فیها لورقاً فقال فاین تری ذلک قال عرق نزعها قال فلعل عرق نزعه ولم یرخص له فی الانتفاء منه متفق علیه المشکوة'' یعنی ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری عورت نے سیاہ رنگ کا لڑکا جنا ہے۔ اس لئے میں نے اُس کا انکار کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کیا تمہارے یہاں اونٹ ہیں؟ کہا ہیں! فرمایا: اُن کے رنگ کیسے ہیں؟ کہا سرخ، فرمایا کیا ان میں کوئی خاکی بھی ہے؟ کہا ہے، فرمایا سرخ رنگ والوں میں خاکی کہاں سے آ گیا، کہا: شاید اصل میں کوئی اس رنگ والا بھی ہوگا۔ فرمایا تمہارے لڑکے میں بھی یہی بات ہوگی۔ غرضکہ یہ قیاس پیش کر کے نفی نسب کی رخصت نہ دی۔ دیکھئے یہاں بھی وہی قیاس ہے کہ اونٹ کے

رنگ پرآدمی کے رنگ کو قیاس فرمایااورروایت بھی اسی کی موید ہے۔’’عن انس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الصائم یقبل قال لا باس ریحانۃ یشمھا کذا فی کنزالعمال ‘‘یعنی کسی نے حضرت سے پوچھا کہ اگر روزہ دار بوسہ لےتو اُس کا کیاحکم ہے؟ فرمایا: کچھ مضائقہ نہیں۔وہ ایسا ہے جیسے ریحان کا سونگنااورکشف بزدوی میں یہ روایت نقل کیا ہے۔’’ قولہ علیہ السلام لام سلمۃ رضی اللہ عنھا و قد سئلت عن قبلۃ الصائم قال ھلا اخبرتیہ انی اقبل انا صائم‘‘ یعنی ام سلمہ سے کسی نے پوچھا کہ صائم کے بوسہ لینے کاحکم کیا ہے؟انہوں نے حضرت سے ذکر کیا ارشاد ہوا کہ تم نے سائل سے کیوں نہیں کہہ دیا کہ میں روزہ کی حالت میں بوسہ لیا کرتا ہوں۔مقصوداس سے قیاس کی تعلیم تھی کہ حضرت کےفعل پراوروں کےفعل کو قیاس کر کے کیوں نہیں جواب دیااوراس کی تائیداُن حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔جن میں احکام کے ساتھ علتیں بھی بیان کی گئیں۔مثلاً فرمایا کہ بلی کا جھوٹا نجس نہیں،اس لئے کہ وہ گھر میں پھرتی رہتی ہیں،مقصود یہ کہ اُن سے پانی کا بچانا مشکل ہے۔اس علت کے بیان فرمانے سے مقصود حضرت کا ظاہر ہے کہ جن جانوروں میں یہ علت پائی جائے اُن کا بھی جھوٹا نجس نہ ہوگا،ورنہ اس علت کا بیان کرنا بے فائدہ ہوتا۔

قیاساتِ صحابہ

انہی امور پرغورکر کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے قیاس کا طریقہ سیکھ لیا۔اوراُن میں جواہل رائے تھے وہ برابر قیاس سے استنباط مسائل کیا کرتے تھے۔اگراُس کی کل نظائر لکھی جائیں تو کتاب ضخیم ہوجائیگی۔اس لئے چند نظائر بطور’’مشتے نمونہ ازخروارے‘‘ یہاں لکھی جاتی ہیں’’عن عروۃ ان عائشۃ رضی اللہ عنھا اخبرتہ انہ جاء افلح اخوابی

القعیس یستاذن علیها بعد ما نزل الحجاب و کان ابو القعیس ابا عائشةؓ من الرضاعة قالت عائشة فقلت واللہ لا آذن لافلح حتی استاذن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فان ابا القعیس لیس هو ارضعتنی و لکن ارضعتنی امراته قالت عائشة فلما دخل رسول اللہ علیه وسلم قلت یا رسول اللہ ان افلح اخا ابی القعیس جاء نی یستاذن علی فکرهت ان اٰذن له حتی استاذنک قال قالت فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم ائذنی له قال عروة فبذلک کانت عائشةؓ تقول حرموا من الرضاعة ما تحرمون من النسب رواه مسلم"۔حاصل اِس کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو صرف رضاعی چچا کے روبرو ہونے کی اجازت دی تھی ، اُس پر انہوں نے قیاس کر کے کہا کہ جو نسبی ناتے حرام ہیں وہ ناتے رضاعی بھی حرام ہیں۔

"عن ابی هریرة قال لما توفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم و استخلف ابوبکر بعده و کفر من کفر من العرب قال عمر ابن الخطاب لابی بکر کیف تقاتل الناس و قد قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا اله الا اللہ فمن قال لا اله الا اللہ فقد عصم منی ماله ونفسه الا بحقه و حسابه علی اللہ تعالیٰ فقال ابوبکر لاقاتلن من فرق بین الصلوٰة والزکوة فان الزکوٰة حق المال واللہ لو منعونی عقالا کانو یودونه الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لقاتلتهم علی منعه فقال عمر ابن الخطاب فواللہ ماهو الا ان رایت اللہ قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق رواه البخاری و مسلم"

ماحصل اس کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ایک انقلاب عظیم برپا ہوا کہ بعضے عرب تو بالکل کافر ہی ہوگئے اور بعضے مرتد تو نہ ہوئے مگر زکوٰۃ دینے سے انکار کر گئے۔ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدوں سے جہاد کر کے چاہا کہ اُن لوگوں سے بھی جہاد کریں جو زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں۔عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ اُن لوگوں سے کیونکر جہاد کروگے، وہ تو لا الہ الا اللہ کے قائل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کا قائل ہوگیا اُس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچالیا اور اندرونی معاملہ اور محاسبہ اُس کا خدا کے ساتھ ہے۔ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اُن لوگوں سے ضرور جہاد کرونگا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے قسم ہے خدا کی اگر رسی کا ایک ٹکڑا جو حضرت کے زمانہ میں ادا کرتے تھے مجھے نہ دیں تو میں اُن سے ضرور جنگ کرونگا۔ عمر رضی اللہ عنہ یہ سنکر قائل ہوگئے اور کہا کہ اُن کو اس باب میں شرح صدر ہوا اور میں سمجھ گیا کہ وہی بات حق ہے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہی۔

اب دیکھئے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو وہ حدیث یاد تھی کہ **" من قال لا الہ الا اللہ عصم منی مالہ و نفسہ "** اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی اُس کو جانتے تھے مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد نے یہ فتویٰ دیا کہ گو وہ لوگ کلمہ گو ہیں، مگر مستوجب قتل ہیں۔اس لئے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں حالانکہ دونوں خدائے تعالیٰ کے حکم ہیں۔اور یہ بات مسلم ہے کہ کسی قبیلہ کے لوگ نماز چھوڑ دیں تو اُن سے جہاد کیا جاتا ہے پھر کیا وجہ کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جہاد نہ کیا جائے؟ غرضکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کا قیاس نماز پر کر کے عمر رضی اللہ عنہ کو ساکت کر دیا اس لئے کہ عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ مجتہد کا قیاس شریعت میں قابل وقعت اور واجب التعمیل ہے۔اس لئے عین مناظرہ میں انہوں نے اُس کو مان لیا اور یہ نہ کہہ سکے کہ حضرت! میں ایک صحیح نص قطعی پیش کر رہا ہوں

جس کا علم آپ کو بھی ہے اور اُس سے ثابت ہے کہ کوئی کلمہ گو زکوٰۃ نہ دینے کے جرم میں قتل نہ کیا جائے اور آپ ایسے نص کے مقابلہ میں اپنا قیاس پیش کرتے ہو جو **اول من قاس ابلیس** سے ناجائز ثابت ہوتا ہے۔

اب اس قیاس کے پرزور اثر اور قوی طاقت کو دیکھئے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خون اُس نے ہدر کر دیا۔ اور کسی صحابی نے چوں و چرا نہ کیا جس سے صحابہ کا اجماع اس بات پر ثابت ہو گیا کہ دین میں قیاس مجتہد بھی گویا ایک مستقل حجت ہے۔ اگر قیاس مجتہد صحابہ کی دانست میں قابل اعتبار نہ ہوتا تو اُس عروج اسلام کے زمانہ میں جس میں حمیت اسلامی کا جوش ہر ایک مسلمان کے رگ و پے میں بھرا ہوا اور نمایاں تھا ممکن نہیں کہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کی ترجیح کو وہ گوارا کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صریح کے مقابلہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیاسی بات چل جاتی۔ کیونکہ وہ زمانہ وہ تھا کہ خلاف شرع کسی کی کوئی بات نہیں چل سکتی تھی۔ تہذیب التہذیب میں امام بخاری کی تاریخ سے نقل کیا ہے کہ ایک روز عمر رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے اور آپ کے اطراف مہاجرین و انصار کا مجمع تھا آپ نے اُن حضرات سے خطاب کر کے کہا کہ اگر کسی کام میں میں تن آسانی کروں تو آپ لوگ کیا کرو گے۔ بشر ابن سعد نے کہا کہ اگر آپ ایسا کرو گے تو ہم آپ کو ایسے سیدھے کر دیں گے جیسے کوئی تیر کو سیدھا کرتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا **انتم اذاً انتم** یعنی تم اُس وقت تم ہو گئے یعنی ایسا ہی کرو گے تو صحابہ سمجھے جاؤ گے۔ اس موقع میں اہل سنت و جماعت میں تو کسی کی مجال نہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قیاس کرنے پر اعتراض کر سکے یا صحابہ کے اجماع کو نہ مانے یا اُس حدیث کی صحت میں کلام کرے۔

اہل حدیث فقہ کی توہین میں **اول من قاس ابلیس** نہایت جرأت سے کہا کرتے تھے۔ سو بفضلہٖ تعالیٰ یقینی طور پر ثابت ہو گیا کہ مجتہدوں کے قیاس پر اس کا اطلاق غلط محض

ہے وہاں یہ کہنا صادق ہے **اول من قاس النبی صلی اللہ علیہ وسلم و تبعہ الصدیق وغیرہ من الصحابة رضی اللہ عنہم ۔**

نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے جو اس مقام میں لکھا ہے، ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے جس کا مطلب اسی کے قریب ہے جو بیان کیا گیا۔ **وھو ھذا و قد اجتمع فی ھذہ القضیة الاحتجاج من عمر بالعموم و من ابی بکر بالقیاس و دل ذلک علی ان العموم یخص بالقیاس و ان جمیع ما تضمنہ الخطاب الوارد فی الحکم الواحد من شرط و استثناء مراعی فیہ و معتبر صحتہ فلما استقر عند عمر صحة رای ابی بکر و بان لہ صوابہ تابعہ علی قتال القوم وھو معنی قولہ فعرفت انہ الحق یشیر الی انشراح صدرہ بالحجة التی اتی بھا و البرھان الذی اقامہ نصا و دلالة** ۔ قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ ابوبکر کی صحت رائے عمر رضی اللہ عنہ پر ظاہر ہوگئی اِس سے ظاہر ہے کہ باوجودیکہ عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں **کان رایہ موافقاً للوحی والکتاب** وارد ہے۔ مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے اُن سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

لقب ’’اہلِ رائے‘‘ مدح ہے

امام صاحب جو اصحاب الرائے کے سرگروہ مانے جاتے ہیں اُس کی وجہ یہی تفاضل رائے ہے یعنی اکابر محدثین نے دیکھا کہ صاحب الرائے تو سبھی ہیں مگر اس قابل کہ اصحاب الرائے کہے جائیں۔ ابوحنیفہ اور اُن کے اتباع ہیں اس وجہ سے وہ اُن کا لقب ہی ٹھہرا دیا مگر اہل حسد نے بجائے مدح اُس میں مذموم معنی پیدا کئے جیسے اہل کتاب آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو راعنا کہہ کر اُس سے مذموم معنی مراد لیتے تھے۔

”عن عبداللہ قال لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالت الانصار منا امیر و منکم امیر فاتاھم عمر رضی اللہ عنہ فقال یا معشر الانصار ألستم تعلمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد امر ابابکر رضی اللہ عنہ ان یؤم الناس فایکم تطیب نفسہ ان یتقدم ابابکر رضی اللہ عنہ فقالت الانصار نعوذ باللہ ان نتقدم ابابکر رضی اللہ عنہ رواہ الامام احمد فی المسند “یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے ساتھ ہی انصار نے مہاجرین سے کہا کہ اب ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ لوگوں کی امامت کریں۔ اب کہئے کہ آپ حضرات میں کس کا نفس گوارا کرتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے بڑھے انصار نے کہا ’نعوذ باللہ‘ ہم ہرگز ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

دیکھئے: عمر رضی اللہ عنہ نے اس نازک موقع میں قیاس ہی سے کام لیا کہ جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت میں مقدّم کئے گئے تھے امارت و خلافت میں بھی مقدم کئے جائیں اور انصار اِس قیاس کو رد نہ کرسکے اور کسی کو یہ کہنے کی مجال نہ ہوئی کہ حضرت ہمیں اُن کی خدمت میں پیش امامی میں کلام نہیں ہر نماز میں ہم اُن کی اقتداء کیا کریں گے۔ مگر ہمارا کلام امارت و خلافت میں ہے جس سے تمام اہل اسلام کے جان و مال وحقوق اور حکمرانی اور اشاعت اسلام وغیرہ امور متعلق ہیں۔ اب قیاس کی وقعت و برکت کو دیکھئے کہ کیسے عظیم الشان معاملہ کو جس میں لاکھوں جانیں تلف ہوا کرتی ہیں کس آسانی سے طے کر دیا۔ وجہ اس کی کیا تھی انصار رضی اللہ عنہم کا تدین اور احقاق حق کی خواہش۔ جب انہوں نے اس قیاس میں غور کیا اور آثار حقانیت اُن سے نمایاں ہوئے از راہ تدین فوراً اس کو

قبول کرلیا گو اُس میں اُن کا سراسر نقصان تھا۔غور کیجئے کہ اسلام میں پہلا مہتم بالشان واقعہ جو پیش آیا وہ امر خلافت تھا۔اور وہ بمقابلہ مہاجرین وانصار صرف قیاس سے طے ہوا۔ یہ واقعہ تمام صحابہ کی گواہیاں پیش کر رہا ہے کہ کل صحابہ قیاس کو فقط مانتے ہی نہ تھے بلکہ بڑے بڑے مہتم بالشان مسائل کا فیصلہ اُسی پر محول کرتے تھے اور اہل رائے کے اتباع اور امتثال کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔اب اس سے بڑھ کر قیاس کے مشروع ہونے پر کونسا اجماع ہوسکتا ہے۔؟

”عن ابن عباس قال قلت لعثمان ماحملکم علی ان عمدتم الی سورة الانفال و ھی من المثانی و الی سورة برائة وھی من المئین فقرنتم بینھما و لم تکتبوا بینھما سطر ابسم الله الرحمن الرحیم فوضعتموھا فی السبع الطوال فما حملکم علی ذلک قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم مما یاتی علیه الزمان وھو ینزل علیه من السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیه الشئ دعا بعض من یکتب له فیقول ضعوا ھذه فی السورة التی یذکر فیھا کذا و کذا اذا نزلت علیه الآیات قال ضعوا ھذه الآیات فی السورة التی یذکر فیھا کذا و کذا واذا نزلت علیه الایة قال ضعوا ھذه الاٰیة فی السورة التی یذکر فیھا کذا و کذاو کانت سورة الانفال من اوائل ما نزل بالمدینة و کانت سورة براء ة من اواخر ما انزل من القرآن قال فکانت قصتھا شبیھا بقصتھا فظننا انھا منھا و قبض رسول الله صلی الله علیه وسلم و لم یبین لنا انھا منھا فمن اجل ذلک قرنت بینھما و لم اکتب بینھما سطر بسم الله الرحمن الرحیم و وضعتھا فی السبع الطوال رواه امام الاحمد فی المسند “۔یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے

عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے سورہ انفال کو جو چھوٹی سورت ہے، سورۂ برأت کے ساتھ کیوں ملا دیا؟ کہا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورے اُترتے تھے اور جب آیتیں اُترتیں تو فرماتے کہ جس سورۃ میں فلاں قسم کا ذکر ہے اُس میں اِن آیات کو لکھ دو اور سورہ انفال مدینہ میں اوائل میں اُترا تھا اور سورہ توبہ قرآن کے آخر میں اُترا اور حضرت نے اُن کے بارہ میں کچھ نہیں فرمایا اور مضمون دونوں کے باہم مشابہ تھے اس لئے اُسی قیاس پر ہم نے دونوں کو ملا دیا جو حضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم بلحاظ مضمون آیتوں کو سورتوں میں داخل فرماتے تھے اور دونوں کے درمیان میں بسم اللہ نہیں لکھی دیکھئے عثمان رضی اللہ عنہ نے ترتیب قرآن میں بھی قیاس کو دخل دیا۔

''عن علی رضی اللہ عنه قال لما توفی ابو طالب اتیت النبی صلی اللہ علیه وسلم فقلت ان عمک الشیخ قد مات قال اذهب فواره ثم لا تحدث شیئًا حتی تاتینی قال فواریته ثم اتیته قال اذهب فاغتسل ثم لاتحدث شیئًا حتی تاتینی قال فاغتسلت ثم اتیته قال فدعا لی بدعوات ما یسرنی ان لی بها حمر النعم و سودها قال وکان علی رضی اللہ عنه اذا غسل المیت اغتسل رواہ الامام احمد فی مسنده'' ۔یعنی علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب میرے والد ابو طالب کی وفات ہوئی تو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کے بوڑھے چچا مر گئے ۔فرمایا جاؤ اُن کو خاک میں چھپا دے کر بغیر اِس کے کہ کوئی دوسرا کام کرو میرے پاس چلے آؤ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا پھر فرمایا کہ جاؤ اور غسل کر کے فوراً میرے پاس آؤ! اور کوئی دوسرا کام نہ کرو جب میں غسل کر کے حاضر ہوا تو حضرت نے میرے لئے ایسی دعائیں کیں کہ اگر سرخ وسیاہ اونٹ اُن کے معاوضہ میں مجھے مل جاتے تو ویسی خوشی مجھے نہ ہوتی ۔راوی کہتے ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ

کی عادت تھی کہ جب کسی میت کو غسل دیتے تو آپ بھی اُس کے بعد غسل کر لیتے۔ دیکھئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا نہ اور کسی سے کہ غسل میت بھی موجب غسل ہے مگر علی کرم اللہ وجہہ نے اُس حکم خاص پر قیاس کر کے ہر میت کے غسل کے بعد غسل کرنے کا التزام کرلیا تھا۔

تفسیر درمنثور میں یہ روایت ہے کہ کسی عورت نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے یا امہ کہا آپ نے فرمایا۔ **انا ام رجالکم و لست ام نسائکم** یعنی میں مردوں کی ماں ہوں عورتوں کی ماں نہیں ہوں۔ یہ اس وجہ سے فرمایا کہ قرآن شریف میں ''**النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم و ازواجه امهاتهم**'' وارد ہے۔ اور امہاتھم کی ضمیر مردوں کی طرف پھرتی ہے مگر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں مردوں اور عورتوں دونوں کی ماں ہوں ''**کما قال و اخرج ابن سعد عن ام سلمة قالت انا ام الرجال منکم و النساء**۔'' حاصل یہ کہ آپ نے مردوں پر عورتوں کو قیاس کیا اور فرمایا کہ جیسے مرد ویسی عورتیں' حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں دونوں شریک ہیں۔ اس وجہ سے عورتوں کی بھی ماں ہونا ثابت ہے۔

''**عن ابن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یقبضه قال ابن عباس و احسب کل شئ بمنزلة الطعام رواه مسلم**''، یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص غلہ خرید کرے تو جب تک قبضہ نہ کرلے، اُس کو دوسرے کے ہاتھ نہ بیچے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ ہر چیز بمنزلہ غلہ ہے جب تک قبضہ نہ کرے نہ بیچے۔ دیکھئے کہ غلہ پر سب چیزوں کا قیاس انہوں نے کیا۔

''**عن ابی هریرة انه قال لمروان احللت بیع الربا فقال ما فعلت فقال**

ابو ھریرة احللت بیع الصکاک و نھی رسول اللہ علیہ وسلم عن بیع الطعام حتی یستوفیٰ فخطب مروان الناس فنھی عن بیعھا قال سلیمان فنظرت الی حرس یأخذونھا من ایدی الناس رواہ مسلم'' یعنی ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے مروان سے کہا تم نے بیع ربوا کو حلال کر دیا انہوں نے کہا یہ تو میں نے نہیں کیا۔فرمایا جو چک خزانہ سرکاری سے نکلتے ہیں اُن کی بیع تم نے حلال کر دی حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ کو قبل قبضہ بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سنکر مروان نے خطبہ پڑھا اور چکوں کو بیچنے سے منع کر دیا۔سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ سپاہی لوگوں کے ہاتھوں سے چک لے لیتے تھے۔

دیکھئے ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے غلہ کی بیع پر چکوں کی بیع کو قیاس کیا اور اُس کی تعمیل بھی ہوگئی کہ لوگوں کے ہاتھوں سے جن میں صحابہ بھی موجود تھے چکیں چھینی جاتی تھیں اور کسی نے یہ اعتراض نہ کیا کہ حضرت یہ تو کاغذ ہیں غلہ نہیں جس کی بیع حرام ہو۔

''عن ابی ھریرةقول نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجمع الرجل بین المراۃ و عمتھا و بین المرأۃ و خالتھا قال ابن شھاب فنری خالة ابیھا وعمة ابیھا بتلک المنزلة رواہ مسلم ''یعنی منع فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خالہ بھانجی اور پھوپھی، بھتیجی کو کوئی شخص اپنے نکاح میں رکھے۔ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ ہماری رائے میں باپ کی خالہ اور باپ کی پھوپی کا بھی یہی حکم ہے دیکھئے ابن شہابؒ نے بھی اس مسئلہ میں رائے لگائی اور قیاس کیا۔

اِن تصریحات سے ثابت ہے کہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کو رائے اور قیاس سے استنباط مسائل کرنے کا انکار نہ تھا اور کیونکر ہو سکے،رائے وہ چیز ہے جس سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خوشنودی ظاہر فرمائی جیسا کہ اس حدیث شریف میں اس کی

تصریح ہے۔ ’’عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما بعثه الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال فبسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنة رسول اللہ قال اجتهد برائی ولا آلو قال فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی صدره و قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما یرضی به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رواه الترمذی و ابوداؤد و الدارمی کذا فی المشکوة‘‘ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو قاضی بنا کر یمن کی طرف روانہ کرنا چاہا تو اُن سے پوچھا کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آئے تو تم کیا کروگے؟ کہا کتاب اللہ سے حکم کروں گا۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں تم نہ پاؤ تو کیا کروگے کہا حدیث سے حکم کروں گا۔ فرمایا اگر حدیث میں بھی نہ پاؤ تو کیا کروگے؟ کہا رائے سے کام لونگا اور کوشش میں کوتاہی نہ کرونگا یہ سنکر حضرت نے اُن کو شاباشی دی اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات کی توفیق دی کہ اُس سے رسول اللہ راضی ہوں۔

جوابِ ابن حزم

اس سے علاوہ تحسین رائے کے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی کہ بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن کو ہر شخص قرآن میں نہیں پاسکتا اس سے ابو داؤد ظاہری اور ابن حزم کی اس دلیل کا جواب بھی ہوگیا جو آیہ شریفہ ’’و نزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئی‘‘۔ ’’و قوله تعالیٰ و لا رطب و لایابس الا فی کتاب مبین‘‘ پیش کرکے کہتے ہیں کہ جب قرآن شریف میں حق تعالیٰ نے ہر چیز کو بیان کردیا تو اب رائے لگانے کی کوئی

ضرورت نہیں بلکہ اُس کی اجازت بھی نہیں۔

کیونکہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہے کہ آیۂ شریف کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مسئلہ کا حکم قرآن سے بغیر رائے اور قیاس سے معلوم ہوسکتا ہے اس وجہ سے قیاس کی ضرورت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم **فان لم تجد فی کتاب اللہ** نہ فرماتے اور نہ صحابہ میں قیاس شائع و ذائع ہوتا حالانکہ احادیث مذکورہ سے جواز قیاس پر اجماع ثابت ہے۔ اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ صحابہ عموماً رائے اور قیاس سے کام لیا کرتے تھے جیسا کہ الانصاف میں لکھا ہے۔ ''**فانقضیٰ عصرہ الکریم علی ذلک ثم تفرقوا (ای الصحابة) فی البلاد و صار کل واحد مقتدی ناحیته من نواحی و کثرت الوقائع و دارت المسائل فاستفتوا فیها فاجاب کل واحد حسب ما حفظه و استنبطه و ان لم یجد فیما حفظه و استنبطه ما یصلح للجواب اجتهد برایه و عرف العلة التی ادا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علیها الحکم فی منصوصاته فاقر الحکم حیثما وجدها لا یالو فی جهد موافقة غرضه علیه الصلوة والسلام فعند ذلک وقع الاختلاف بینهم علی ضروب**'' اس سے ظاہر ہے کہ جب ضرورت ہوتی تھی صحابہ اپنی رائے سے قیاس کر لیتے تھے اسی وجہ سے صحابہ کے اقوال میں اختلاف واقع ہے اس کے بعد یہ کہنا کہ آیۂ موصوفہ سے قیاس کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے احادیث اور اجماع صحابہ کو باطل کرنا ہے رہا یہ کہ آیہ موصوفہ سے ظاہر ہے کہ ہر چیز کا بیان قرآن میں موجود ہے پھر قیاس کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت قرآن شریف میں سب کچھ ہے مگر سمجھ کر اُس کو نکالنا مشکل ہے، کیا ممکن ہیکہ جتنے واقعات پیش ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں ہر شخص قرآن سے اُن کا حکم نکال سکے؟ ہرگز نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اہل

رائے کی ضرورت خود آیۂ موصوفہ سے ثابت ہوتی ہے جو اپنی رائے اور قیاس سے ہر مسئلہ قرآن سے نکال سکیں۔اسی وجہ سے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں رائے کی تحسین وارد ہے۔

مجتہدین قیاس کے لیے مامور ہیں

جس طرح آیۂ موصوفہ سے مجتہد کی رائے اور قیاس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔اسی طرح اس آیت سے قیاس مجتہد کی اجازت ثابت ہے۔''**وھو قولہ تعالیٰ فاعتبروا یا اولی الابصار**'' اس آیہ شریفہ میں اعتبار کرنے کا حکم ہے۔کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ اہل لغت اعتبار کے معنی **رد الشیئ الی نظیرہ** لکھے ہیں اور محاورہ میں کہا جاتا ہے **اعتبرت ھذاالثوب بھذا الثوب ای سویتہ فی التقدیر** یعنی جب کسی کپڑے کے برابر دوسرا کپڑا قطع کیا جاتا ہے تو **اعتبرت ھذا الثوب بھذا الثوب** کہتے ہیں۔ چونکہ قیاس فقہی میں بھی **ردالشیئ الی نظیرہ** اور **تسویۃ الشئی** صادق ہے کہ اس لئے مثلاً جو چیز مسکر ہونے میں خمر کی نظیر ہو اُس کو خمر کی طرف پھیر کر اُس کے حکم یعنی حرمت میں برابر کردیتے ہیں جیسے کپڑے میں برابری کردی جاتی ہے۔اس وجہ سے اعتبار کے معنیٰ پورے طور سے قیاس فقہی پر صادق آ گئے۔اس سے معلوم ہوا کہ خطاب ''**فاعتبروا یا اولی الابصار**'' سے اہل بصیرت قیاس فقہی کے مامور ہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہیکہ پوری آیۂ شریفہ یہ ہے کہ ''**و قذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم و ایدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار**'' اس میں پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ کفار کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا گیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتوں سے خراب کرنے لگے اور مسلمانوں نے بھی خراب کیا اس کے بعد ارشاد ہے ''**فاعتبروا یا اولی الابصار**'' جس سے ظاہر ہے کہ اعتبار حاصل کرنے

سے مراد اتعاظ اور نصیحت لینی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کی حالت کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرو۔ اسی وجہ سے اعتبار کا اطلاق عموماً نصیحت قبول کرنے والے پر ہوا کرتا ہے۔ اس صورت میں فاعتبروا کو قیاس سے کوئی تعلق نہ ہوا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتبار کا اطلاق حقیقۃً ایسے معنی پر ہوتا ہے جہاں انتقال اور مجاوزت الی الغیر ہو اس لئے کہ مادۂ ع ب ر کی خاصیت ہے کہ اُس میں انتقال کے معنی ضرور ہوتے ہیں مثلاً عبور نہر وغیرہ سے گذر جانے کو کہتے ہیں۔ اور معبر پل اور اُس کشتی کو جو نہر کے پار اتار دے اور عبّار اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو قوی السیر ہو اور **عابر سبیل** راستہ سے گذرنے والے کو اور **عبرۃ** اُس اشک کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے نکل پڑے اور خواب کی تعبیر میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جو چیز دیکھی جاتی ہے اُس سے دوسری چیز کی طرف عبور کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً دودھ خواب میں دیکھا جائے تو اُس کی تعبیر علم ہوگی چونکہ نصیحت حاصل کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کی حالت پر اپنی حالت قیاس کی جاتی ہے کہ جس طرح اُسنے کیا اگر ہم بھی کریں تو ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو اُس کا ہوا اس لئے انتقال و مجاوزت کے معنی اُس میں بھی صادق آ گئے۔ اس وجہ سے کہ گویا اُس کی حالت کو اپنی حالت پر منطبق کر دیا یہی ہے ''**ردالشیٔ الی نظیرہ**'' جو عبرت کے لغوی معنیٰ ہیں اور فقہی قیاس پر بھی صادق آتے ہیں۔ پھر اگر غور کیا جائے تو اعتبار کے معنی موضوع لہ اتعاظ ہو بھی نہیں سکتے اس لئے کہ کہا جاتا ہے ''**اعتبر فلان فاتعظ**'' حالانکہ اعتبار پر اتعاظ مرتب ہو رہا ہے جو فائے تفریع سے ظاہر ہے اگر دونوں کے معنیٰ ایک ہی ہوں تو **ترتب الشیٔ علی نفسہ** لازم آئیگا جو محال ہے۔ اس لئے یہ کہنا ضرور پڑیگا کہ اعتبار کا درجہ اتعاظ پر مقدم ہے جس پر **ردالشیٔ الی نظیرہ** صادق آتا ہے جو حقیقت قیاس ہے اس صورت میں فاعتبروا کے معنی یہ ہوئے کہ کفار کے حال پر اپنے حال کو قیاس کرلو کہ تم بھی تمرد

کرو گے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو اُن کا ہوا البتہ اس اعتبار اور قیاس پر اتعاظی کیفیت مرتب ہوگی جو اثر اُس قیاس کا ہے اور اگر غور کیا جائے تو اتعاظ میں بھی مجاوزت اور انتقال کے معنی موجود ہیں۔ اس لئے کہ جو شخص کسی کے حال کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے اُس میں یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کے حال کو معلوم کر کے اپنے حال کو معلوم کرتا ہے کہ میرا بھی وہی حال ہونے والا ہے اگر اُس کی سی کیفیت اپنے میں ہو۔ بہرحال اعتبار کے معنی **رد الشئ الی نظیرہ** ہیں جو حقیقت قیاس ہے۔

یہاں ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی حالت کو دیکھ کر قیاس کرے اور اُس میں اتعاظی کی کیفیت کے آثار نمایاں نہ ہوں تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُس نے عبرت حاصل نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اعتبار کے معنیٰ قیاس کے نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عبرت کے معنیٰ تو یہاں بھی صادق آ گئے۔ مگر چونکہ مقصود اعظم عبرت کا یعنی اتعاظی کیفیت فوت ہے اس لئے مجازاً عبرت کی نفی ہوگی۔ جس طرح آیات میں تدبر نہ کرنے والے کو اعمیٰ واصم کہا جاتا ہے اس لئے کہ بصارت وسماعت کا مقصود اصلی اُس نے فوت کر دیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن میں بصارت وسماعت ہی نہیں ہے اِس طرح اتعاظی کیفیت پیدا نہ ہونے سے لازم نہیں آتا کہ اعتبار کا وہاں وجود نہیں۔

یہاں یہ بھی ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ کفار کا حال بیان کر کے حق تعالیٰ نے **فاعتبروا** فرمایا اگر اُس کے معنی قیاس کرنے کے لئے جائیں تو کلام الٰہی کے یہ معنی ہوں گے کہ کفار کے حال کو دیکھ کر قیاس کرو کہ سیندھی مثلاً مسکر ہونے کی وجہ سے مثل خمر حرام ہے جس کی رکاکت پوشیدہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ **فاعتبروا** کا مطلب اِسی قدر ہے کہ کفار کی حالت کو دیکھ کر قیاس کرلو کہ اُن کا سا تمرد کرو گے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا۔ اس سے مطلق قیاس کا ثبوت ہوگیا جس کے افراد و جزئیات میں جس طرح قیاس اتعاظی داخل

ہے قیاس شرعی بھی داخل ہے۔ رکاکت تو جب ہو کہ **فاعتبروا** کے وہ معنیٰ لئے جائیں جو اتعاظ کو شامل نہ ہوں اور جب ایسے معنیٰ لئے جائیں جو اتعاظ و غیر اتعاظ دونوں پر شامل ہوں تو کسی طرح رکاکت نہیں ۔ اِس کی مثال یوں سمجھی جائے کہ اگر کوئی سوال کرے کہ رمضان کے روزہ میں کھانے پینے سے کفارہ لازم آتا ہے تو اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ جماع سے کفارہ لازم آتا ہے البتہ وہ رکیک ہوگا بخلاف اُس کے اگر یہ کہا جائے کہ روزہ توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔ تو اس میں کوئی رکاکت نہیں ۔ کیونکہ وہ اکل و شرب کے حکم پر بھی شام ہے اور اس کے غیر یعنی جماع کے حکم پر بھی اسی طرح **فاعتبروا** کے معنیٰ جب مطلق قیاس کے ہوئے جس میں قیاس اتعاظی بھی داخل ہے اور اس کا غیر یعنی قیاس شرعی بھی تو اُس میں کوئی رکاکت کی بات نہیں غرضکہ **فاعتبروا** سے مطلق قیاس یعنی ذات قیاس بلاتعرض صفات ثابت ہے، جس کے افراد میں قیاس شرعی بھی داخل ہے۔ گو اِس مقام میں مطلق کا تحقق فرد خاص ہی میں کیوں نہ ہو مگر قیاس شرعی بھی وہی ذات ہے جس کی اجازت نص قطعی سے ہوگئی۔ اب اس کا تحقق اس فرد میں ناجائز سمجھنے کے لئے دوسری نص قطعی درکار ہے اور جب تک وہ پیش نہ ہو یہی نص اُس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ خصوصاً جب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیاس شرعی کی اجازت دی بلکہ اُس کا طریقہ بتلا دیا اور صحابہ برابر اُس پر عمل کرتے رہے، تو اِس قسم کے احتمالات اور شبہات سے اُس کا ابطال ممکن نہیں ۔

ضرورتِ قیاس

دراصل قیاس کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں صرف اصول دین اور ضروری امور بیان فرمائے۔ مثلاً ارشاد ہوا'' **و اقیمو الصلوۃ واتوا الزکوٰۃ**'' یعنی ہر مسلمان کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں اس کی

بھی تصریح نہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے ۔ اور اُس کی ہیئت مجموعی یہ ہے اسی طرح زکوٰۃ کا نہ نصاب بتلایا گیا نہ مقدار واجب بلکہ اِس قسم کے امور سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر محول کردیئے گئے ۔ اور ارشاد ہوگیا ”**وما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا**“ یعنی جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کریں سب کو قبول کرلو اور جس سے منع کریں اُس سے باز رہو۔ پھر چونکہ خدائے تعالیٰ کا مقصود رسول کے بھیجنے سے یہ تھا کہ اپنے بندوں کی پوری پوری اصلاح ہو جس سے اُن کو دنیوی اور اُخروی سعادتیں حاصل ہوں ، اور دونوں جہاں میں نیک نام فائز المرام رہیں اس لئے دونوں سعادتوں سے جتنے امور متعلق تھے سب قرآن شریف میں باجمال بیان فرمادیئے مثلاً اخلاقی حالتوں کی اصلاح جس کو اصلاح تمدن اور سعادت دنیوی سے زیادہ تر تعلق ہے ۔ اور حقوق عبودیت اور اُن کے ادا کرنے کے طریقے یعنی عبادت جس کو سعادت اخروی سے تعلق ہے سب اُس میں مذکور ہیں ”**کما قال تعالیٰ ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین**“ اور یہ بات ظاہر ہے کہ دونوں سعادتوں کا مدار حرکات نفسانی اور جسمانی یعنی افعال قلبی اور افعال جوارح کی اصلاح پر ہے ۔ اس لئے کوئی حرکت اور سکون خواہ قلب سے متعلق ہو یا جوارح سے ایسا نہیں ہوسکتا جس کو شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو اور قرآن اس کی اصلاح کا متکفل نہ ہوا ہو مگر چونکہ قرآن کا نزول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا اس لئے اُس کا پورا پورا مطلب حضرت ﷺ ہی کو سمجھایا گیا پھر حضرت ﷺ نے اُس اجمال کی تفصیل شروع کی اور جیسے جیسے واقعات دنیا اور آخرت سے متعلق پیش ہوتے گئے اُن کے احکام بیان فرماتے گئے ۔ مگر حضرت ﷺ جانتے تھے کہ جتنے وقائع اپنے روبرو پیش ہوں گے محدود ہوں گے ، اور قیامت تک جو واقعات پیش ہونے والے ہیں وہ غیر محدود ہیں حالانکہ اُن سب کے احکام معلوم ہونے کی ضرورت ہے ، جن پر عمل کرنے سے سعادت

دارین حاصل ہو اس لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بیان کا ایسا طریقہ اختیار فرمایا کہ کل جزئیات مسائل کے احکام معلوم ہو جائیں یعنی مجتہدوں کے قیاس پر محول فرمایا تاکہ وہ اپنی رائے اور قیاس سے کام لیکر اِس غرض کو پوری کریں۔ اور اہل رائے کی تحسین فرمائی جیسا کہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہے کہ اُن سے استفسار فرمایا کہ اگر کسی واقعہ کا حکم قرآن و حدیث میں نہ ہو تو تم کیا کرو گے؟ اور جب انہوں نے مرضی مبارک پا کر عرض کیا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا تو اُن کی تحسین کی اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے بعد حدیث شریف کی ضرورت ہے اور اُس کے بعد قیاس مجتہد کی اور یہی بات اِس روایت سے ظاہر ہے جو تفسیر درمنثور میں امام سیوطیؒ نے نقل کی ہے۔''

اخرج ابن ابی حاتم من طریق مالک ابن انس عن ربیعة قال ان اللہ تبارک و تعالیٰ انزل الیکم الکتاب مفصّلا و ترک فیه موضعا للسنة و سنّ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم و ترک فیھا موضعاً للرائی'' ۔یعنی خدائے تعالیٰ نے کتاب مفصل نازل کی مگر حدیث کی جگہ باقی رکھی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث بیان فرمائے مگر اُن میں رائے کی جگہ باقی رکھی۔ یہاں یہ غور کرلیا جائے کہ ہر ایک واقعہ میں ہر حرکت و سکون انسانی کی اصلاح جب خدا و رسول کے کلام سے متعلق ہے اور واقعات غیر متناہی ہیں؟ تو جب تک قیاس شرعی سے کام نہ لیا جائے کیونکر وہ اصلاح ممکن ہوگی اگر قیاس شرعی کی پابندی چھوڑ دی جائے تو بہت سے واقعات میں آدمی اپنے قیاس اور رائے سے کام لیگا جس کو شریعت سے تعلق نہ ہوگا کیونکہ قیاس کی ضرورت اُسی موقع میں ہوتی ہے جس میں قرآن و حدیث وارد نہ ہوں پھر جب اُس میں اپنی خالص رائے سے کام لیا جائے تو شریعت کو اُس میں کوئی دخل نہ ہوگا اور وہ مقصود حاصل نہ ہوگا کہ خدا اور رسول کے کلام سے سب افعال و احوال کی اصلاح ہو۔ برخلاف اُس کے شرعی

قیاس میں یہ غرض پوری ہوتی ہے اس لئے کہ جس واقعہ میں کوئی نص وارد نہ ہوتو مجتہد تمام واقعات پر جن کا ذکر قرآن وحدیث میں مع احکام وارد ہے غور کرکے اُس واقعہ کو پیش نظر کرلیتا ہے جو اُسی قسم کا ہو پھر جب اُس واقعہ منصوصہ میں غور کرتا ہے کہ جو حکم اُس میں دیا گیا ہے اُس کی علت کیا تھی اور اپنے قیاس سے اُس کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ اُس اصل منصوص میں جو حکم مصرح ہے فلاں علّت کے ساتھ وابستہ ہے، اور وہی علت اِس واقعہ میں بھی موجود ہوتی ہے تو اُس کو ظن غالب ہو جاتا ہے کہ جو حکم اصل میں تھا وہی فرع میں بھی ہے کیونکہ علّت کے وجود سے معلول کا وجود وابستہ ہوتا ہے۔

احکام معلول بعلل ہیں

اگر کہا جائے کہ افعال الٰہیہ میں علّت کے قائل ہونا اُن کو معلل بالاغراض کہنا ہے حالانکہ علماء نے تصریح کی ہے کہ حق تعالیٰ کے افعال معلل باغراض نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ معلل بالاغراض نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ افعال الٰہیہ میں کوئی غرض ایسی نہیں ہوسکتی جس سے اُس کا کوئی ذاتی نفع اور استکمال ہو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ افعال الٰہیہ منافع اور مصالح اور فوائد سے خالی ہو۔ بلکہ بلحاظ ''**فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة**''۔ یہ ماننا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ کے ہر فعل میں صدہا منافع ہیں جن کا ادراک طاقت بشری سے خارج ہے۔ غرضکہ جو احکام خدائے تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں اُن میں کوئی نہ کوئی علّت ضرور ہوگی۔ جو مصالح عباد سے متعلق ہے اِس سے ثابت ہے کہ ہر حکم معلل ہے چنانچہ اس پر کئی آیات قرآنیہ گواہی دے رہی ہیں۔ منجملہ اُن کے چند آیات یہ ہیں قولہ تعالیٰ ''**و ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**''۔ یعنی جن وانس کو ہم نے صرف عبادت کے لئے پیدا کیا'' **قوله تعالیٰ و ما ارسلنا من رسول الا بلسان**

قومہ لیبین لھم‘‘ یعنی جس رسول کو ہم نے بھیجا وہ اپنی قوم کی زبان میں بات چیت کرتے تا کہ ان سے اپنا مافی الضمیر بیان کریں‘‘ و قولہ تعالیٰ و ما انزلنا علیک القرآن الا لتبیّن لھم الذی اختلفوا فیہ ‘‘ ۔یعنی تم پر ہم نے اس واسطے قرآن اُتارا کہ اُن سے وہ بیان کرو جس میں وہ لوگ اختلاف کرتے ہیں‘‘و قولہ تعالیٰ و اذّن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم و یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات ۔مطلب یہ کہ حج اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ لوگ اپنی منفعتوں کی جگہ پہنچیں اور چند روز اللہ کا ذکر کریں۔

’’و عن ابن عباسؓ قال نزلت ھذہ الایة والنبی صلی اللہ علیہ وسلم متوار بمکة ولا تجھر بصلوتک ولا تخافت بھا قال و کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی باصحابہ رفع صوتہ بالقرآن فلما سمع ذلک المشرکون سبو القرآن و سبوا من انزلہ و من جاء بہ قال فقال اللہ عزّ و جل لنبیہ و لا تجھر بصلوتک ای بقرانک فیسمع المشرکون فیسبو القرآن ولا تخافت بھا عن اصحابک فلا تسمعھم القرآن حتی یاخذوہ عنک و ابتغ بین ذلک سبیلا‘‘ ۔یعنی حق تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل فرمایا کہ نماز میں قرآن کو نہ بہت بلند آواز سے پڑھو نہ بہت پست آواز سے اُس کی علّت یہ تھی کہ مشرک قرآن کو سنکر قرآن کو اور اُس کے اُتارنے والے اور لانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے اس لئے حکم ہوا کہ نہ اتنی بلند آواز سے پڑھو کہ مشرک سنیں اور نہ اتنی پست آواز سے کہ صحابہ بھی نہ سنیں ۔ان آیات سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ کے افعال اور احکام شرعیہ فوائد اور مقاصد سے خالی نہیں اب چند احادیث بھی دیکھ لیجئے جن میں علّتوں کا امام کے ساتھ ملحوظ ہونا ثابت ہے۔ منتقی الاخبار میں ابن تیمیہ نے یہ حدیث نقل کی ہے۔

عن سعد ابن ابی وقاص ؓ قال سمعت النبی صلی الله علیه سلم یسئل عن اشتراء التمر بالرطب فقال لمن حولا ینقص الرطب اذ ایبس قالوا نعم فنهی عن ذلک رواه الخمسة و صحه الترمذی'' یعنی کسی نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ رطب یعنی تر کھجور دے کر سوکھی کھجور خریدنے کا کیا حکم ہے؟ آپ نے حضار مجلس سے دریافت فرمایا کہ رطب سوکھ کر کیا کم ہوجاتی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کم ہوجاتی ہے فرمایا یہ بیع درست نہیں۔

نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس استفسار سے حضرت ﷺ کو دریافت حال مقصود نہ تھا کیونکہ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ رطب سوکھ کر کم ہوجاتی ہے بلکہ عدم جواز کی علّت بتلانا مقصود تھا۔ کہ رطب سوکھ کر جب تمر سے کم ہوجائے گی تو ربوٰ متحقق ہوگا جو حرام ہے دیکھئے کہ بیان علت حکم میں کس قدر اہتمام فرمایا کہ حضار مجلس کی زبان سے کہلوادیا تاکہ سب کو معلوم ہوجائے کہ حکم علّت پر متفرع ہوتا ہے۔

''عن طاوس عن ابن عباس ؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ابتاع طعاماً فلایبعه حتی یقبضه قلت لابن عباس لما قال الا تریٰ انهم یبتاعون بالذهب و الطعام مرجاء رواه الامام احمد فی المسند''۔ یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جو شخص غلّہ خریدے تو جب تک قبضہ نہ کرے اُس کو نہ بیچے۔ طاؤس نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اُس کی علّت پوچھی فرمایا کہ سونے کے معاوضہ میں لوگ غلّہ خریدتے ہیں اور وہ غائب ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ احکام کی علّت دریافت کی جاتی تھی اور صحابہ میں جو فقہاء تھے وہ بیان بھی کیا کرتے تھے۔ ''عن ابن عباس ؓ قال کنّا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فخر رجل عن بعیره فوقص فمات وهو محرم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم غسلوه

بماء وسدر واد فنوه فی ثوبیه و لا تخمروا راسه فان الله عزوجل یبعثه یوم القیٰمة مهلاً و قال مرة یهل رواه الامام احمد فی مسنده" یعنی حالت احرام میں ایک شخص کا انتقال ہوا حضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اُس کے سر کومت ڈھانکو اور اُس کی علّت یہ بیان کی کہ قیامت کے روز وہ احرام کی حالت میں اُٹھے گا۔

جامع ترمذی میں یہ روایت ہے وعن ام عطیة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یخرج الا بکار والعواتق و ذوات الخدور والحیض فی العیدین فاما الحیض فیعتزلن المصلی و یشهدن دعوة المسلمین قالت احدٰهین یا رسول الله ان لم یکن لها جلباب قال فلتعرها اختها من جلبابها . قال ابو عیسیٰ و روی عن ابن المبارک انه قال اکره الیوم الخروج للنساء فی العیدین فان ابت المراة الا ان تخرج فلیاذن لها زوجها ان تخرج من اطمارها ولاتزین فان ابت ان تخرج کذلک فللزوج ان یمنعها من الخروج و روی عن عائشةؓ قالت لورأی رسول الله صلی الله علیه وسلم ما احدث النساء لمنعهن المسجد کما منعت نساء بنی اسرائیل و یروی سفیان الثوری انه کره الیوم الخروج للنساء الی العیدین "یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باکرہ اور قریب البلوغ اور حائضہ عورتوں کو عیدین میں جانے کا حکم فرماتے تھے۔ حائضہ عورتیں مصلیٰ سے علحدہ رہتی تھیں اور دعائے استسقاء وغیرہ کے لئے بھی وہ نکلتی تھیں۔ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر کسی کے پاس چادر نہ ہو فرمایا: اُس کی بہن اُس کو اپنی چادر دے۔ ابن مبارک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حالت موجودہ کے لحاظ سے میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ عورتیں عیدین میں نکلیں۔ اگر عورت اصرار ہی کرے تو شوہر پرانے لباس کے ساتھ نکلنے کی اجازت دے اور اگر وہ چاہے کہ

زینت کے ساتھ نکلے تو شوہر اُس کو نہ نکلنے دے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج کل کی عورتوں کی حالت دیکھتے تو اُن کو مسجد میں جانے سے منع فرما دیتے۔ سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ میں عورتوں کے عیدین میں نکلنے کو مکروہ سمجھتا ہوں'' دیکھئے باوجود صحیح حدیث وارد ہونے کے عائشہ رضی اللہ عنہا ابن مبارک اور سفیان ثوریؒ نے اُس کے خلاف میں عورتوں کے منع کرنے کو کہا اس وجہ سے کہ اس میں فساد ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرون ثلثہ میں احکام معلل بعلّت سمجھے جاتے تھے اور اسی کے لئے فقہاء کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ منتقی الاخبار میں یہ روایت ذکر کی کہ ایک بار کسی یہودی کا جنازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو سے گذرا آپ اُٹھ کھڑے ہوئے' لوگوں نے کہا کہ وہ یہودی کا جنازہ ہے۔ فرمایا کیا وہ نفس نہیں ہے۔ قاضی شوکانی نے اس کی شرح نیل الاوطار میں امام حسن علیہ السلام کا قول ذکر کیا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قیام فرمایا تھا اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس جنازہ کے ساتھ بخور جلا رہے تھے جس کی بو ناگوار خاطر عاطر ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ یہودی کا جنازہ سر سے بلند ہونا خلاف مرضی ہوا جس کی وجہ سے آپ کھڑے ہوگئے۔ اُس کے بعد لکھا ہے کہ حضرت سے جو تعلیل مروی ہے اُس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جنازہ خواہ مسلمان کا ہو یا کافر کا اُس کے لئے اٹھنا مسنون ہے۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی تعلیل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ کافر کے جنازہ کے لئے اٹھنے کی ضرورت نہیں یہاں مقصود اسی قدر ہے کہ کبھی حدیث میں علّت مذکور ہوتی ہے اور کبھی صحابہ اپنے اجتہاد سے علّت نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ نیل الاوطار کی عبارت یہ ہے ''اما ثانیا فلان التعلیل بذلک راجع الی ما فھمہ الراوی و التعلیل الماضی صریح من لفظ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کان الراوی لم یسمع التصریح بالتعلیل منہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلل باجتھادہ و مقتضی

التعلیل بقوله الیست نفسا اِنّ ذلک یستحب لکل جنازۃ ''اس سے ظاہر ہے کہ حکم علّت کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔اور مجتہد علّت تلاش کرنے کے مجاز ہیں۔

کنز العمال کی کتاب الطہارۃ میں یہ روایت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مجاہدؒ کہتے ہیں کہ ایک روز میں اور عطا اور طاؤس اور عکرمہ رحمھم اللہ بیٹھے تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آ کر پوچھا کہ جب میں پیشاب کرتا ہوں تو پیشاب کے بعد ماء دافق یعنی منی نکلتی ہے کیا اُس سے غسل واجب ہوتا ہے؟ ہم نے کہا کیا وہی ماء دافق نکلتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے کہا ہاں ہم نے کہا جب تو غسل واجب ہے۔ وہ شخص انا للہ پڑتا ہوا چلا گیا۔ابن عباسؓ نے جلد نماز سے فارغ ہو عکرمہ سے کہا اُس شخص کو بلا لاؤ چنانچہ وہ آیا۔ پھر ہم سے پوچھا کیا تم نے قرآن سے فتوی دیا ہے؟ ہم نے کہا نہیں فرمایا حدیث سے؟ ہم نے کہا نہیں۔فرمایا صحابہ کے اقوال سے؟ ہم نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کس کے قول سے فتویٰ دیا؟ ہم نے کہا اپنی رائے سے یہ سنکر فرمایا ''**لذلک یقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**'' یعنی اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ تر سخت ہے۔ پھر اُس سائل سے پوچھا کہ پیشاب کے بعد جو چیز نکلتی ہے کیا اُس کے نکلنے کے وقت تمہارے دل میں شہوت یعنی عورت کی خواہش ہوتی ہے؟ کہا نہیں فرمایا کیا اعضاء میں استرخاء اور ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے؟ کہا نہیں۔فرمایا اس صورت میں صرف وضو تمہارے لئے کافی ہے۔انتہی ابن عباسؓ نے جب دیکھا کہ ماء دافق کے لفظ پر انہوں نے دھوکا کھایا اور علّت غسل پر غور نہیں کیا تو سمجھ گئے کہ اُن میں کوئی فقیہ نہیں اگر فقیہ ہوتے تو علّت غسل کی تشخیص ضرور کرتے پھر جب دیکھا کہ علّت غسل یعنی خروج منی کے لوازم نہیں پائے جاتے اس لئے فتویٰ دیا کہ وہ منی ہی نہیں اس لئے غسل بھی واجب نہیں اس سے

ظاہر ہے کہ فقیہ کی جو تعریف وتوصیف احادیث میں وارد ہے۔ اُس کو اعلیٰ درجہ کی سمجھ درکار ہے اور مجاہد اور عطاء اور طاؤس اور عکرمہ رحمہم اللہ جیسے اکابر محدثین کو ابن عباسؓ نے فقیہ نہیں سمجھا اس وجہ سے کہ انہوں نے علّت کی تشخیص نہیں کی۔

کنز العمال میں یہ روایت بھی ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ تھے یعنی اوائل اسلام میں اُن کا پاخانہ قلت غذا کی وجہ سے مینگیاں ہوتا تھا اور تمہارا پاخانہ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لئے تم لوگوں کو ضرور ہے کہ ڈھیلوں کے بعد پانی سے بھی آبدست کرلیا کرو انتہی۔ بعض روایات میں جو وارد ہے کہ اوائل اسلام میں آبدست نہیں کیا جاتا تھا اُس کی علّت آپ نے بیان کردی اور چونکہ وہ علّت آپ کے زمانہ میں موجود نہ تھی اس لئے حکم دیا کہ اب پانی سے آبدست کی ضرورت ہے۔

قرآن شریف میں ہے ''واقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم'' ۔یعنی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرڈالو ظاہر ہے کہ یہ حکم عام ہے اس سے نہ بوڑھے خارج ہوسکتے ہیں نہ عورتیں مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اُن کو قتل کرنے کی علت یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں اور ضرر پہنچاتے ہیں اور بوڑھوں اور عورتوں اور بچوں اور درویشوں میں وہ علّت نہیں پائی جاتی اس لئے اُن کو قتل کرنے سے منع فرمادیا۔ چنانچہ ابن تیمیہ نے منتقی الاخبار میں اس مضمون کی روایتیں ذکر کی ہیں۔ اُس کی شرح نیل الاوطار میں قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ اصحاب صوامع کے باب میں جو حدیث وارد ہے ہر چند اس کی اسناد میں کلام ہے لیکن صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ مشرکوں کے لڑکوں اور عورتوں کا قتل جائز نہیں اور وہی علّت اصحاب صوامع میں موجود ہے۔ اُس وجہ سے اُس کی تائید ہوگئی اور چونکہ وہی علّت اپاہجوں اور اندھوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے قیاس سے اُن کا بھی قتل جائز نہ ہوا اور چونکہ قتل کی علّت مسلمان کی ضرر رسانی ہے اس لئے اگر عورت

بھی مسلمان کو قتل کرنا چاہے تو وہ بھی قتل کی جائے گی حالانکہ عورتوں کا قتل صحیح حدیث سے ممنوع ہے نیل الاوطار کی عبارت یہ ہے" قوله و لا اصحاب الصوامع فيه دليل على انه لا يجوز قتل من كان متخلياً للعبادة من الكفار كالرهبان لا عراضه عن ضرر المسلمين و الحديث و ان كان فيه المقال المتقدم لكنه معتضد بالقياس على الصبيان و النساء بجامع عدم النفع و الضّر و هو المناط و لهذا لم ينكر صلى الله عليه وسلم على قاتل المراة التى ارادت قتله و يقاس على المنصوص عليهم بذلك الجامع من كان مقعداً او اعمىٰ او نحوهما ممن لا يرضى نفعه و لا ضره على الدوام" دیکھئے قاضی شوکانی نے کس وضاحت سے بیان کیا کہ علّت پر حکم کا مدار ہے کہ جہاں علّت پائی جائے حکم بھی پایا جائیگا۔ گو اُس ظاہر حدیث سے اُس حکم کا اثبات نہ ہوتا ہو اور جہاں علّت نہ پائی جائے حکم بھی ثابت نہ ہوگا گو ظاہر حدیث سے اُس کا ثبوت معلوم ہوتا ہو" و عن سالم عن ابيه قال بعث النبى صلى الله عليه وسلم خالد بن الوليد الى بنى خذيمة فدعاهم الى الاسلام فلم يحسنوا ان يقولوا اسلمنا فجعلوا يقولون صبانا فجعل خالد يقتل منهم و ياسر و دفع الى كل رجل منا اسيره حتى اذا كان يوم امرنا خالد ان يقتل كل رجل منا اسيره فقلت والله لا اقتل اسيرى و لا يقتل رجل من اصحابى اسيره حتى قدمنا على النبى صلى الله عليه وسلم فذكرناه له فرفع النبى صلى الله عليه وسلم يده فقال اللهم انى ابرأ اليک مما صنع خالد مرتين رواه البخارى ۔یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد ابن ولید کو قبیلہ بنی خذیمہ کی طرف بھیجا انہوں نے ان لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ مگر ان لوگوں نے

صاف طور پر نہیں کہا کہ ہم اسلام لائے بلکہ یہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے دین کو چھوڑ کر نیا دین قبول کیا۔ خالد نے اس کا اعتبار نہ کر کے ان کو قتل اور گرفتار کرنا شروع کیا چنانچہ ہر ایک شخص کی تحویل میں ایک ایک قیدی دیا اور ایک روز حکم کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے قیدی کو قتل کر ڈالے میں نے کہا کہ میں ہرگز اپنے قیدی کو قتل نہ کروں گا اور نہ میرے رفقاء قتل کریں گے جب ہم حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ واقعہ بیان کیا تو سنتے ہی آپ ہاتھ اُٹھا کر بارگاہ کبریائی میں عرض کرنے لگے کہ الٰہی خالد نے جو کیا ہے میں اُس سے بَری ہوں اور اس جملہ کو دو بار ادا کیا۔

خالد رضی اللہ عنہ نے لفظ صبأنا کو عرف عام کے مطابق خیال کیا کہ وہ صابی بننے کی خبر دے رہے ہیں جو اُس زمانہ میں خاص فرقہ تھا جیسا کہ اِس آیہ شریفہ سے ظاہر ہے۔ ''ان الذّین آمنوا والذین هادوا والصابئین والنصاریٰ ''۔ اور ابن عمرؓ نے دیکھا کہ صبأنا کے لغوی معنی یہ ہیں کہ ہم نے اپنا دین چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار کیا اور بقرینہ مقام اجتہاد سے کام لیکر یہ سمجھا کہ اُن کا مقصود قبول اسلام ہے اس لئے اُن کا قتل ناجائز خیال کیا اور اسی اجتہاد کی طرفداری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کی اور خالد رضی اللہ عنہ نے جو اجتہاد کو ترک کیا اُس سے ناراضی ظاہر کی۔ اب اِس اجتہاد کی قوت دیکھئے کہ باوجودیکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ امیر کی اطاعت واجب ہے۔ مگر اپنے اجتہاد کے مقابلہ میں اُس کو ضرور نہ سمجھا اور اس مقام میں دوسرا اجتہاد یہ کیا کہ اجتہادی حکم کسی نص کے معارض ہو بھی تو اجتہاد ہی کو ترجیح ہوگی جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ لڑنے والی عورت بھی قتل کی جائے باوجودیکہ عورتوں کا قتل نص سے ممنوع ہے پھر ان دونوں اجتہادوں کو موجودہ صحابہ نے مان بھی لیا۔

کنز العمال میں زاذانؒ سے روایت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم علی

کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں ایکبار حاضر تھے آپ نے فرمایا کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر مرد عورت کو طلاق کا اختیار دے تو اُس کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا اگر وہ اپنے نفس کو اختیار کرے تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوگی اور اگر زوج کو اختیار کرے تو بھی ایک طلاق ہوگی مگر زوج کو حق رجعت ہوگا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ اُس نے اگر زوج کو اختیار کرلیا تو طلاق نہ ہوگی اور اگر اپنے نفس کو اختیار کیا تو ایک ہوگی۔ اور مرد کو حق رجوع ہوگا۔ پھر فرمایا جب تک امیر المومنین زندہ تھے میں نے اُن کی متابعت کی اور جب امر خلافت مجھ سے متعلق ہوا تو میں اب اپنی رائے کے مطابق حکم دیتا ہوں اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ فروج کے معاملہ میں مجھ سے سوال ہوگا انتہی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجتہد کو ضرور ہے کہ اپنی رائے کے مطابق عمل کرے اور دوسرے مجتہد کی تقلید نہ کرے۔

اب غور کیا جائے کہ قرآن و حدیث سے جب یہ ثابت ہوگیا کہ احکام میں علّت ملحوظ ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جہاں علّت پائی جائے قیاس سے حکم بھی ثابت کیا جاتا ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے اور قیاس کی تحسین کی۔ بلکہ خود نے قیاس کا طریقہ بتلایا اور صحابہ اور سلف صالح اُسی طریقہ کی اتباع کر کے بحسب ضرورت قیاس کرتے رہے تو اُس کے بعد یہ کہنا کہ قیاس جائز نہیں ہرگز قابل التفات نہیں ہوسکتا۔

دلیلِ مانعینِ قیاس

مانعین قیاس کی دلیل یہ ہے کہ آیات واحادیث میں علّت حکم تو مذکور ہوتی نہیں اُس کو رائے سے معیّن کرنا جس میں خطا اور غلطی کا احتمال ہے اور اُس سے حلت و حرمت جو خالص حق اللہ ہے ثابت کرنا اور صرف احتمالی طور پر ثابت کی ہوئی چیز میں اطاعت خداو

رسول کو خیال کرنا عقلاً ہرگز جائز نہیں۔

یہاں قابل غور یہ بات ہے کہ رائے اور قیاس کا ابطال صرف رائے سے کیا جارہا ہے جس کو آیات واحادیث رد کر رہے ہیں حیرت یہ ہے کہ جس چیز کا انکار جس دلیل سے کر رہے ہیں اُسی سے اُس کا اقرار ہو رہا ہے۔ حروریہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور صحابہ پر مخالفت قرآن کا الزام لگاتے تھے اور خود مرتکب ایسے امور کے ہوتے تھے جو سراسر مخالف قرآن وحدیث ہیں۔ ظاہراً انہوں نے کمال احتیاط اور تشدد فی الدین کا مسلک اختیار کیا تھا مگر وہ بالکل خدا اور رسول کی مرضی کے مخالف تھا۔

اُن حضرات نے جس قدر تشدد دین میں کر رکھا ہے خوارج اِس باب میں اُن سے بھی بڑھے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو صرف اس وجہ سے کہ آپ نے حکم مقرر فرمایا تھا معاذ اللہ کافر حلال الدم قرار دیا، اور یہ دلیل پیش کی کہ حکم کرنا خاص خدائے تعالیٰ کا کام ہے۔

تقریر بالا سے ظاہر ہے کہ صحابہ کے زمانہ سے اجتہاد جاری ہے اور فقہاء محدثین میں ممتاز رہے اور فقہ نہایت عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی کیوں نہ ہو فقہ کی ترغیب و تحریص میں کئی حدیثیں وارد ہیں جن میں سے تھوڑی اوپر ذکر کی گئیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذھبیؒ نے حافظ محاملیؒ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے مکان میں فقہ کی مجلس قائم کی جس میں اہل علم جمع ہوا کرتے تھے۔ محمد ابن حسین کہتے ہیں کہ میں نے انہی دنوں خواب دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ خدائے تعالیٰ محاملی کی وجہ سے اہل بغداد سے بلا کو دفع کرتا ہے۔ دیکھئے اِس واقعہ کو محدثین نے نقل کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اہل انصاف محدثین فقہ کے ہرگز مخالف نہ تھے۔ غرضکہ فقہ کی ضرورت ہر زمانہ میں محسوس رہی اور سر برآوردہ محدثین قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط اور استخراج کرتے رہے‘

امام صاحبؒ نے بنیاد فقہ کی مستحکم کی

امام ابوحنیفہؒ نے دیکھا کہ جب تک اُس کے قواعد نہ مقرر کئے جائیں فقہ کی بنیاد مستحکم نہیں ہوسکتی اس لئے قرآن وحدیث اور صحابہ کے طریقۂ عمل اور لغت وغیرہ سے مدد لیکر اُس کے قواعد اور اصول مقرر کئے جس سے فن اصول فقہ مدون ہوا اور اُن کے ذریعہ سے قرآن وحدیث سے مسائل استنباط کئے جس سے فقہ مدون ہوئی۔

خ۔ پہلے پہل جس نے فقہ کو مدون کیا اور ابواب اور کتب کی ترتیب دی وہ ابوحنیفہ ہیں۔ امام مالک نے موطا میں اُسی کی اتباع کی پیشتر صرف اپنے حفظ پر اعتماد کیا کرتے تھے۔

ک۔ ابومعاویہ ضریر کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے علم کے طریقہ کی بنیاد ڈالی ایسا کون شخص ہے جو اُن کے مبلغ علم تک پہونچا ہو۔ اور کس کو وہ راہ ملی تھی جو اُن کو ملی تھی۔ خدائے تعالیٰ کی اُن پر منت تھی۔

ک ت خ۔ نضر ابن شمیل کہتے ہیں کہ لوگ فقہ سے خواب غفلت میں تھے ابوحنیفہؒ نے ان کو بیدار کر دیا۔

ک۔ نضر ابن محمد کہتے ہیں کہ میرے گمان غالب میں یہی ہے کہ ابوحنیفہؒ رحمت پیدا کئے گئے اگر وہ نہ ہوتے تو بہت سا علم کم ہو جاتا۔

ت خ۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کو فقہ کی توفیق دی گئی جس سے اُن پر اُس کی مشقت نہ رہی۔

م ک۔ یحیی ابن آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے فقہ میں ایسا اجتہاد اور کوشش کی کہ اُن سے پہلے کسی نے نہیں کی تھی اس لئے خدائے تعالیٰ نے اُن کو اُس کا راستہ دکھلا دیا اور اُس کا طریقہ آسان کر دیا اور خاص وعام نے اُن کے علم سے نفع اُٹھایا۔

ص ک ۔ عبداللہ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ اگر ابو حنیفہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے یعنی جو تبحر علمی اُن کو اب ہے، اکابر تابعین کے زمانہ میں ہوتا تو تابعین بھی اُن کی طرف محتاج ہوتے۔

م ص ک ۔ ابو عصمہ لکھتے ہیں جو شخص ابو حنیفہؒ سے بے پروائی کرے وہ جاہل ہے مطلب یہ کہ ہر عالم اُن کے علم کی طرف محتاج ہے۔ اِس احتیاج کی یہی وجہ تھی کہ اُس وقت تک اجتہاد کے قواعد ایجاد نہیں ہوئے تھے امام صاحب نے اُس کا بار اپنے ذمہ لیکر محدثین کو ممنون کیا جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا۔

توالی التاسیس میں ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ حاکم نے لکھا ہے کہ میں جہاں تک جانتا ہوں اُس میں خلاف نہیں کہ امام شافعی ۱۵۰ھ ایک سو پچاس ہجری میں پیدا ہوئے اور یہ وہی سن ہے جس میں ابو حنیفہؒ کا انتقال ہوا جس میں یہ اشارہ ہے کہ امام شافعیؒ ابو حنیفہؒ کے فن میں اُن کے جانشین ہوں گے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ محدثین نے بھی امام شافعیؒ کو امام صاحب کا خلیفہ قرار دیا اور صدارت فقہ امام صاحب ہی کو مسلم رکھی چونکہ امام صاحب گویا موجد فن فقہ ہیں۔ اس لئے اُن کا تھوڑا سا حال معلوم کر لینا مناسب ہے۔ اگرچہ یہاں امام صاحب کے فضائل بیان کرنے سے مقصود دوسرا ہے مگر یہ بات معلوم رہے کہ آپ کے فضائل کا نفس بیان بھی فائدہ سے خالی نہیں جیسا کہ اِس روایت سے ظاہر ہے۔

م ص ک۔ عبدالوہاب مروزی کہتے ہیں کہ جب شقیق بلخیؒ مکہ معظّمہ کو آئے تو ہم اُن کے مجلس میں اکثر جایا کرتے اُن کی عادت تھی کہ ابو حنیفہؒ کی تعریفیں کثرت سے کیا کرتے ایک بار ہم نے کہا حضرت کب تک اُن کی تعریف و توصیف کرو گے۔ ایسی باتیں بیان کیجئے جس سے ہمیں کچھ نفع ہو فرمایا افسوس ہے کہ تم لوگ ابو حنیفہ کے ذکر کو اور اُن کے مناقب کو افضل الاعمال نہیں سمجھتے اگر اُن کو دیکھتے اور اُن کے ساتھ بیٹھتے تو یہ بات کبھی نہ کہتے۔

م ص ک ۔ یحییٰ ابن آدمؒ کہتے ہیں کہ شعبہ کے روبرو جب ابو حنیفہؒ کا ذکر آتا تو تعریف و توصیف میں بہت اطناب کرتے حالانکہ امام صاحب کے وہ استاد تھے۔

م ص ۔ محمد ابن قاسم کہتے ہیں کہ یاسین زیاتؒ امام صاحب کی تعریف حد سے زیادہ کرتے، جب کبھی اُن کا ذکر آتا تو دیر تک ذکر کرتے اور خاموش رہنا نہیں چاہتے تھے۔

اب ہم چند اکابر محدثین کے اسمائے گرامی اِن کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔ مناقب امام اعظمؒ، مولفۂ امام موفق اور مناقب کردریؒ اور **الانتصار لامام ائمة الامصار** مولفہ أبی المظفر یوسف بن عبداللہ سبط ابن الجوزیؒ اور **تبییض الصحیفة فی مناقب أبی حنیفه** مؤلفہ امام سیوطیؒ اور الخیرات الحسان مولفہ شیخ ابن حجر مکیؒ جنھوں نے امام صاحب کے علم و فضل و ذہن و ذکاوت قوت حافظہ فقاہت اور ورع و تقویٰ وغیرہ کمالات کی تعریفیں کی ہیں۔ ان حضرات کے اقوال تو موقع موقع پر ذکر کئے جائیں گے۔ مگر یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ جن کی تعریفیں اتنے اکابر دین نے کی ہوں جن کی روایتوں پر کل صحاح کا مدار ہے، اُن کی توہین اس آخری زمانہ کا کوئی مولوی کرے تو وہ کیونکر قابل التفات ہو ہمیں اس موقع میں توہین کرنے والوں کی شکایت بھی مقصود نہیں اس لئے کہ اس زمانہ کا مقتضی اسی قسم کے امور کا ظہور و شیوع ہے۔ کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی پیشین گوئی فرما چکے ہیں کہ آخری زمانہ میں لوگ پچھلے زمانہ والوں پر لعنت کریں گے بے دینی پھیل جائیگی علم کم ہو جائے گا ہر شخص اپنی رائے پر نازاں ہوگا اگر ایسے لوگ ہوں تو خیر القرون اور آخری زمانہ میں فرق کیونکر ہو سکے حالانکہ فرق ضروری ہے غرضکہ ہر شخص اپنا وظیفہ ادا کرتا ہے۔ بلکہ ہمیں یہاں اپنے ہم مشربوں کو یہ معلوم کرا دینا منظور ہے کہ مخالفوں کی تقریریں سننے اور دیکھنے سے جو وساوس شیطانی پیدا ہوں اُن کے دفعیہ میں ان بزرگان

دین کے اقوال سے لاحول کا کام لیں اور اعتقاد میں تزلزل کو آنے نہ دیں و ما توفیقنا الا باللہ۔

اسماءِ گرامی مداحینِ امامِ اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ

ا۔ابراہیم ابن طہمانؒ، تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ وہ پانچویں طبقہ میں ہیں۔ عبداللہ ابن مبارک اور حفص ابن عبداللہ وغیرہ کے اُستاد اور ابوحنیفہؒ وغیرہ کے شاگرد ہیں اور خلاصہ تہذیب التہذیب کمال میں لکھا ہے کہ صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۲۔احمد ابن بشیر، تہذیب التہذیب میں شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ وہ ابوموسیٰ اور محمد ابن سلام وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں بخاری‘ ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۳۔امام احمد ابن حنبلؒ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ وہ طبقۂ ہشتم میں ہے اور امام بخاری اور مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کے استاد ہیں۔خلاصہ تذہیب التہذیب میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔مذاہب حقہ میں ایک مذہب کے آپ موجد ہیں بہت سے محدثین اور اولیاء اللہ آپ کے مقلد ہیں۔

۴۔ابوالاحوص سلام ابن سلیمؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقۂ سادسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ مسدد اور قتیبہ اور خلف وغیرہ کے استاد ہیں۔اور خلاصہ تذہیب التہذیب مذکور میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

۵۔اسباط ابن نضرؒ خلاصہ مذکور میں لکھا ہے کہ وہ عمرو ابن حماد کے استاد ہیں اور سوائے بخاری کے مسلم وغیرہ کتب صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۶۔اسرائیل ابن یونسؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقۂ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ

عبدالرحمٰن بن مہدی اور ابونعیم وغیرہ کے استاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۷۔ اعمشؒ ' تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقۂ رابعہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور دونوں سفیان اور وکیع وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۸۔ اوزاعیؒ ' تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور ابن مبارک اور یحییٰ قطان وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۔ بکر ابن خنیسؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابراہیم ابن طہمان اور ابوالنصر وغیرہ کے استاد ہیں۔ اور اُن کی روایتیں ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۱۰۔ بکیر ابن معروفؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور ولید ابن مسلم وغیرہ کے استاد ہیں۔ اور اُن کی روایتیں مراسیل ابوداؤد میں مذکور ہیں۔

۱۱۔ ابونمیلہ یحییٰ ابن واضحؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمدؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۲۔ ابن جریجؒ ' تذکرۃ الحفاظ میں ان کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ دونوں سفیان اور مسلم بن خالد اور ابن عیینہ اور ابوعاصم اور روح اور وکیعؒ وغیرہم کے استاذ ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۳۔ جریر ابن حازمؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ایوب سجستانی اور دونوں سفیان اور ابن وہب اور ابوالربیع زیرانی وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۴۔ جریر ابن عبدالحمیدؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ سادسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ علی ابن مدینی اور اسحاق وقتیبہ وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۵۔ امام جعفر صادقؓ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ امام مالک اور دونوں سفیان اور یحیی قطان اور ابو عاصم نبیل کے استاد ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اُن سے افقہ میں نے نہیں دیکھا۔

۱۶۔ ابوالجویریہ حطان ابن خفافؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابن عباسؓ کے شاگرد اور اسرائیل اور شعبہ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں بخاری ابوداؤد اور نسائی میں مذکور ہیں۔

۱۷۔ حسن ابن صالحؒ، تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ وکیع اور یحییٰ ابن آدم اور یحییٰ ابن فضل وغیرہ کے استاذ ہیں خلاصہ میں لکھا ہے کہ سوائے بخاری کے مسلم وغیرہ صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۸۔ حسن ابن عرفۃ العبدیؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۹۔ حسن ابن عمارہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ دونوں سفیان اور قطان وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں بخاری شریف کے تعلیقات اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۲۰۔ حماد بن سلمہؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابن جریج اور ثوری اور شعبہ کے استاذ ہیں۔ اور اُن کی روایتیں صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۲۱۔ حفص ابن عبدالرحمٰنؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابوداؤد طیالسی اور یحییٰ ابن اکثم وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد کی کتاب القدر میں اور نسائی میں مذکور ہیں۔

۲۲۔حفص ابن غیاثؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ سادسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ احمد اور اسحاق اور علی ابن مدینی اور ابن معینؒ کے استاد ہیں اور تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۲۳۔ابوحمزہ السکری محمد بن میمونؒ تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ خامسہ میں ان کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ابن مبارک وغیرہ کے استاد ہیں۔خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۲۴۔حماد ابن زیدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ثوری اور ابن مہدی وغیرہ کے اُستاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۲۵۔خارجہ ابن مصعبؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ مالک اور ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور سفیان ثوری اور عبدالرحمٰن ابن مہدی اور وکیع وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۲۶۔خلف ابن ایوّبؒ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ احمد اور ابوکریب وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ترمذی میں مذکور ہیں۔

۲۷۔داؤد طائیؒ چونکہ ہمہ تن آپ کی توجہ علوم روحانیہ کی طرف مبذول تھی اور علم حدیث میں اشتغال کم تھا اس لئے محدثین نے آپ کے نسبت کچھ کلام کیا ہے لیکن حضرات صوفیہ میں آپ کی جلالت شان اظہر من الشّمس ہے۔

۲۸۔ابوداؤد جفری عمرو بن سعدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل و اسحاق اور ابن مدینیؒ کے استاذ ہیں اور سوائے بخاری کے کل صحاح میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

۲۹۔ابوداؤد سجستانیؒ آپ کی جلالت شان اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی تصنیف صحاح ستہ میں ایک مقبول کتاب ہے۔تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو نویں طبقہ میں لکھا ہے۔

۳۰۔ رقبۃ ابن مصقلہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ سلیمان تیمی اور ابوعوانہ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں بخاری مسلم ابوداؤد وترمذی اورنسائی میں موجود ہیں۔

۳۱۔ روح ابن عبادہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ احمد اوراسحاق وغیرہ کے اُستاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۳۲۔ زہیر ابن معاویہؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں لکھ کر کہا کہ وہ احمد ابن یونس اور ابونعیم وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی حدیثیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۳۳۔ ابوالزبیر المکیؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ رابعہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ایوب اور شعبہ اور سفیان اور حماد ابن سلمہ اور مالک اور لیث کے اُستاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۳۴۔ زید ابن علیؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ آپ زہری اور زکریا اور ابن ابی زائدہ کے اُستاد ہیں۔ اور صحابہ کی ایک جماعت کو آپ نے دیکھا ہے اور ترمذی وغیرہ میں آپ کی روایتیں موجود ہیں۔

۳۵۔ سعید ابن ابی عروبہؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ بشر ابن المفضل وابن علیہ وغندر ویحیٰی ابن سعید وروح ابن عبادہ وغیرہ کے استاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۳۶۔ سفیان ثوریؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ابن مبارک اور یحیی قطان اور وکیع اور احمد ابن یونس وغیرہ کے استاد ہیں۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۳۷۔ سفیان ابن عیینہؒ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ وہ ابن مبارک اور ابن مہدی اور امام

شافعی اور امام احمد ابن حنبل اور یحییٰ بن معین اور اسحاق وغیرہ کے اُستاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہیکہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۳۸۔سوید ابن سعیدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں مسلم اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۳۹۔امام شافعیؒ آپ کی جلالت شان اظہر من الشمس ہے مذاہب حقہ ایک مذہب کے موجد آپ ہیں بڑے بڑے محدثین اور اولیاء اللہ آپ کے مذہب میں داخل اور آپ کے فقہ پر عامل ہیں۔آپ کا مذہب شام' مصر' عراق' یمن' فارس اور ہند وغیرہ کے اکثر بلاد میں شائع وذائع ہے۔آپ کے مناقب میں کتابیں بکثرت لکھی گئیں۔تاریخ ابن خلکان میں لکھا ہے کہ ابوحسان زیادی کہتے ہیں کہ امام محمدؒ کو میں نے کسی عالم کی تعظیم اس قدر کرتے نہیں دیکھا جو امام شافعیؒ کی تعظیم کرتے تھے۔

۴۰۔شریک ابوعبداللہ النخعیؒ' تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ قتیبہ وعلی ابن حجر اور ہناد بن السری وغیرہ کے استاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۴۱۔شعبہؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ایوب سجستانی اور سفیان ثوری اور غندر وغیرہ کے استاد ہیں خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۴۲۔شقیق بلخیؒ' نفحات الانس میں مولانا جامیؒ نے لکھا ہے کہ آپ اولیاء اللہ کے پہلے طبقہ میں ہیں۔اور امام زفرؒ کے شاگرد اور حاتم اصم کے استاد تھے۔

۴۳۔ابوشیخؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ بیہس اور قتادہؒ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہیں۔

۴۴۔ابوضمرہ انس بن عیاضؒ' خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ احمد اور قعنبی اور احمد بن صالح

وغیرہ کے اُستاد ہیں۔اوراُن کی روایتیں صحاح ستہ میں ہیں۔

۴۵۔ابو عاصم النبیل جن کا نام ضحاکؒ ہے، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ بخاری وغیرہ کے استاد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۴۶۔عبثرؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ خلف ابن ہشام واحمد ابن یونس اورقتیبہ وغیرہ کے استاد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۴۷۔عبیداللہ ابن داؤدالخریبیؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ بشرابن الحراث ومسدداور بندار وغیرہ کے اُستاد ہیں اوراُن کی روایتیں سوائے مسلم کے بخاری وغیرہ صحاح میں موجود ہیں۔

۴۸۔عبداللہ ابن مبارکؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کوطبقہ سادسہ میں ذکرکر کے لکھا ہے کہ وہ دونوں سفیان اورمعتمر اور بقیہ اورابن مہدی وغیرہ کے استاد ہیں اورصحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔انشاءاللہ تعالیٰ اُن کا تفصیلی حال آئندہ لکھا جائیگا۔

۴۹۔عبداللہ ابن یزیدمقریؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کوطبقۂ سابعہ میں ذکرکر کے لکھا ہے کہ وہ ابوحنیفہ وغیرہ کے شاگرداورامام بخاری وغیرہ کے استاد ہیں اورخلاصہ میں لکھا ہے کہ ابن مالک اوریحییٰ ابن کثیر کے بھی وہ استاد ہیں۔

۵۰۔عبداللہ ابن نمیرؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کوطبقۂ سادسہ میں ذکرکر کے لکھا ہے کہ وہ امام احمدوغیرہ کے استاد ہیں۔اورخلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۵۱۔عبدالرحمٰن المسعودیؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کوطبقہ خامسہ میں ذکرکر کے لکھا ہے کہ وہ ابن مبارک اورابن عیینہ اورعبدالرحمٰن ابن مہدی وغیرہ کے استاد ہیں اورخلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں بخاری ابوداؤدوترمذی نسائی اورابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۵۲۔عبدالرحمٰن بن مہدیؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن مبارک اورامام احمدوغیرہ کے استاد ہیں اوراُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۵۳۔عبدالعزیز ابن رزمہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہیں۔

۵۴۔عبدالعزیز ابن ابی روادؒ ' خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ یحییٰ ابن قطان وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں سوائے مسلم کے صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۵۵۔عثمان المدنیؒ ' خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ثوریؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۵۶۔عطاء ابن ابی رباحؒ ' تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ ثالثہ میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ وہ ابوحنیفہ اور ابن جریج وغیرہ کے استاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۵۷۔عفان بن سیارؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں نسائی میں موجود ہیں

۵۸۔علقمہ ابن مرثدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ مسعر اور شعبہ اور ثوریؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۵۹۔علی ابن عاصمؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۶۰۔عمرو ابن حمادؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں اُن کی راویتیں موجود ہیں۔

۶۱۔عمرو بن دینارؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ قتادہ وشعبہ اور دونوں سفیانؒ وغیرہ کے استاد ہیں۔اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۶۲۔علی ابن موسیٰ رضاؒ آپ ائمہ اہل بیت میں ہیں۔جلالت شان آپ کی اظہر من الشّمس ہے۔

۶۳۔ابن عون عبداللہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور ثوری اور قطانؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۶۴۔فضل ابن دکینؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد واسحاق اور یحییٰ بن معین کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۶۵۔فضل ابن سویدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ ابوداوٗد نے کتاب القدر میں اُن کی روایتیں لکھی ہیں۔

۶۶۔فضل ابن عطیہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۶۷۔فضل ابن موسیٰ سینائیؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ اسحاق وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۶۸۔فضیل ابن عیاضؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ سفیان ثوری اور سفیان ابن عیینہ اور ابن مبارک اور یحییٰ قطان اور سری السقطیؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور بخاری، مسلم، ابوداوٗد و ترمذی اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ابن مبارک کہتے ہیں کہ جتنے لوگوں کو میں نے دیکھا ہے اُن سب سے وہ اورع تھے۔

۶۹۔قاسم ابن معینؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن مہدی اور ابونعیم وغیرہ کے استاد ہیں اور ابوداوٗد اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۷۰۔قبیصہ ابن عقبہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ بخاری وغیرہ کے اُستاد ہیں اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں ہیں۔

۷۱۔قیس ابن الربیعؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور ثوریؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداوٗد، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۷۲۔ابن ابی لیلیٰ محمد ابن عبدالرحمٰنؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں لکھا ہے

اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور دونوں سفیان اور وکیعؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں

۷۳۔ لیث ابن سعدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن مبارک وغیرہ کے اُستاد ہیں۔ اور وہ امام مالکؒ سے بھی افقہ تھے اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

۷۴۔ امام مالکؒ، آپ کی جلالت شان محتاج بیان نہیں آپ ایک مذہب حقہ کے موجد ہیں اکثر محدثین اور اولیاء اللہ آپ کے مقلد ہیں بہت سے بلاد اسلامیہ میں اُن کی فقہ رائج ہے۔

۷۵۔ مالک ابن مغولؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ شعبہ اور دونوں سفیان وغیرہم کے استاد ہیں اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں ہیں۔

۷۶۔ محمد ابن طلحہ بن مصرفؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن مہدی اور ابونعیم وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں بخاری مسلم ابوداؤد ترمذی وغیرہ میں موجود ہیں۔

۷۷۔ محمد ابن مسلمؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن مہدی وعبدالرزاق اور قتیبہ وغیرہ کے استاد ہیں صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۷۸۔ مخلد ابن یزیدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد اور اسحاقؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور سوائے ترمذی کے بخاری وغیرہ کتب صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۷۹۔ مسعر ابن کدامؒ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو طبقہ خامسہ میں لکھا ہے اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ سلیمان تیمی وابن اسحٰق وشعبہ اور ثوریؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۸۰۔ مسلم ابن خالد الزنجیؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام شافعی اور ابن وہبؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۸۱۔معافی ابن عمران الموصلیؒ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ وہ بشر حافیؒ وغیرہ کے استاد ہیں۔سفیان ثوریؒ اُن کو یاقوتۃ العلماء کہا کرتے تھے۔اوزاعیؒ کا قول ہے کہ معافی موصلی اور ابن مبارک اور موسیٰ ابن اعین ائمہ ہیں مگر موصلی پر میں کسی کو مقدم نہیں کرتا۔ خلاصہ میں لکھا کہ اُن کی روایتیں بخاری، ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہیں۔

۸۲۔معمرؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ سفیان ثوری اور ابن مبارک وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۸۳۔مقاتل ابن حیانؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابراہیم ابن ادہم اور ابن مبارکؒ وغیرہ کے استاد ہیں۔اور سوائے بخاری کے مسلم وغیرہ کتب صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۸۴۔مکی ابن ابراہیمؒ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ وہ امام جعفر صادق اور ابوحنیفہ وغیرہ کے شاگرد اور امام بخاریؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۸۵۔موسیٰ کاظمؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ آپ امام جعفر صادق کے فرزند اور علی رضا کے والد ہیں۔اور آپ کی روایتیں ترمذی اور ابن ماجہ میں مذکور ہیں۔

۸۶۔نضر بن شمیلؒ خلاصہ میں لکھاہیکہ وہ یحییٰ ابن یحییٰ اور اسحٰق کوسج کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۸۷۔نضر ابن محمدؒ خلاصہ میں اس نام کے دو محدث ہیں دونوں کی روایتیں صحاح میں ہیں۔

۸۸۔نوح ابن ابی مریم ابوعصمہؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ زہری اور ثابت کے شاگرد ہیں اور علی ابن الحسین اور ابونعیم ابن حماد کے استاد ہیں۔ابوداؤد نے کتاب القدر میں اور ابن ماجہ نے تفسیر میں اُن کی روایتیں ذکر کی ہیں۔

۸۹۔وکیع ابن الجراحؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ احمد و اسحٰق اور ابن معینؒ وغیرہ کے

استاد ہیں۔اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۰۔ ہارون ابن المغیرۃؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن معینؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہیں۔

۹۱۔ ہشام ابن یوسفؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ اسحٰق اور ابن مدینی وغیرہ کے استاد ہیں۔اور سوائے مسلم کے بخاری وغیرہ کل کتب صحاح میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۲۔ ابو یحیٰی الحمانیؒ، جن کا نام عبدالحمید ابن عبدالرحمٰن ہے، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابوکریب وغیرہ کے استاد ہیں اور بخاری ابوداؤد و ترمذی اور ابن ماجہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۳۔ یحیٰی ابن آدمؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد و اسحٰق اور ابن مدینیؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۴۔ یحیٰی ابن اکثمؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں ترمذی وغیرہ میں ہیں۔

۹۵۔ یحیٰی ابن فضلؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ ان کی روایتیں ابوداؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

۹۶۔ یحیٰی ابن قطانؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ شعبہ اور ابن مہدی اور احمد ابن حنبل وغیرہ کے استاد ہیں۔اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۷۔ یحیٰی ابن معینؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ بخاری اور مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۹۸۔ یزید ابن ابراہیمؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

۹۹۔ یزید ابن ہارونؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام احمد اور اسحٰق اور ابن مدینیؒ وغیرہ کے استاد ہیں اُن کی مجلس میں ستر ہزار شخص تک جمع ہوئے ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں

موجود ہیں۔

۱۰۰۔ یزید ابن زریعؒ، خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ ابن المدینی اور محمد ابن منہالؒ وغیرہ کے استاد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

۱۰۱۔ یوسف ابن خالدؒ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں ترمذی میں موجود ہیں اُن کے سوا تبییض الصحیفہ وغیرہ میں مداحین امام صاحب کے اور بھی بہت سے نام ہیں۔ چنانچہ منجملہ اُن کے چند نام یہ ہیں۔

ابراہیم ابن معویۃ الضریر، اسمٰعیل ابن حماد، ابوامیہ جزری، اسرائیل ابن زیادہ، ابوبکر ابن عباس، بحر السقا، توبہ ابن سعد، جعفر ابن بزیغ، جریر ابن معاویہ، جعفر ابن الربیع، حازم، حسن بن زیاد، حیان التوحیدی، رباح ابن ابی نصر، ابوسفیان الحمیری، سہل ابن مزاحم، سعدان ابن سعید، شداد بن حکیم، عبدالعزیز ابن ابی سلمہ، عبداللہ بن اسحٰق، ابوعمر وابن العلا، علی ابن اسحٰق الحنظلی، عیسیٰ بن یونس، عمران ابن محمد، ابوغانم، کنانہ الہروی، لیث ابن نصر، ابومعویۃ الضریر، معروف ابن حسان، مقاتل ابن سلیمان، ابومعاذ البلخی، مغیرۃ ابن قاسم، نوح ابن اسد، یحییٰ ابن سعید، یٰسین الزیات، یحییٰ ابن ابی کثیر وغیرھم رحمہم اللہ تعالیٰ۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظمؒ کو پانچویں طبقہ میں اور امام بخاریؒ کو نویں طبقہ میں لکھا ہے اور آپ نے دیکھ لیا کہ امام صاحب کی مدح وثناء تیسرے ہی طبقہ سے شروع ہوگئی۔ اور نویں طبقہ تک ہر طبقہ کے اکابر محدثین برابر آپ کے مداح رہے اور محدثین بھی کیسے کہ اگر اُن کی اور اُن کے شاگردوں کی روایتوں کو علحدہ کردیں تو صحاح ستہ میں بجائے شمار احادیث صفر رہ جائیگا۔

دیکھنے کو تو یہ حضرات سوسوا سو ہیں جن کے نام لکھے گئے۔ مگر اُن کے شاگردوں کا حساب کیا جائے تو آسانی سے نہ ہوسکے گا۔ اس لئے کہ اُس زمانہ میں ایک ایک محدث کے صدہا سر برآوردہ شاگرد ہوا کرتے تھے پھر مداحوں کا انحصار انہی میں نہیں۔ آئندہ یہ

بات معلوم ہوگی کہ امام صاحب کے حلقہ مقدس میں ہر ملک و دیار سے جوق جوق محدثین آ کر مستفید ہوا کرتے تھے غرضکہ جب یہ حضرات امام صاحب کے حالات اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ سے اپنے تلامذہ سے کہتے ہوں گے تو ان اکابر دین کے ارشادات سے طالبین حق کے دلوں پر کیسا عمدہ پرزور اثر پڑتا ہوگا کیونکہ سلیم طبیعتوں کا لازمہ ہے کہ اپنے معتمد اساتذہ کے قول کو بغیر چوں وچرا کے مان لیتی ہیں۔ چونکہ کتب رجال سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں ایک ایک استاد کے صدہا شاگرد اور ایک ایک شاگرد کے صدہا استاد ہوا کرتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب فضائل علمیہ مختلف معتبر طریقوں سے بکّرات ومّرات محدثین کے طبقات میں پہونچا کئے۔ اور سعادتمند طلبہ کے دلوں میں پورے طور پر اُن کا رسوخ اور وثوق ہوتا گیا جس سے ثابت ہے کہ امام صاحب اپنے ہی زمانہ میں شہرۂ آفاق ہوگئے تھے اور اسلامی دنیا میں کمال وقعت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے یہاں تک محسود خلائق ہوگئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حاسدوں نے اقسام کے الزام آپ کے ذمہ لگائے جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوگا اور جہاں آپ کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں اُن افترا پردازیوں کا تودۂ طوفان پیش کیا جاتا ہے مگر اہل انصاف سمجھ پاتے ہیں کہ وہ سب بے اصل محض ہیں۔

اکابر محدثین جو امام صاحب کی تعریف میں رطب اللسان رہے وہ کوئی معمولی بات نہیں یہ حضرات دین کے معاملات میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے بلکہ دینی امور میں اُن کو اپنی جان کی بھی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جو تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ سفیان ثوریؒ نے اوزاعی سے پوچھا کہ عبداللہ بن علی سفاح کے ساتھ آپ کو کیا واقعہ پیش آیا؟ فرمایا کہ جب وہ شام میں آیا اور بنی امیہ کو قتل کیا تو ایک روز مجھے بلوایا۔ جب میں اُس کے دروازہ پر پہونچا تو دو شخصوں نے میرے دونوں بازو پکڑ لئے اور

دربار میں لے چلے۔ دیکھا کہ وہ تخت پر بیٹھا ہے اور چوبدار اور سپاہی تلواریں کھینچے ہوئے اور کافر کوب وغیرہ ہتھیاروں سے مسلح دوطرفہ صف بستہ کھڑے ہیں اور دونوں نے مجھے اتنے فاصلہ پر کھڑا کیا کہ میری بات کی آواز اُس تک پہونچے اُس نے مجھ سے پوچھا کیا تمہارا ہی نام عبدالرحمٰن ابن عمراوزاعی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں۔ کیا بنی امیہ کی جو خونریزی ہوئی اُس بات میں تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا آپ میں اور اُن میں کچھ معاہدے ہوں گے جن کے ایفا کی ضرورت تھی غصہ سے کہا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اُس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ اب قتل کا حکم دیتا ہے اور اپنے بچاؤ کی فکر کرنے لگا۔ ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ خدائے تعالیٰ کے روبرو کھڑے ہونے کا دن قریب آنے والا ہے اگر کوئی خلاف بات کہی جائے تو اُس روز کا معاملہ اس سے زیادہ سخت ہوگا اس خیال کے ساتھ ہی اُس کا خوف جاتا رہا اور میں نے جواب دیا کہ خونریزی اُن کی تم پر حرام تھی یہ سنکر غصہ کے مارے اُس کی یہ حالت ہوئی کہ رگیں پھول گئیں۔ آنکھیں متغیر ہو گئیں اور پوچھا یہ کس دلیل سے؟ میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کسی مسلمان کا خون حلال نہیں سوائے تین وجہ کے ایک زنا دوسری قصاص' تیسری ارتداد یعنی دین سے پھر جانا۔ کہا کیا دین کی راہ سے ہم مجاز نہیں؟ میں نے کہا وہ کیسا؟ کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو وصی نہیں بنایا تھا؟ میں نے کہا اگر وصی تھے تو اُن کو دو حکم مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سُنکر آگ بگولہ بن گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا سر میرے سامنے گرتا ہے مگر غصہ سے اشارہ کیا کہ اس کو نکال دو چنانچہ میں نکالا گیا تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک سوار پہونچا میں اُس کو دیکھتے ہی سواری سے اُتر پڑا اور اس خیال سے نماز پڑھنے لگا کہ نماز ہی میں سر کاٹا جائے مگر وہ ٹھہرا رہا۔ اور بعد فراغ نماز بہت سی اشرفیاں مجھے دیں جن کو میں گھر پہونچنے سے پہلے تقسیم کر دیا۔ اب دیکھئے ایسے راست باز جن کو دین کے معاملہ میں جان کی پرواہ نہ ہو، کیا

دینی معاملہ میں مداہنت کر کے انہوں نے امام صاحب سے از راہ تملق یہ کہا ہوگا کہ ہم محدثین دواساز ہیں اور تم فقہاء اطبّا ہو، اور کسی دباؤ سے امام صاحب کی بدگوئی اور بدگمانی سے توبہ کی ہوگی؟ معاذ اللہ جس سے اُن کو ذرا بھی اشتباہ ہوتا تو اغماض کرنا ممکن ہی نہ تھا بلکہ اُس کو رسوا کر کے مسلمانوں کو اُس کی حالت سے خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے تاکہ لوگ اُس کے فتنہ سے بچیں۔

اعترافِ محدثین بعلمِ امام صاحب

اب ہم امام صاحب کے علم کا حال لکھتے ہیں جو اکابر محدثین کی شہادتوں سے ثابت ہے۔
امام صاحب ۸۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے یہ وہ متبرک زمانہ ہے کہ بہت سے صحابہ اُس میں موجود تھے مگر آفتاب وجود صحابہ غروب ہونے کو تھا اس لئے اشاعت علوم کا بازار گرم تھا۔ اُدھر صحابہ بحسب ارشاد **فلیبلغ الشاھد الغائب** سرگرم اشاعت علوم تھے اُدھر مسلمانوں پر یہ خیال مسلّط تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ارشاد اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ ہی کے ساتھ واپس ہو جائے جس سے تمام امت مرحومہ محروم رہ جائے' تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ابوحنیفہؒ نے انس ابن مالک رضی اللہ عنہ کو کئی بار دیکھا ہے جس سے امام صاحب کا تابعی ہونا ثابت ہے۔

امام صاحب کا ابتدائی حال

امام صاحب کو اوائل میں کمال حمیت اسلامی اور حرارت دینی سے مذاہب باطلہ کے رد کا شوق ہوا جیسا کہ امام موفقؒ نے مناقب امام صاحب میں لکھا ہے کہ یحییٰ ابن شیبان کہتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنے ابتدائی حال کی خبر دی کہ مجھے علم کلام میں پوری مہارت

ہوگئی تھی اکثر طبقات خوارج اور حشویہ سے مناظرے کیا کرتا تھا۔ایک بار میرے خیال میں یہ بات آئی کہ صحابہ اور تابعین کو قوت علمیّہ کم نہ تھی مگر انہوں نے یہ کام کبھی نہیں کیا بلکہ وہ حضرات شرائع اور ابواب فقہیہ میں ہمیشہ خوض کیا کرتے اور لوگوں کو اُس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔اس لئے میں نے مناظرے چھوڑ کر سلف کا طریقہ اختیار کیا۔اور اُس میں قبیصہ ابن عقبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہؒ اوائل میں اہل ہوا سے مناظرے کیا کرتے تھے یہاں تک اس باب میں وہ راس اور صدر مانے جاتے تھے اور لوگوں کی نگاہیں اُن کی طرف لگی رہتی تھی مگر انہوں نے وہ ترک کر کے فقہ اور حدیث کی طرف توجہ کی اور اُس میں بھی امام ہو گئے۔

مناظرۂ امام صاحب

یوں تو آپ کے مناظرے بہت سارے ہیں مگر یہاں ایک مناظرہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

م ص ک۔ جب خوارج کو معلوم ہوا کہ ابوحنیفہ گناہگار اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے تو ستّر شخص امام صاحب کے پاس آئے دیکھا کہ مجلس درس مالا مال ہے امام صاحب سے کہا کہ ہم سب ایک مذہب والے ہیں لوگوں سے کہئے کہ ہمیں ایک مقام میں جگہ دیں آپ نے سب کو ہٹا دیا۔انہوں نے فوراً تلواریں کھینچ لیں امام صاحب کا محاصرہ کر کے کہا اے امت کے دشمن اور اے امت کے شیطان! ہم میں ہر شخص تیرے قتل کو ستّر جہاد سے بہتر سمجھتا ہے اور باوجود اس کے ہم تجھ پر ظلم کرنا نہیں چاہتے! امام صاحب نے فرمایا تو کیا انصاف سے میرا قتل چاہتے ہو؟ کہا ہاں فرمایا جب ایسا ہے تو تم تلواروں کو میان کرلو کیونکہ اُن کی روشنی سے مجھے خوف ہوتا ہے انہوں نے کہا یہ نہیں ہوسکتا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اُن کو تیرے خون سے رنگین کریں فرمایا خیر بسم اللہ جو کہنا ہو کہو انہوں نے کہا مسجد کے دروازے پر دو جنازے ہیں، ایک کا حال یہ تھا

کہ شراب ہمیشہ پیا کرتا تھا یہاں تک کے غرغرہ کی حالت تک اُس کے منہ میں شراب تھی گویا وہ شراب میں غرق تھا۔ دوسرا جنازہ ایک عورت کا ہے جس نے زنا کروائی اور جب حمل کا یقین ہوگیا تو خودکشی کر لی۔ امام صاحب نے فرمایا کہ وہ دونوں کس ملت کے تھے کیا یہودی تھے؟ کہا نہیں فرمایا نصاریٰ تھے؟ کہا نہیں فرمایا مجوسی تھے؟ کہا نہیں۔ فرمایا پھر کس ملت کے تھے؟ کہا اس ملّت کے جس میں لا الہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دی جاتی ہے۔ فرمایا یہ شہادت ثلث ایمان ہے یا ربع یا خمس کہا: ایمان کا ثلث ربع خمس نہیں ہوا کرتا پھر فرمایا پھر وہ ایمان کا کتواں حصہ ہے؟ کہا پورا ایمان ہے۔ فرمایا پھر تم پوچھتے کیا ہو۔ تم خود کہتے ہو کہ وہ دونوں مسلمان تھے۔ کہا خیر اس کو جانے دو وہ جنتی ہیں یا دوزخی؟ فرمایا میں اُن کے بارہ میں وہی کہتا ہوں جو نبی اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کی نسبت کہا تھا۔ ”**فمن تبعنی فانه منی و من عصانی فانک غفور رحیم**“۔ حالانکہ اُس قوم کے گناہ اُن دونوں سے بہت بڑے ہوئے تھے اور فرمایا میں وہی کہتا ہوں جو نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا **ان تعذبهم فانهم عبادک و ان تغفرلهم فانک انت العزیز الحکیم** ۔ حالانکہ اُن کے گناہ اُن دونوں کے گناہوں سے بڑے ہوئے تھے اور فرمایا میں اُن کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو نبی اللہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا ”**فما علمی بما کانوا یعملون ان حسابهم الا علی ربی لو تشعرون**“ یہ سنکر انہوں نے تلواریں ڈال دیں۔ اور کہا کہ ہم اپنے اعتقاد سے توبہ کرتے ہیں اور آپ کا دین اختیار کرتے ہیں۔ خدا نے آپ کو فضل و حکمت اور علم عطا فرمایا ہے اور سب رائے خوارج سے توبہ کر کے اہل سنت و جماعت میں داخل ہوگئے۔

غرضکہ امام صاحب کو مناظرہ میں کمال اور پورا ملکہ تھا اور اُس سے اسلام کو فائدہ بھی تھا مگر صرف اس خیال سے کہ سلف صالح نے یہ کام نہیں کیا اُس کو ترک کر کے فقہ کی طرف توجہ کی اور کمال ذکاوت وفہم سے اُس کے امام کہلائے۔

محدثین کو امام صاحب کے فہم وذکاء کا اعتراف

م ک ص۔ حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ ایک نادرالوجود شخص تھے میں نے اُن کا ساذکی اور ذی فہم اور صاحب نظر نہ دیکھا نہ سُنا۔

م ک ص۔ مقاتل ابن حیان کہتے ہیں کہ میں نے تابعین اور تبع تابعین کو دیکھا مگر اُن میں ابوحنیفہ کے جیسا نکتہ رس اور بصیرت والا شخص نہیں دیکھا۔

م ص ک۔ عبداللہ ابن اجلح کہتے ہیں کہ امام صاحب علم میں غوّاص تھے جب غوطہ مارتے تو عمدہ عمدہ دُر ویاقوت نکالتے۔

م ص۔ علی ابن ہاشم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کنز العلم تھے جو مسائل اعلیٰ درجہ کے علماء پر سخت تھے وہ اُن پر سہل تھے۔

خ۔ **قال الشعبة واللہ کان ابو حنیفة حسن الفهم جید الحفظ** یعنی شعبہ جو امام صاحب کے استاد ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ابوحنیفہ کی فہم اچھی اور حافظہ جید تھا۔

م۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے ہزار علماء سے ملاقات کی ہے مگر تین شخصوں کا سا عقلمند نہیں دیکھا محمد ابن مقاتل نے پوچھا تین شخص کون؟ کہا ابن عون اور ابوحنیفہ اور سفیان ثوری محمد کہتے ہیں میں نے کہا ابوحنیفہ ان لوگوں میں ہیں انہوں نے اس پر بہت افسوس کر کے کہا اگر میں ابوحنیفہ سے نہ ملتا تو اُن لوگوں میں ہوتا جو بازار میں پیسے بیچتے ہیں۔ اگر اُن سے نہ ملتا تو میں بدعتیوں میں ہوتا۔

م ک۔ علی ابن عاصمؒ کہتے ہیں کہ اگر ابوحنیفہ کی عقل نصف اہل زمین کی عقلوں کے ساتھ وزن کی جائے تو ان ہی کی عقل غالب ہوگی۔

م ص۔ خارجہ ابن مصعب کہتے ہیں کہ مجھے ایک ہزار علماء سے ملاقات ہے مگر اُن میں

تین یا چار شخصوں کو عقل میں زیادہ پایا جس میں ایک ابو حنیفہ ہیں۔

م ص ت۔ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ اگر اہل زمانہ کو اجازت ہوتی کہ اپنی رائے سے کچھ کہیں تو ابو حنیفہ سب سے زیادہ اس کے مستحق ہوتے۔

ک۔ بکر ابن خنیسؒ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور اُن کے زمانہ والوں کی عقلیں جمع کی جائیں تو ابو حنیفہ ہی کی عقل سب پر غالب آ جائیگی۔اور یزید بن ہارون کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو ابو حنیفہ سے عقل میں زیادہ اور افضل ہو۔

تہذیب الکمال میں لکھا ہے کہ یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ مجھے بہتوں سے ملاقات ہے مگر ابو حنیفہ سے اعقل، افضل اور اورع نہیں دیکھا۔

ص۔امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ابو حنیفہ سے زیادہ عقلمند کوئی نہ تھا۔

م ص ک۔حسن بن محمد بلخی کہتے ہیں کہ حماد بن ابی سلیمان جو امام صاحب کے استاد ہیں، وہ کہا کرتے تھے کہ بسا وقت ایسا ہوتا ہے کہ ابو حنیفہؒ کی رائے کے مقابلہ میں میں اپنی رائے کو متہم کرتا ہوں اور ان ہی کے قول کے قائل ہونے کی مجھے ضرورت ہوتی ہے۔

م ص ک۔محمد ابن جابرؒ کہتے ہیں کہ ہم حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے اور ابو حنیفہ اُن سے کلام کرتے اور جب کسی مسئلہ میں اُن کو خلاف ہوتا تو ایسی گفتگو کرتے کہ حماد کو تنگ کر دیتے۔آخر وہ کہتے کہ میں کیا کروں یہ قول عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ہے۔ ابو حنیفہ اُس کو یاد کر لیتے۔

م ص ک۔محمد بن مروان کہتے ہیں کہ ایک بار کلبیؒ نے ابو حنیفہؒ کو دیکھا اور حاضرین مجلس سے کہا اس شخص کو دیکھتے ہو خدا کی قسم جو شخص مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو اُس کا جواب میں آسانی سے دیدیتا ہوں مگر اس شخص نے جب کوئی بات مجھ سے پوچھی تو اُس کا جواب مجھ پر پہاڑ سے بھی زیادہ ثقیل ہو گیا۔۔

م ص ۔ مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ قوت حافظہ میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے بڑے ہوئے تھے۔

قوتِ حافظۂ امام صاحب

م ص ۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ قوت حافظہ اور فقہ اور صیانت اور شدت ورع میں سب پر غالب تھے۔

تبییض الصحیفہ میں امام صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ جب میں حمادؒ کی خدمت میں گیا تو جو مسائل وہ فرماتے میں یاد رکھ لیتا دوسرے روز جب اعادہ اُن مسائل کا ہوتا تو میرے ہمدرسؒ خطا کرتے اور میں سب سنا دیتا یہ دیکھ کر حمادؒ نے سب سے فرما دیا کہ صدر حلقہ میں میرے مقابل سوائے ابوحنیفہ کے اور کوئی نہ بیٹھے۔

م ۔ حارث ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ہم لوگ عطاء ابن ابی رباح کے حلقہ میں جایا کرتے کثرت کی وجہ سے آگے پیچھے بیٹھ جاتے مگر جب ابوحنیفہؒ آتے تو وہ مجلس کی توسیع کر کے اُن کو اپنے نزدیک جگہ دیتے ۔ قوت حافظہ ہی کے کمال کا باعث ہے کہ تمام احادیث جو فقہ سے متعلق ہیں اُن کو مستحضر تھیں اور جو مسئلہ پوچھا جاتا تھا اس کا جواب فوراً دیتے تھے۔

م ص ۔ لیث ابن سعید جو امام اہل مصر ہیں کہتے ہیں کہ مجھے ابوحنیفہ کے دیکھنے کی تمنا تھی۔ ایک بار دیکھا کہ لوگ ایک شیخ پر ٹوٹ پڑے ہیں ۔ ایک شخص نے اُن کا نام لیکر کوئی مسئلہ پوچھا انہوں نے فوراً جواب دے دیا ۔ لیث کہتے ہیں کہ اُن کے جواب باصواب سے مجھے اُس قدر تعجب نہیں ہوا جو فوراً جواب دینے سے ہوا ۔ فی الحقیقت امام صاحب کی حاضر جوابی تعجب خیز تھی۔

امام صاحب کی حاضر جوابی

موفقؒ نے عمار بن محمد کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ابوحنیفہ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کے پاس ہر ملک کے لوگوں کا ہجوم تھا ہر طرف سے لوگ مسائل پوچھتے تھے اور آپ ہر ایک کو برابر جواب دیتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سب جواب آستین میں رکھے ہوئے ہیں اور ہر ایک کو آپ فوراً نکال نکال کر دیتے ہیں۔

م ص۔ زفرؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ جب کلام کرتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ اُن کو تلقین کر رہا ہے۔

م ص۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ کسی مسئلہ میں ہم آپس میں اختلاف کرتے اور وہ حل نہ ہوتا تو امام صاحب کے پاس آتے۔ آپ اُس کا جواب ایسا فی الفور دیدیتے کہ گویا آستین میں رکھا تھا کہ آتے ہی نکال کر دے دیا۔

ت خ۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے حسن بن عمارہ کو دیکھا کہ ابوحنیفہ کی رکاب پکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو فقہ میں آپ سے زیادہ بلیغ اور حاضر جواب ہو۔

مدحِ کوفہ

اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ علم کا مدار عقل اور فہم اور حافظہ پر ہے اور اکابر محدثین کی گواہیوں سے ثابت ہے کہ اُس متبرک زمانہ میں جو عین شباب علم کا زمانہ تھا ان امور میں امام صاحب کا کوئی نظیر نہ تھا اور امام صاحب کا نشو نما ایسے شہر میں ہوا جو اسلامی دنیا میں دارالعلوم اور قبۃ الاسلام مسلم ہو چکا تھا اس لئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کوفہ

کو دار الخلافہ قرار دیا تھا تلقیح میں ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ کوفہ آٹھ خلیفوں کا دار الخلافت رہا ہے۔ اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اُس کو قبۃ الاسلام کہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دار الخلافت میں اہل کمال کا مجمع ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے بہت سے صحابہ وہاں اقامت گزیں تھے چنانچہ تلقیح میں ایک سوبیس صحابہ کے نام لکھے ہیں جو وہاں مقیم تھے۔ جامع ترمذی میں خیثمہ ابن سبرہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ طیبہ گیا اور ابو ہریرہؓ سے ملاقات کی۔ انہوں نے میرا وطن دریافت کیا میں نے کہا اہل کوفہ سے ہوں اور یہاں طلب علم کی غرض سے آیا ہوں فرمایا کیا تمہارے یہاں سعد ابن مالک اور عبداللہ ابن مسعود اور حذیفہ اور عمار اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ جہاں یہ حضرات ہوں وہاں کے لوگوں کو اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اور امام صاحب کے اساتذہ کوفہ میں ایک شعبی ایسے شخص ہیں اُن کا نظیر نہیں۔ چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ اُن کو پانچ سو صحابہ سے ملاقات ہے۔

ابن سیرین کہتے ہیں کہ جب میں کوفہ کو گیا تو دیکھا کہ شعبیؒ تدریس کر رہے ہیں اور لوگ اُن سے فتویٰ پوچھ رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں حالانکہ صحابہ وہاں بکثرت موجود تھے۔ اعصم احول کہتے ہیں کہ احادیث اہل کوفہ و بصرہ اور اہل حجاز کو شعبی سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ صلت ابن بہرام کہتے ہیں کہ میں نے ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو شعبی کے مبلغ علم کو پہونچا ہوا تھی۔ اور اُس میں لکھا ہے کہ **هو یعنی الشعبی اکبر شیخ ابی حنیفه** غرضکہ تبحر علمی حاصل کرنے کے لئے امام صاحب کو صرف شعبیؒ کی شاگردی کافی تھی۔ پھر علاوہ اس کے کوفہ میں علم حدیث کا سرمایہ اس قدر تھا کہ محدثین اُس سے مستغنی نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مقدمہ فتح الباری میں شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے امام بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ میں شام اور مصر اور جزیرہ اور بصرہ کو دو دو چار چار بار گیا ہوں مگر کوفہ اور بغداد کو اتنے بار گیا کہ اُس کا شمار نہیں کر سکتا۔ **کما قال لا احصی کم دخلت الکوفة و بغداد مع**

المحدثين ۔

اب غور کیجئے کہ اس قدر سرمایہ علم جس کے حاصل کرنے کو محدثین ہمیشہ مصائب سفر گوارا کر کے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ امام صاحب کے گھر میں موجود تھا اُس کے لئے اُن کو باہر جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر امام صاحب نے وہیں کے اساتذہ پر نہیں کفایت کی بلکہ حجاز وغیرہ میں سیاحت کر کے چار ہزار استادوں سے حدیث شریف کا سرمایہ حاصل کیا۔ جیسا کہ **الخیرات الحسان** وغیرہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ سے علم حاصل کیا ہے۔

امام سیوطی نے **تبییض الصحیفة** میں اور امام موفقؒ اور کردریؒ نے مناقب میں امام صاحب کے بہت سے اساتذہ کے نام لکھے ہیں۔ ہم اُن میں سے چند اسمائے گرامی ہدیہ ناظرین کرتے ہیں اور اُن کا مختصر سا حال بھی خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال سے لکھ دیتے ہیں تا معلوم ہو کہ کس درجہ کے وہ حضرات ہیں۔

اسمائے اساتذۂ امام صاحب

محمد ابن مسلم ابوبکر، عبداللہ بن عمر اور سہل بن سعید وغیرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

محمد ابن مسلم ابن تدرسؒ، جابر اور ابن عباس اور عائشہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔ اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

محمد ابن المنکدر ابو عبداللہؒ، عائشہ اور ابو ہریرہ اور ابو قتادہ اور جابر رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔ اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

ابراہیم ابن عبدالرحمٰن السکسکیؒ عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور صحاح

میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

ابراہیم ابن میسرۃ الطائفیؒ وہب ابن عبداللہ الثقفی اور انس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

اسمٰعیل ابن ابی خالد البجلی ابوعبداللہؒ، عبداللہ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما کے شاگر ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

اسمٰعیل ابن خالدؒ، ابوالملیح اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے شاگر ہیں اور ابن ماجہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

اعمش سلیمان بن مہرانؒ عبداللہ بن ابی اوفی وزید ابن وہب اور ابو وائل رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

الاوزاعیؒ، عبدالرحمٰن ابن عمر وعطا وابن سیرین کے شاگرد ہیں، اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

ایوب ابن ابی تمیمۃ السختیانیؒ، عمرو بن سلمہ اور ابو رجاء عطاردی اور ابوعثمان نہدی رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

بلال ابن مرداسؒ، انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد اور ترمذی وابن ماجہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

بہز ابن حکیم بن معاویہؒ، اپنے والد حکیم رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

ثابت البنانیؒ، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن فضل اور انس رضی اللہ عنہم کے شاگر ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

حبیب ابن ابی ثابت ابویحییٰؒ، زید ابن ارقم اور ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اور صحابہ کی ایک جماعت کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

حجاج ابن ارطاۃؒ ، شعبی اور عطاء اور عکرمہ رحمہم اللہ کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
الحر ابن الصباحؒ ، عبداللہ ابن عمر اور انس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد ترمذی ونسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
حسن ابن الحرؒ ، عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ترمذی وغیرہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔
حصین ابن عبدالرحمٰن ابوالہذیلؒ ، جابر ابن سمرہ اور ابووائل اور ابوظبیان رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
حکم بن عتبہؒ ، ابوجحیفہ وعبداللہ بن شداد اور ابووائل رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
حکیم ابن جبیر الاسدیؒ ، ابوجحیفہ اور ابوالطفیل رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور اکثر صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
حماد ابن ابی سلیمان الاشعریؒ ، انس اور ابووائل رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور مسلم شریف وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
خالد ابن علقمہ الہمدانیؒ ، عبدخیرؒ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
رباح الکوفیؒ ، عثمان رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
ربیعہ ابن ابی عبدالرحمٰن ابوعثمان المعروف بربیعۃ ، انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
ربیعہ ابن عبدالرحمٰنؒ ، حصین رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں ہیں۔
زیاد ابن علاقہؒ ، قطبہ اور جریر بجلی اور اسامہ ابن شریک رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور

کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

زید ابن اسلمؒ مولی عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ، اسلم اور ابن عمر اور جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

زید ابن علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے کہ آپ نے صحابہ کی ایک جماعت کو دیکھا ہے ابوداؤد و ترمذی وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

زید ابن انیسہؒ حکم اور طلحہ بن مصرف اور نعیم المجمرؒ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں ہیں۔

سعید ابن ابی عروبہؒ حسن اور نضر ابن انس رحمہم اللہ کے شاگرد اور شعبہ وغیرہ کے استاد ہیں کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

سعید ابن المرزبانؒ، انس اور ابووائل رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور بخاری وغیرہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

سعید ابن مسروقؒ، ابووائل رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

سلمہ ابن کہیلؒ، ابن عمر، اور جندب اور سوید ابن غفلہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں۔ اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

سماک ابن حربؒ، جابر ابن سمرہ اور نعمان ابن بشیر رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

شبیب ابن غرقدہؒ، عروۂ بارقی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن روایتیں موجود ہیں۔

شرحبیل بن سعیدؒ سعید ابن عبادہ رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

شرحبیل بن مسلمؒ، تمیم داری اور ابوالدرداء اور ابوامامہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور

ابوداؤدوترمذی وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

شعبہ ابن حجاجؒ، معاویہ ابن قرۃ اورانس ابن سیرین اوراعمش رحمہم اللہ کے شاگرد اور سفیان ثوری کے استاد ہیں۔اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

طلحہ ابن مصرف الیامیؒ، عبداللہ ابن ابی اوفیٰ اورانس اور ذرا بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

طلحہ ابن نافعؒ، ابوایوب اورابن عباس اور جابراورانس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عاصم الاحولؒ، انس ابن مالک اورعبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عاصم ابن سلیمان ابوعبدالرحمٰنؒ، انس اورعبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عاصم ابن کلیب الکوفیؒ ،کلیب اورابو بردہ اورمحمد بن کعب رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اورصحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عاصم ابن ابی النجودؒ، ابو وائل رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عامر ابن شراحیل، ابوہریرہ وعائشہ اورابن عباس رضی اللہ عنھم کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبداللہ ابن رباحؒ، ابی ابن کعب اورعمار رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اورمسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبداللہ ابن عبدالرحمٰن ابن ابی حسین المکیؒ، ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اورکل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبداللہ بن عثمان ابن خثیمؒ ،صفیہ بنت شیبہ اور ابوالطفیل رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبداللہ ابن ابی المجالدؒ،عبداللہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابودؤ وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدالعزیز ابن رفیع المکیؒ ، ابن عباس اور ابن عمر اور انس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدالکریم ابن ابی المخارقؒ ، انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور مسلم ،نسائی ،ترمذی وغیرہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدالملک ابن ایاس الشیبانی الاعور الکوفیؒ ،ابوعمر والشیبانی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدالملک ابن عمر اللخمیؒ، جریر بجلی اور جندب بجلی رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدالملک ابن میسرۃ الہلالی الکوفیؒ ،زید ابن وہب رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبدۃ ابن ابی لبابتہ الاسدیؒ ، ابن عمر رضی اللہ عنہما اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما و کے شاگرد ہیں اور بخاری وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عبیداللہ ابن ابی زیاد المکیؒ، ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

عثمان ابن عاصم کوفیؒ ،ابن عباس اور ابن الزبیر وغیرھما رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عثمان ابن عبداللہ ابن موہبؒ، ابن عمر اور ابو ہریرہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور بخاری وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عطیہ ابن الحرث ابو روق الکوفیؒ، انس اور ابراہیم تیمی رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عطیہ ابن سعد جنادۃ الجد لیؒ، ابو ہریرہ اور ابو سعید اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، ابن عباس اور عائشہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

العلاء ابن زہیر الکوفیؒ، عبدالرحمٰن ابن الاسود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور نسائی میں اُن کی روایتیں ہیں۔

علی ابن اقمر الوداعیؒ، ابو جحیفہ اور اسامہ ابن شریک اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عمرو ابن دینارؒ، عبداللہ بن عمر وعبداللہ بن مسعود وعبداللہ بن عباس رضی اللہ عہنم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

عمرو بن عبداللہ الہمد انی السبیعیؒ، جریر بجلی اور عدی بن حاتم اور جابر ابن سمرہ اور زید ابن ارقم رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔

عمرو بن مرۃ المرادی الجملیؒ، عبداللہ بن ابی اوفی اور ابووائل رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

عون ابن عبداللہ ابن عیینہ الہذ لی الکوفیؒ، اپنے والد اور عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

غالب ابن الہذیل ابوالہذیل الکوفیؒ ، انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
فرات ابن ابی عبدالرحمٰن القزازؒ ، عامر ابن واثلہ اور ابوحازم رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
قتادہ ابن دعامہؒ ۔ انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
قیس ابن مسلم ابوعمر الکوفیؒ طارق ابن شہاب رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔
محارب ابن دثار الکوفیؒ ابن عمر اور جابر اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔
مرزوق ابوبکر التیمیؒ ام درداء رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں اور ترمذی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
مسعر ابن کدامؒ ۔ عطاء اور سعید ابن ابی بردہ اور حکم رحمہم اللہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں کہ صدق کی وجہ سے اُن کا نام مصحف رکھا گیا تھا۔
مسلم ابن کیسان الملائی الکوفیؒ انس اور عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور ترمذی وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
مکحول الشامیؒ واثلہ اور انس رضی اللہ عنھا کے شاگرد ہیں اور مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
معاویہ ابن اسحاقؒ عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں اور بخاری وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
منصور ابن زاذان الواسطیؒ انس اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ

میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
منصور ابن المعتمر ابو عتاب الکوفیؒ ۔ ابراہیم اور ابووائل اور وز بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں ان کی روایتیں موجود ہیں۔
موسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ التیمیؒ اپنے والد اور عثمان رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
موسیٰ ابن مسلم الکوفیؒ ابراہیم تیمی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
میمون بن سیاہ البصریؒ انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور بخاری وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
میمون ابن مہرانؒ، ابو ہریرہ اور ابن عباس اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
نافع مولیٰ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ، ابن عمر اور ابولبابہ اور ابو ہریرہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
ہشام ابن عروہؒ فاطمہ بنت المنذر اور ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ایوب وابن جریج وشعبہ ومعمرؒ وغیرہ کے اُستاد کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
یحییٰ بن ابی حیۃ الکوفیؒ ۔ عبدالرحمٰن ابن ابی لیلی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
یحییٰ ابن عبداللہ ابوالحارثؒ سالم ابن ابی الجعد رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور ابوداؤد وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔
یزید ابن صہیبؒ ابن عمر اور جابر رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں اور بخاری، مسلم وغیرہ میں اُن کی

روایتیں موجود ہیں۔

توثیقِ مرویاتِ امام صاحب

یہ ہیں امام صاحب کے اساتذہ آپ نے دیکھ لیا کہ اکثر اساتذہ امام صاحب کے تابعین اور صحابہ کے شاگرد ہیں جن کی روایتیں صحاح ستہ میں موجود ہیں۔ اور جن کی روایتیں بعضے محدثین نے نہیں لیں اُس کی عام وجہ یہ ہے کہ بُعد زمانہ کی وجہ سے معرفت کے اکثر ذریعے مسدود ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخالفوں اور حاسدوں کی افترا پردازیاں مشہور ہو جاتی ہیں جس سے متاخرین کو ان میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے اور اُن کی حدیثوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے معاصرت میں ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کیونکہ آدمی اپنی ذات سے تحقیق کر سکتا ہے۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ امام صاحب پر کیسے کیسے طعن ہوئے جواب تک مخالفوں کے زبان زد ہیں۔ مگر عبداللہ ابن مبارک وغیرہ اکابر محدثین نے جو امام صاحب کے معاصر تھے خود جا کر تحقیق کر لی اور جب دیکھا کہ سب محض کذب وافترا ہیں، آپ کو اپنا استاد بنا لیا اسی وجہ سے ابن سیرین فرماتے ہیں جیسا کہ ترمذی شریف میں ہے" **روی عن ابن سیرین انه قال ان الرجل لیحدثنی فما اتهمه و لکن اتهم من فوقه**" یعنی میں اپنے استاد پر تہمت نہیں لگا سکتا البتہ اُن کے اوپر کے لوگوں کو متہم سمجھ سکتا ہوں‘ اس کی وجہ یہی ہے کہ کسی کو جب اپنا استاد بناتے ہیں تو اول اُس کی حالت کی تحقیق کر لیتے ہیں اس لئے کہ علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے" **انظروا ممن تاخذون هذا العلم فانما هو الدین** " یعنی تحقیق کر کے کسی کو اپنا استاد بنایا کرو کیوں کہ علم ہی دین ہے اور جامع الصغیر میں اسی کی مؤید حدیث مرفوع موجود ہے۔" **ان هذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم .ک عن انس السنجری عن ابی هریره**" اور بعد تحقیق تہمت

لگانے کا موقع نہیں بخلاف اوپر کے لوگوں کے کہ اُن کی جرح وتعدیل کا مدار تقلید پر ہے۔
یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ کے بعضے اساتذہ ایسے بھی ہیں کہ امام مسلم وغیرہ نے ان میں کلام کر کے اُن کی روایتوں کو داخل صحاح نہیں کیا اور چونکہ بخاریؒ کے نزدیک اُن کا صدق مسلم ہو گیا تھا۔ اس لئے اُن کو استاد بنالیا الغرض امام صاحب کے جتنے اساتذہ ہیں اُن میں کلام کی گنجائش نہیں کیونکہ اپنی ذاتی تحقیق سے امام صاحب نے اُن کو استاد بنالیا تھا۔ اور متاخرین کی جرح جو تقلید پر مبنی ہے اُس ذاتی تحقیق کے مقابلہ میں مفید نہیں۔ اب رہے استادوں کے استاد سو وہ صحابہ تھے جن میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں۔ جیسا کہ اصول حدیث میں مسلم ہے کہ صحابہ کل عدول ہیں اور جو روایتیں امام صاحب کے اساتذہ نے تابعین سے کی ہیں اُن میں بھی جرح کا احتمال بہت کم ہے جیسا کہ اہل بصیرت پر پوشیدہ نہیں۔
الحاصل امام صاحب کو جتنی روایتیں پہونچی ہیں اُن کی صحت میں کلام نہیں اور اگر کسی روایت میں متاخرین کو کلام ہو تو بمقابلہ تقدم زمان وقلت وسائط وجلالت شان امام و دیگر قرائن قابل اعتبار نہیں۔

امام صاحب اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے

غرضکہ اکابر محدثین کی چشم دید گواہیوں سے ثابت ہے کہ نہ کوئی عقل وفہم میں امام صاحب کا نظیر تھا نہ قوت حافظہ میں اور امام صاحب کی نشو ونما ایسے شہر میں ہوئی جو قبۃ الاسلام اور مرجع علماء ومحدثین تھا اور علاوہ اس کے دوسرے شہروں میں بھی آپ نے طالب علمی کی اور چار ہزار استادوں سے سرمایۂ حدیث فراہم کیا۔ اور تدین وخدا ترسی کا وہ حال کہ سرآمد روزگار تھے جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہوگا۔ اب ان تمام امور کے لوازم اور متعلقات پر غور کرنے سے اہل انصاف بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ امام صاحب کو فن حدیث

میں جو تبحر حاصل تھا مافوق العادت تھا یہ بات ہم اپنے قیاس سے نہیں کہتے بلکہ اکابر محدثین نے اُس کی تصریح کی ہے چنانچہ کردریؒ نے مناقب میں یزید بن ہارون کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ابوحنیفہ کے زمانہ میں اُن کا نظیر تلاش کیا گیا مگر نہ ملا۔اسی وجہ سے یزید بن ہارون قائل تھے کہ امام صاحب اعلم الناس ہیں جیسا کہ موفق نے لکھا ہے۔

م۔ ابوبکر ابن عیاش کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہؒ اپنے زمانہ کے لوگوں میں افضل تھے۔

م۔ ابویحیٰی حمّانی کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے بہتر شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔

م ص۔عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ افقہ الناس تھے میں نے فقہ میں اُن کا مثل نہیں دیکھا۔

ص ک۔اعمش کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ وہ مسائل جانتے ہیں کہ نہ حسن بصری جانتے ہیں نہ ابن سیرین نہ قتادہ نہ اُن کے سواء اور کوئی۔

م ص ک۔خارجہ ابن مصعب کہتے ہیں کہ ایک ہزار سے زیادہ علماء سے میں نے ملاقات کی ہے مگر علم وعقل میں میں نے کسی کو ابوحنیفہ کا نظیر نہیں پایا۔اُن کے روبرو آتے ہی اُن کے علم اور زہد اور ورع اور صیانت نفس کی وجہ سے آدمی کی یہ حالت ہوجاتی تھی کہ اپنے نفس کو حقیر سمجھ کر متواضع ہوجاتا تھا۔

م ص۔ایک بار ابن مبارکؒ کی مجلس میں امام صاحب کا ذکر کسی نے بے طوری سے کیا آپ نے فرمایا کہ تمام علماء میں سے ایک تو ابوحنیفہؒ کا مثل پیش کرو ورنہ ہمارا پیچھا چھوڑو اور ہم کو عذاب میں نہ ڈالو! میں اُن کی مجلس میں اکابر کو دیکھتا تھا کہ صغیر معلوم ہوتے تھے اُن کی مجلس میں میں اپنے آپ کو جس قدر ذلیل پاتا تھا کسی مجلس میں نہیں پایا۔یعنی اُن کے مقابلہ میں اپنے علم کی کوئی ہستی نہ تھی۔

خ۔ سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ ابوحنیفہؒ کی مخالفت ایسا شخص کرسکتا ہے جو اُن سے قدر اور علم میں بڑھا ہوا اور ایسا شخص کہاں ہے۔

م ص ۔ سفیان ابن عیینہؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے زمانہ کے عالم تھے اُن کے بعد شعبیؒ اپنے زمانہ کے عالم ہوئے ۔ اُن کے بعد ابو حنیفہؒ اپنے زمانہ کے عالم ہوئے یعنی ان قرون ثلاثہ میں ہر ایک اپنے اپنے زمانہ میں بے مثل تھا۔

خ ۔ سفیان ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہ کا مثل میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔

ک ۔ مسیّب ابن شریک کہتے ہیں کہ اگر تمام شہروں کے لوگ اپنے اپنے علماء کو لائیں اور ہم ابوحنیفہ کو پیش کریں تو وہ ہمارا مقابلہ نہ کرسکیں گے۔

ک ۔ خلف ابن ایوب کہتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں اُن سے علم میں بڑھا ہوا کوئی نہ تھا۔

م ک ۔ ابومعاذ خالد بن سلیمانی بلخی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ سے افضل شخص میں نے نہیں دیکھا۔

ک م ص ۔ حمانی کہتے ہیں شریکؒ ایک روز اپنی مسجد میں بیٹھے تھے کہ قریش کی ایک قوم آئی اور ابوحنیفہؒ کا ذکر کر کے پوچھا کہ آپ کا کیا حال تھا؟ کہا وہ ایک اجنبی شخص تھے ہم سے نہ تھے مگر ہم سب پر غالب آ گئے۔

م ص ک ۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ علما کے قاضی القضاۃ ہیں ۔ یعنی جس مسئلہ میں انہوں نے فیصلہ کر دیا اُس کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔

ت خ ۔ مکی ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ اپنے زمانہ کے علماء میں اعلم تھے یعنی علم میں سب سے زیادہ تھے امام صاحب کے زمانہ کے علماء امام مالک ، اوزاعی ، سفیان ثوری ، مسعر اور عبداللہ ابن مبارک وغیرہ صدہا محدثین تھے جن کے شاگردوں میں اصحاب صحاح ستہ کے معتمد اساتذہ تھے اُن سب کے علم پر امام صاحب کے علم کو مکی ابن ابراہیم جیسے شیخ جلیل القدر ترجیح دے رہے ہیں یہ وہی مکی ابن ابراہیمؒ ہیں جن کا حال امام ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ وہ ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور بخاری وغیرہ کے استاد ہیں۔

امام بخاری اُن کی شاگردی پر جس قدر ناز کریں بجا ہے اس لئے کہ اکثر ثلاثیات کا افتخار جو

اُن کو حاصل ہے ان ہی حضرت کے طفیل سے ہے کیونکہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں اورامام بخاریؒ کے زمانہ تک زندہ رہے۔

ص۔مکی ابن ابراہیم حدیث اور فقہ میں ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے اوراُن سے نہایت محبت رکھتے تھے اوراُن کے مذہب کے باب میں نہایت متعصب تھے۔اسمٰعیل ابن بشر کہتے ہیں کہ ایک بار مکی ابن ابراہیم کی مجلس میں میں حاضر تھا انہوں نے کہا حدثنا ابوحنیفہ ایک شخص نے کہا حضرت ابن جریج کی کوئی روایت بیان کیجئے ابوحنیفہ کی روایت کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ سنتے ہی نہایت غضبناک ہوکر کہا! اے شخص میری مجلس سے اٹھ جا اور جب تک وہ اٹھا یا نہیں گیا کوئی روایت نہیں بیان کی۔اب غور کیا جائے کہ مکی ابن ابراہیم اورا کابر محدثین جب یہ کہہ رہے ہیں کہ ابوحنیفہ اعلم الناس تھے جن کا نظیر تلاش کرنے پر بھی نہ ملا تو ان چشم دید گواہیوں کے مقابلہ میں اگرکوئی آخری زمانہ والا ہندوستانی کہے کہ ابوحنیفہ ایک بے علم شخص تھے جن کوحدیثیں پہونچی ہی نہیں تو اُس کو کیا کہنا چاہیئے۔

ت۔شداد ابن حکیم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ سے اعلم میں نے نہیں دیکھا۔

خ۔امام شافعیؒ نے امام مالکؒ سے کئی محدثین کا حال دریافت کر کے ابوحنیفہؒ کا حال پوچھا۔ فرمایاسبحان اللہ لم ار مثلہ ،یعنی وہ عجیب شخص تھے ان کا مثل میں نے نہیں دیکھا۔

م ص ک۔معروف ابن حسان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ملاقاتی علماء میں ابوحنیفہؒ کا مثل علم فقہ، ورع، اورصیانت میں نہیں دیکھا۔

م ص ک۔یوسف ابن خالدالسمتی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ دریائے بے پایاں تھے اُن کی عجیب شان تھی نہ میں نے اُن کا مثل دیکھا نہ سنا۔

م ص۔خلف ابن ایوّب کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہ ایک نادرالوجود شخص ہیں۔

م ص۔ابو یوسف کہتے ہیں کہ پہلے میں ابن ابی لیلیٰ کے حلقہ میں جایا کرتا تھا اُس کے بعد ابوحنیفہ

کے حلقہ میں جانا شروع کیا۔ایک بار ابن ابی لیلی سے ملاقات ہوئی انہوں نے امام صاحب کی خیریت پوچھی پھر کہا ان کو مت چھوڑ و فقہ اور علم میں اُن کا مثل تم نے نہیں دیکھا انتہی ۔

یہ بات متعدد روایتوں سے ثابت ہے کہ ابن ابی لیلی اور امام صاحب میں سخت مخالفت تھی مگر طبیعت میں اُن کے انصاف تھا اس لئے واقعی بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔الحاصل موافق مخالف سب قائل تھے کہ علم اور فقہ میں امام صاحب کا مثل نہیں ۔

ص ک۔سعید ابن ابی عروبہ نے امام صاحب سے کئی مسئلوں میں گفتگو کی آخر کہدیا کہ ہم نے جو متفرق اور مختلف مقاموں سے حاصل کیا تھا وہ سب آپ کے پاس مجتمع ہے۔

سعید ابن ابی عروبہ نے جو مختلف مقاموں کا ذکر کیا اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے جیسا کہ امام ذھبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ **''حدث عن الحسن و ابی نصرۃ العبدی و ابی رجاء العطاردی و نضر ابن انس و قتادۃ و مطر الوراق و خلق کثیر''** دیکھئے جو حدیثیں انہوں نے ایک خلق کثیر سے حاصل کی تھیں سب امام صاحب کے پاس جمع تھے کیا اس کا یہی مطلب ہوگا کہ امام صاحب فن حدیث سے ناواقف تھے۔

ت۔خلف ابن ایوب کہتے ہیں کہ علم خدائے تعالیٰ کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا پھر صحابہ میں تقسیم ہوا پھر تابعین میں اُن کے بعد ابو حنیفہ اور اُن کے اصحاب میں آیا۔

م ص ک۔عبداللہ ابن مبارک کہتے ہیں اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ افراط کی نسبت میری طرف کی جاویگی تو ابوحنیفہ پر کسی کو مقدم نہ کرتا۔

م ص ک۔بحر سقا کہتے ہیں کہ میں ابو حنیفہؒ سے علمی مسائل میں کلام کیا کرتا تھا ایک روز انہوں نے کہا تم اپنے نام کی طرح بحر ہو میں نے کہا میں بحر ہوں تو آپ بحور ہو۔

م ص۔حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ ایک دریائے بے پایاں تھے۔اُن کے علم کی

انتہاءہمیں معلوم نہ ہوسکی۔
ک۔اسرائیل ابن یونس کی مجلس میں امام صاحب کا ذکر آیا انہوں نے کہا کہ اس زمانہ میں لوگ جن چیزوں کی طرف محتاج ہیں اُن کو وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔
ت۔اسرائیل بن یونس کہتے ہیں کہ جس حدیث میں فقہ کا کوئی مسئلہ ہواُس کو ابوحنیفہ خوب یادرکھتے تھے۔

امام صاحب کی حدیث دانی

تہذیب التہذیب میں اسرائیل بن یونس کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایک خلق کثیر سے روایت کی ہے دیکھئے جنہوں نے ایک خلق کثیر سے سرمایہ حدیث حاصل کیا اور حافظہ اُن کا اس قدر کہ امام احمد ابن حنبلؒ جیسے قوی الحفظ اُن کے حافظہ پر تعجب کرتے تھے جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے جب ایسے شخص کہیں کہ لوگ جن چیزوں کی طرف محتاج ہیں ابوحنیفہ اُن کو سب سے زیادہ جانتے ہیں تو غور کیجئے کہ امام صاحب کے پاس محتاج الیہ سرمایہ حدیث کس قدر ہوگا۔ہم نے مانا کہ لوگوں کو اُس زمانہ میں تدوین فقہ کی احتیاج تھی مگر اُس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ فقہ بغیر حدیث کے مدون نہیں ہوسکتی تھی اس سے یہ لازم ہے کہ بقول اسرائیلؒ امام صاحب فقہ اور حدیث دونوں میں سب سے بڑے ہوئے تھے۔چنانچہ یہی بات اعمشؒ نے کھلے لفظوں میں فرمایا کہ آپ فقہ اور حدیث دونوں کو خوب جانتے ہو۔
ک۔حفص ابن غیاثؒ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے جیسا عالم اُن احادیث کا میں نے نہیں دیکھا جو احکام میں مفید اور صحیح ہوں۔
حفصؒ چونکہ خود فقیہ تھے جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے اس لئے انہوں نے ایک چھوٹے سے جملہ میں امام صاحب کی نہایت وسیع تعریف کی اس لئے کہ امام صاحب کو

تدوین فقہ میں انہی احادیث کی ضرورت تھی جو مفید احکام اور صحیح ہوں۔ کسی مسئلہ میں ایک صحیح حدیث موجود ہو تو وہ سو غیر صحیح حدیثوں سے بہتر سمجھی جائیگی۔ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ سے جو حدیثیں لی تھیں اُن میں غور وفکر کر کے انہی حدیثوں کو مستحضر کرلیا تھا۔ جن سے احکام کا استنباط ہوسکتا تھا اور وہ صحیح بھی تھیں۔ اب غور کیجئے کہ جو کہا جاتا ہے کہ فقہ صحیح حدیثوں کے مخالف ہے کس قدر زیادتی ہے اکابر محدثین کی شہادتوں سے تو یہ ثابت ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں جو حدیثیں صحیح سمجھی جاتی تھیں فقہ اُن کے موافق ہے۔

م ص ک۔ محمود ابن شریک کہتے ہیں کہ " **انبانا عبدالله بن یزیدقال حدثنا ابو حنیفة شــاه مردان** " یعنی عبداللہ یزید مقری امام صاحب سے حدیث کی روایت کرتے تو اُن کا نام شاہ مردان کے لقب کے ساتھ لیتے اور لکھا ہے کہ حدثنا شاہ شاہ بھی کہتے تھے۔

م ک ص۔ ابوعصمہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سی حدیثیں جو اساتذہ سے سنی تھیں ابوحنیفہؒ پر پیش کیں انہوں نے ہر ایک کا ضروری حال بیان کر دیا کہ فلاں حدیث لینے کے قابل ہے اور فلاں نہیں۔ اب مجھے افسوس آتا ہے کہ کل حدیثیں اُن کو کیوں نہیں سنائیں''۔

اسی سے امام صاحب کی حدیث دانی کا بھی حال معلوم ہو گیا کہ ہر حدیث کے **ماله و ما علیه** کو بھی خوب جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ محدثین بھی امام صاحب کو امام کہتے تھے۔

چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابو داؤد سجستانی (صاحب سنن) کا قول ہے ''**ان اباحنیفة کان اماماً**'' یعنی وہ کہتے ہیں یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ ابوحنیفہ امام تھے۔

ک۔ ابراہیم ابن طہمان کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ ہر بات کے امام ہیں۔

ک۔ ابوامیہ سے پوچھا گیا کہ عراق سے جو علماء آپ کے پاس آئے اُن میں افقہ کون ہیں؟ کہا ابوحنیفہ اور وہی امام ہیں۔

ک۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں ''**کیف تقولون الامام الاعظم لا یعرف الحدیث**''

یعنی امام اعظم کی نسبت یہ کیونکر کہہ سکتے ہو کہ وہ حدیث نہیں جانتے مطلب یہ کہ جو اور اماموں سے بڑا امام ہو کیا ممکن ہے کہ وہ حدیث ہی کو نہ جانے۔

امام صاحب کا امام اعظم ہونا

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام صاحب کو امام اعظم کا لقب امیر المومنین فی الحدیث (یعنی ابن مبارک نے) دیا ہے جن کی اتباع کل محدثین کو لازم ہے اسی وجہ سے امام ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کے ترجمہ کی ابتدا یوں کی ہے ''**ابو حنیفۃ الامام الاعظم فقیہ العراق النعمان ابن ثابت**''۔

م ص ک۔ امام ابو یحیٰی زکریا ابن یحیٰی نیشا پوری نے اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہؒ میں یحیٰی بن نصر ابن حاجبؒ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ کئی صندوق حدیثیں میرے پاس ہیں اُن میں سے بہت تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے انتفاع ہوا تھی۔

کشف بزدوی میں بھی یہ روایت موجود ہے چونکہ امام صاحب کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کئی صندوق حدیثیں آپ کو ازبر یاد تھیں جس کو آپ اجتہاد کے وقت مستحضر رکھتے تھے۔ مگر چونکہ روایت کا کام آپ نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا اس لئے وہ روایتیں آپ سے مروی نہیں۔ آپ کی عادت تھی کہ اجتہاد کے وقت جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اہل حلقہ سے فرماتے جن کو جو کچھ احادیث و آثار یاد ہوں پیش کردیں۔ اُس کے بعد آپ تقریر کرتے اثنائے تقریر میں جس بات پر آپ کو بمقتضائے اجتہاد زور دینا منظور ہوتا اور اُس کی مؤید اہل حلقہ کی پیش کردہ حدیثوں میں کوئی حدیث نہ ہوتی تو ایسے موقع میں آپ اپنی ذاتی مرویات کو بیان کردیتے۔ یہ طریقہ آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اختیار کیا تھا کہ جب

کسی واقعہ میں اشد ضرورت ہوتی اور کسی کو اُس واقعہ سے متعلق کوئی حدیث یاد نہ ہوتی آپ بیان کر دیتے جیسا کہ کتب سیر وغیرہ سے ظاہر ہے۔

اوپر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اعمشؒ جو مصحف کہے جاتے تھے انہوں نے بھی امام صاحب کے محدث ہونے کو تسلیم کر لیا ہے۔

امام صاحب صرف کثرت سرمایہ حدیث ہی کی وجہ سے امام نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ احادیث کے معنی اس خوبی سے کرتے تھے کہ کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہتا تھا۔

م ک ۔ خلف ابن ایوب کہتے ہیں کہ میں علماء کی مجلسوں میں جایا کرتا تھا جو بات سمجھ میں نہ آتی تو مجھے غم ہوتا اور ابوحنیفہ سے جب وہی بات پوچھتا تو اشکال حل ہو جاتا جس سے دل میں نور پیدا ہوتا تھا۔

م ص خ ک ۔ میں لکھا ہے کہ حافظ محمد ابن میمون قسم کھا کر کہتے تھے کہ ابوحنیفہ کے افادات سننے میں جس قدر مجھے خوشی ہوئی لاکھ اشرفی ملنے میں بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ نور وسرور جو امام صاحب کے افادات سے حاصل ہوتا تھا اُس کی وجہ یہی تھی کہ احادیث کے مضامین غامضہ جن تک محدثین کے فہم و ادراک کی رسائی نہ تھی ۔ امام صاحب اُن کو نہایت عمدگی سے بیان کرتے تھے جس کو طالبین کمال اصل علم سمجھتے تھے۔

ک ۔ شداد بن حکیم کہتے ہیں کہ نوح ابن مریم جب کوئی روایت سلف سے کرتے تو اُس کے آخر میں ابوحنیفہؒ کا قول ضرور بیان کر کے کہتے کہ جس طرح انہوں نے علم کی تفسیر کی ہے کسی نے نہیں کی۔

م ص ک ۔ معروف ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں علی بن عاصم کی مجلس میں تھا انہوں نے سب سے کہا کہ تم لوگ علم سیکھو ہم نے کہا کیا آپ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں وہ علم نہیں کہا وہ علم ہے جو ابوحنیفہ جانتے ہیں اور کہا کہ اگر ابوحنیفہ کا علم اُن کے زمانہ کے تمام علماء کے ساتھ

وزن کیا جاتا تو انہی کا علم غالب ہوتا۔

م ص ک۔ ابوسفیان حمیریؒ کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہ اس امّت کے بہترین اشخاص سے ہیں سخت مسائل کا کشف اور احادیث مبہمہ کی تفسیر جو انہوں نے کی کسی سے نہ ہوسکی۔

م ص ک۔ مقاتل ابن سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو علم کی تفسیر کرتے دیکھا ایسی تفسیر کرتے تھے کہ اُس سے تسکین ہو جاتی تھی۔

م۔ فضل ابن موسیٰ سینانی کہتے ہیں کہ ہم حجاز اور عراق کے علماء کی مجلسوں میں پھرا کرتے تھے مگر جو برکت اور نفع ابوحنیفہؒ کی مجلس میں تھا وہ کہیں نہ تھا۔

ک۔ ایک روز وکیعؒ کی مجلس میں ایک حدیث پیش ہوئی جس کا مضمون مشکل تھا وہ کھڑے ہوگئے اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا اب ندامت سے کیا فائدہ کہاں ہیں وہ شیخ یعنی ابوحنیفہ جن سے یہ اشکال حل ہوتا۔

خ۔ ابن مبارکؒ نے امام صاحب کے قبر پر کھڑے ہو کر کہا کہ ابراہیم نخعی اور حماد ابن سلیمان نے مرتے وقت اپنا خلیفہ چھوڑا تھا خدا آپ پر رحم کرے کہ آپ نے اپنا خلف روئے زمین پر نہ چھوڑا یہ کہکر زار زار دیر تک روتے رہے۔

ک۔ امام ابو یوسفؒ کہتے تھے کہ مجھے آرزو آتی ہے کہ ابوحنیفہؒ کی ایک مجلس مجھے نصیب ہو اور میں اپنا آدھا مال اُس کے لئے صرف کردوں۔ لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں بیس لاکھ درہم اُن کے ملک میں تھے اصمعیؒ نے اس آرزو کی وجہ دریافت کی کہا کہ بعضے مسائل میں خدشے ہیں جن کے حل کرنے کی ضرورت ہے۔

م ص۔ خلاد سکونی کہتے ہیں ایک روز میں زہیر ابن معاویہ کے یہاں گیا انہوں نے پوچھا کہاں سے آتے ہو میں نے کہا ابوحنیفہ کے پاس سے سنتے ہی انہوں نے کہا خدا کی قسم اُن کے پاس ایک روز بیٹھنا میرے پاس ایک مہینہ بیٹھنے سے زیادہ تم کو نفع دے گا۔ یہ ہیں نفوس

قدسیہ کے آثار وعلامات کہ باوجودیکہ منشا حسد کا قائم ہے مگر واقعی فضیلت بیان کرنے اور خود اپنے آپ پر ترجیح دینے میں ذرا بھی تامل نہیں ۔اور قابل قبول بھی ایسی ہی شہادتیں ہوتی ہیں ۔بخلاف اس کے جو بدگوئیاں معاصرین میں باہم ہوتی ہیں ۔چنانچہ امام صاحب کی نسبت بھی بہت سارے الزام لگائے گئے جن کا منشا صرف حسد تھا سووہ اس قابل بھی نہیں کہ توجہ سے سنے جائیں اسی وجہ سے محدثین اہل تحقیق نے قاعدہ ٹھہرا دیا ہے کہ اس قسم کی جرحیں بےاعتبار محض ہیں ۔

ک ۔وکیعؒ محدثین سے کہا کرتے تھے کہ اے قوم تم حدیثیں طلب کرتے ہو اور اُن کے معنی نہیں طلب کرتے ۔اس میں تمہاری عمر اور دین ضائع ہوجائیگا ۔مجھے آرزو آتی ہے کہ ابو حنیفہ کی فقہ کا عشر مجھ میں ہوتا ۔ایک روز انہوں نے حضار مجلس سے فرمایا لوگو حدیث سننا بغیر فقہ کے تم کو کچھ نفع نہ دے گا ۔اور تم میں سمجھ پیدا نہ ہوگی ۔جب تک اصحاب ابوحنیفہ کے ساتھ نہ بیٹھو گے اور وہ اُن کے اقوال کی تفسیر نہ بیان کریں گے ۔

م ص ک ۔ابن مبارک کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی رائے مت کہو بلکہ تفسیر حدیث کہو ۔اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کے اقوال حدیث کی تفسیر ہیں ۔

م ص ۔یوسف ابن خالد سمتیؒ کہتے ہیں کہ میں بصرہ میں عثمان بتیؒ کی خدمت میں جایا کرتا تھا اُس زمانہ میں مجھے یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ بہرہ کافی علم سے مجھے حاصل ہوگیا ہے ۔مگر جب ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس وقت میری آنکھیں کھلیں اور یہ معلوم ہوا کہ علم کچھ بھی مجھے نہیں آیا ۔پھر جو کچھ حاصل ہوا وہ ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاصل ہوا ۔ابتداء میں انہوں نے صرف کثرت احادیث ہی کو علم سمجھ رکھا تھا جس طرح عموماً محدثین کا خیال تھا مگر جب انہوں نے امام صاحب کی مجلس کو دیکھا اور نادر نادر مضامین احادیث کی تفسیر میں سنے اُس وقت معلوم ہوا کہ علم الفاظ اور تحت اللفظ ترجمہ کا نام نہیں بلکہ علم چیز ہی اور ہے اس کے

لئے امام اعظم کی ضرورت ہے۔

م ص ک۔شداد ابن حکیم کہتے ہیں کہ اگر خدائے تعالیٰ ہم پر احسان نہ فرماتا ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب کے وجود سے جنہوں نے علم کو ظاہر کیا اور اُس کی شرح کی تو ہم نہ جان سکتے کہ کس چیز کو اختیار کرلیں اور لیں۔

م ص ک۔ابن مبارک اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ آثار واحادیث کو لازم سمجھو مگر اُن کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے کیونکہ وہ حدیث کے معنی جانتے ہیں۔اور لکھا ہے کہ ابن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ علماء ابوحنیفہ سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔کچھ نہیں تو تفسیر حدیث میں تو ضرور محتاج ہیں۔دیکھئے امیر المومنین فی الحدیث تو یہ فرما رہے ہیں کہ ہر محدث تفسیر حدیث میں ابوحنیفہؒ کا محتاج ہے اور آخری زمانہ کے مولوی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے اقوال دیکھنا درست نہیں۔اگر ابوحنیفہ ہی کی مخالفت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا مگر افسوس یہ ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث کی بھی مخالفت کی جارہی ہے۔

امام صاحب کی تعظیم وتوقیر

م ک۔محدثین کہا کرتے تھے کہ عبداللہ ابن مبارک ابوحنیفہ سے علم میں بڑے ہوئے ہیں ابوسعید ابن معاذ نے یہ سُنکر کہا کہ اِن لوگوں کی مثال رافضیوں کی سی ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا امام بنالیا اور خود انہوں نے جن کو اپنا امام بنایا تھا یعنی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو امام نہیں سمجھتے اسی طرح یہ لوگ بھی عبداللہ ابن مبارک کو اپنا امام قرار دیتے ہیں اور خود انہوں نے جو ابوحنیفہؒ کو اپنا امام بنایا تھا اُن کو امام نہیں سمجھتے بات یہ ہے کہ بمصداق **انما یعرف الفضل من الناس ذووہ** ۔اہل فضل کی قدر ومنزلت اہل فضل ہی جانتے ہیں باوجودیکہ سفیان ثوری اور امام صاحب میں بمقتضائے بشریت کسی قدر شکر رنجی تھی مگر قدر ومنزلت امام

صاحب کی جس قدر چاہئے سفیان ثوریؒ کے دل میں تھی جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے جو تبییض الصحیفہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ ابوبکر ابن عیاش کہتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ کے بھائی کا جب انتقال ہوا تو ابوحنیفہؒ اُن کی تعزیت کے لئے گئے سفیانؒ اُن کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور معانقہ کر کے اُن کو اپنی جگہ بٹھلایا اور خود روبرو بیٹھ گئے بعد برخاست میں نے کہا کہ آج آپ نے یہ کیا حرکت کی جو ہم سب کو بدنما معلوم ہوئی فرمایا کیا بات میں نے کہا کہ آپ ابوحنیفہ کے لئے اُٹھے اور اُن کو اپنی جگہ بٹھا کر خود روبرو بیٹھ گئے۔ فرمایا اعتراض کی کیا بات ہے میں ایسے شخص کے لئے اُٹھا جو علم میں اعلیٰ درجہ پر ہے اگر اُن کے علم کی وجہ سے نہ اُٹھتا تو عمر کے لحاظ سے اٹھتا تھا اور اگر عمر کے لحاظ سے بھی نہ اُٹھتا تو اُن کی فقہ کے سبب سے اُٹھنے کی ضرورت تھی وہ کہتے ہیں کہ اس کا جواب مجھ سے نہ ہو سکا۔

خ۔ ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ ایک بار بالاتفاق حج کو گئے انہوں نے التزام کرلیا تھا کہ ہر جگہ ابوحنیفہ کو آگے بڑھاتے اور خود پیچھے رہتے تھے اور جو کوئی مسئلہ پوچھتا تو آپ کچھ جواب نہ دیتے۔ یہاں تک کہ ابوحنیفہؒ کو جواب دینے کی ضرورت ہوتی۔

امام صاحب کا افقہ ہونا

اکابر محدثین امام صاحب کی تعظیم وتوقیر اور ثناوصفت جو اس قدر کرتے تھے اُس کا سبب یہی تھا کہ علاوہ وفور علم حدیث کے امام صاحب کا تفقہ مسلم اور شہرۂ آفاق تھا جس کی طرف محدثین محتاج تھے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔

ک۔ ابوحمزہ شمالی کہتے ہیں کہ ہم لوگ امام باقرؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ امام صاحب آئے اور چند مسائل پوچھے جب وہ چلے گئے تو امام باقرؒ نے کہا کہ یہ شخص کیسے کثیر الفقہ ہیں امام باقرؒ کا غائبانہ امام صاحب کی کثرت فقہ کی تعریف کرنی اُن کی جلالت شان پر دلیل قوی ہے۔

م خ ک۔ یزید ابن ہارون سے کسی نے پوچھا کہ امام مالکؒ کی رائے کو آپ اچھی سمجھتے ہو یا ابوحنیفہؒ کی رائے کو؟ کہا کہ امام مالکؒ سے حدیثیں لکھ لو کیونکہ وہ احادیث کی تحقیق خوب کرتے ہیں اور فقہ ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب کا کام ہے گویا وہ اسی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

م ص۔ علی ابن ہاشم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ علم کے خزانہ تھے جو مسائل اعلیٰ درجہ کے عالم پر سخت ہوں وہ اُن پر آسان تھے۔

م ص ک۔ رقبہ بن مسقلہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے علم میں ایسا خوض کیا کہ کسی نے کیا نہ تھا۔ اس لئے وہ جو چاہتے تھے اُن کو حاصل ہو گیا۔

م ص ک۔ یحییٰ بن آدمؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے فقہ میں ایسی کوشش کی کہ اُن کے پیشتر کسی نے نہیں کی اس لئے خدائے تعالیٰ نے اُن کو راہ بتلا دی اور اُس کو آسان کر دیا۔ اور خاص و عام نے اُن کے علم سے نفع اٹھایا۔

ک۔ نضر ابن محمد کہتے ہیں کہ میرا ظن غالب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ کو رحمت پیدا کیا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو بہت سا علم گم ہو جاتا۔

م ص ک۔ سفیان ابن عیینہ کہتے ہیں کہ جب میں سعید ابن ابی عروبہ کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بلاد سے ابوحنیفہ کی جو خبریں پہونچتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن سے افقہ کوئی نہیں مجھے آرزو ہے کہ اس شخص کو جو خدائے تعالیٰ نے علم دیا ہے وہ تمام مسلمانوں کے دلوں میں ڈالا جائے اس شخص کے لئے خدائے تعالیٰ نے فقہ میں فتح باب کر دیا گویا کہ وہ اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

م ص ک۔ اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے ابوعمرو بن علا سے سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ علم اگر پوچھو تو ابوحنیفہ کا ہے اور ہم لوگ جس علم میں مصروف ہیں وہ بہت آسان ہے۔

م ص۔ یحیی ابن سعید القطان کہا کرتے تھے کہ جو واقعات لوگوں میں وقتاً فوقتاً پیش ہوا کرتے

ہیں۔اُن میں حکم شرعی بیان کرنے والا سوائے ابوحنیفہ کے کوئی نہیں۔ یہ بات اُن کے اوائل میں نہ تھی مگر تھوڑے دنوں میں اُن کا کام ترقی کر گیا۔

م ص ک۔سفیان ابن عیینہ کہتے ہیں کہ جس کو مغازی کا شوق ہو وہ مدینہ جائے اور جو مناسک چاہے تو مکہ جائے اور جو فقہ سیکھنے کا ارادہ کرے وہ کوفہ میں جا کر اصحاب ابوحنیفہ کی صحبت کو لازم پکڑے۔

م ص۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس کو فقہ کی معرفت منظور ہو وہ ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب کو لازم پکڑے کیونکہ فقہ میں سب عیال ابوحنیفہ ہیں اس سے ظاہر ہے کہ فقہ کے لئے کوفہ اور اُس میں خاص امام صاحب کا حلقہ مخصوص ہے۔

خ۔قاضی شریک کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ فقہ میں دقیق النظر اور علم وعمل اور بحث میں اُن کا استخراج لطیف ہوتا تھا۔ چونکہ دقت نظر ایک خلقی امر ہے جس میں کسب کو دخل نہیں۔جیسا کہ اعمشؒ نے امام صاحب سے کہا تھا کہ اگر طلب سے فضیلت حاصل ہوتی تو میں تم سے افقہ ہو جاتا مگر وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے عطا ہے **كما ذكره الكردری فی المناقب** اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کو فقہ کے ساتھ منجانب اللہ وہ خصوصیت حاصل تھی جو دوسروں کو نہ تھی یہی بات امام مالکؒ کے ارشاد سے بھی ثابت ہے جو الخیرات الحسان میں نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کو فقہ کی توفیق دی گئی جس سے اُن پر اسی کی مشقت نہ رہی۔

ک۔اسمٰعیل ابن ابان کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن عبداللہ مسعودیؒ نے کہا کہ ابوحنیفہؒ فقہ اور فتوے میں مؤیّد من اللہ تھے میں نے یہ قول ابوعبدالغفار پر پیش کیا انہوں نے کہا کہ ہاں وہ ہمارے زمانہ کے فقیہ ہیں پھر قیس بن الربیع پر وہ قول پیش کیا انہوں نے بھی کہا کہ مسعودی سچ کہتے ہیں۔غرضکہ امام صاحب کا موفق من جانب اللہ ہونا اُس زمانہ میں مسلّم تھا۔

م ص ک۔سوید بن سعید کہتے ہیں کہ اگر ابوحنیفہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان کوئی امر محکم نہ

ہوتا تو اُن کو اس قدر توفیق نہ ہوتی کردری نے سوید کو تو بہ لکھا ہے۔
م ص۔ ابوبکر ابن عیاش کہتے ہیں کہ میں نے محمد ابن السائب الکلبی سے بارہا سنا ہے کہ کہتے تھے ابوحنیفہ خدا کی رحمت ہے۔
م ک۔ ابوجعفر بلخی کہتے ہیں کہ یہ بات مجھے پہونچی ہے کہ جب ابوحنیفہ پر کوئی مسئلہ مشکل ہوتا تو اپنے اصحاب سے کہتے کہ کوئی گناہ مجھ سے صادر ہوا ہے جس کی یہ سزا ہو رہی ہے پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتے اور استغفار کرتے جس سے وہ مسئلہ حل ہو جاتا اور نہایت خوشی سے کہتے کہ مجھے امید ہے کہ میری توبہ قبول ہوگئی اس لئے کہ یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ خبر جب فضیل ابن عیاضؒ کو پہونچی تو وہ رونے لگے اور کہا کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ابوحنیفہؒ کے گناہ بہت کم تھے دوسروں کو تو تنبہ ہی نہیں ہوتا اس لئے کہ گناہ میں غرق ہیں'' دیکھئے امام صاحب پر کس قدر فیضان الٰہی متصل اور متواتر تھا کہ ہر مسئلہ بجز دسوال کے آپ بیان کر دیتے تھے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور اگر کسی گناہ کی وجہ سے اس میں رکاوٹ آ جاتی تو استغفار کرنے سے وہ بھی فوراً دفع ہو جاتی اسی وجہ سے اکابر محدثین امام صاحب کو بڑے بڑے نامی و گرامی فقہاء سے افقہ کہا کرتے تھے۔
م ص ک۔ نضر ابن علیؒ نے ابو عاصم نبیلؒ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک ابوحنیفہ افقہ ہیں یا سفیان انہوں نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ ابوحنیفہ میرے نزدیک ابن جریج سے بھی افقہ ہیں۔ میری آنکھوں نے اُن سے زیادہ فقہ پر اقتدار والا شخص نہیں دیکھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے جھڑک کر کہا اے جاہل ابوحنیفہ کے یہاں کا چھوٹا لڑکا سفیان سے افقہ ہے چونکہ ابو عاصم نبیلؒ خود بھی فقیہ تھے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے اس لئے ان حضرات کا موازنۂ علم کر کے امام کو ترجیح دی۔
ک۔ ابوحنیفہؒ جب مکہ معظّمہ جاتے تو ابن جریج اور عبدالعزیز ابن رواد اُن کے ساتھ اکثر

بیٹھتے اور ابن جریج حد سے زیادہ ان کی توصیف کیا کرتے ایکبار اُن کی مجلس میں امام صاحب کا تذکرہ آیا فرمایا وہ بیشک فقیہ ہیں اور اس جملہ کو مکرر تین بار کہا۔

م ص ک۔ حرملہ ابن یزید کہتے ہیں کہ میں نے مقریؒ سے سنا ہے کہتے تھے کہ کسی جوان شخص کو میں نے ابوحنیفہ سے افقہ نہیں دیکھا۔

م ص ک۔ محمد بن منصور کہتے ہیں کہ میں نے خلف ابن ایوب سے سنا ہے کہتے تھے کہ جو شخص ابوحنیفہ کے باب میں افراط نہ کرے ہم اُس سے بدگمان ہوتے ہیں کسی نے پوچھا افراط کی کیا صورت فرمایا یہ کہنا چاہئے کہ اُن کے زمانہ میں اُن سے اعلم اور افقہ کوئی نہ تھا۔

م ص۔ عثمان المدینی کا قول ہے کہ حماد اور ابراہیم اور علقمہ اور ابن اسود سے افقہ ابوحنیفہ تھے۔ یہ حضرات مشاہیر فقہاء میں ہیں جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ سے ظاہر ہے۔

م ص ک۔ یحیٰی ابن آدم کہتے ہیں کہ شریک اور داؤد ابوحنیفہ کے مقابلہ میں ایسے تھے جیسے چھوٹے لڑکے کاش وہ اُن کا قول ہی سمجھ لیتے۔

م ک۔ جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مغیرہ نے مجھ سے کہا کہ ابوحنیفہ کے حلقہ میں رہا کرو گے تو فقیہ ہو جاوگے اگر ابراہیم نخعی ہوتے تو وہ بھی اُن کے حلقہ میں بیٹھتے۔

م ص۔ مسعرؒ کہتے ہیں کوفہ میں ابوحنیفہ سے افقہ میں نے نہیں دیکھا اُن کی فقاہت پر مجھے رشک آتا ہے۔

م ص ک۔ یحیٰی ابن آدم کہتے ہیں کہ تمام اہل فقہ اور اہل بینش کا اتفاق ہے کہ ابوحنیفہ سے افقہ کوئی نہیں۔ اس امر میں انہوں نے ایسی کوشش کی کہ اُن سے پہلے کسی نے نہیں کی تھی اس لئے خدائے تعالیٰ نے اُن کو راستہ دکھلا دیا۔ اس سے تو انہوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ امام صاحب کے افقہ ہونے پر اُس زمانہ کے کل فقہاء و محدثین کا اجماع ہو گیا تھا یہ بات اوپر معلوم ہوئی کہ ابوحنیفہ اکابر تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو تابعین بھی اُن کی طرف محتاج

ہوتے ۔اس کی تصدیق مقاتلؒ کےقول سے ہوتی ہے جوابھی لکھا گیا کہ میں نے تابعین اور تبع تابعین کودیکھا مگراُن میں ابوحنیفہ کے جیسا نکتہ رس اوربصیرت والاشخص نہیں دیکھا۔

م۔عفان ابن سیار کہتے ہیں کہ فقہ میں ابوحنیفہؒ کوکوئی پہنچ نہ سکا۔

م ص ک۔وکیعؒ کا قول ہے کہ ’’ما لقیت احد ا افقه من ابی حنیفة‘‘ اب دیکھئے کے وکیعؒ کو کیسے کیسے اکابرمحدثین سے ملاقات ہے تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے ہشام ابن عروہ اوراعمش اوراسمٰعیل ابن ابی خالداورابن عون اورابن جریج اور سفیان اوراودی اورخلق کثیر سے حدیثیں سنی ہیں ۔اورامام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ’’مارأت عینی مثل و کیع قط یحفظ الحدیث و یذاکر بالفقه فیحسن مع ورع و اجتهاد‘‘ یعنی امام احمدؒفرماتے ہیں کہ میری آنکھوں نے وکیع کے جیسا عالم نہیں دیکھا حدیثیں اُن کوخوب یادتھیں اورفقہ کا مذاکرہ عمدگی سے کیا کرتے اورنہایت پرہیزگاراورعابد تھےاوریحیٰی ابن اکثم کا قول نقل کیا ہے کہ میں انُ کے ہمراہ سفراورحضر میں رہا ہوں ہمیشہ یہی دیکھا کہ دن کوروزہ رکھتے اوررات میں ایک ختم قرآن کا کیا کرتے تھے ۔اس کے سوااوربہت سی تعریفیں اُن کی لکھیں ہیں ایسے شخص جب یہ کہہ رہے ہیں کہ کسی ایسے شخص سے مجھے ملاقات نہ ہوئی جوابوحنیفہ سے افقہ ہوتو غورکیا جائے امام صاحب کی فقاہت کس درجہ کی تھی ۔معلوم رہے کہ امام احمدؒ نے جووکیعؒ کے مذاکرۂ فقہ کی تعریف کی وہ یہی فقہ حنفیہ تھی اس لئے کہ وہ امام صاحب کے مقلد ہیں جیسا کہ اسی تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے’’و کان یفتی بقول ابی حنیفة‘‘ اسی وجہ سے وہ نبیذ پیا کرتے تھے حالانکہ محدثین کواُس میں بہت کچھ خلاف ہے ۔امام ذہبیؒ نے اُسی میں لکھا ہے کہ اُن میں کوئی عیب نہ تھا مگرنبیذ پیا کرتے تھے جس کا ثبوت کسی طور سے ہوگیا ہےاوریحیٰی ابن معینؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے اُن سے پوچھا کہ میں نبیذ پیا تھا سوخواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ

ایک شخص کہہ رہا ہے کہ تم نے شراب پی۔ وکیعؒ نے یہ سنتے ہی کہا کہ وہ شیطان تھا یہ وہی وکیع رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کو امام صاحب سے اوائل میں مقابلہ تھا جیسا کہ خطیب بغدادیؒ نے کتاب النصیحہ لاہل الحدیث میں اُن کا قول نقل کیا ہے کہ ایک بار ابوحنیفہ مجھ سے ملے اور کہا کہ آپ جو حدیثیں لکھا کرتے ہو کیا اُس سے بہتر نہ ہوگا کہ فقہ حاصل کریں میں نے کہا کیا حدیث تمامی فقہ کو جامع نہیں ہے اُس پر انہوں نے ایک مسئلہ پوچھا میں جواب میں ایک حدیث پڑھ دی اُس کے بعد انہوں نے میرا پیچھا چھوڑا۔

اُس میں علی ابن حشرمؒ کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کئی بار میں نے وکیعؒ سے سنا ہے کہ محدثین سے کہا کرتے کہ اگر تم لوگ فقہ حدیث سیکھ لو گے تو اصحاب الرائے تم پر غالب نہ آ سکیں گے۔ ابوحنیفہؒ جو کسی مسئلہ میں کچھ کہتے ہیں سو ہم اُس میں ایک باب روایت کر سکتے ہیں۔

دیکھئے ان تقریروں سے کس قدر مخالفت معلوم ہوتی ہے مگر یہ سب اوائل کی باتیں تھیں جب امام صاحب کے حالات سے خوب واقف ہوئے اور معلوم ہو گیا کہ اُن کو حدیث میں بھی ید طولیٰ ہے اُس وقت ایسے معتقد ہو گئے کہ امام صاحب ہی کے اقوال پر فتوی دینے لگے۔ یہی حال کل اہل حق محدثین کا رہا ہے کہ ابتداء میں فقہ کو مخالف حدیث سمجھ کر مخالفت کرتے اور امام صاحب کو بُرا بھلا کہتے مگر جب واقف ہوتے تو پشیمان ہو کر توبہ کرتے جیسا کہ اعمش اور اوزاعی وغیرہ رحمہم اللہ کے حالات سے ظاہر ہے۔

خ۔ اگر سفیان ثوریؒ کے پاس کوئی آ کر کہتا کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس سے آیا ہوں تو کہتے کہ ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو جو روئے زمین پر اُن کا سا فقیہ نہیں۔

ت۔ محمد ابن بشیرؒ کہتے ہیں میں ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے پاس جایا کرتا تھا جب سفیان ثوریؒ کے پاس جاتا اور وہ پوچھتے کہ کہاں سے آئے اور میں ابوحنیفہؒ کا نام لیتا تو وہ کہتے کہ ''جئت من عند افقه اهل الارض'' سفیان ثوریؒ وہ شخص تھے کہ امام ذہبیؒ نے اُن کو

تذکرۃ الحفاظ میں **الامام شیخ الاسلام سید الحفاظ الفقیہ** لکھا ہے اور لکھا ہے کہ شعبہ اور یحییٰ ابن معین اُن کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے تھے۔ اور ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ایک ہزار ایک سو شیوخ سے میں نے حدیث لکھی ہے اُن میں سفیانؒ سے کوئی افضل نہ تھا۔ وکیعؒ کہتے ہیں کہ سفیانؒ ایک دریا تھے۔ ابو اسامہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی تم سے کہے کہ میں نے ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ سفیان سے افضل تھا تو اُس کی تصدیق مت کرو۔ اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ سوائے سفیان کے اب کوئی ایسا شخص باقی نہیں جس کی رضا اور صحت پر امت کا اجماع ہوا ہے۔ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ''**کان قوالا بالحق**'' یعنی وہ بڑے حق گو شخص تھے۔ اس قسم کے اقوال ان کی جلالت شان اور تقدس کے باب میں بہت سے وارد ہیں۔ غور کیا جائے کہ جب ایسے جلیل القدر امام فقیہ امیر المومنین فی الحدیث حق گو فرما رہے ہیں کہ ابوحنیفہ کا نظیر روئے زمین پر نہیں تو امام صاحب کا تفقہ اور فقہ حنفیہ کس درجہ قابل وثوق ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باوجودیکہ اوزاعیؒ سفیان ثوری کی جلالت شان کے قائل ہیں مگر طبیب امت امام صاحب ہی کو قرار دیا اور طبقۂ محدثین کو عطاروں ہی میں داخل رکھا۔ اسی طرح وکیعؒ نے باوجودیکہ اُن کو علم کا دریا کہا مگر امام صاحب ہی کے سرچشمہ حیات سے اپنی تشنگی بجھاتے رہے اور ابن مبارکؒ نے گو اُن کو افضل الشیوخ فرمایا مگر عمر بھر امام صاحب ہی کے ملازم خدمت رہے اس سے ظاہر ہے کہ اکابر محدثین عمل کے لئے فقہ کی ضرورت سمجھتے تھے اور عمل بالحدیث کے قائل نہ تھے۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ سفیان ثوریؒ امام صاحب کو اگر افقہ سمجھتے تھے تو اُن کی تقلید کیوں نہیں کی سو اُس کا جواب یہ ہے کہ سفیانؒ خود فقیہ اور مجتہد تھے اور مجتہد کو اپنے اجتہاد کے خلاف کسی مجتہد کی تقلید درست نہیں۔ باوجود اس کے فتوی دینے کے لئے امام صاحب ہی کے اقوال کی تلاش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام موفق اور کردریؒ نے ثابت زاہدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جب سفیان ثوریؒ

سے کوئی دقیق مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے کہ اس مسئلہ میں کوئی عمدہ تقریر نہیں کرسکتا سوائے اُس شخص کے جس پر ہم لوگ حسد کرتے ہیں (یعنی ابو حنیفہؒ) پھر امام صاحب کے شاگردوں سے پوچھتے کہ اُس مسئلہ میں تمہارے استاد کا کیا قول ہے اور جو وہ جواب دیتے اُس کو یاد رکھ کے اسی کے موافق فتوی دیتے تھے۔

م ص۔قیس ابن الربیع کہتے ہیں کہ میں بہت سے علماء کی مجلس میں گیا مگر ابو حنیفہ سے زیادہ فقہ اور علم میں کسی کو نہیں پایا۔

عبید ابن سعیدؒ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ نے جس سے ملاقات کی وہ اُس سے افقہ تھے یعنی تقریباً کل معاصرین سے آپ افقہ تھے۔

م ص۔امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ کل فقہائے کوفہ سے افقہ ہیں۔

م۔علی ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں ابو امیہ سے پوچھا کہ عراق یا کوفہ سے جو لوگ آپ کے یہاں آئے اُن میں افقہ کون تھے کہا ابو حنیفہ۔

ت خ۔عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے حسن ابن عمارہ کو دیکھا کہ ابو حنیفہ کی رکاب پکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو فقہ میں آپ سے زیادہ بلیغ اور حاضر جواب ہو آپ اپنے وقت کے تمام فقہاء کے سردار ہو اور جو لوگ آپ کے باب میں کچھ کلام کرتے ہیں وہ صرف حسد سے ہے دیکھئے حسن ابن عمارہ جیسے شخص کہ سفیان ثوریؒ کے استاد ہیں امام صاحب کی رکاب پکڑے ہوئے فرما رہے ہیں کہ آپ سید الفقہاء ہو تو اس سے کیسی جلالت شان امام صاحب کی ظاہر ہوتی ہے۔

م ص ک۔عبید ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ سید الفقہاء ہیں اور جو اُن پر تہمت لگاتا ہے وہ حاسد یا شریر شخص ہے۔

م ت خ۔ابن مبارک کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ افقہ الناس تھے اُن سے افقہ میں نے نہیں

دیکھا۔

م ص۔اسحاق ابن راہویہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو احکام اور قضایا کو ابوحنیفہ سے زیادہ جانتا ہو ہر چند قبول قضا پر زبردستی اور سختی کی گئی مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔خالصاً لوجہ اللہ تعلیم اور ارشاد کیا کرتے تھے۔

ک۔ابوالحسن احمد بن محرز کہتے ہیں کہ ایک بار منصور کو کسی مسئلہ کی ضرورت ہوئی مدینہ طیبہ اور کوفہ وغیرہ تمام شہروں سے علماء بلائے گئے مگر کسی سے اُس کا جواب نہ ہوسکا آخر ابو حنیفہ نے تسکین بخش جواب دیا بادشاہ نے سب کو رخصت کر کے امام صاحب کو ٹھہرایا اور خدمت قضا قبول کرنے کی درخواست کی۔

خ۔عیسیٰ ابن یونس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ اگر ابوحنیفہ کے باب میں کوئی بدگوئی کرے تو ہرگز اس کی تصدیق مت کرو۔میں خدا کی قسم کھا کر تم سے کہتا ہوں کہ میں نے اُن سے افضل اور افقہ نہیں دیکھا۔

اکابر دین جو قسمیں کھا کھا کر امام صاحب کی جلالت شان اور عظمت پر گواہیاں دیتے ہیں اس سے یہی مقصود تھا کہ حاسدین اور سفہاء جو امام صاحب کی نسبت بدگوئیاں کرتے ہیں وہ طالبین حق کے ذہن نشین نہ ہو اور اس میں صرف خیر خواہی ان ہی کی ملحوظ تھی کہ کہیں بے اصل باتوں کو باور کر کے عتاب الٰہی کے مستحق نہ ہو جائیں۔ورنہ اس سے انکا کوئی ذاتی نقصان متصور نہ تھا مگر افسوس ہے بعضے آخری زمانہ والے اُس سے بھی کچھ نفع نہ اُٹھا سکے۔

م ت خ ک۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں ''**الناس عیال فی الفقه علی ابی حنیفةؒ** '' یعنی لوگ فقہ میں ابوحنیفہؒ کے عیال ہیں۔منتہی الارب میں لکھا ہے کہ **عیال الرجل** زن و فرزند و ہر کہ در نفقہ و مؤنث مرد باشد۔اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کے معاصر اور بعد والے فقہاء اُن کے عیال ہیں جن کی تربیت معنوی امام صاحب کے افادات سے متعلق ہے

اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ’’من اراد ان تعرف الفقه فليلزم ابا حنيفة و اصحابه‘‘ **كذا فی تبييض الصحيفه** اورالخیرات الحسان وغیرہ میں لکھا ہے ’’من لم ينظر فی كتبه لم يتبحر فی العلم و لا يتفقه‘‘یعنی جوشخص امام صاحب کی کتابیں نہ دیکھے اُس کو نہ علم میں تبحر حاصل ہوسکتا ہے نہ وہ فقیہ بن سکتا ہے۔اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے مسند ارشاد پر بیٹھنے سے پہلے اصحاب الرائے کی کتابیں یعنی فقہ حنفیہ دیکھ لئے جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا۔ بڑی افسوس کی بات ہے کہ اکابر سلف رحمہم اللہ تو امام صاحب کی فقہ کی ایسی تعریفیں کریں اور آخری زمانہ والے اُس کے برخلاف اُس کو گمراہی قرار دیں۔

م ص ک۔ ہارون ابن سعید کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ ابوحنیفہ سے افقہ میں نے نہیں دیکھا۔خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے افقہ میرے علم میں نہیں ہے۔

ک م ص۔داؤد طائیؒ کے روبرو امام صاحب کا ذکر آیا انہوں نے فرمایا کہ وہ ایک ستارہ ہیں جن سے راہ وہدایت پاتے ہیں اور ایک بڑی نشانی ہے جس کے طرف مسلمانوں کے دل متوجہ ہوتے ہیں جو عالم اُن کا علم نہیں جانتا وہ اُس پر بلا ہے۔ یہ اس وجہ سے فرمایا کہ فقہ میں حدیث کے اشکال حل ہوتے ہیں بغیر فقہ کے حدیث مفید نہیں ہوتی۔

م ص ک۔نضر ابن علی کہتے ہیں کہ ہم شعبہؒ کے پاس بیٹھے تھے کسی نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سنائی انہوں نے انا للہ پڑھ کر کہا کہ اب اہل کوفہ کی روشنی علم جاتی رہی۔ یاد رکھو کہ اُن کے جیسا شخص وہ کبھی نہ دیکھیں گے۔ دیکھئے امام صاحب کا تبحر علم کس قدر مافوق العادۃ ہوگا کہ باوجودیکہ امام صاحب کا مثل تو کیا بہتر شخص کا پیدا ہونا بھی حیز امکان میں ہے مگر اُن کا علم وفضل مافوق العادۃ دیکھ کر بلحاظ امکان عادی شعبہؒ نے صاف کہدیا کہ اُن کے جیسا عالم کبھی پیدا نہ ہوگا۔

ک۔شعبہؒ جب ابوحنیفہ کا ذکر کرتے تو بہت دیر تک اُن کی مدح کرتے اور ابوالید کہتے ہیں کہ جب امام صاحب کا ذکر شعبہؒ کی مجلس میں ہوتا وہ اُن کے حق میں دعا کرتے۔

شعبہ وہ شخص ہیں کہ اُن کا حال تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ چارسو تابعین سے انہوں نے حدیثیں لی ہیں اور اعمش اور سفیان ثوری وغیرہ کے استاد ہیں مزاج میں اُن کے تحقیق اس درجہ تھی کہ اگر بیس بار مختلف استادوں سے روایت سنتے تو اُس پر بھی کفایت نہ کرتے۔امام احمد کہا کرتے تھے کہ ''کان شعبة امة وحدة فی هذا الشان '' یعنی شعبہ اکیلے ایک امت کے قائم مقام تھے اُن سے بڑھ کر عابد وزاہد دیکھا نہیں گیا **صائم الدھر** اور **کثیر الصلوٰۃ** تھے ریاضت سے اُن کا پوست ہڈیوں پر خشک ہو کر سیاہ ہو گیا تھا اُن کے کپڑے مٹی کے ہمرنگ تھے۔ایسے شخص امام صاحب کی مدح میں فرما رہے ہیں کہ اُن کا نظیر پیدا ہونا مشکل ہے۔مردم شناسی انہی حضرات کا کام تھا شعبہ جیسا کوئی فاضل محتاط باخدا شخص ہو تو امام صاحب کی قدر جانے ہر کس و ناکس کو اُن کی کیا قدر۔

م ص ک۔عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں ایک روز معمرؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ ابن مبارکؒ آئے اُن کو دیکھتے ہی معمرؒ نے کہا کہ سوائے ابوحنیفہ کے ایسا کوئی شخص میرے خیال میں نہیں ہے جو فقہ میں عمدگی سے کلام کرے اور حدیث کی شرح کرنے کی لیاقت رکھتا ہو اور اُس کو خوف بھی ہو کہ دین میں کوئی شک کی بات داخل نہ ہونے پائے' معمر اکابر محدثین سے ہیں چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ وہ سفیان ثوری اور ابن مبارک وغیرہ کے استاد ہیں۔امام احمدؒ کہتے ہیں کہ معمر کو جس کے ساتھ ملاؤ گے انہیں کو فوقیت ہوگی۔ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں اُن سے زیادہ علم میں کوئی شخص نہ تھا۔

دیکھئے ایسے بے نظیر جلیل القدر محدث مذہب حنفیہ کی تعریف چند مختصر لیکن نہایت گراں بہا معنیٰ خیز الفاظ میں کر رہے ہیں جن سے بہتر نہیں مل سکتے۔اس لئے کہ بانی مذہب کو چاہئے

کہ ملکہ تفقہ کامل اوراحادیث کی شرح کرنے میں لیاقت تامہ رکھتا ہواوراُس کے ساتھ خوف خدابھی ہوکہ کوئی شک کی بات مذہب میں شریک نہ ہونے پائے سوانہوں نے بتصریح بیان کردیا کہ ان تینوں امور میں امام صاحب بے نظیر شخص تھے جس سے ظاہر ہے کہ معرکۃ الآراء مسائل میں امام صاحب نے وہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اُس میں شک کا گذر نہ ہو۔اب غور کیجئے کہ فقہ حنفیہ کس قدر موافق حدیث اور مذہب حنفیہ کس درجہ قابل وثوق ہے۔

ان اقوال اکابر دین سے ثابت ہے کہ تفقہ میں امام صاحب کا کوئی نظیر نہ تھااوراس کے پیشتر یہ بات معلوم ہوئی کہ یزیدابن ہارون ، خارجہ، ابن مبارک ،سفیان ثوری،سفیان ابن عیینیہ،مسیّب بن شریک ،خلف ابن ایوب ،مکی ابن ابراہیم ،امام مالک ،سعیدابن ابی عروبہ، اسرائیل ابن یونس اورحفص ابن غیاث وغیرہم رحمہم اللہ نے تصریح کی ہے کہ ابوحنیفہ علماء میں بے مثل وبے نظیر تھے۔اب اس کے بعد کوئی محدث توامام صاحب کی توہین نہیں کرسکتا رہے جہال' سووہ معذور ہیں اوران کی کوئی بات قابل توجہ بھی نہیں ہوسکتی یہ توامام صاحب کی علم وتفقہ کا حال تھا اب ان کے خوف وخشیت اورورع وتقوی کا حال سنئے مجملاً یہ ہے کہ آیۂ شریفہ''و امامن خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوٰى'' کا پوراپورا مضمون آپ پرصادق تھا۔

چونکہ ہمارے نفوس میں نہ اس قسم کا خوف ہے نہ خشیت نہ کوئی شخص ایسا نظر آتا ہے جس کو بطورنظیر پیش کرے اس لئے بعضے لوگوں کو امام صاحب کے حالات دور از قیاس معلوم ہونگے۔اس وجہ سے قبل از بیان مقصود خوف الٰہی سے متعلق تھوڑی بحث کی جاتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کامل الایمان وہی شخص سمجھا جاتا ہے جس کوقرآن وحدیث پر پوراپورا ایمان ہواور جانتا ہو کہ قیامت کا روز جزاوسزا کے لئے مقرر ہے اور گناہوں سے آدمی مستوجب غضب الٰہی ہوتا ہے ہر چند ہر مسلمان کواس کا یقین ہے مگر غفلت بھی مقتضائے

بشری ہے اور غفلت ایک ایسا پردہ ہے کہ ایمان کے آثار کو ظاہر ہونے نہیں دیتا۔ اسی وجہ سے عموماً عوام الناس میں وہ حالات نہیں پائے جاتے جو اعلیٰ درجہ کے اہل ایمان سے ظہور میں آتے ہیں کیونکہ وہ حضرات جن کی عقل معاد کامل ہوتی ہے اکثر اپنے گناہوں اور لغزشوں کو پیش نظر رکھتے ہیں جو لازمۂ نفس غیر معصوم ہیں اور اُس کے ساتھ ہی اُن وعیدوں اور سزاؤوں کا خیال بھی لگا رہتا ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں اور یہی خیال باعث خوف الٰہی ہوتا ہے جس طرح مشاہد ہے کہ جو شخص کسی جرم کا مرتکب ہو اور قانون سے واقف ہو کہ اُس جرم پر سزا مقرر ہے اور اُس کو یقین ہو جائے کہ بادشاہ کو اپنے جرم کی خبر ہوگئی ہے تو ضرور اُس کے دل میں ایک ایسی کیفیت اور حالت پیدا ہوگی جس کو خوف کہتے ہیں پھر بعضوں کی طبیعت میں خوف زیادہ ہوتا ہے اور بعضوں کی طبیعت میں بے باکی ہوتی ہے' چنانچہ یہ بھی مشاہد ہے کہ کسی معزز نیک نام شخص سے کوئی خفیف جرم بھی صادر ہوتا ہے تو اُس کو اتنی فکر ہوتی ہے کہ خواب وخورنا گوار ہو جاتا ہے اور بعض اس طبیعت کے بھی لوگ ہیں کہ بڑے بڑے جرموں کی بھی اُن کو کچھ پروانہیں ہوتی بلکہ بعضوں کا تو یہ حال بھی سنا گیا کہ سزا بھگت کر قید خانہ سے جب نکلتے ہیں تو یہ کہہ کر نکلتے ہیں کہ پھر چندروز میں ہم یہاں آجائیں گے۔ ایسی طبیعت والوں کو خوف سے کیا تعلق۔ بہرحال بعضے غیرت دار طبیعتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں کہ جرائم کا خیال اُن کے دلوں پر اپنا پورا اثر کر کے اُن کو خائف وترساں رکھتا ہے۔

ان حضرات پر جو خوف الٰہی غالب رہتا ہے اُس کا سبب فقط یہی نہیں کہ جرائم کو باعث سزا سمجھتے ہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کے حکم کی تعمیل بھی منظور ہے جس کی تاکید قرآن شریف میں بکرات ومرات ہوئی چنانچہ ارشاد ہے ''فاتقون یا اولی الالباب ''یعنی اے عقل والو مجھ سے ڈرتے رہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوف الٰہی کی صلاحیت عقلمندوں ہی کے دلوں میں ہے اسی وجہ سے قابل خطاب وہی لوگ سمجھے گئے غرضکہ جب خالق عزوجل اپنے نام

قہار، شدید العقاب، شدید البطش اور رقیب وغیرہ بتا کر یہ فرما دے کہ مجھ سے ڈرتے رہو تو عقل مند اہل ایمان کا کیا حال ہونا چاہئے پھر اہل ایمان کا حال حق تعالیٰ خود بیان فرماتا ہے "انّ الذین هم من خشية ربهم مشفقون والذين هم بآيات ربهم يؤمنون . والذين هم بربهم لا يشركون . والذين يؤتون ما اٰتوا و قلوبهم وجلة انهم الى ربهم راجعون . اولئک يسارعون فی الخيرات وهم لها سابقون" یعنی البتہ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے مضطر رہتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے اور جو لوگ دیتے ہیں جو دیتے ہیں اور اُن کے دل میں ڈر ہے کہ اُن کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے وہی لوگ نیکیوں میں کوشش اور جلدی کرتے ہیں اور نیکیوں کی طرف سبقت کرتے ہیں۔ اور ارشاد ہے قولہ تعالیٰ "انما يخشى الله من عباده العلماء" یعنی اللہ سے ڈرتے وہی ہیں جو علماء ہیں اس سے تو ظاہر ہے کہ جس کو خوف خدا نہیں وہ عالم ہی نہیں اس لئے کہ جس ایماندار کو خدائے تعالیٰ کی عظمت اور سطوت اور تمام صفات قہاریہ کا علم ہو اور اُس کے ساتھ ہی اُن وعیدوں کا بھی علم ہو جو قرآن و حدیث میں ہیں تو ممکن نہیں کہ ان تمام امور کو جاننے کے بعد بھی خوف خدا دل میں پیدا نہ ہو۔ البتہ آج کل کی اصطلاح میں جس کا نام علم رکھا گیا ہے کہ چند کتابیں ادبیات وغیرہ کی پڑھ لیں اور مولوی عالم اور مولوی فاضل ہو گئے خواہ مسلمان ہوں یا ہندو وغیرہ سو ایسے علم پر آثار مرتب نہیں ہو سکتے اور نہ وہ درحقیقت علم ہے اُس کو تخیل یا ظن کہنا چاہئے۔ علم وہ ہے جس کی مثال ابھی بیان کی گئی کہ کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہوا اور وہ جانتا ہے کہ جو جرم اپنے سے صادر ہوا وہ سنگین ہے اور اُس کا بھی اُس کو علم ہو کہ بادشاہ نے اس قسم کے جرم کی سزا سخت مقرر کی ہے اور اُس کا بھی علم ہو کہ باشادہ کو اپنے جرم کی اطلاع ہو گئی ہے تو اُس پر یہ آثار ضرور مرتب ہوں گے کہ

اُس کو فکر ضرور ہو جائے گی اور خوف شاہی کے مارے آب و خور نا گوار ہو جائیگا اور کسی کام سے اُس کو دلچسپی نہ رہے گی اب غور کیجئے کہ جن پر لفظ علماء کا اطلاق صحیح طور پر ہوسکتا ہو کیا ممکن ہے کہ اُن کو خشیت اور خوف الٰہی نہ ہو پھر جس دل میں واقعی خوف ہوگا اُس کے آثار بھی نمایاں ہوں گے۔ چنانچہ کسی بزرگ نے کہا ہے:

دوستان من کی ہوس دارم بنالیدن ولے درد چوں درسینہ باشد نالۂ زار آورد۔

اب ہم چند نظیریں پیش کرتے ہیں کہ جن حضرات پر خوف خدا غالب تھا اُن کی کیا حالت تھی امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی'' **و ان جهنم لموعدهم اجمعين** '' یعنی دوزخ اُن سب کی وعدہ گاہ ہے تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بے اختیار چیخ ماری اور ایسی بیخودی اُن پر طاری ہوئی کہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکے اور تین دن تک حیران و پریشان جنگلوں میں پھرتے رہے عمر رضی اللہ عنہ نے ایک روز سورہ **اذالشمس كورت** پڑھی جب **واذا الصحف نشرت** پر پہونچے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ ایک روز عمر رضی اللہ عنہ کسی صاحب کی ملاقات کو گئے وہ نماز پڑھ رہے تھے آپ وہاں ٹھہر گئے جب انہوں نے یہ آیت پڑھی'' **ان عذاب ربک لواقع ماله من دافع** '' جس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً تمہارے رب کا عذاب ہونے والا ہے اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ تو آپ سواری سے اُتر کر دیوار کے سہارے سے کھڑے ہو گئے اور بہت دیر کے بعد اپنے مکان کو واپس آئے اور اُس کا صدمہ آپ کے دل پر اس قدر رہا کہ ایک مہینہ بیمار رہے آپ اِس قدر روتے تھے کہ آپ کے رخساروں پر آنسوؤں کے بہنے سے دو سیاہ خط محسوس ہوتے تھے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قرآن کی کوئی آیت سن کر بیہوش ہو جاتے اور کئی روز تک ایسے بیمار رہتے کہ لوگ عیادت کو آتے۔ لکھا ہے کہ ایک روز یحییٰ بکا کی مجلس میں کسی نے یہ آیت پڑھی'' **و لو ترىٰ اذ وقفوا علی ربهم** '' تو وہ چیخ مار کر گر گئے اور چار مہینے تک

بیمار رہے۔ ایک روز علی کرم اللہ وجہہ نے کمال افسوس سے فرمایا کہ صحابہ کی یہ حالت تھی کہ رات بھر وہ قیام اور سجود اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے اور اتنا روتے کہ آنسوؤں سے اُن کے کپڑے تر ہوجاتے۔ اور اب ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ رات غفلت میں گذار دیتے ہیں اس کے بعد آپ کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا اُس وقت تک کہ شہید ہوئے انتہیٰ۔

احیاء العلوم میں اس کے سواء اور بہت سے خائفین کے واقعات مذکور ہیں۔

ذہبیؒ نے تذکرہ الحفاظ میں منصور بن المعتمر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ چالیس سال تک وہ دن کو روزہ رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے اور روتے رہتے۔ اُسی میں امام اوزاعیؒ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ راتیں نماز اور تلاوت قرآن اور گریہ وزاری میں بسر کرتے۔ اور یحییٰ ابن سعید قطان کے حال میں لکھا ہے کہ ایک روز کسی نے سورۂ دخان اُن کے روبرو پڑھی وہ چیخ مار کر بیہوش ہوگئے۔ عبداللہ ابن وہب کے حال میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو کتاب احوال قیامت میں لکھی تھی ایک روز اُن کے روبرو پڑھی گئی وہ بیہوش ہوگئے اور وہی حالت ممتد ہوئی یہاں تک کہ چندروز میں انتقال ہوگیا اور اُس وقت تک کوئی بات نہ کرسکے۔ امام ترمذیؒ کے حال میں لکھا ہے کہ کثرت گریہ وزاری سے اُن کی بصارت جاتی رہی تھی۔

تہذیب التہذیب میں شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ زرارہ ابن ابی اوفیؓ نے ایک بار نماز صبح پڑھائی جب اس آیت پر پہونچے ''فاذا نقر فی الناقور'' تو ایک چیخ ماری اور جان بحق ہوگئے۔ امام نوویؒ نے التبیان فی آداب حملۃ القرآن میں لکھا ہے کہ سلف کی کئی جماعتوں کا قرأت قرآن سے بیہوش ہونا اور مرجانا ثابت ہے۔

خوف وخشیت امام صاحب

اب امام صاحب کے خوف وخشیت کا حال سنیئے۔

ک ۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ ہم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بیٹھے اور اُن سے سنے اور لکھے جب ہم اُن کے چہرہ کی طرف دیکھتے تو صاف معلوم ہوتا کہ اُن کو خوف خدا ہے۔

خ ۔ وکیعؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ بڑے امانت دار شخص تھے اُن کے دل میں خدائے تعالیٰ کی بڑی عظمت تھی۔

خ ۔ یحییٰ قطان کہتے ہیں کہ اگر کوئی ابوحنیفہؒ کا چہرہ دیکھ لیتا تو اُس کو صاف معلوم ہوتا کہ خدائے تعالیٰ کا اُن کو خوف ہے یعنی آثار خوف الٰہی آپ کے چہرہ سے نمایاں تھے۔

ص ۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ جب میں ابوحنیفہؒ کو دیکھا تو یہی دیکھا کہ آثار گریہ اُن کی آنکھوں اور رخساروں سے ظاہر تھے۔

خ ۔ فضل ابن دکینؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک تابعین کی جماعت کو دیکھا اور اُن کے سوا بہتوں کو دیکھا مگر ابوحنیفہؒ سے بہتر نماز پڑھتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا نماز سے پہلے اُن پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی کہ بے اختیار روتے اور دعا کرتے جس سے دیکھنے والوں کو اُن کے خوف الٰہی کا اِس قدر یقین ہوتا تھا کہ اُس پر قسم کھا سکیں۔

ص خ ۔ امام صاحب کے رونے کی یہ کیفیت تھی کہ جب آنسو بوریے پر ٹپکتے تو بارش کے قطروں کی سی آواز سنائی دیتی تھی۔

ص ت خ ۔ مفضل ابن صدقہ کہتے ہیں کہ تہجد میں امام صاحب کے رونے کی آواز اکثر اتنی بلند ہوجاتی کہ محلّہ والے سنکر ترحم کرتے اور لکھا ہے کہ ایک رات آپ نے نماز میں یہ آیۂ شریفہ پڑھی ’’ **بل الساعة موعدهم والساعة ادهیٰ و امرّ** ‘‘ جس میں قیامت کی سختیوں کا ذکر ہے اُس کو رات بھر دُہرا دُہرا کر پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ ہرچند امام صاحب کا معمول تھا کہ ہر رات ایک قرآن نماز میں ختم کیا کرتے تھے مگر اصحاب قلوب اور ارباب احوال جانتے ہیں کہ جب کوئی خاص حالت دل پر طاری ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ

ایسے وقت کسی دوسرے مضمون کی طرف توجہ ہو سکے۔ چنانچہ نسائی اور ابن ماجہ میں ابوذر رضی للہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ''**ان تعذبھم فانھم عبادک**'' اور صبح تک اُسی کومکرر فرماتے رہے۔**ذکرہ النوویؒ فی التبیان** ۔اسی طرح امام صاحب بھی کبھی کبھی بمقتضائے غلبۂ حال صبح تک ایک ہی آیت کی تکرار کرتے رہتے کیونکہ یہ تو مقصود تھا ہی نہیں کہ کسی طرح شبینہ میں قرآن پڑھ لیا اور بےفکر ہو گئے۔وہاں تو تدبر معنیٰ اور عبادت مقصود تھی جس کا منشاء خوف الٰہی تھا۔

ص خ ت۔ یزید ابن لیثؒ کہتے ہیں کہ ایک روز امام نے عشاء میں سورۂ **اذا زلزلت** پڑھی اور ابوحنیفہؒ بھی جماعت میں شریک تھے نماز کے بعد دیکھا کہ اُن پر فکر کے آثار نمایاں اور حالت متغیر ہے میں چلا گیا جب صبح کے قریب آکر دیکھا تو کھڑے ہیں اور ڈارھی پر ہاتھ رکھے ہوئے کہہ رہے ہیں''**یا من یجزی بمثقال ذرۃ خیر خیرا و یا من یجزی بمثقال ذرۃ شر شراً آجر النعمان عبدک من النار و ما یقرب منھا و ادخلہ فی سعۃ رحمتک**''۔اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس رات آپ تہجد بھی نہ پڑھ سکے اور تضرع اور زاری میں رات بسر ہوگئی۔غرضکہ خوف الٰہی کے آثار ہر وقت نئے رنگ میں ظہور کرتے ہیں۔

ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ خوف الٰہی ایک نعمت عظمٰی ہے جو ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوسکتی۔احیاء العلوم میں رسالۂ قشیریہ سے نقل کیا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خدائے عزوجل سے سوال کیا کہ میرے دل پر خوف کا دروازہ کھولا جائے چنانچہ وہ دعا قبول ہوئی اور ایسا خوف الٰہی میرے دل پر مسلط ہوا کہ قریب تھا کہ عقل جاتی رہے میں نے فوراً دعا کی کہ الٰہی اُسی قدر دیجیو کہ میں متحمل ہوسکوں اُس کے بعد وہ حالت نہ رہی اور دل کو تسکین ہوئی دیکھئے اکابر دین دعائیں کرکے خوف الٰہی حاصل کرتے اور اپنے

میں صلاحیت نہ پا کر اُس کے کم ہونے کی دُعا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے یہ ظرف امام صاحب کو عنایت فرمایا تھا کہ ہر وقت خوف الٰہی مسلط ہے رات بھر گریہ وزاری اور تضرع وابتہال اور دن بھر اشاعت علم اور خدمت دین جس میں محض امتثال الٰہی مقصود ہے۔

ص ت خ۔ مسعرؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو دیکھا کہ نماز صبح پڑھ کر بیٹھ گئے اور ظہر کے قریب تک تدریس وتعلیم میں مشغول رہے پھر ظہر پڑھ کر عصر تک پھر عصر کے بعد مغرب کے قریب تک پھر مغرب کے بعد عشاء تک تدریس وتعلیم میں مشغول رہے میں نے دل میں کہا کہ اتنی خدمت علم کے بعد عبادت اُن سے کیونکر ہو سکے گی۔ دیکھیں رات میں اُن کی کیا حالت رہتی ہے دیکھا کہ جب لوگوں کی آمد ورفت موقوف ہوگئی تو طہارت کر کے لباس فاخرہ پہنے ایسے معطر نکلے جیسے دولہا۔ اور نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور صبح تک نماز پڑھتے رہے پھر مکان میں جا کر معمولی لباس پہن کے صبح کی نماز کے لئے نکلے اور اسی طرح دن بھر تدریس وتعلیم میں مشغول رہے میں نے خیال کیا کہ شاید اتفاقی طور پر حالت نشاط میں یہ سب کیا ہوگا دیکھیں آج کی رات کیا حالت رہتی ہے وہ رات بھی انہوں نے نماز ہی میں گذاری۔ میں نے خیال کیا کہ شاید وہ بھی اتفاقی ہو۔ تیسری رات بھی وہی گزاری غرضکہ تین دن اور تین راتیں متصل اُن کو دیکھا کیا کہ نہ دن کو افطار ہے نہ رات کو نیند صرف ظہر کے پیشتر کسی قدر قیلولہ کر لیتے تھے اُس وقت میں نے اپنے دل میں جزم کر لیا کہ جب تک اپنی یا اُن کی زندگی ہے اُن کی صحبت سے جدا نہ ہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسعرؒ کا انتقال امام صاحب ہی کی مسجد میں عین سجدہ کی حالت میں ہوا انتہیٰ۔ اور اسی قسم کی روایت شریکؒ سے بھی نقل کی ہے۔ دیکھئے یہ ہیں خوف الٰہی کے آثار کے دن رات میں سوائے طاعت وعبادت کے ہوا وہوس کا دل میں گذر ہی نہیں۔

الخیرات الحسان وغیرہ میں لکھا ہے کہ ایک روز امام صاحب کا پاؤں کسی لڑکے کے پاؤں

پر پڑ گیا اُس نے کہا اے شیخ کیا تم کو خوف نہیں کہ قیامت کے روز قصاص ہوگا یہ سنتے ہی آپ بیہوش ہوگئے۔افاقہ کے بعد کسی نے پوچھا کہ اس لڑکے کی بات کا آپ پر بڑا ہی اثر ہوا فرمایا کہ مجھے خوف ہوا کہ اس لڑکے کو غیب سے تلقین ہوئی ہے کیونکہ وہ بات اُس کے حوصلہ سے بڑھی ہوئی تھی۔حاصل یہ کہ جس دل میں اس قسم کا خوف الٰہی ہوتا ہے اُس کے آثار ہی نرالے ہوتے ہیں بات بات میں نیا معاملہ پیش آتا ہے اس وجہ سے ممکن نہیں کہ وہ تمام وقائع قید قلم میں آسکیں۔اس لئے ہم نے یہ چند واقعات بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھے۔اہل دانش اس پر قیاس کر سکتے ہیں کہ جس کو اس قدر خوف خدا ہو دینی مسائل میں وہ کس قدر احتیاط کرتے ہوں گے۔

امام صاحب کے شدّت خوف الٰہی پر دلیل قوی اُن کی کثرت اطاعت وعبادت ہے اس لئے کہ اُس کا منشاء یا خوف الٰہی ہوگا یا محبت وشوق۔اور جس میں دونوں باتیں نہ ہوں وہ اُس کو فضول سمجھے گا۔یہ بات کہ امام صاحب کی عبادت مافوق العادت تھی ابھی معلوم ہوئی کہ اُن کے رات دن ہی عبادت میں گزرتے تھے اور الخیرات الحسان میں امام ذہبیؒ کا نقل کیا ہے۔''**قد تواتر قیام اللیل و تهجده و تعبده و من ثمه کان یسمیٰ الوتد من کثرة قیامه اللیل بل احیاه بقرأة القران فی رکعة ثلثین سنة و حفظ عنه انه صلی صلوة الفجر بوضوء العشاء اربعین سنة فکان عامة اللیل یقرأ جمیع القرآن فی رکعة واحدة یسمع بکاؤه باللیل حتی یرحمه جیرانه و حفظ عنه انه ختم القرآن فی الموضع الذی توفی فیه سبعة الاف مرة الخ**''یعنی امام ذہبیؒ جو فن رجال میں محقق اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں لکھتے ہیں کہ یہ بات بتواتر ثابت ہوئی ہے کہ ابوحنیفہؒ کو کثرت عبادت اور تہجد وقیام لیل کی وجہ سے لوگ وتد یعنی میخ کہتے تھے اس لئے کہ اُن کو جنبش ہی نہ تھی تیس (۳۰) برس تک وہ تہجد کی ایک رکعت میں

قرآن ختم کرتے رہے اور یہ بات محفوظ چلی آ رہی ہے کہ چالیس سال تک انہوں نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک رکعت میں سالم قرآن پڑھتے اور رات کو اس قدر روتے کہ اُن کے ہمسایہ والے اُن پر ترحم کرتے انتہیٰ۔ اور الانتصار میں لکھا ہے کہ اس روایت کو خطیب بغدادی نے بھی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔

ت۔ اسد ابن عمر کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ نے چالیس برس عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔

خ ص۔ ابوالاحوص فرماتے ہیں کہ اگر ابوحنیفہ سے کہا جاتا کہ تم تین دن میں مر جاؤ گے تو اُن سے یہ نہ ہوسکتا کہ عمل میں کچھ زیادتی کریں اس لئے کہ جتنے اوقات تھے سب عبادت سے معمور تھے۔

ص ت۔ ابوالجویریہ اور شریک کا قول مختلف ذرائع سے نقل کیا ہے جس میں ایک روایت خطیب بغدادی سے بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم حماد بن ابی سلیمان اور علقمہ اور مرثد اور محارب اور ابن وثار اور عون ابن عبداللہ اور سلمہ ابن کہیل اور عطاء اور طاؤس اور سعید ابن جبیر رحمہم اللہ کی بھی صحبت میں رہے اور ابوحنیفہؒ کی بھی صحبت میں رہے مگر جو رات ابوحنیفہ کی تھی یعنی شب بیداری اور گریہ وزاری وغیرہ وہ کسی کو حاصل نہ تھی۔ یہ حضرات اکابر تابعین میں عباد و زہاد تھے اب اس سے زیادہ عبادت کیا ہوگی۔

ص۔ علی ابن یزید صدای کہتے ہیں کہ میں رمضان میں ابوحنیفہؒ کو دیکھا کہ ساٹھ قرآن انہوں نے ختم کئے ہر روز دو قرآن ختم کرتے ایک دن میں اور ایک رات میں اور سفیان ابن عیینہ سے بھی یہی مروی ہے۔

ص۔ احمد ابن بشر اور حفص ابن غیاث کہتے ہیں کہ ہم نے جس عابد کو دیکھا حلال وحرام کے باب میں اُس کو ناقص پایا اور جس فقیہ کو دیکھا عبادت میں اُس کو کم رغبت پایا بخلاف ابوحنیفہؒ کے کہ حق تعالیٰ نے دونوں صفتیں اُن میں کامل دی تھیں۔

م ص۔ اسحٰق بن بہلول کہتے ہیں کہ ابو ضمرہ ابو حنیفہؒ کا ذکر نہایت عمدگی سے کر کے کہا کرتے تھے کہ باوجود اشتغال علم کے اُن سے عبادت اس قدر کیونکر ہوسکتی ہے۔

امام صاحب کی کثرتِ عبادت پر اعتراض اور اس کا جواب

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھنی وغیرہ امور جو امام صاحب کی ریاضات اور تقوی سے متعلق لکھے گئے ہیں صرف مبالغے اور افسانے ہیں یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ اُن سے کسی کے شرف پر استدلال ہوسکتا ہے اس کے لئے ایسی سند درکار ہے جس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہ ہو۔

معلوم نہیں مولوی صاحب نے اس باب میں اس قدر تشدد کیوں فرمایا۔ شاید یہ خیال ہوا ہے کہ اگر یہ امور ثابت ہو جائیں تو ہمیں بھی یہ سب کام کرنے پڑیں گے اور محال ہے کہ ایسا ایک کام بھی ہم سے ہو سکے اس خیال پر یہ قرینہ ہے کہ مولوی صاحب نے صدہا روایتیں اُس کتاب میں نقل کر دیں اور کبھی کسی کی سند کا نام تک نہیں لیا۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ کثرت عبادت اور تقوی کا مدار خوف الٰہی پر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ خوف ایک کیفیت قلبیہ کا نام ہے جس کی وجہ سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو عموماً ہر کسی سے نہیں ہوتے اور جس قدر خوف زیادہ ہوگا اُس کے آثار بھی زیادہ ہوں گے۔ کون نہیں جانتا کہ زردی رنگ اور برخاستگی خاطر اور بیخوابی وغیرہ خوف کے لوازم ہیں بعضے وقت خائف شخص سے ایسے حرکات صادر ہوتے ہیں جو دیکھنے والے اُس کو احمق بلکہ دیوانہ سمجھتے ہیں مثلاً قوی دشمن کسی کا تعقب کرے تو کیسا ہی عقلمند ہو اُس سے بھاگے گا اور بلا تامل کسی کے گھر بلکہ زنانہ میں گھس جائیگا۔ اس خلاف وضع و عادت حرکت کو دیکھنے والے جو اصل سبب سے ناواقف ہوں یہی

خیال کریں گے کہ اُس کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔اب غور کیجئے کہ جب مخلوق کے خوف سے اس قسم کی حالتیں طاری ہوں تو جس کے دل پر خوف خدا کامل طور پر ہو اُس کا کیا حال ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ہم میں اس قدر خوف نہیں اور نہ کوئی ایسا آدمی دیکھا جاتا ہے سو یہ دوسری بات ہے۔اصل یہ ہے کہ خوف الٰہی کا مدار ایمان پر ہے اور ایمان ویقین ایک ایسی وسیع کیفیت ہے کہ اُس کے مدارج بے انتہا ہیں۔ پہلا درجہ اُس کا یہ ہے کہ سال میں ایک مہینہ ایک وقت کا کھانا اور ہر روز پانچ وقت تمام کاروبار کو چھڑا دیتا ہے۔اُس کے بعد بحسب مدارج ایک ایک چیز چھوٹتی جاتی ہے۔مثلاً گناہوں کی بُرائیوں اور اُن کی سزاؤں کا یقین کامل ہو اور دار و گیر محکمۂ آخرت اور قید خانۂ جہنم پیش نظر ہو تو تقریباً کل گناہ چھوٹ جائیں گے اور خود بخود طبیعت میں یہ احتیاط پیدا ہو جائے گی کہ ادنیٰ ادنیٰ شبہ سے بہت سارے مباحوں کا ترک کر دینا آسان ہو جائیگا۔اور حدیث شریف ’’**دع ما یریبک الی ما لایریبک**،، وغیرہ پر عمل ہونے لگے گا۔غرضکہ کامل الایمان اور بے ایمان شخص کے اعمال افعال حرکات وسکنات میں جو تفاوت ہوگا محتاج بیان نہیں۔سعدی علیہ لرحمہ فرماتے ہیں۔

ملحد گرسنہ در خانۂ خالی برخوان عقل باور نکند کز رمضان اندیشد

ملحد سے ہزار کہئے کہ بھائی رمضان میں دن کو کھانے سے آدمی گنہگار ہوتا ہے خدا کا غضب اُترتا ہے وہ کبھی نہ مانے گا۔بخلاف اِس کے اُسی سفرہ پر جاہل سے جاہل مسلمان کو بٹھا دیجئے اور ترغیبیں بھی دیجئے کہ ہر نوالہ پر ہم کچھ انعام بھی دیں گے تو بھی وہ اُس کی طرف توجہ نہ کرے گا بشرطیکہ نئی روشنی کی جھلک اُس پر نہ پڑھی ہو۔جب ہم جاہل مسلمانوں میں اس قدر خوف خدا پاتے ہیں تو جن کو سچے مسلمانوں کے اکابر نے صرف اُن صفات کی وجہ سے جو دین میں محمود ہیں اپنا مقتدا بنالیا تھا اُن کے خوف وخشیت کا کیا حال ہوگا۔اس کو ہر قوم وملت والا تسلیم کرے گا کہ ہر ملت و دین میں وہی لوگ مقتدا مانے جاتے ہیں جو اُس

ملت کے ضروریات اور مستحسنات کو ادا کرنے میں اوروں سے ممتاز ہیں ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں وہی لوگ بزرگ اور مقتدا تسلیم کئے گئے ہیں جن میں خوف خدا وتقویٰ وغیرہ صفات حمیدہ تھے جیسا کہ کتب سیر وتراجم اور تذکروں وغیرہ سے ظاہر ہے اور تواتر اور خود مولوی صاحب کے بیان سے بھی ثابت ہے کہ امام صاحب کو اکابر دین نے امام ومقتدا تسلیم کرلیا تھا تو اب بمقتضاے درایت اجمالی طور پر یہ ماننا پڑیگا کہ امام صاحب میں خوف خدا اور تقوی وغیرہ صفات حمیدہ کا وجود کامل طور پر تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے اقران وامثال میں ممتاز اور امام تھے ۔ اور اس اجمال کی تفصیل میں وہی واقعات پیش ہوں گے جو تواریخ وغیرہ میں مذکور ہیں یہ بات بالکل مطابق عقل ہے کہ جب تک کسی کے تقدس کا اثر دل پر مسلط نہ ہو آدمی اُس کو اپنا امام نہیں بناتا ۔ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ہارون رشید جب حج کو گیا تو حجر اسود کو بوسہ دینے میں بڑی زحمت اُس کو اٹھانی پڑی اور اُسی عرصہ میں حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ جب تشریف لائے تو بلا زحمت حجر اسود تک پہونچ گئے ۔ ہارون رشید نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا تم ائمۃ الاجسام ہو اور ہم ائمۃ القلوب ہیں ۔ دیکھئے آپ کے تقدس کا اثر تھا کہ خلیفۂ وقت کے مقابلہ میں مسلمانوں نے آپ کو اپنا امام تسلیم کرلیا ۔

اب غور کیجئے کہ محدثین اور اولیاء اللہ کے اکابر مرشدین مثل داؤد طائی اور شقیق بلخی اور فضیل ابن عیاض رضی اللہ عنہم نے جب آپ کو مقتدا اور امام تسلیم کرلیا تھا تو آپ میں تقویٰ وغیرہ کا کس قدر رسوخ ووثوق ہوگا ۔

ان قرائن پر غور کرنے کے بعد درایت سے کام لیا جائے تو وہ اسی بات پر گواہی دے گی کہ جتنے واقعات امام صاحب کی عبادت اور تقویٰ وغیرہ سے متعلق مورخین نے لکھے ہیں سب واقعی اور بلا مبالغہ ہیں اور اُن میں خوش اعتقادی کو اگر دخل ہے تو اس قدر ہے کہ اُن واقعات کے اظہار پر اُس نے مورخین کو مجبور کیا تھا اگر یہ خوش اعتقاد حضرات بھی اوروں کی

طرح قلم انداز ہوجاتے تو ہمیں اپنے امام کی اُن حالتوں پر اطلاع ہی نہ ہوتی جنہوں نے اُن کو اسلام کے عین شباب کے زمانہ میں امام بنا دیا۔ دراصل یہی امور مورخین کی تصانیف کے باعث رونق ہوئے ورنہ اگر ان خصوصیات کو ترک کر کے معمولی باتیں لکھدیتے کہ امام صاحب ایک مولوی اور مجتہد تھے لوگوں کو پڑھایا کرتے تھے فتوے دیا کرتے تھے تو اُن کی کتابوں کو کون دیکھتا بلکہ خود اُن کو لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

مولوی صاحب نے ان واقعات کو مبالغے اور افسانے قرار دے کر مصنفین پر جو حملہ کیا ہے کہ (لطف یہ ہے کہ ہمارے مورخین انہیں دوراز کار قصوں کو امام صاحب کے کمالات کا جوہر سمجھتے تھے) یہ انقلاب زمانہ کی تاثیر ہے کہ بارہ سو برس سے جو امور مسلمانوں میں کمالات کے جوہر سمجھے جاتے تھے اس زمانہ میں باعث توہین ہورہے ہیں کیوں نہ ہو یہ وہ زمانہ ہے کہ باوجودیکہ مسلمانوں کو اپنے فرائض دینی ادا کرنے میں گورنمنٹ کی طرف سے آزادی ہے مگر اس زمانہ کے مسلمانوں سے اُن کو آزادی نہیں مل سکتی اسی کو دیکھ لیجئے کہ اُن مسلمانوں کی مجلس میں کوئی پرانی فیشن والا مسلمان نماز وروزہ وغیرہ ادا کرے تو اُس کی کیسی گت بنائی جاتی ہے اور کیسی کیسی پھبتیاں اُس پر اُڑتی ہیں کہ مارے شرم کے بے چارہ سر نہ اٹھا سکے۔

حنفیوں کو مولوی شبلی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ امام صاحب کے علم وذکاوت کو اصول درایت اور اصول تاریخ کے شکنجہ میں نہیں کھینچا ورنہ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا ہوتا کیونکہ آج کل درایت زوروں پر ہے۔ کسی بات کا خیال آنے کی دیر ہے۔ اُدھر خیال آیا اور اِدھر ذہن نے کارسازیاں شروع کر دیں۔ اور کسی بات کا سر اور کسی بات کا پاؤں چسپاں کر کے ایک ایسی تصویر پیش کر دی کہ کسی کے حاشیۂ خیال میں نہ ہو جس طرح فوٹو میں دستکاریاں کی جاتی ہیں اور مصنوعی ایسا فوٹو تیار کیا جاتا ہے کہ جس کا فوٹو ہو وہ بھی حیران رہ جائے۔ محکی عنہ سے حکایت کو کوئی تعلق نہیں صرف چہرہ تو اُسی شخص کا ہوتا ہے اور باقی اعضاء اور لباس، وضع،

ترکیب جس کی چاہیں اُس کی چسپاں کر کے کسی شہادت میں پیش کر دیں۔

امام صاحب کے ورع کا حال

اب امام صاحب کے ورع کا حال سنئیے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جس کو خوف الٰہی ہوگا وہ متورع اور پرہیز گار ضرور ہوگا اور امام صاحب کے خوف وخشیت کا حال اکابر محدثین کی گواہیوں سے ابھی ثابت ہوا۔اس لئے جداگانہ اُن کے ورع کا حال بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔مگر چونکہ محدثین نے اُس کو خاص طور پر بیان کیا ہے اس لئے ان حضرات کی تقلید کر کے ہم بھی چند روایات اور واقعات لکھتے ہیں۔

م ص ک۔ یحییٰ ابن معین سے کسی نے پوچھا کیا ابوحنیفہ ؒ ثقہ تھے؟ کہا ہاں ثقہ تھے ثقہ تھے مکرر توثیق کر کے کہا خدا کی قسم اُن کا رتبہ اِس سے بلند تھا کہ وہ جھوٹ کہتے۔ورع میں وہ سب سے زیادہ تھے۔اور کہا کہ جس کو ابن مبارک اور وکیع نے عدل کہا اُس کو تم کیا گمان کرتے ہو۔

م ص ک ت۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ جب میں کوفہ میں گیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کے علماء میں افقہ کون ہیں کہا ابوحنیفہ۔پھر پوچھا زہد میں سب سے زیادہ کون ہیں کہا ابوحنیفہ۔پھر پوچھا ورع اور پارسائی میں سب سے زیادہ کون ہیں کہا ابوحنیفہ۔

م ص ک ت۔ مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں کوفہ کے تمام علماء کے ساتھ بیٹھا مگر ابوحنیفہ ؒ سے اورع کسی کو نہیں دیکھا۔تہذیب الکمال میں بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

م ص ک۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے زمانہ میں کوئی اُن سے افقہ اور اورع اور افضل کوفہ میں نہ تھا۔

م۔ عشیر ؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ صوام، قوام، ورع، زاہد اور فقیہ تھے۔اور کردری ؒ نے یہی

الفاظ عامرؒ سے نقل کئے ہیں۔
م ص ک۔ابو شیخ کہتے ہیں کہ نو سال اور کئی مہینوں میں ابو حنیفہ کے ساتھ بیٹھا اس مدت میں کوئی بات اُن سے ایسی نہیں دیکھی جو قابل انکار ہو وہ صاحب ورع وصلوٰۃ وصدقہ ومواساۃ تھے۔
م ص ک۔بکیر ابن معروف کہتے ہیں کہ جس نے ابو حنیفہؒ کو دیکھا اُس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اعلیٰ درجہ کے فقیہ اور صاحب معرفت اور پرہیز گار کیسے ہوا کرتے ہیں اور اُن کو دیکھنے والے پر یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ وہ خیر ہی کے لئے مخلوق ہیں۔
م ص ک۔امام صاحب کا ذکر امام احمد ابن حنبل کی مجلس میں آیا۔انہوں نے کہا یقیناً وہ صاحب ورع تھے اکیس کوڑے خدمت قضا قبول کرنے کے لئے ان کو مارے گئے۔مگر وہ انکار ہی کرتے رہے۔
م ص ک۔ابن عیینہؒ سے مروی ہے کہ ابن جریحؒ کہتے تھے کہ مجھے نعمان فقیہ اہل کوفہ کے حالات معلوم ہوئے ہیں کہ وہ شدید الورع تھے۔اپنے دین اور علم کی صیانت کرتے تھے۔ اہل آخرت کے مقابلہ میں اہل دنیا کو اختیار نہیں کرتے تھے میں گمان کرتا ہوں کہ قریب میں اُن کے علم کی عجیب شان ہوگی۔
م ص۔عبدالوہاب بن ہمام کہتے ہیں کہ جتنے مشائخ عدن طلب حدیث کے لئے کوفہ گئے تھے وہ بالاتفاق کہتے تھے کہ ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اُن سے افقہ اور اورع کوفہ میں ہم نے نہیں دیکھا۔
ک۔عبدالرزاق ابن حمام کہتے ہیں کہ جتنے ہمارے شیوخ طلب علم کے لئے کوفہ گئے تھے سب کا یہی قول تھا کہ ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اُن سے افقہ اور اورع ہم نے کوفہ میں نہیں دیکھا۔
م ص ک۔یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ مجھے بہت سارے علماء سے ملاقات ہے مگر ابو حنیفہؒ سے افضل اور اورع میں نے نہیں دیکھا۔

م ص ک۔ ابراہیم ابن عکرمہ مخزومی کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے افقہ اوراورع نہیں دیکھا۔

م ص ک۔ عمر ابن ذرؒ کہتے ہیں کہ جس موقع میں ہم ابوحنیفہؒ کے ساتھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں کے علماء پر فقہ اور علم اور ورع میں ابوحنیفہؒ ہی غالب تھے۔

م ص ک۔ ابو بردہ کندیؒ کہتے ہیں کہ میں حماد ابن ابی سلیمان اور علقمہ اور عبدالرحمٰن اودی اور طلق ابن معاویہ اور نخعی اور عبدالرحمٰن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صحبت میں رہا مگر اُن میں کسی کو ابوحنیفہؒ سے اورع نہیں پایا۔

م ص ک۔ وکیعؒ کہتے ہیں کہ حدیث کے باب میں ابوحنیفہؒ کو جس قدر ورع تھا کسی میں نہیں پایا گیا۔

الانتصار میں سبط ابن جوزیؒ نے حافظ ابوبکر محمد ابن عمر ابن محمد بن سیرۃ الجعابی کی کتاب **الانتصار لمذهب ابی حنیفة** سے نقل کیا ہے ”**قال اخبرنی علی ابن الحسین عن ابیه قال سئل یحییٰ ابن معین عن الرجل یحدث الحدیث لا یحفظه یحدث به فقال کان ابو حنیفة یقول لا یحدث الا بما یعرف و یحفظ** یعنی ابن معینؒ سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص حدیث روایت کرے اور اُس کو وہ حفظ نہ ہو تو جائز ہے یا نہیں کہا ابوحنیفہؒ کہتے تھے کہ وہی حدیث روایت کرنی چاہئے جس کو اچھی طرح جانتا اور یاد رکھتا ہو۔ یہاں دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ امام صاحب کے مذہب کی تائید میں قدماء میں بھی حافظ جعابیؒ نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام الانتصار لمذہب ابی حنیفہ رکھا ہے اور دوسری یہ کہ یحییٰ ابن معین جیسے جلیل القدر محدث نے جن پر جرح و تعدیل کا گویا مدار ہے امام صاحب کے قول سے استدلال کیا اور اُس پر فتویٰ دیا۔

م ص ک۔ ابوغسان مالک ابن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے نزدیک یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ جن جن حضرات کی طرف ورع کی نسبت کی گئی اور وہ متورع مشہور تھے۔ اُن میں ابوحنیفہؒ سے اورع کوئی نہ تھا۔

م ص۔ حفص ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں اقسام کے علماء یعنی فقہاء، زہاد، نساک، عباد اور اہل ورع کے ساتھ بیٹھا مگر سوائے ابوحنیفہ کے کسی کو ان صفات کا جامع نہ پایا۔

م ص۔ عطاء ابن حبلہؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کے افقہ اور اورع اور اعبدالناس ہونے میں کسی عالم کو اختلاف کرتے نہیں دیکھا۔

م ص۔ ابوحمزہ سکریؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں کوئی شخص اُن سے اورع نہیں سمجھا گیا۔

م ص ک خ۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے ورع میں ابوحنیفہؒ سے بڑھا ہوا شخص نہیں دیکھا اُن کے ورع کی آزمائش کوڑوں اور اموال سے ہوگئی۔ یعنی باوجودیکہ خدمت قضا قبول کرنے کے لئے کوڑے لگائے گئے۔ مگر اُن کو لغزِش نہ ہوئی اور مالی امور میں تجربہ ہوگیا کہ ادنیٰ ادنیٰ شبہ سے احتیاط کرتے اور مال لٹا دیتے تھے۔

م ص ک۔ شداد بن حکیم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ سے اورع کوئی نہ تھا۔

ک۔ عمرو بن صالح کا قول ہے کہ علم اور ورع میں ابوحنیفہؒ کا مثل نہیں دیکھا گیا۔

ص ک خ ت۔ یزید ابن ہارون کہتے ہیں کہ میں نے ہزار شیوخ سے علم حاصل کیا مگر خدا کی قسم ابوحنیفہ سے اورع نہیں دیکھا۔

م ک۔ عیسیٰ ابن یونس قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ میں نے ابوحنیفہ سے افقہ اور اورع نہیں دیکھا۔

م ص خ۔ حسن ابن صالح کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہؒ شدید الورع اور نہایت پرہیزگار شخص تھے حرام کی اُن پر اتنی ہیبت تھی کہ بہت سارے حلال چیزوں کو انہوں نے شبہ سے چھوڑ دیا تھا کسی فقیہ کو اُن سے زیادہ صیانت نفس اور علم کرتے میں نے نہیں دیکھا۔

م ک خ۔ ایک بار کوفہ میں ایک مغصوبہ بکری بکریوں میں مل گئی۔ آپ نے دریافت کیا کہ بکری کی عمر کتنی ہوتی ہے کہا گیا سات سال۔ آپ نے سات سال تک بکری کا گوشت ترک کردیا۔

م ص ک ۔ ابو داؤد حضری کا قول ہے کہ ابو حنیفہ ایسی چیزوں سے ورع اور پرہیز گاری کرتے تھے جن کے حلال ہونے میں شک نہیں تو خیال کیا جائے کہ حرام سے اُن کو کس قدر احتراز ہوگا۔

م ص ک خ ت ۔ تاریخ بغداد میں خطیبؒ نے لکھا ہے کہ حفص بن عبدالرحمٰن جو تجارت میں امام صاحب کے شریک تھے اُن کے پاس آپ نے پارچہ بھیجا اور یہ اطلاع دی کہ فلاں تھان میں عیب ہے۔ بیچتے وقت مشتری کو اُس پر مطلع کر دینا۔ مگر اتفاقاً حفص بھول گئے جب حساب پیش ہوا امام صاحب نے اُس تھان کا حال دریافت کیا انہوں نے کہا کہ میں بھول کر سب تھانوں کے ساتھ اُس کو بھی بیچ ڈالا یہ سنتے ہی امام صاحب اپنے حصے کے پورے روپئے فقیروں کو دیدیئے لکھا ہے کہ تیس ہزار درہم تھے جو اُس تھان کی قیمت اُن میں مخلوط ہوگئی تھی۔ تہذیب الکمال میں بھی یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

م ص ۔ جب منصور نے امام صاحب کو خدمت قضاء کے لئے کہا تو آپ نے جواب دیا کہ مجھ میں اس خدمت کی صلاحیت نہیں یہ تو میں جانتا ہوں کہ بینہ پیش کرنا مدعی کے ذمہ ہے اور منکر پر قسم ہے۔ لیکن اس خدمت کے لئے ایسا نفس چاہئے کہ آپ پر اور آپ کی اولاد پر اور عہدیداروں پر برابر حکم کر سکے اور میرے نفس کی یہ حالت ہے کہ جب آپ مجھ کو بلاتے ہیں تو وہ میرے اختیار میں نہیں رہتا جب تک آپ سے جدا نہ ہوں۔ منصور نے کہا ہم جو صلے اور عطیات دیتے ہیں وہ کیوں نہیں قبول کرتے۔ کہا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے مال سے مجھ کو کچھ دیا ہو اور میں نے قبول نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ضرور قبول کرتا۔ آپ نے تو بیت المال کا روپیہ مجھے دیا جس میں میرا کوئی حق نہیں نہ میں سپاہی ہوں کہ جنگ پر جاؤں نہ اُن کی اولاد میں ہوں کہ گھر بیٹھے کھاؤں اور نہ فقیروں میں ہوں۔ غرضکہ آپ نے نہ خدمت قبول کی نہ خزانہ شاہی کا روپیہ لیا۔

ص ک ۔ تاریخ خطیب بغدادی میں یوسف ابن خالد السمتی سے مروی ہے کہ ایک بار ابوجعفر منصور نے تیس ہزار درہم ابوحنیفہؒ کو بطور ہدیہ بھیجے آپ نے کہا اے امیر المومنین میں بغداد میں مسافر ہوں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اُن کی حفاظت کروں اس لئے بیت المال ہی میں رکھنے کا حکم دیا جائے چنانچہ امام صاحب کے انتقال تک وہ بیت المال کے مد امانت میں رکھے رہے اُس کے بعد جب منصور کو اطلاع ہوئی تو کہا ابوحنیفہ نے ہمیں دھوکا دیا غور کیجئے کہ اس زمانہ میں جس طرح ناجائز طور پر روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے حیلے اور تدبیریں کی جاتی ہیں امام صاحب جائز طور پر اشتباہی روپیہ نہ لینے کی تدبیریں کرتے تھے آخری زمانہ کے نفوس کو اُس نفس قدسی کے ساتھ کیا مناسبت مگر افسوس ہے کہ ان لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ باوجود ایسی ناگفتہ بہ حالت کے اپنے نفوس پر قیاس کرکے امام صاحب کی توہین کرتے ہیں کیا عقل سلیم یہ بات قبول کرسکتی ہے کہ ایسا محتاط خائف شخص جس کو دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو دین میں فساد ڈالے اور خلاف مرضی خدا و رسول اپنے دل سے مسئلے گھڑ کر اپنی آخرت تباہ کرے۔

اگر فقہ کے ایجاد سے اُن کو دنیا طلبی مقصود ہوتی تو بجائے اس کے کہ سلاطین کے طرف سے خدمت قبول کرنے کی درخواست اور اصرار ہوتا خود درخواست کرتے اور سفارشیں پہونچاتے اور کسی کسی حیلے سے خدمت حاصل کرکے امیرانہ گزران کرتے ۔ برخلاف اس کے وہاں تو ان چیزوں کا ذکر ہی نہ تھا۔

م ص خ ۔ سہل ابن مزاحم کہتے کہ ہم ابوحنیفہؒ کے گھر میں جایا کرتے تھے سوائے بوریوں کے کوئی چیز وہاں نظر نہ آتی۔

م ۔ ابوالخبیب مروزی کہتے ہیں کہ امام صاحب کا قوت مہینے میں دو درہم تھا۔

م خ ص ک ۔ جب قضاء کے بارے میں آپ بغداد میں قید کے گئے تو آپ نے فرزند کو

کہلا یا تم جانتے ہو کہ مہینے میں میرا قوت دو درہم ہے اس کو بھی تم نے روک دیا جلد بھیجو۔

یہ تو آپ کی ذاتی حالت تھی جس سے کمال زہد ظاہر ہے۔ اب آپ کے تمول کا حال بھی سُن لیجئے۔

م ک۔ عبدالحکیم بن میسرہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے کئی غلام تجارت پر مامور تھے ایک بار وہ ستر ہزار درہم لے آئے جن میں تیس (۳۰) ہزار درہم نفع کے تھے امام صاحب نے اُن سے تجارت کے طریقے دریافت کئے بعضوں نے اکا دطریقہ ایسا بھی بیان کیا کہ اس میں غلطی تھی امام صاحب نے پوچھا کیا وہ نفع علحدہ رکھا گیا یا خلط کر دیا گیا۔ کہا خلط کر دیا گیا آپ نے فرمایا تم نے کل مال کو فاسد کر دیا۔ پھر علمائے کوفہ سے سات شخصوں کو بلا کر ہر ایک کو دس دس ہزار درہم دیئے کہ مساکین پر تقسیم کر دیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ ستر ہزار درہم جو راس المال اور نفع کا مجموعہ یعنی کل سرمایہ تھا سب کو ایک ادنیٰ شبہ سے لٹا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ اس زمانہ میں حالانکہ۔ ''بدینارے چو خرورگل بماند''۔ کا مضمون پورے طور پر صادق ہے مگر تقویٰ کا وہ دعویٰ کہ ابوحنیفہ نے عمر بھر میں کبھی نہ کیا ہوگا کیونکہ ان کو اگر تقویٰ کا دعویٰ ہوتا تو رات دن خوف خدا سے رونے کی کیا ضرورت تھی۔

قرائن سے بخوبی ظاہر ہے کہ آپ کا تجارت کرنا بھی دینی مصلحتوں کے لحاظ سے تھا پہلے تو تقوے کا امتحان دینا آپ کو مقصود تھا۔ کیونکہ تقوے کی آزمائش انہی معاملات سے ہوتی ہے جو مال سے متعلق ہیں سو بفضلہٖ تعالیٰ آپ کا اس امتحان میں کامیاب ہونا اُن حیرت انگیز وقائع سے ظاہر ہے جو کتابوں میں کثرت سے مروی ہیں مگر چونکہ اس رسالہ کی غرض اُن سے چنداں متعلق نہیں اس لئے اُن کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا۔ پھر مال حاصل ہونے کے بعد بخل اور اسراف سے بچنا بھی ایک مشکل کام ہے سو امام صاحب اُس میں بھی قابل تحسین رہے چنانچہ آپ کی سخاوت اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ اپنے زمانہ میں آپ سخی مشہور تھے

چنانچہ کردریؒ اور امام سیوطیؒ نے فضیل ابن عیاض کا قول نقل کیا ہے **کان ابو حنیفة معروفاً بکثرة الافضال و اکرام العلم و اھله ۔**

م ک ۔ مسعرؒ کہتے ہیں کہ جب ابوحنیفہؒ کوئی چیز اپنے عیال کے واسطے خرید کرتے یا لباس بناتے یا فواکہ خرید کرتے تو پیشتر اُن اشیاء کی قیمت سے زیادہ قیمتی اشیاء شیوخ علماء کے لئے خرید کرتے اور یہ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی چیز صدقہ یا ہدیہ کے لئے خرید کرتے تو عمدہ اور بیش قیمت خرید کرتے اور اپنے عیال کے لئے خرید کرتے تو اس میں یہ اہتمام نہ کرتے۔

م ک ۔ شقیق بلخیؒ کہتے ہیں کہ ایک بار میں ابوحنیفہؒ کے ساتھ کسی کی عیادت کو جا رہا تھا راستہ میں ایک شخص آپ کو دیکھ کر چھپ گیا اور دوسرے راستہ سے نکل جانا چاہا۔ آپ نے اُس کو پکار کر کہا دوسرے راستہ سے کیوں جاتے ہو اُس نے دیکھا کہ امام صاحب پہچان گئے شرمندہ ہو کر کھڑا ہو گیا آپ نے جب مکرر سبب دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ مجھ پر آپ کے دس ہزار درہم ہیں اور باوجود مدت گذر جانے کے تنگدستی کی وجہ سے ادا نہ کر سکا اس لئے روبرو آنے سے مجھے شرم آئی فرمایا سبحان اللہ اُن درہموں سے چھپنے کی نوبت پہنچ گئی وہ کُل میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اور تم سے یہ درخواست ہے کہ میری طرف سے تمہارے دل پر جو گرانی گذری وہ تم معاف کر دو۔

م ک ۔ امام صاحب کے فرزند حمادؒ نے جب سورۂ فاتحہ ختم کی تو آپ نے معلم کے پاس ہزار درہم بھیج کر معذرت کہلائی کہ اس وقت میرے پاس اتنے ہی ہیں اگر زیادہ ہوتے تو تعظیم قرآن کے لحاظ سے وہ سب بھیج دیتا۔

غرضکہ تجارت اور تمول سے آپ نے نہ حظوظ نفسانی حاصل کئے نہ دنیوی کوئی فائدہ اٹھایا۔ بلکہ اُس کے کل مصارف فی سبیل اللہ تھے اور اپنی ذاتی گذران فقیرانہ رکھی اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ مہینے بھر میں صرف دو درہم آپ کا قوت تھا جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔

انہی اسباب سے اکابر محدثین کے دل میں آپ کی وہ وقعت تھی کہ کسی دوسرے کی نہ تھی۔

م ص ک۔ اسمٰعیل بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کسی نے یزید ابن ہارون سے پوچھا کہ آدمی کو فتویٰ دینا کب حلال ہوتا ہے فرمایا کہ جب ابو حنیفہؒ کے جیسا ہو۔ اُس نے کہا حضرت آپ ایسی بات کہتے ہو کہا ہاں اس سے زیادہ کہوں گا میں نے اُن سے افقہ اور اورع نہیں دیکھا۔ ایک روز وہ کسی شخص کے دروازہ کے روبرو دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا سایہ میں اگر آپ بیٹھ جاتے تو اچھا تھا کہا اس مکان والے پر میرا کچھ قرض ہے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اُس کے گھر کے سایہ میں بیٹھوں اب کہو کہ اس سے زیادہ کیا ورع ہوگا۔ اور یحییٰ ابن ابی زائدہ کہتے ہیں کہ میں نے جب ابو حنیفہ کو دیکھا کہ دھوپ میں بیٹھے ہیں تو اُن کو قسم دے کر پوچھا کہ سایہ چھوڑ کر دھوپ میں بیٹھنے کا کیا سبب ہے۔ کہا اس مکان والے پر میرا کچھ قرض ہے میں اُس کے گھر کے سایہ کو اس وجہ سے مکروہ سمجھتا ہوں کہ کہیں وہ نفع نہ ہوجائے (کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے جس قرض سے کوئی نفع حاصل کیا جائے وہ ربوٰ ہے) پھر فرمایا اس قسم کی احتیاط اور لوگوں پر واجب نہیں۔ عالم کو ضرور ہے کہ جن امور کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اُن میں خود زیادہ احتیاط اور عمل کریں۔ الخیرات الحسان میں بھی یہ واقعہ بالاختصار قشیریہ سے نقل کیا ہے۔ یزید بن ہارون نے جو فتوی کے لئے ورع اور تقوی کی ضرورت سمجھی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو خوف خدا ہوگا وہی سچے مسئلے دین کے بتائے گا۔ ورنہ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق فتوے دے گا جیسا کہ دیکھا جاتا ہے۔

م ص ک۔ مالک ابن سلیمان سے روایت ہے کہ حسن بن عمارہ ابو حنیفہؒ کی شان میں بدگوئی کیا کرتے تھے ایک بار کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے امیر کوفہ نے کل علماء کوفہ کو جمع کیا۔ مناظرہ کے بعد سب کا اتفاق ابو حنیفہؒ کے جواب پر ہوا۔ جب امیر نے لکھنے کو کہا تو ابو حنیفہؒ نے تامل کر کے کہا کہ اس مسئلہ میں ہم سب خطا پر تھے اور ثواب وہی ہے جو حسن ابن عمارہ

کہتے ہیں چنانچہ وہی لکھا گیا۔ اُس کے بعد حسن بن عمارہ امام صاحب کی نہایت مدح کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اگر ابو حنیفہؒ چاہتے تو میرا قول رد کر دیتے اور باوجودیکہ وہ مجلس مفاخرت کی تھی مگر انہوں نے خطا کا الزام اپنے ذمہ لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا اس روز سے مجھے یقین ہوا کہ وہ ورع میں سب سے زیادہ ہیں۔

م ص۔ نضر بن محمد کہتے ہیں کہ چند روز پادشاہ نے ابو حنیفہؒ کو فتوی دینے سے منع کر دیا تھا۔ اُس زمانہ میں اگر اُن کے فرزند حماد بھی کوئی بات پوچھتے تو آپ حکم شاہی کا عذر کر کے جواب نہ دیتے۔ ایک بار حماد نے کہا حضرت یہاں تو آپ ہیں اور میں تیسرا کوئی شخص نہیں آپ نے فرمایا اے لڑکے اللہ کہاں ہے یعنی اللہ تعالیٰ تو موجود ہے۔

م ص۔ ابو غانم کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ ایسے شخص تھے کہ جب فتویٰ دینے کو بیٹھے ایک مسئلہ پیش ہوا جس کا جواب وہ نہ دے سکے اُس کے بعد دس سال تک فتویٰ اور مجلس کو ترک کر دیا۔ پھر جب تکمیل کی اور معلوم ہوا کہ لوگوں کو اُن کے فتوے کی طرف احتیاج ہے اُس وقت فتویٰ دینا شروع کیا۔

م ک۔ جب امام صاحب کے استاد حمادؒ کا انتقال ہوا اور اُن کی خدمت کو جس طرح چاہئے کوئی انجام نہ دے سکا تو اصحاب حمادؒ نے بالاتفاق امام صاحب سے درخواست کی کہ مسند افتاء کو اپنے افادات سے آپ زینت دیں ورنہ علم ضائع ہونے کا خوف ہے امام صاحب نے کہا کہ اس شرط پر میں یہ کام قبول کرتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے دس صاحب ضامن ہو جائیں کہ ایک سال تک میرے ساتھ رہیں چنانچہ انہوں نے قبول کیا۔ ہر چند یہ مسلم تھا کہ اصحاب حمادؒ میں امام صاحب ہی اس خدمت کے مستحق ہیں۔ لیکن امام صاحب کے تقویٰ نے یہ اجازت نہ دی کہ خود رائی سے آپ مسند نشین ہو جائیں۔ اس لئے آپ نے دس صاحبوں کو منتخب کیا کہ ہر مسئلہ اُن کے شوریٰ سے قابل نفاذ سمجھا جائے باوجود اس قدر احتیاط کے

بمقتضائے خوف الٰہی پھر بھی کھٹکا لگا رہتا تھا چنانچہ اِس روایت سے ظاہر ہے۔

م ص ک ۔ یزید طحان کہتے ہیں کہ جب ابو حنیفہؒ کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتے تو دیر تک سکوت کرتے پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر کہتے **اللھم لا تؤاخذ نا** ۔

م ص ک ۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ ایک بار میں امام صاحب کے مکان کو گیا دیکھا کہ اس قدر مغموم ہیں کہ اُس کا سبب دریافت کرنے کی بھی مجھے جرأت نہ ہوئی تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر فرمایا اے ابو یوسف ہم جو کام کر رہے ہیں کیا خدائے تعالیٰ اس کا سوال ہم سے کرے گا میں نے عرض کی حضرت خدائے تعالیٰ آپ پر رحم کرے۔ مجتہد کے ذمہ اسی قدر ہے کہ اجتہاد اور کوشش میں کمی نہ کرے پھر کہا **اللھم اغفر** پھر تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا **اللھم لا تؤاخذنا** ۔

م ص ۔ مالک ابن مغولؒ کہتے ہیں کہ ایک روز میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اُس وقت ایک مسئلہ اُن سے پوچھا گیا انہوں نے اپنے اصحاب میں اُس کو پیش کیا جب سب نے خوض وفکر کر کے اُس کا حکم بیان کیا تو انہوں نے سب کے آخر میں ایک تقریر کی اُس کے بعد بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے پھر سر اٹھا کر کہا ''**اللھم انک تعلم انی انما اریدبہ وجھک** '' یعنی یا اللہ تو جانتا ہے کہ مجھے اس سے مقصود صرف تیری ذات ہے یہ کہہ رہے تھے اور اُن کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد ہر شخص کی طبیعت اس بات پر گواہی دے گی کہ امام صاحب نے جو فقہ کا کام اپنے ذمہ لیا تھا اُس میں ان کی کوئی نفسانی غرض نہ تھی اور بفضلہٖ تعالیٰ خالصاً لوجہ اللہ نہایت دیانتداری سے اُس کو انجام دیا۔ بات یہ ہے کہ جس دل میں خوف خدا ہوتا ہے اُس سے جو کچھ صادر ہوگا خدا ورسول کی مرضی کے مطابق ہوگا کیونکہ بات بات میں اس کو ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ایسا فعل یا حرکت نفسانی ایسی صادر نہ ہو جو باعث عتاب الٰہی ہو۔ اسی وجہ سے خاصان خدا

محدثین کو ورع حاصل کرنے کی ہدایت کیا کرتے تھے چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبیؒ نے بکرابن مقر کے ترجمہ میں لکھا ہے **الامام المحدث الصادق العابد ابو عبد الملک المصری کان طویل الحزن خازناً للسانه** یعنی اکثر اوقات اُن پر حزن طاری ہوتا اور خاموش رہا کرتے تھے ۔اُن کے فضائل ذاتی بیان کر کے لکھا ہے کہ جب محدثین اُن کے پاس آتے تو اکثر اوقات کہا کرتے **تعلموا الورع** یعنی احادیث کے ساتھ ورع بھی سیکھو۔

اب غور کیجئے کہ اس قدر خوف الٰہی کے بعد کیا ممکن ہے کہ کوئی بات دین میں انہوں نے ایسی ایجاد کی ہوگی ۔یا کوئی مسئلہ ایسا دل سے گھڑ لیا ہوگا جو خلاف حکم خدا ورسول ہو۔عقل سلیم تو اس کو ہرگز قبول نہیں کرسکتی اُن کے کمال تدین ہی کی وجہ سے اکابر محدثین نے اُن کے اتباع کی ترغیبیں دیں اور بتصریح کہدیا کہ جس نے ابوحنیفہؒ کو اپنا پیشوا بنالیا اُس نے احتیاط میں کمی نہ کی وغیر ذلک۔

امام صاحب کی تقریر

اب امام صاحب کی تقریر کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے ۔چونکہ قوت تقریر کا مدار کثرت معلومات اور استحضار مضامین اور طبیعت نکتہ رس پر ہے اور ابھی معلوم ہوا کہ امام صاحب اُس وقت کے علماء میں سب سے علم میں فائق اور قوت حافظہ میں ممتاز اور طبیعت نکتہ رس کے لحاظ سے بے نظیر تھے ان وجوہ سے آپ کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ موافق تو موافق مخالف بھی دم نہیں مار سکتے تھے اور سب کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔

م ک ۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں جب ابوحنیفہؒ کلام کرتے تو کُل حاضرین کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔

م ص ک ۔ کنانہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا کل علم مفہوم اور مستعمل ہے ۔اور دوسروں کے علم

میں حشو وزوائد بہت ہیں ۔ میں اُن کی صحبت میں ایک مدت تک رہا۔مگرایک بات بھی اُن سے ایسی نہیں سنی جو قابل مواخذہ ہو یا اُس پر عیب لگایا جائے۔

م۔ابومعاویہ کہتے ہیں کہ شریکؒ جہل اور حسد کی وجہ سے ابوحنیفہؒ کے ساتھ دشمنی تو رکھتے تھے مگر جب اُن کا قول سنتے تو بیچارے سر نہ اُٹھا سکتے۔

ک ۔عبدالصمد بن حسان کہتے ہیں کہ میں ایک بارسفیان کے پاس بیٹھا تھا ایک شخص نے کہا کہ ابوحنیفہؒ کوجدل اور جھگڑے کا علم دیا گیا ہے۔انہوں نے کہا اگر تم اُن کے پاس بیٹھو تو معلوم ہوگا کہ اُن کا مثل تم نے دیکھا نہیں جب وہ شخص امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس بات کا قائل ہوگیا کہ جوشخص اُن کے پاس بیٹھے اُن کی فقہ اور فہم اور ورع کی وجہ سے خاضع ہوکر اُن کے روبرو سر نہ اُٹھا سکے گا۔ پھر وہ شخص ہمیشہ امام صاحب کے فضائل بیان کر کے بدگویوں کو جواب دیا کرتا تھا۔

الحاصل امام صاحب کی تقریرایسی ہوتی تھی کہ کوئی سر نہ اٹھا سکتا۔اب غور کیجئے کہ اُس زمانہ میں امام صاحب کے مخالف محدثین کثرت سے تھے جنکی مخالفت کا اثر اب تک جاری ہےاور محدثین کی عادت تھی کہ جو بات مخالف حدیث پاتے اُس میں مناظرے کرتے یہاں تک کہ جان دینے کو مستعد ہوجاتے تھے جیسا کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں آپ نے دیکھ لیا۔ اورامام صاحب حاکم یا صاحب احتشام شخص نہیں تھے کہ اُن کے دروازہ پر روک ٹوک ہو وہ تو ہمیشہ مسجد میں بیٹھے رہتے تھے جس کا جی چاہتا مسئلہ پوچھ لیتا یا مناظرہ کر لیتا غرضکہ محدثین کی تصریحات اورعقل کی رو سے ثابت ہے کہ اُس زمانہ کے محدثین امام صاحب سے بکثرت مناظرہ کیا کرتے تھے مگر امام صاحب کی تقریرسنکر بجز انقیاداورگردن جھکانے کے گریز نہ تھا۔اس سے یہ بات بآسانی معلوم ہوسکتی ہے کہ جتنے مسائل میں محدثین کوامام صاحب سے خلاف ہے اُن میں اکثر مباحثے ہوئے اور بکرات ومرات محدثین کو امام

صاحب نے منوا کر چھوڑا پھر جو حضرات متدین اور منصف مزاج تھے وہ تو امام صاحب کی تعریفیں کیا کرتے اور جو خودسر اور حاسد تھے روبرو کچھ نہ کہہ سکتے البتہ غائبانہ بدگویاں کیا کرتے تھے جیسا کہ دنیاداروں کی عادت ہے مگر دینداروں کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔

م ص ک۔ یحییٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا کلام خالصۃً للہ تھا اگر اُس میں دنیوی امور کی آمیزش ہوتی تو اُن کا کلام آفاق میں ہرگز نافذ نہ ہوسکتا کیونکہ اُن کے حاسد اور کسر شان کرنے والے لوگ بہت سارے تھے۔

اب غور کیجئے کہ امام صاحب کے کلام کو آفاق میں پہونچانے والے کیسے متدین اور باوجاہت حضرات ہوں گے۔ کہ حاسدوں اور مخالفوں کو ساکت کر کے اُس کو آفاق میں نافذ کردیا اور کس زمانہ میں کہ جدھر دیکھے حدیث ہی حدیث ہے فقہ کی ایک کتاب بھی دنیا میں نظر نہیں آتی تھی یہ امام صاحب کی لِلّٰہیت اور قوت کلام کا اثر تھا۔

م ص ک۔ ایک بار کسی نے مسعرؒ سے کہا کہ ابوحنیفہؒ کے دشمن کس قدر کثرت سے ہیں یہ سُنکر مسعرؒ سیدھے ہو بیٹھے اور کہا دور ہو میں نے جب کسی کو اُن کے ساتھ مباحثہ کرتے دیکھا تو انہی کو غالب دیکھا۔

م۔ مطلب ابن زیاد کہتے ہیں کہ جب کبھی ابوحنیفہؒ نے کسی مسئلہ میں کسی کے ساتھ گفتگو کی تو وہ شخص ذلیل اور اُن کا منقاد ہوگیا۔

م ک۔ ابومعاویہ ضریرؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے اعلم نہیں دیکھا کبھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص تقریر میں اُن پر غالب ہوگا۔ مباحثہ میں نہ اُن کا ساحلیم دیکھا نہ کبھی اُن کو مغلوب ہوتے دیکھا۔

ک۔ ابوسعد الصفانی کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ کسی مسئلہ میں ابوحنیفہؒ پر

غالب ہوا ہو۔

خ۔ سفیان ثوری کہا کرتے تھے کہ ابوحنیفہؒ کی مخالفت ایسا شخص کرسکتا ہے جو اُن سے قدر اور علم میں بڑھا ہوا ہو اور ایسا شخص کہاں ہے۔

انصاف اسے کہتے ہیں باوجود اس تبحر کے کہ امیر المومنین فی الحدیث سمجھے جاتے تھے انصاف سے کہد یا کہ ابوحنیفہؒ سے مخالفت کوئی نہیں کرسکتا۔

م۔ واقدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ سے پوچھا کہ اہل عراق جو آپ کے یہاں آئے ہیں اُن میں افقہ کون ہیں فرمایا اہل عراق سے ہمارے یہاں کون آئے ہیں میں نے کہا ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ۔ فرمایا تم نے ابوحنیفہ کا نام آخر میں لیا میں نے اُن کو دیکھا کہ ہمارے یہاں کے کسی فقیہ کے ساتھ انہوں نے مناظرہ کیا اور تین بار اُس کو اپنی رائے کی طرف رجوع کرا کے آخر میں کہد یا کہ یہ بھی خطا ہے۔ مطلب یہ کہ جس مسئلہ میں مناظرہ ہوا تھا اُس میں امام صاحب کے تین قول یکے بعد دیگرے ہوئے اور جس قول کے اثبات میں امام صاحب نے تقریر کی اُس فقیہ کو تسلیم کرنا پڑا اور آخری قول کو بھی قابل فتویٰ نہیں سمجھا اور فرمایا کہ اس میں بھی خطا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کے استدلال میں وہ قوت ہوتی تھی کہ کسی کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں ملتی تھی اس سے بڑھ کر کیا ہو کہ امام مالکؒ اس مناظرہ کو دیکھ رہے تھے اور ہر قول کی تقریر اور استدلال کو سن رہے تھے مگر یہ نہ ہوسکا کہ کسی استدلال میں جرح کریں حالانکہ مناظرہ صرف احقاق حق کی غرض سے ہوا کرتا ہے۔ اور ہر عالم کو حق ہے کہ اُس میں دخل دے کر احقاق حق کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب جس قول پر دلیل پیش کرتے وہ ایسی قوی ہوتی تھی کہ امام مالک جیسے افراد بھی اُس میں جرح وقدح نہ کرسکتے تھے ''تا بہ دیگرے چہ رسد'' آخر امام صاحب ہی کو معلوم ہوتا کہ وہ دلیل مخدوش ہے اور اُس سے رجوع کر کے دوسرا قول اختیار کرتے اب غور کیجئے

کہ جب امام صاحب کے مقابلہ میں امام مالکؒ کا یہ حال ہو جو اُس زمانہ میں امام مسلم ہو چکے تھے تو دوسرے کس قطار وشمار میں۔

ک ت خ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے ابو حنیفہؒ کو دیکھا ہے کہا ''**نعم لو کلمک فی ھذہ الساریۃ ان یجعلھا ذھبا لقام بحجۃ**'' یعنی ہاں دیکھا ہے وہ ایسے شخص تھے کہ اگر تم سے کہہ دیتے کہ اس ستون کو سونے کا ثابت کردیں گے تو اُس پر حجت قائم کر دیتے۔

م ک خ ص۔ عبداللہ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ایک بار میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک صاحب آئے امام مالکؒ نے اُن کی بڑی تعظیم وتکریم کی جب وہ چلے گئے تو کہا تم جانتے ہو یہ کون ہیں یہ ابوحنیفہ ہیں اگر کہہ دیں کہ یہ ستون سونے کا ہے تو اُس پر دلیل قائم کردیں گے حق تعالیٰ نے اُن کو فقہ کی توفیق دی ہے جس سے اُس کا بار اُن پر نہیں رہا اُس کے بعد سفیان ثوری آئے اُن کو امام صاحب سے کم درجہ میں جگہ دی اور اُن کے جانے کے بعد کہا کہ یہ سفیان ہیں اور اُن کی فقہ اور ورع کا بھی ذکر کیا۔ کردریؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے امام صاحب کی نسبت جو کہا ہے **لو کلمک فی ھذہ الساریۃ الخ** اس سے جملہ محدثین کے زعم میں امام مالکؒ کی عدالت ساقط ہوگئی۔ عجیب بات یہ ہے یہ سب جانتے ہیں کہ لو کا مدخول محال ہوا کرتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے''**لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا**'' دیکھئے آلھہ کا وجود محال ہے اور اگر بفرض محال ہو جائے تو فساد لازم ہے اسی طرح امام مالکؒ نے فرمایا''**لو کلمک فی ھذہ الساریۃ ان یجعلھا ذھباً**'' ۔اس سے ظاہر ہے کہ امام مالک کو یقین تھا کہ امام صاحب کا ایسا دعویٰ کرنا کہ (یہ ستون سونے کا ہے) محال ہے اسی وجہ سے کلمۂ لو کو استعمال کیا اور فرمایا کہ اگر بفرض محال یہ دعویٰ کرتے تو اُس پر بھی دلیل قائم کر دیتے چونکہ اس قسم کے کلام میں صرف مبالغہ مقصود ہوتا ہے اس لئے

یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام مالکؒ یہ خبر دے رہے ہیں کہ امام صاحب لکڑی کے ستون کو سچ مچ سونے کا ستون ثابت کر سکتے ہیں بلکہ اُن کو امام صاحب کا کمال تدین بیان کر کے مبالغہ کے ساتھ یہ بتلانا منظور تھا کہ استدلال میں اُن کو اعلیٰ درجہ کی قوت اور اقتدار حاصل تھا اسی وجہ سے امام صاحب کے حاسدوں کو جوش آ گیا اور اس کلام سے امام مالک جیسے جلیل القدر امام المحدثین کی عدالت ہی ساقط کر دی انا للہ و انا الیہ راجعون حالانکہ اسی قسم کی بات محدثین نے امام شافعیؒ کی نسبت بھی کہی ہے چنانچہ توالی التاسیس میں ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے ''**قال ذکریا الساجی حدثنی ابوبکر ابن سعد ان قال سمعت هارون بن سعید یقول لو ان الشافعی ناظر علی هذا العمود الّذی من حجارة بانه من خشب لغلب لاقتداره علی المناظرة**'' یعنی امام شافعیؒ اگر اس ستون کے باب میں جو پتھر کا ہے مناظرہ کرتے اور اُس کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہتے تو اس وجہ سے کہ اُن کو مناظرہ پر اقتدار حاصل تھا غالب آ جاتے ۔غرضکہ اس قسم کی بات سے نہ امام شافعیؒ اور امام صاحب کی توہین مقصود تھی نہ اُس کے قائل پر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے۔

م ص ک۔محمد ابن اسماعیل ابن ابی فدیک کہتے ہیں کہ میں نے مالک ابن انسؒ کو دیکھا کہ ابو حنیفہؒ کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلے جا رہے ہیں جب مسجد نبوی کے دروازہ پر پہونچے تو ابو حنیفہؒ کو آگے بڑھا کر آپ اُن کے پیچھے چلنے لگے۔

اس سے ظاہر ہے کہ امام مالکؒ کا خیال امام صاحب کی نسبت یہ نہ تھا کہ جھوٹے مسئلے تراشتے ہیں بلکہ اُن کو معظم و محترم سمجھتے تھے۔

ت م ک۔جعفر ابن الربیع کہتے ہیں کہ میں پانچ سال ابو حنیفہؒ کی خدمت میں رہا اُن سے زیادہ خاموش شخص نہیں دیکھا مگر جب فقہ کی کوئی بات پوچھی جاتی تو سیل کی طرح اُن کا کلام پر زور ہوتا۔

خ ک۔ یحییٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ جس مجلس میں ابوحنیفہؒ ہوتے تو کلام کا مدار اُنہی پر ہوتا اور جب تک وہ وہاں رہتے کوئی دوسرا بات نہ کرسکتا۔

م۔ عمرو بن حماد بن طلحہ کہتے ہیں کہ جس مجلس میں ابوحنیفہؒ ہوتے تو کلام کا مدار اُنہی پر ہوتا اور جب تک وہ وہاں رہتے کوئی دوسرا بات نہ کرسکتا۔ مطلب یہ کہ امام صاحب کے روبرو مسائل شرعیہ میں بات کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی اس وجہ سے مجبوراً امام صاحب ہی کو کلام کرنے کی ضرورت ہوتی۔

م ک۔ عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں کہ فقہاء امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھتے تو اُن کے شاگرد سمجھے جاتے۔ اور جب امام صاحب کلام کرتے تو اُن کے کلام کی تہ تک بڑی قوت والے یعنی اعلیٰ درجہ کے ذکی علماء پہونچتے تھے۔

جب فقہاء (جو اعلیٰ درجہ کے محدث ہوا کرتے تھے) اُن کا یہ حال ہوتو غور کیجئے کہ معمولی محدثین کا کیا حال ہوگا۔ آدمی شاگردی کی ذلت گوارا کرسکتا ہے مگر باوجود اس کے اگر چہ سمجھ میں نہ آئے تو مفت کی ذلت اٹھانے سے کیا فائدہ اس لئے اکثر محدثین امام صاحب کے تلمذ اور صحبت سے محروم رہ گئے۔

م ک۔ یحییٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ شریک اور اُن کے رفقاء ابوحنیفہ کے مقابلہ میں ایسے تھے جیسے کم عمر لڑکے۔ کاش وہ ابوحنیفہؒ کے اقوال سمجھ ہی لیتے۔

ابھی معلوم ہوا کہ شریک جب امام صاحب کا قول سنتے تو سر نہ اُٹھا سکتے اور یحییٰ ابن آدمؒ کے قول سے ثابت ہے کہ اُن کی لیاقت اتنی بھی نہ تھی کہ امام صاحب کی تقریر ہی سمجھ سکتے مگر بیچارے حسد کے مارے دشمنی پر مجبور تھے۔ یہی حال اُن تمام محدثین کا تھا جو امام صاحب کی شان میں بدگوئیاں کیا کرتے تھے جن کے کاسہ لیس آج تک موجود ہیں۔

خ۔ ابوسلیمان کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ عجیب شخص تھے اُن کے کلام سے وہی منہ پھیرتا ہے جو

اُس کے سمجھنے پر قادر نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فقہ سے اُن لوگوں نے منہ پھیرا کہ جن کی سمجھ میں اُس کے مضامین نہیں آئے کیونکہ ایسا آدمی تو عامی اور جاہل ہے اُس کا ذکر ہی کیا، یہاں کلام محدثین میں ہے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ احادیث تو وہ سمجھتے تھے مگر فقہ کو نہیں سمجھ سکتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض محدثین یہ نہ سمجھ سکتے کہ امام صاحب کے اقوال احادیث کے خلاصہ ہیں اور کوئی بات خلاف حدیث نہیں اور ناسمجھی سے یہ خیال کرلیا کہ وہ امام صاحب کی صرف رائیں ہیں۔ اس لئے اُس سے منہ پھیرا۔ غرضکہ مقصود ابوسلیمانؒ کا یہ ہے کہ امام صاحب کا کوئی قول مخالف حدیث نہیں۔ مگر یہ بات ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے لئے طبیعت نکتہ رس اور استحضار احادیث کی ضرورت ہے۔

خ۔ شعبہؒ قسم کھا کر کہتے تھے کہ ابوحنیفہ کا فہم درست اور حافظہ جید تھا لوگوں نے اُن کی تشنیع ایسے مسائل میں کی جو اُن کے سمجھ میں نہ آئے اور ابوحنیفہ اُن سے زیادہ اُن مسائل کو جانتے تھے۔

اب دیکھئے کہ قصور تو اپنی سمجھ کا اور طعن و تشنیع امام صاحب پر کس قدر زیادتی ہے۔ حق تعالیٰ اہل انصاف محدثین کو جزائے خیر دیوے کہ انہوں نے فقہ کی توثیق کر کے نافہموں کا قصور ثابت کر دیا۔

خ۔ اعمشؒ سے پوچھا گیا کہ آپ اُن لوگوں کے باب میں کیا فرماتے ہو جو ابوحنیفہ کی برائیاں بیان کرتے ہیں فرمایا بات یہ ہے کہ جو مسائل انہوں نے بیان کئے کچھ تو لوگوں نے سمجھے اور کچھ نہ سمجھے اس لئے اُن کے دشمن ہو گئے اور حسد کرنے لگے۔

یہ بات اوپر معلوم ہوئی کہ اعمشؒ سے چند مسئلے کسی مجلس میں پوچھے گئے جس میں امام صاحب بھی موجود تھے انہوں نے امام صاحب سے پوچھا کہ اُن میں تمہارے کیا اقوال ہیں۔

امام صاحب نے بیان کیا مگر اعمشؒ کو تسکین نہ ہوئی اور دلیل طلب فرمائی۔ امام صاحب نے استدلال میں وہی حدیثیں پیش کیں جو اعمشؒ سے اُن کو پہونچی تھیں اور ہر ایک سے استخراج کس طرح کیا گیا۔ اُس کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ اعمشؒ نے امام صاحب کی تحسین کر کے فرمایا کہ تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں۔ اور جب حج کو گئے تو مناسک حج امام صاحب ہی سے لکھوائے اور اُن پر عمل کیا اور شاگردوں سے بھی لکھ لینے کو کہا۔

دیکھئے اعمشؒ نے جو لوگوں کے نہ سمجھنے کا حال بیان کیا وہ اُن کا ذاتی تجربہ تھا اس لئے کہ جن روایتوں سے امام صاحب نے استدلال کیا وہ اعمشؒ ہی سے آپ کو پہونچی تھیں اور مدتوں وہ اُن کے خزانۂ حافظہ میں محفوظ اور ہمیشہ اُن کے پڑھنے پڑھانے میں پیش نظر رہیں۔ مگر کبھی یہ نہ معلوم ہوا کہ اُن سے کچھ مسائل بھی نکلتے ہیں۔ پھر اعمشؒ آخر امام صاحب کے استاد ہی تھے اُن کے نازک استدلال کو فوراً سمجھ گئے اور اس کی داد دی بھلا ہر کس و ناکس میں وہ صلاحیت کہاں اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی نازک بات آدمی کی سمجھ میں نہیں آتی تو جھنجھلا کر کج بحثی شروع کرتا ہے چنانچہ اکثر غبی طلبہ کی حالت دیکھی جاتی ہے کہ جب کوئی نازک مضمون استاد بیان کرتا ہے جس کو اُس کے ہم درس اذکیاء سمجھ جاتے ہیں تو وہ لوگ ناسمجھی کے عار کو دفع کرنے کی غرض سے کج بحثی شروع کرتے ہیں جس کی انتہاء دشمنی اور حسد پر ہوتی ہے۔ یہی بات تھی جو اعمشؒ نے کہی کہ امام صاحب کی باتوں کو نہ سمجھ کر بعضے دشمن ہو گئے اور حسد کرنے لگے۔

م ص خ۔ حافظ ابوحمزہ محمد ابن میمون قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کی تقریر سننے سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی وہ لاکھ اشرفی کے ملنے سے بھی نہیں ہو سکتی۔

علماء خصوصاً ان میں وہ اذکیاء جن کی طبیعتوں میں اعلیٰ درجہ کا مذاق علمی ہے اس خوشی کا سبب سمجھ سکتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ جب کوئی نازک اور غامض بات سمجھ میں آجاتی ہے تو

کس قدر خوشی ہوتی ہے کبھی تو وجد کی سی حالت طاری ہوتی ہے اور بعضے تو شادی مرگ سے ہلاک ہوجاتے ہیں ۔ جیسا کہ تاریخ حکمائے یونان میں لکھا ہے کہ فیثا غورس فیلسوف کی طبیعت نکتہ رس نے جب شکل عروس کی ایجاد میں کام دیا اور اُس کی سمجھ میں بات آ گئی تو اُسے اس قدر خوشی ہوئی کہ بقول بعض وہ اسی سے ہلاک ہوگیا۔ غرض اغبیاء پر جس قدر نہ سمجھنے کا بُرا اثر پڑتا ہے اُسی قدر اذکیاء کو سمجھنے سے خوشی پیدا ہوتی ہے یہی بات تھی کہ حافظ محمد ابن میمونؒ کو امام صاحب کی تقریر سمجھنے کی اس قدر خوشی ہوئی کہ لاکھ اشرفیوں پر اُس کو ترجیح دی ۔ کردریؒ وغیرہ نے یزید بن ہارون کا قول نقل کیا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے اقوال کو وہی لوگ دوست رکھتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کے علماء میں اذکیاء ہیں ۔ اور وہی لوگ اُن کو ضبط کرتے ہیں جو اُن میں اہل فہم ہیں۔

ک۔ یوسف بن خالد سمتی کہتے ہیں کہ جب میں علم حاصل کر کے ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں گیا اور اُن کی تقریریں سنیں تو معلوم ہوا کہ علم کے چہرہ پر نقاب تھا جو اُن کی تقریروں سے اُٹھ گیا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کونسا نقاب تھا جس کو محدثین نہ اُٹھا سکے ادنی تامل سے یہی ثابت ہوگا کہ ظاہری تعارض احادیث اور مضامین کا اشکال تھا جس سے طالب علم کو یقینی طور پر یہ نہیں معلوم ہوسکتا تھا کہ جو وقائع پیش ہوتے ہیں اُن میں عمل کس طرح کیا جائے ۔ امام صاحب نے تمام آیات واحادیث واقوال صحابہ وغیرہم کو پیش نظر رکھ کر اپنی طبیعت خداداد سے مدد لی۔ اور تعارض احادیث کو اٹھا کر اشکالوں کو ایسا حل کر دیا کہ شارع کی مراد منکشف ہوگئی۔

خ۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے علم کو ایسا منکشف کر دیا کہ کسی نے کیا ہی نہ تھا۔

جب امیر المومنین فی الحدیث یہ گواہی دے رہے ہیں تو غور کیجئے کے امام صاحب کا کس قدر شکریہ کرنا چاہیئے ۔ بات یہ ہے کہ ابہام اور اشکال کا معلوم کرنا بھی ہر کسی کا کام نہیں

چنانچہ یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی معمولی طالب علم نے کسی فاضل کے روبرو کہا کہ میں شرح جامی پڑھ چکا ہوں انہوں نے کہا اُس میں تو بڑے بڑے شیر لیٹے ہیں اُس نے کہا کہ حضرت بندہ بھی پاؤں دبا کر ایسا نکل گیا کہ کسی شیر کو خبر ہی نہ ہوئی۔ غرضکہ امیر المومنین فی الحدیث کی سی طبیعت کسی کی ہو تو وہ امام صاحب کی قدر جانے اور جس کی طبیعت میں اشکال وغیرہ کا احساس ہی نہ ہو وہ کیا جانے اسی وجہ سے عبداللہ بن یزید مقریؒ نے کہا ہے کہ جو لوگ ابوحنیفہؒ کے فضل وتقدم کو نہیں جانتے وہ زندے نہیں مردے ہیں۔ **ذکرہ فی الانتصار وغیرہ** اور عبداللہ بن مبارکؒ نے ایسے لوگوں کو سفہاء کہا ہے۔ بہرحال جو عالم عاقل ہو امام صاحب کے فضل کا ضرور اعتراف کرے گا۔

م ک۔ ابوسفیان حمیری کہتے ہیں کہ سخت مسائل کا کشف اور احادیث مبہمہ کی تفسیر جو ابو حنیفہؒ نے کی وہ کسی سے نہ ہوسکی۔

م ص۔ سعدان ابن سعید خلمی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ اس امت کے طبیب ہیں۔ اس لئے کہ جہل ایسی بیماری ہے کہ اُس کی حد نہیں اور علم ایسی دوا ہے کہ اُس کی نظیر نہیں اور ابوحنیفہؒ نے علم کی ایسی شافی تفسیر کی کہ جہل جاتا رہا۔

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ اس تفسیر سے پہلے کس قسم کا جہل تھا اور وہ جہل کس تفسیر سے دفع ہوا۔ ادنی تامل سے یہی ثابت ہوگا کہ مختلف احادیث وآثار سے یہ نہیں معلوم ہوسکتا تھا کہ ہر مسئلہ میں کس طرح سے عمل کیا جائے اور امام صاحب نے علم کی تفسیر جو کی وہ یہی فقہ حنفیہ ہے جس سے وہ جہل جاتا رہا۔

م ص ت۔ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ میں ایک بار معمرؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ عبداللہ بن مبارکؒ آئے معمرؒ نے کہا کہ سوائے ابوحنیفہؒ کے میں کسی شخص کو نہیں جانتا جو فقہ میں عمدگی سے کلام کرے۔

ک۔ عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ فقہ میں ابوحنیفہؒ سے

بہتر کلام کرتا ہو۔

م ک ص ۔ خلف ابن ایوب کہا کرتے تھے کہ میں علماء کے حلقوں میں جایا کرتا تھا مگر جو بات اُن کی تقریروں سے سمجھ میں نہ آتی تو مجھے بہت غم ہوتا اور ابوحنیفہؒ سے پوچھتا اُن کی تقریر سے وہ ایسی حل ہو جاتی کہ دل میں نور پیدا ہوتا تھا۔

م ص ک ۔ ابو سعد صغانیؒ کہتے ہیں کہ جو مسئلہ میں ابوحنیفہؒ سے پوچھتا تھا۔ اُس کی شرح اور توضیح انتہاء درجہ کی کرتے تھے۔

ک ۔ عامر فرات کہتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ بات تھی کہ میں علم میں خوب کلام کر چکا ہوں (یعنی اپنی تقریر اور علم پر ناز تھا) مگر جب ابوحنیفہؒ کی تقریر سنی تو مجھے اپنا نفس صغیر اور حقیر معلوم ہونے لگا۔

م ص ۔ عبداللہ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کی مجلس میں ہر صبح وشام جایا کرتا تھا ایک بار حیض کے مسئلہ میں گفتگو شروع ہوئی اور تین روز تک صبح وشام ہوا کی مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا آخر تیسرے روز قریب شام اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا جس سے میں نے یہ سمجھا کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا اور یہ خوشی کا نعرہ ہے جو بے اختیار سب کی زبان سے اللہ اکبر نکل آیا۔

یہ حالت عبداللہ ابن مبارکؒ کی تھی جو امیر المومنین فی الحدیث ہو چکے تھے کیونکہ حدیث کی تکمیل کے بعد امام صاحب کے حلقہ میں وہ شریک ہوئے دیکھیئے وہ فرماتے ہیں'' و كنت لا افهم من مسأ لتهم قليلاً و لا كثيراً'' ۔ یعنی تین دن تک جو تقریر اُس مسئلہ میں ہوتی رہی وہ میری سمجھ میں کچھ نہ آئی ۔ نہ تھوڑی نہ بہت ۔ چونکہ وہ مستقل مزاج تھے یہ خیال کر لیا کہ ابتدائی حالت ہر فن میں ایسی ہی ہوا کرتی ہے رفتہ رفتہ اُس میں بھی تبحر ہو جائیگا مگر اُن کی حق پسندی اور حق طلبی دیکھنے کے قابل ہے کہ تین دن تک تضییع اوقات کر کے تبرکاً سنتے ہی رہے اور یہ نہ کہا کہ اس جھگڑے سے کیا فائدہ اور جس طرح دوسرے طالب علم فقہ

سے محروم رہ جاتے تھے۔ آپ نہ رہے بلکہ جزم کرلیا کہ عمر بھرامام صاحب ہی کی صحبت میں رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا کہ امام صاحب کے انتقال تک ملازم حلقہ رہے اور کمال حاصل کیا۔ بات یہ ہے کہ جو مردانہ ہمت امیر المومنین کو حاصل تھی وہ ہر کسی کو کہاں نصیب۔ اُن لوگوں نے جب دیکھا کہ طبیعت میں صلاحیت نہیں کہ یہ وادی طے کر سکے تو جاتے جاتے امام پر کچھ الزام دھر دیا جیسے نقل مشہور ہے کہ انگور کھٹے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تقریر جس کی خبر ابن مبارکؒ نے دی ہے عام فہم تھی جو مجمع میں کی گئی تھی ورنہ خاص خاص تقریریں جن میں باریک اور نازک استدلال ہوتے وہ تو تنہائی میں ہوا کرتی تھیں جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے۔

م ک ص۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ جب امام صاحب کو کوئی نازک تقریر کرنی منظور ہوتی تو خلوت میں بیٹھتے اور مسعر اور عمر ابن ذر اور ذر رحمہم اللہ کو بلاتے پھر ذر رحمۃ اللہ علیہ چند آیات قرآنی پڑھتے اور مناظرہ ہوتا۔

امام صاحب کا حلقۂ درس

الغرض امام صاحب کی تقریر کی قوت اور متانت اور برجستگی اور اُس میں دقائق وحقائق کا اظہار اور استدلال کی عمدگی اور نزاکت اور مبہمات کا کشف اور مشکلات کا حل وغیرہ امور نے آپ کو شہرۂ آفاق بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے امام صاحب کا حلقۂ درس اسلامی دنیا کے اہل فضل وکمال کا مجمع اور طالبین حق کا مرجع بنا ہوا تھا۔ اب اُس مرکز فیض و بابرکت حلقہ کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے۔

م ص ک۔ حماد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ مفتی کوفہ ابراہیم نخعیؒ اُن کے بعد حماد ابن ابی سلیمان ہوئے جن کی وجہ سے لوگ مستغنی تھے جب اُن کا بھی انتقال ہوا تو لوگوں کو ایسے شخص کی

احتیاج ہوئی کہ اُن کا جانشین ہوسکے۔ ہر چند اُن کے فرزند ذی علم تھے اور ابوبکر نہشلی وغیرہ شاگردان حمادؒ نے اُن سے درخواست کی مگر اُن کی نحو اور کلام عرب کا مذاق زیادہ تھا اس لئے وہ فقہ کی خدمت نہ کرسکے۔ پھر ابوبکر نہشلی سے کہا گیا انہوں نے بھی انکار کیا۔ آخر ابوحنیفہؒ سے کہا گیا آپ نے کہا علم کا تلف ہونا میں گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے قبول تو کرتا ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ حضرات میں سے دس علماء میری رفاقت دیں۔ چنانچہ آپ نے وہ کام شروع کردیا ابتداء میں حمادؒ کے شاگرد آپ کے یہاں آتے رہے اُس کے بعد ابویوسف اور زفرؒ وغیرہ علمائے کوفہ شریک حلقہ ہوئے اور شدہ شدہ یہاں تک شہرت ہوئی کہ دور دور سے علماء آکر شریک حلقہ ہونے لگے۔ اور امراء اور حکام کو آپ کی طرف احتیاج ہوئی انتہی ملخصًا۔

چونکہ امام صاحب کو فن حدیث میں کمال تھا اور رائے ایسی صائب تھی کہ بسا وقت آپ کے استاد حمادؒ اپنی رائے سے رجوع کرکے آپ کی رائے اختیار کرتے تھے۔ حالانکہ وہ زمانہ آپ کی طالب علمی کا تھا اور استخراج مسائل میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا جس کو اکابر محدثین نے تسلیم کرلیا ہے اور استدلال آپ کا ایسا قوی ہوتا تھا کہ کوئی اُس میں کلام نہیں کرسکتا تھا اور دقیق اور مشکل مضامین کے حل کرنے میں آپ کی طبیعت وہ کام کرتی تھی جو کسی سے نہ ہوسکے۔ غرضکہ جو اسباب یگانۂ روزگار بنانے والے ہیں بفضلہٖ تعالیٰ آپ میں جمع تھے اس وجہ سے چند ہی روز میں آپ ایسے مشہور آفاق ہوگئے کہ بڑے بڑے محدثین آپ کے حلقہ میں آنے لگے۔

م ک ص ت۔ عبداللہ بن داؤد کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ آثار اور ورع چاہتے ہو تو سفیانؒ کے پاس جاؤ اور اگر دقائق چاہتے ہو تو اس کام کے لئے ابوحنیفہؒ ہیں۔

چونکہ فن حدیث کے جاننے اور روایت کرنے والے اُس زمانہ میں بکثرت تھے اور دقائق علمیہ بیان کرنا ہر کسی کا کام نہیں اس کے لئے اعلیٰ درجہ کی طبیعت درکار ہے اور امام

صاحب کو طالب علمی کے زمانہ سے اپنی طبعیت خداداد پر وثوق ہوگیا تھا اس لئے روایت حدیث کا کام محدثین پر محول کر کے آپ دقائق علمیہ کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ اور اُس میں کمال حاصل کیا کہ شہرہ آفاق ہوئے چنانچہ محدثین سے جب دقائق احادیث پوچھے جاتے تو آپ پر محوّل کرتے جیسا کہ عبداللہ ابن داؤد نے کیا۔

م ک۔ مقاتل بن حیان جوفن تفسیر کے امام ہیں کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا ایسا شخص جس کو غوامض کے ادراک میں بصیرت تامہ ہواُن سے بہتر نہیں دیکھا۔

ک۔ ابو معاویہ ضریرؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے علم کے طریقہ کی بنیاد ڈالی اور اُس کے معانی بیان کئے اور مشکلات حل کئے ۔ ایسا کون شخص ہے جو اُن کے مبلغ علم تک پہونچا ہو اور کس کو وہ راہ ملی جو اُن کو ملی تھی ۔ اُن پر خدائے تعالیٰ کی بڑی منت تھی اُن کی سعی مشکور ہوئی ۔

ابو معاویہ نابینا کوفہ میں معزز عالم مانے جاتے تھے ایک بار ہارون رشید نے اُن کی دعوت کی اور اپنے ہاتھ سے اُن کے ہاتھ دھلائے اور پوچھا کہ آپ جانتے ہو کہ آپ کے ہاتھ پر پانی کون ڈال رہا ہے کہا نہیں، کہا امیر المومنین ۔ یہ سنکر انہوں نے دعا دی کہ جس طرح آپ نے علم کا اکرام کیا حق تعالیٰ آپ کا اکرام کرے اور آپ کے درجہ آخرت میں بلند فرمادے ۔ ہارون نے کہا میری غرض یہی تھی کہ آپ کے زبان سے یہ دعا سنوں ۔ ابو معاویہؒ نے جو امام صاحب کے خصوصیات بیان کئے کہ علم کی بنیاد ڈالی اور مشکلات حل کئے ۔ اور جو راہ اُن کو ملی وہ کسی کو نہ ملی ۔ اہل علم پر بلکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اُس سے یہی فقہ مراد ہے جس کو اُس زمانہ کے علماء خدائے تعالیٰ کی منت سمجھتے اور امام صاحب کے ممنون ہوتے تھے۔ اور یہی امر امام صاحب کے حلقہ میں شریک ہونے کا باعث تھا۔

م ک ص۔ یوسف ابن خالد السمتیؒ کہتے ہیں کہ میں بصرہ میں عثمان سمنی کے پاس ہمیشہ جایا کرتا تھا ایک روز میرے خیال میں یہ بات آئی کہ میرا مبلغ علم اعلیٰ درجہ تک پہنچ گیا اور اُس

سے بہرہ کافی مجھے حاصل ہو گیا ہے مگر چونکہ اُن دنوں ابوحنیفہؒ کے علم اور فقہ کی شہرت سنی جاتی تھی میں نے کوفہ کا قصد کیا جب اُن کے حلقہ میں پہونچا اور اُن کے اصحاب کی تقریریں سنیں تو اُس وقت مجھے اپنے علم کی حقیقت معلوم ہوئی جس کی وجہ سے میں اپنے نفس کو حقیر سمجھنے لگا اور یہ معلوم ہوا کہ اب تک علم کا کوئی مسئلہ میں نے سنا ہی نہ تھا اور جو پردہ مجھ پر پڑا تھا وہ اُٹھ گیا۔

دیکھئے اہل انصاف کا یہ حال تھا کہ گو اپنی ذلت کی بات تھی مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں پہلے حدیث ہی کو علم سمجھتا تھا مگر امام صاحب کے حلقہ میں جب حدیث کے ثمرات اور نتائج اور نازک مضامین معلوم ہوئے جن کا ماحصل فقہ ہے تو اس وقت یہ ثابت ہوا کہ بغیر فقہ علم سے بہرۂ کافی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ تمامی ارشادات سے شارع علیہ السلام کا مقصود عمل ہے۔ اور جب تک فقیہ اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لیکر ایک بات قابل عمل نہ بتلائے آدمی حیران رہتا ہے کہ کس حدیث پر عمل کیا جائے اور کونسی حدیث ترک کی جائے۔ یہی بات زہیرؒ کے قول سے اوپر معلوم ہوئی ہے کہ انہوں نے قسم کھا کر اپنے شاگردوں سے کہا کہ میرے پاس ایک مہینہ بیٹھنے سے ابوحنیفہؒ کے پاس ایک روز بیٹھنا بہتر ہے حالانکہ زبیرؒ کے حلقہ میں حدیث ہوتی تھی اور امام صاحب کے حلقہ میں فقہ۔

م۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں اکابر کو دیکھا کہ صغار اور کم وقعت معلوم ہوتے تھے۔

م ک ص۔ فضل ابن موسیٰ رازیؒ کہتے ہیں کہ ہم مشائخ حجاز و عراق کی خدمت میں جایا کرتے تھے مگر جو برکت اور نفع ابوحنیفہؒ کے مجلس میں تھا وہ کسی مجلس میں نہ تھا۔

امام صاحب کے حلقہ میں برکت اور نفع ہونے کے کئی سبب تھے ایک تو خود امام صاحب کا وجود باجود جن کی ذات سے وہ تمام برکتیں وابستہ تھیں۔ دوسرا یہ کہ اہل حلقہ تقریباً کل علماء اور محدثین ہوتے تھے کیونکہ معمولی علماء اُن کی باہمی تقریریں جو تحقیق مسائل میں ہوتی تھیں

سمجھ نہیں سکتے تھے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوا اور ظاہر ہے کہ متبحر محدثین کا مجمع کس قدر بابرکت ہوسکتا ہے۔ تیسرا حل مشکلات وکشف مبہمات اور معلوم نہیں ان کے سوا اور کیا کیا معنوی برکات وفیوض اُن کے قلوب پر فائض ہوتے تھے۔

م ک۔ خلف ابن ایوبؒ کہتے ہیں کہ میں محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتا تھا مگر جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو مجھے غم ہوتا۔ پھر جب ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں آ کر اُن سے دریافت کرتا تو وہ اس خوبی سے اشکال کو حل کرتے کہ میرے دل میں ایک نورانی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اُس متبرک حلقہ کے ضروری مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ طالبین حق کے شبہات حل کئے جائیں۔

ت ک۔ قاسم بن معنؒ سے کسی محدث نے کہا کیا آپ پسند کرتے ہو کہ ابوحنیفہؒ کے لڑکوں یعنی کم درجہ کے شاگردوں میں شامل رہو۔ کہا ابوحنیفہ کی مجلس سے زیادہ کسی مجلس میں نفع نہیں ہوسکتا اگر تم خود چل کر دیکھ لوگے تو یہ معلوم ہو جائیگا۔ چنانچہ وہ اُن کے ساتھ گئے اور قائل ہوگئے کہ فی الحقیقت اُن کا مثل نہیں اور پھر انہوں نے امام صاحب کے حلقہ کو کبھی نہ چھوڑا۔ یہ واقعہ تہذیب الکمال میں بھی لکھا ہے۔ قاسم ابن معن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں اور امام صاحب کا انتساب فقہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی طرف ہے اس وجہ سے اُن محدث صاحب نے اُن کو عار دلایا کہ آپ ایسے نامی وگرامی خاندان کے شخص ہو پھر اس ذلت کو کیوں پسند کرتے ہو۔ مگر طالبین حق پر ایسے افسون کب اثر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے قائل کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ انہی کو منصف قرار دے دیا اور فی الحقیقت وہ تھے بھی منصف قائل ہوگئے۔ دراصل یہ قاسمؒ کے صدق کا اثر تھا کہ مخالف کو گرویدہ بنا دیا۔

م ک ص۔ ابومعاذ بلخیؒ کہتے ہیں جو شخص ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں نہیں بیٹھتا مفلس رہ گیا۔ جس میں کوئی خیر نہیں۔

لکھا ہے کہ ابو معاذ وہ شخص ہیں کہ امام مالکؒ اُن کی نسبت اپنی آرزو ظاہر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تمہارے یہاں تین شخص جو خراساں میں ہیں ایسے ہیں کہ خالصاً لوجہ اللہ مقام کریم میں قائم ہیں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اُن کو کسی کا خوف نہیں کاش وہ ہمارے یہاں ہوتے وہ تین شخص یہ ہیں تو بہ ابن سعد اور متوکل اور ابو معاذ ۔ اُن کے خلوص اور بے خوفی ہی کا اثر تھا کہ امام صاحب کے مخالفوں کی نسبت صاف صاف کہدیا کہ وہ مفلس ہیں جن میں کوئی خیر نہیں ۔ اور ذرا بھی خیال نہ کیا کہ محدثین زمرہ اہلحدیث سے اُن کو خارج کر دیں گے ۔ **لا خیر فیھم** کہنے کی یہی وجہ ہوگی کہ حدیثوں کے الفاظ یاد کر لینے سے مسلمانوں کو کیا نفع نہ کسی معاملہ میں فتویٰ دے سکتے ہیں نہ خود اُن پر عمل کر سکتے ہیں ۔

ک ۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ابو حنیفہؒ کو اس امت کے لئے رحمت پیدا کیا ۔ جو شخص اُن کے حلقہ میں نہیں بیٹھا یا اُن کے علم میں نظر نہیں کیا وہ محروم اور ناقص رہا ۔

چونکہ ابن مبارکؒ امیر المومنین فی الحدیث مسلم ہو چکے تھے اس لئے ان کو حق تھا کہ محدثین کو اُن کے نقص اور محرومی پر مطلع کر دیں مگر افسوس ہے کہ بعض خود وسرں نے اُن کی بھی نہ مانی ۔

م ک ص ۔ جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں ۔ مغیرہؒ نے مجھ سے کہا کہ ابو حنیفہؒ کے حلقہ کو اگر لازم پکڑو گے تو فقیہ ہو جاؤ گے اور اگر احیاناً میں جانے میں قصور کرتا تو خفا ہو کر فرماتے کہ بلا ناغہ جایا کرو ہم اور ابو حنیفہؒ حمادؒ کے ہاں جایا کرتے تھے مگر جو علم کا فتح باب ابو حنیفہؒ کے لئے ہوا وہ ہمارے لئے نہیں ہوا ۔

خفگی کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جریرؒ طالب علمی کے زمانہ میں امام صاحب کی قدر کیا جان سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ ابتدائی نظر میں طلب حدیث سے بہتر کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی پھر اُس پر علاوہ امام صاحب کے حاسدوں کا روکنا مگر چونکہ استاد بالغ النظر تھے کمال شفقت سے اُن کو ایسی بات پر مجبور کرتے تھے کہ جو اُن کے حق میں نافع تھی ۔

م۔خلادسکونیؒ کہتے ہیں کہ ایک روز میں زہیر ابن معاویہ کے یہاں گیا انہوں نے پوچھا کہاں سے آتے ہو میں نے کہا ابوحنیفہؒ کے یہاں سے فرمایا خدا کی قسم اُن کے پاس ایک روز بیٹھنا میرے یہاں ایک مہینہ بیٹھنے سے تمہارے لئے انفع ہے **کما مر سابقاً**۔

م ک ص۔ جریر ابن عبدالحمید کہتے ہیں کہ مغیرہ بن قاسم کہا کرتے تھے کہ اگر ابراہیم نخعیؒ زندہ ہوتے تو وہ ابوحنیفہؒ کے حلقہ کے محتاج ہوتے خدا کی قسم ابوحنیفہؒ حلال وحرام میں نہایت عمدگی سے کلام کرتے ہیں۔

ابراہیم نخعیؒ امام صاحب کے استاد اور بڑے فقیہ تھے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ ابوحنیفہؒ اُن کے مقلد تھے وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثر امام صاحب کے اجتہاد امام نخعیؒ کے اجتہادوں کے مطابق تھے۔اس قرینہ سے شاہ صاحب نے یہ لکھ دیا دراصل یہ توارد ہی تھا تقلید پر قرینہ نہیں ہوسکتا۔دیکھ لیجئے امام صاحب کے اجتہاد اکثر امام مالکؒ کے اجتہادوں کے بھی مطابق ہوا کرتے ہیں جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہے پھر جب اُسی زمانہ کے علماء اپنی ذاتی مشاہدہ سے یہ تصریح کر رہے ہیں کہ ابراہیمؒ بھی زندہ ہوتے تو ابوحنیفہؒ کے محتاج ہوتے تو اس گواہی کے مقابلہ میں اجمالی قرینہ قابل اعتبار نہیں اور اُسی کے مؤید وہ روایت ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ عثمان مدینیؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ حماد اور ابراہیم اور علقمہ اور ابن اسودؒ سے افقہ تھے اور نیز ابن مبارکؒ کا وہ قول ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ ابوحنیفہؒ اگر تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ بھی ان کی طرف محتاج ہوتے۔

م ک ص۔ وہب ابن جریر ابن حازمؒ کہتے ہیں کہ میرے والد ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں بہت بیٹھے ہیں وہ ہمیشہ ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھنے کی مجھے ترغیب دیا کرتے تھے۔

ک۔ جریرؒ کہتے ہیں کہ جب اعمشؒ سے کوئی شخص مسئلہ پوچھتا تو اکثر فرماتے کہ ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں جاؤ۔اُن کے یہاں جو مسئلہ پیش ہوتا ہے وہ لوگ مباحثہ کر کے اُس کو نہایت

روشن کر دیتے ہیں۔غور کیجئے کیسا مستند حلقہ تھا کہ اعمشؒ جیسے جلیل القدر استاذ المحدثین اُس کی توثیق کر کے طالبین حق کو وہاں جانے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ایسے اکابر محدثین کی گواہیوں کے مقابلہ میں یہ کہنا کہ ابوحنیفہ نے حدیثوں کی مخالفت کی اُن محدثین پر یہ الزام لگانا ہے کہ انہوں نے بھی اس مخالفت سے حصہ لیا اور اس کی تائید کی۔

م ص ک ت۔عبداللہ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ مسعرؒ جب ابوحنیفہؒ کو دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے اور جب بیٹھتے تو روبرو بیٹھتے اور مثل شاگردوں کے سوال اور استفادے کرتے امام موفق اور سبط ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ مسعر وہ شخص تھے کہ حفظ اور زہد میں اہل کوفہ کو اُن سے فخر تھا اور اکابر محدثین اور خود امام صاحب کے بھی استاد تھے۔

غور کیجئے کہ جب ایسے جلیل القدر استاد المحدثین امام صاحب کے حلقہ میں شاگردوں کی طرح بیٹھتے ہوں گے تو اُس حلقہ کی کس قدر وقعت طالبین حق کے دل میں متمکن ہوتی ہوگی۔

م ص ک۔ابن سماکؒ کہتے ہیں کہ کوفہ کے اوتاد چار ہیں سفیان ثوری اور مالک ابن مفول اور داؤد طائی اور ابوبکر نہشلی اور یہ سب ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں بیٹھے ہیں۔

م۔کسی نے یحییٰ ابن معین سے پوچھا کیا سفیان ثوری نے ابوحنیفہ سے روایت کی ہے کہا ہاں ابوحنیفہ حدیث اور فقہ میں ثقہ اور صدوق تھے اور دین الٰہی پر مامون تھے۔

اگرچہ سفیان ثوریؒ سے مختلف روایتیں وارد ہیں لیکن کئی روایتوں سے صفائی ثابت ہوتی ہے۔اس لئے ممکن ہے کہ اوائل یا اواخر میں حلقہ میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہو۔اور یہ کوئی مستبعد اور قابل تعجب بات نہیں اس لئے کہ ابن مبارکؒ وغیرہ کی شہادتوں سے خود مسعرؒ کا امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھنا ثابت ہے جو سفیان ثوریؒ کے اُستاد ہیں۔

ک۔یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں کہ ہم ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں بیٹھے اور اُن سے سنے اور لکھے ہیں جب میں اُن کی طرف دیکھتا تو اُن کے چہرہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ خدا کا اُن کو بہت خوف ہے۔

ک ص۔ حارث بن عمیر کہتے ہیں جب ابو حنیفہؒ مکہ معظّمہ کو جاتے تو ابن جریج اور عبد العزیز ابن رواد اُن کے ساتھ بیٹھے اور ابن جریج اُن کی نہایت مدح کرتے اور عبدالمجید بن عبدالعزیز ابن رواد سے روایت ہے کہ جب ابوحنیفہؒ مکہ معظّمہ کو آتے تو میرے والد ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتے اور تمام کاموں میں اُن کی اقتداء کرتے اور جب کوئی مسئلہ اُن پر مشتبہ ہوتا تو اُن سے لکھ کر پوچھتے۔

م ص ک۔ ابوسعد صاغانی کہتے ہیں کہ حسن بن عمارہ امام صاحب کے حلقہ میں اکثر بیٹھتے اور اثنائے تحقیق مسائل میں احادیث پیش کرتے تھے چنانچہ اکثر روایتیں جو ہم اُن سے کرتے ہیں وہی ہیں جن کو امام صاحب کے حلقہ میں ہم نے اُن سے سنا ہے۔ اور امام صاحب کے کہنے سے لکھ لیا ہے۔

ک۔ توبہ ابن سعد امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھا کرتے اور اُن کے علم سے استفادہ حاصل کرتے اور قضاء میں اُن کے قول کے خلاف نہ کرتے۔ اور کہا کرتے تھے کہ وہ میرے اور میرے رب کے درمیان ہیں۔ یعنی میں اُن کی پیروی کرتا ہوں اس وجہ سے کہ وہ اُن خصال کے جامع ہیں، جن کے باعث اقتداء صحیح ہے۔ یعنی فقاہت، ورع، تقویٰ اور اصول کی معرفت ان تمام امور میں وہ ضرب المثل تھے۔

کردری نے لکھا ہے کہ توبہ اہل مرو کے امام دین کے معاملہ میں سخت تھے چنانچہ ابن مبارکؒ نے اُن کی نسبت کہا ہے کہ وہ مومن قوی القلب تھے اور نضر ابن زیاد کہتے ہیں کہ ایک بار امام مالکؒ کے پاس میں بیٹھا تھا توبہ ابن سعد کا ذکر آیا انہوں نے فرمایا کہ مجھے آرزو آتی ہے کہ اُن کے جیسا ایک شخص ہمارے یہاں ہوتا۔ دیکھئے ایسے اشخاص کا ملازم حلقہ رہنا اور یہ کہنا کہ ابوحنیفہؒ میرے اور خدا کے درمیان ہیں۔ کوئی معمولی بات نہیں۔

ک۔ نوح ابن مریم کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کی صحبت اور حلقہ میں رہا ہوں اُن کے بعد

اُن کا مثل نہیں دیکھا۔

م ص ک۔ وزیرابن عبداللہ کہتے ہیں کہ مکہ معظّمہ میں ایک کثیر جماعت یاسین بن معاذ زیّاتؒ کے پاس تھی۔انہوں نے نہایت بلند آواز سے جس طرح اذان کہی جاتی ہے پکار کے کہا اے لوگوابوحنیفہ کوغنیمت سمجھواوراُن کے حلقہ کوغنیمت جانو اُن سے علم حاصل کرواُن کے جیسے عالم کے ساتھ بیٹھنا تمہیں نصیب نہیں ہوا۔اور نہ تم اُن سے زیادہ حلال وحرام جاننے والے کو پاؤ گے۔یادرہے کہ اگرتم اُس کوکھودوگےتوعلم کثیرتم سےفوت ہوجائیگا۔

یاسین زیات بڑے نامی فقیہ تھے جیسا کہ ذہبیؒ نے میزان میں لکھا ہے کہ وہ کبار فقہائے کوفہ سے تھےاور مفتی کوفہ بھی تھے۔جب ایسے شخص مکہ معظّمہ جیسے شہر میں جہاں روے زمین کے مسلمانوں کا مجمع ہرسال ہوا کرتا ہے امام صاحب کے فضائل اوراُن کے حلقہ کےفوائدکی منادی کرتے ہوں تو خیال کیا جائے کہ کس قدر علماء دور دراز سے اُس متبرک حلقہ میں شریک ہوتے ہوں گے۔

ک م ص۔ابراہیم ابن فیروزا اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کودیکھا کہ مسجد میں بیٹھے ہیں اوراہل مشرق ومغرب کا ہجوم ہے وہ مسائل پوچھتے جاتے ہیں اورآپ جواب دیئے جاتے ہیں اور پوچھنے والے معمولی لوگ نہیں بلکہ فقہاءاورخیارالناس تھے۔

اگرچہ فتویٰ طلب کرنے والےعوام الناس بھی ہوں گےمگراس میں شبہ نہیں کہ محدثین کو بھی اُس کی سخت ضرورت تھی کیونکہ اختلاف احادیث وآثار جس مسئلہ میں ہوتا ہے مفتی کو یہ قول معلوم نہ ہوتو اہل علم کوسخت پریشانی ہوتی ہے۔اورامام صاحب کی تحقیق شہرۂ آفاق ہوگئی تھی۔اس لئے ہر ملک کے اہل حدیث کا مجمع امام صاحب کے یہاں رہا کرتا تھا۔

ک۔ابونعیم کہتے ہیں کہ لوگ طوعاً وکرہاً امام صاحب کے منقاد ہوئے جاتے تھے آپ کے یہاں جوہجوم رہتا تھا دن بھراوررات کے کچھ حصہ میں منقطع نہیں ہوتا تھا خواہ آپ مسجد

میں ہوں یا مکان میں۔

م ص ک۔ خالد بن صبح کہتے ہیں کہ ایک رات امام صاحب عشاء کی نماز پڑھ کر جا رہے تھے کہ زفرؒ نے کوئی مسئلہ پوچھا امام صاحب نے جواب دیا مگر اُن کو تسکین نہ ہوئی اور صبح تک مناظرہ ہوتا رہا پھر نماز صبح کے بعد بھی گفتگو رہی یہاں تک کہ زفرؒ کو تسکین ہوئی۔

چونکہ دینی مسئلہ کی تحقیق کی فضیلت اور ثواب بھی نوافل کے ثواب سے کم نہیں اس لئے امام صاحب نے اُس رات خدمت علمی کو تہجد پر ترجیح دی شاید یہاں یہ نکتہ چینی کی جائیگی۔ کہ دوسری روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ چالیس سال تک امام صاحب نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی یعنی رات بھر تہجد پڑھا کرتے تھے اور اس روایت میں ہیکہ اُس رات نماز تہجد بھی نہیں پڑھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے ناغے اُس روایت کے منافی نہیں ممکن ہے کہ بیماری وغیرہ میں اور بھی ناغے ہوئے ہوں مقصود اُس روایت سے یہ ہے کہ اُس مدت میں بلا وجہ کبھی آپ نے ناغہ نہیں کیا۔

م ص۔ مسعرؒ کہتے ہیں کہ امام صاحب کے حلقہ میں لوگوں کا ایک ہجوم اور ہنگامہ رہتا تھا کہ کوئی سوال کر رہا ہے اور کوئی مناظرہ کر رہا ہے مگر اس گڑبڑ میں امام صاحب جب تقریر کرتے تو سب ساکت ہو جاتے لکھا ہے کہ اُس وقت مسعرؒ کہا کرتے کہ اتنے بلند آوازوں کو جس شخص کی تقریر سے اللہ تعالیٰ ساکت کر دیتا ہے وہ اسلام میں ایک عظیم الشان شخص ہے۔

ک۔ شقیق بلخیؒ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھے تھے اور مسجد لوگوں سے بھری ہوئی تھی کہ یکا یک مسجد کے سقف سے ایک سانپ امام صاحب کے سر کے محاذی نظر آیا یہ دیکھتے ہی لوگ بھاگے اور میں بھی اُن کے ساتھ بھاگا مگر امام صاحب کو جنبش نہ ہوئی یہاں تک کہ وہ سانپ امام صاحب کے گود میں گرا آپ نے اُس کو ہاتھ سے جھٹک دیا اور اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کی۔ اور یہی روایت مالک ابن دینارؒ سے بھی مروی ہے۔

امام صاحب کے حلقہ میں محدثین کے جمع ہونے پر قرائن

اس روایت سے بھی ظاہر ہے کہ مسجد امام صاحب کے حلقہ سے بھری رہا کرتی تھی ان شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ امام صاحب کا حلقہ طالبین کمال سے مالا مال رہتا تھا۔ اور تقریر بالا سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اکثر محدثین ہی کا مجمع اُس میں رہا کرتا تھا اس کا ثبوت کئی دلائل وقرائن سے ہوسکتا ہے جن میں سے چند یہاں لکھے جاتے ہیں۔

متعدد روایتوں سے ثابت ہے کہ اکابر دین جیسے مسعرؒ، عبداللہ ابن مبارکؒ، یحییٰ ابن معین، مکی ابن ابراہیم، مقاتل ابن حیان فضل ابن موسیٰ جریر ابن حازم، جریر ابن عبدالحمید، قاسم بن معن، ابو یوسف، محمد ابن حسن زفر، داؤد طائی، شقیق بلخی، مالک ابن دینار وغیرہم رحمہم اللہ بغرض استفادہ امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے اور جہاں یہ حلقہ ہوتا تھا کوئی تنہائی کا مقام نہ تھا بلکہ اکثر مسجد میں نشست تھی جہاں اہل شہر اور مسافرین اور ان میں بھی خاص کر ذی علم لوگ بے روک ٹوک چلے جاتے ہیں۔ پھر مسجد بھی کس شہر کی جس میں محدثین کا آنا ضروریات سے تھا۔ چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ دوسرے شہروں میں، میں ایک ایک دو دو بار گیا اور کوفہ کو محدثین کے ساتھ اتنے بار گیا کہ اُس کا شمار نہیں۔ اگر اوروں کو امام بخاریؒ کا سا شوق نہ بھی ہو تو کم از کم ایک دو بار تو جانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ پھر یہ حلقہ نشین حضرات ایسے نہ تھے کہ طالبین فن حدیث پر مخفی رہیں۔ خزانۂ حدیث کا ایک بڑا حصہ انہی حضرات کے یہاں تھا جس کی طلب میں محدثین کوفہ جاتے تھے اب غور کیجئے کہ جوق جوق بلاد اسلامیہ کے محدثین جب کوفہ میں آتے اور اُس حلقۂ متبرکہ کی کیفیت بچشم خود دیکھ لیتے ہوں گے کہ اکابر دین زانوئے ادب تہ کئے سر جھکائے امام صاحب کے روبرو بیٹھے ہیں اور امام صاحب کی پرُ زور تقریر دریا کی طرح امنڈ رہی ہے۔ اور موافق ومخالف کو مجال نہیں کہ دم مار سکے تو کیا یہ

کوئی معمولی بات ہے ہاں تو اس قدر سمجھتے ہوں گے کہ ایک استاد صاحب شاگردوں کو پڑھا رہے ہیں مگر اہل علم کے نزدیک یہ ایسی حیرت انگیز اور تعجب خیز بات تھی کہ دنیا میں اُس کی نظیر نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ ایسی حیرت انگیز بات کو وہ بھول جائیں ہرگز نہیں جہاں جہاں کے محدثین آ کر یہ واقعہ دیکھتے تھے اپنے اپنے احباب اور ملاقاتیوں کے روبرو منجملہ اور اور عجائبات کے اُس کو زیادہ تر ضروری الذکر سمجھ کر بیان کرتے تھے اس وجہ سے چند ہی روز میں یہ خبر تمامی اسلامی ممالک میں حد تواتر کو پہنچ گئی تھی۔

اب غور کیجئے کہ اس متواتر خبر کو سنکر اُس زمانہ میں جو اہل اسلام کی ہمتیں تکمیل علوم کی طرف عموماً متوجہ تھیں کیا طالبین کمال محدثین کو اس متبرک حلقہ کے دیکھنے اور اُس سے مستفید ہونے کا شوق نہ ہوتا ہوگا عقل سلیم گواہی دیتی ہے کہ یہ خبر متواتر اُن کو کشاں کشاں اس حلقہ کی طرف ضرور لاتی تھی۔ پھر علاوہ اس خبر متواتر کے ہر ملک و دیار کے محدثین نے جو امام صاحب کی تعریفیں کیں وہ حد سے زیادہ ہیں۔ اس وقت امام صاحب کے مناقب کی جو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں حالانکہ بہت تھوڑی ہیں۔ باوجود اس کے جن محدثین نے آپ کی تعریفیں کیں اور اپنے چشم دید واقعے بیان کئے اس کثرت سے ان میں مذکور ہیں کہ ہم بالاستیعاب اُن کو نہ لکھ سکے۔ اگرچہ جس قدر لکھے گئے ہیں وہ بھی اتنے ہیں کہ بے تعصب منصف مزاج کے اطمینان کے لئے کافی ووافی ہوسکیں مگر قابل غور یہ بات ہے کہ جو کتابیں ہم تک نہیں پہونچیں وہ کتنی ہوں گی اور اُن میں کتنے محدثین سے امام صاحب کے فضائل مروی ہوں گے۔

الحاصل اکابر محدثین نے امام صاحب کی نسبت جو فرمایا ہے جس کو آپ نے بھی دیکھ لیا کہ ہم لوگ عطار ہیں اور آپ طبیب حاذق۔ آپ کا سا دقیقہ شناس عالم عاقل ذکی ذی فہم صاحب حافظہ دنیا میں نہیں۔ آپ کا مثل اور تو کیا طبقۂ تابعین میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ آپ

کا مثل بہت تلاش کیا مگر نہ ملا۔ آپ اعلم الناس اور افقہ الناس اور اورع الناس ہیں کوئی عالم آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جس نے آپ سے مباحثہ کیا وہ مغلوب اور ذلیل ہوا۔ متفرق علماء کے پاس جس قدر علم ہے وہ سب آپ کے پاس جمع ہے۔ صحابہ میں جو علم تقسیم ہوا تھا وہ سب آپ کے یہاں ہے۔ زمانہ کے لوگ جس علم کی طرف محتاج ہیں وہ آپ خوب جانتے ہیں اور جو علم آپ نہیں جانتے وہ وبال جان ہے۔ آپ نے علم کی جو تفسیر کی ہے وہ کسی سے نہ ہوسکی۔ مشکل مشکل حدیثوں کو جس طرح آپ نے حل کیا کوئی نہ کرسکا۔ تمام علماء تفسیر احادیث میں آپ کے محتاج ہیں۔ آپ فقہ وفتوی میں **مؤید من اللہ** ہیں۔ سید الفقہاء ہیں۔ جو شخص آپ کے حلقہ میں نہ بیٹھا وہ مفلس اور محروم رہ گیا وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کی شہرت سے مستند اور متدین محدثین کے نزدیک آپ ایسے نیک نام تھے کہ احادیث موضوعہ کو رواج دینے والے کہا کرتے تھے کہ یہ روایت ابوحنیفہ سے ہمیں پہونچی ہے تاکہ کوئی چوں و چرا نہ کرسکے۔ چنانچہ میزان الاعتدال میں آبا ابن جعفر کے ترجمہ میں ابن حبان کا قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اُس کی عادت تھی کہ مسجد جامع میں صباحؒ کے مقابل بیٹھ کر حدیثیں بیان کرتا ایک روز میں اُس کا سرمایۂ حدیث معلوم کرنے کی غرض سے اُس کے گھر گیا۔ اُس نے حدیثوں کا ایک ذخیرہ پیش کیا اُس میں دیکھا کہ تین سو سے زیادہ حدیثیں ابوحنیفہؒ سے مروی ہیں۔ حالانکہ ابوحنیفہ نے وہ روایتیں کبھی نہیں کیں میں نے کہا اے شیخ خدا سے ڈر جھوٹ مت کہہ اس پر وہ بہت برہم ہوا آخر میں اٹھ کر چلا آیا اور اُسی میں احمد بن یعقوب کے ترجمہ میں حاکم کا قول نقل کیا ہے کہ وہ حدیثیں بنا کر لوگوں میں روایت کرتا کہ یہ روایتیں مجھے ابو حنیفہ سے پہونچی ہیں غرضکہ امام صاحب محدثین میں مشہور ومعروف اور مستند تھے۔ ایسے شخص کی نسبت اساتذۂ اہل حدیث کی چشم دید مذکورۂ بالا شہادتیں جب شہرۂ آفاق ہوئی ہوں گی تو عقل سلیم ہرگز قبول نہیں کرتی کہ ان کا اثر کچھ نہ ہوا ہو۔ یہ بات دوسری ہے کہ بعض

طالب علم دقیق مضامین سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے اُس حلقہ میں ٹھہر نہیں سکتے تھے۔اُن سے ہمیں بحث نہیں۔کلام ہمارا اُن محدثین میں ہے جو مستقل مزاج ، ذکی ،حق پسند وحق طلب تھے جن کو دقائق حدیث سمجھنے اور احادیث کے اشکال حل کرنے کی ضرورت کا احساس تھا۔وہ تو امام صاحب کے حلقہ میں ضرور شریک ہوتے اور حاسدین کے اقوال کو لغو سمجھ لیتے تھے۔ دیکھ لیجئے عبداللہ ابن مبارکؒ کو ان لوگوں نے کس طرح بہکانا چاہا تھا مگر انہوں نے ایک کی نہ سنی اور اُس متبرک حلقہ میں پہونچ ہی گئے۔اور امام صاحب کے فیضان صحبت کو دیکھ کر صاف کہدیا کہ اگر اُن سفہاء کی باتوں کا میں یقین کر لیتا تو مفلس اور محروم رہ جاتا اور بازاری جاہل و بدعتی ہو جاتا اور طلب حدیث میں جس قدر محنت کی تھی اور مال صرف کیا تھا سب ضائع ہو جاتا''۔اس میں شک نہیں کہ حُساد اور غبی طلبہ امام صاحب کے حلقہ کے دشمن تھے اور اقسام کے افترا پردازیاں کر کے وہاں جانے سے لوگوں کو روکتے تھے مگر مستقل مزاج اور طالبین کمال اکابر محدثین کی شہادتوں کے مقابلہ میں اُن کے قول کو لغو سمجھ کر نفس الامر کی تحقیق کے لئے ضرور حلقہ میں جاتے پھر پہلے پہل جب اُن کی نظر امام صاحب کے چہرہ پر پڑتی تو آپ کے تقویٰ اور خوف وخشیت الٰہی پر خود اُن کے دل گواہی دیتے جس سے طالبین حق اور خالصاً لوجہ اللہ تکمیل علم کرنے والوں کو یقین ہو جاتا کہ ممکن نہیں کہ ایسے متقی با خدا شخص دین میں کوئی بات خلاف مرضیٔ خدا ورسول احداث کریں۔پھر جب تقریر سنتے تو نور علی نور کا مضمون صادق آجاتا اور اگر ابتداء میں بعض غوامض تقریر سمجھ میں نہ آتی تو خیال کر لیتے کہ رفتہ رفتہ اُن کے سمجھنے کی بھی استعداد ہو جائیگی۔جیسا کہ عبداللہ ابن مبارکؒ نے کہا اور جن طبیعتوں میں چنداں خوف خدا یا استقلال یا دقیق ولطیف مضامین سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی وہ عدم مناسبت طبعی کی وجہ سے حلقہ سے خارج ہو کر حاسدوں اور غبی طلبہ کی جماعت کو قوت دیتے جس سے بھولے بھالے محدثین اُس متبرک حلقہ میں جانے کو بھی بُرا

سمجھتے اور صرف سنی سنائی باتوں پر امام صاحب سے مخالفت رکھتے تھے۔ الحاصل تمام ممالک اسلامیہ کے منتخب حق پسند محدثین جن کی طبیعتوں میں استقلال اور مزاجوں میں تدین اور اذہان میں صفائی اور افہام میں رسائی تھی وہ امام صاحب کے حلقہ میں ضرور شریک ہوکر تحقیق مسائل کے وقت اپنا علمی سرمایہ جو شہر بہ شہر اور قریہ بقریہ پھر کر جمع کیا تھا پیش کیا کرتے جس کا حال انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا۔

صرف محدثین' امام صاحب کی شاگردی قبول کرتے تھے

یوں تو امام صاحب کے حلقہ میں مسئلے پوچھنے کے لئے جہلاء اور شبہات رفع کرنے کے لئے طلبہ بھی آتے تھے مگر وہ ارکان حلقہ اور شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے۔ ارکان حلقہ وہ حضرات تھے جو تحصیل حدیث سے فراغت پاکر تفقہ حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ دیکھئے امام ابو یوسف اور امام محمدؒ حالانکہ امام صاحب کے اعلیٰ درجہ کے شاگرد ہیں مگر انہوں نے بھی حدیث امام صاحب سے نہیں پڑھی جیسا کہ کردریؒ نے مناقب میں لکھا ہیکہ امام ابو یوسفؒ نے تحصیل حدیث ابواسحٰق' وسلیمان، اعمش' ہشام ابن عروہ وعبداللہ بن عمر العمری و حنظلہ ابن ابی سفیان وعطاء ابن السائب اورلیث ابن سعد وغیرہ رحمہم اللہ سے کی ہے اور لکھا ہے کہ امام محمدؒ نے مسعر بن کدام اور ثوری اور عمرو ابن دینار اور امام مالک اور ابی عمر اوزاعی اور زمعہ بن صالح اور بکر وغیرہ رحمہم اللہ سے تحصیل حدیث کی ہے اور وکیعؒ کا قول نقل کیا ہے کہ تحصیل حدیث کے زمانہ میں ہم اُن کے ساتھ چلنے کو پسند نہیں کرتے تھے اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوبصورت لڑکے تھے غرضکہ حدیث کی تحصیل انہوں نے امام صاحب سے نہیں کی۔

م۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ ہم جھوٹ کبھی نہ کہیں گے فقہ میں ہمارے امام ابوحنیفہ ہیں اور حدیث میں سفیان''۔ اس سے ظاہر ہے کہ حدیث انہوں نے باہر پڑھی۔

م ص۔فضل ابن جعفر کہتے ہیں کہ روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے بہت کم سنا ہے اور جس قدر سنا ہے وہ میرے نزدیک بہت سارے مسموعات ومرویات سے زیادہ تر محبوب ہے کسی نے پوچھا پھر آپ اُن کے حلقہ میں زیادہ کیوں نہیں بیٹھتے کہا میں نے پہلے شعبہؒ کے حلقہ کا التزام کیا اُس کے بعد ابن جریج کے یہاں گیا اور میری رائے یہ تھی کہ آخر میں کوفہ کا طریقہ اختیار کروں اور ابوحنیفہ کے حلقہ میں بیٹھوں مگر ابن جریج ہی کے یہاں اُن کے انتقال کی خبر آئی۔یعنی اُن کا ارادہ یہ تھا کہ ان اکابر محدثین کے یہاں تحصیل حدیث کر کے امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھنے کی صلاحیت پیدا کریں اس سے ظاہر ہے کہ بعد تحصیل حدیث امام صاحب کے حلقہ میں جایا کرتے تھے۔

الحاصل تقریر بالا سے واضح ہے کہ اُس زمانہ کے تقریباً تمام منصف مزاج محدثین امام صاحب کے حلقہ میں منسلک تھے۔مگر چونکہ تمام بلاد اسلامیہ کے محدثین کی فہرست لکھنا کوئی آسان کام نہیں اور نہ امام صاحب کی طبیعت میں تعلّی تھی کہ افتخار کی غرض سے ایک رجسٹر بناتے جس میں وقتاً فوقتاً جو لوگ شریک حلقہ ہوتے اُن کے نام لکھدئے جاتے اس لئے کل تلامذہ کی فہرست نہ مل سکی۔چنانچہ خیرات الحسان میں لکھا ہے کہ امام صاحب سے جن لوگوں نے حدیث وفقہ لی ہے اُن کا استعاب متعذر ہے اور ضبط ممکن نہیں۔اس وجہ سے بعض ائمہ حدیث نے کہا ہے کہ جس قدر امام صاحب کے اصحاب اور تلامذہ تھے کسی امام کو اُتنے نصیب نہ ہوئے مگر سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ حافظ ابوالمحاسن شافعی نے نوسواٹھارہ شخصوں کے نام بقید نسب لکھے ہیں جو امام صاحب کے حلقۂ درس میں مستفید ہوئے۔غالبًا یہ تعداد مشہور محدثین کی ہوگی یا اُن محدثین کی ہوگی جو اکثر ملازم حلقہ رہا کرتے تھے۔اور اس کا ثبوت رد المحتار سے بھی ملتا ہے۔چنانچہ اُس میں بحوالۂ طحطاویؒ لکھا ہے کہ فقہ کے جمع کرتے وقت ایک ہزار عالم امام صاحب کے ساتھ تھے جس میں چالیس شخص درجہ اجتہاد کو پہونچے ہوئے

تھے۔ اتنے علما میں ہر مسئلہ میں تحقیق ہوتی اور سب کے اتفاق سے جب طے ہوتا تو اُس وقت کتاب میں لکھا جاتا تھا۔

اسماءِ تلامذۂ امام صاحب

اب ہم چند اکابر محدثین کے نام تبرکاً لکھتے ہیں جو تحصیل فقہ کی غرض سے امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھتے اور اپنا اندوختہ سرمایۂ حدیث بحسب ضرورت پیش کرتے تھے اور امام صاحب کی تقریر اور طریقہ اجتہاد میں غور کرتے جاتے تھے کہ جن احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے کس طرح اٹھایا جاتا ہے اور بعض احادیث کے ظاہری معنی سے عدول کن ضرورتوں سے کیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن مبارکؒ

تہذیب التہذیب میں ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابن مبارکؒ ان حضرات کے شاگرد ہیں سلیمان تیمی بصری، حمید الطّویل بصری، اسمٰعیل ابن ابی خالد کوفی، یحییٰ ابن سعید الانصاری بخاری مدنی، سعد ابن سعید الانصاری مدنی، ابراہیم ابن ابی عبلہ مقدسی، ابی خلدہ خالد ابن دینار بصری، عاصم الاحول بصری، ابن عون بصری، عبداللہ ابن عمر مدنی، عکرمہ ابن عمار یمامی، عیسیٰ ابن طہمان البصری ثم الکوفی، فطر ابن خلیفہ کوفی، محمد ابن عجلان مدنی، موسی ابن عقبہ مدنی، ابراہیم بن عقبہ مدنی، اعمش کوفی، ہشام ابن عروہ مدنی، ثوری کوفی، شعبہ واسطی، اوزاعی دمشقی، ابن جریج مکی، مالک مدنی، لیث مصری، ابی ابن ذئب مدنی، ابراہیم بن طہمان نیشاپوری، ابراہیم بن نشیط مروزی، ابی بردہ برید بن عبداللہ بن ابی بردہ کوفی، حسین المعلم بصری، حیوۃ بن شریح مصری، خالد بن سعید الاموی، خالد عبدالرحمٰن بن بکر السلمی بصری، زکریا بن اسحاق مکی، زکریا بن ابی زائدہ کوفی، سعید بن ابی عروہ بصری، سعید بن ابی

ایوب مصری' ابی شجاع سعید بن یزید القتبانی اسکندرانی' سعید بن ایاس الجریری' سلام بن ابی مطیع بصری' صالح بن صالح بن حی کوفی' طلحہ بن ابی سعید مصری' عبدالملک بن ابی سلیمان کوفی ' عمر بن ذر کوفی' عمر بن سعید بن ابی حسین مکی، محمد بن عمر بن فروخ' عمرو بن میمون بن مہران کوفی' عوف الاعرابی' محمد بن ابی حفصہ بصری' معمر بن راشد بصری' ہشام بن حسان بصری، وہیب بن الورد مکی' یونس بن یزید الایلی' ابی بکر بن عثمان بن سہل بن حنیف مدنی وخلق کثیر اُس کے بعد اُن کے شاگردوں کی یہ فہرست لکھی۔ ثوری معمر بن راشد' ابواسحاق الفرازی' جعفر بن سلیمان الضبعی' بقیۃ بن الولید' داؤد بن عبدالرحمٰن العطار' ابن عیینہ' ابوالاحوص' فضیل بن عیاض، معمر بن سلیمان' ولید بن مسلم، ابوبکر بن عیاش وغیرہم یہ وہ حضرات ہیں جو اُن کے شیوخ اور اقران ہیں۔ اور مسلم بن ابراہیم' ابواسامہ' ابوسلمہ التھوذکی، نعیم بن حماد' ابن مہدی قطان اسحاق بن راہویہ' یحییٰ بن معین' ابراہیم بن اسحاق الطالقانی' احمد بن محمد مردویہ' اسماعیل بن ابان الوراق' بشیر بن محمد السختیانی' حیان بن موسیٰ' حکم بن موسیٰ' زکریا بن عدی، سعید بن سلیمان، عمرو الاشعثی' سفیان بن عبدالملک المروزی' سلمہ بن سلیمان المروزی' سلیمان بن صالح سلمویہ' عبداللہ بن عثمان عبدان' ابوبکر وعثمان بیٹے ابی شیبہ کے عبداللہ بن عمر بن ابان الجعفی، علی بن الحسن بن شقیق، عمرو بن عون' علی بن حجر محمد بن الصلت الاسدی' محمد بن عبدالرحمٰن بن سہم الانطاکی' ابوکریب' ابوبکر بن احرم' منصور بن ابی مزاحم' محمد بن مقاتل المروزی' یحییٰ بن ایوب المقابری' سعید بن نصر اور خلق کثیر اور اُسی میں ابن مہدی کا قول نقل کیا ہے کہ ائمہ چار ہیں۔ ثوری' مالک حماد ابن زید اور ابن مبارک' اور شعیب کا قول ہے کہ جس سے ابن مبارک نے ملاقات کی وہ اُس سے افضل تھے یعنی کل ملاقاتی محدثین سے۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ اُن کے زمانہ میں اُن سے زیادہ علم طلب کرنے والا کوئی شخص نہ تھا اور ابواسامہ نے بھی یہی کہا ہے۔ فضیل بن عیاضؒ نے اُن کے انتقال کے بعد کہا کہ انہوں نے

اپنا مثل نہیں چھوڑا۔ابواسحاق فزاری کا قول ہے کہ ابن مبارک امام المسلمین ہیں۔ایک جگہ اکابر محدثین کا مجمع تھا سب نے کہا کہ ابن مبارکؒ میں کیا کیا فضائل اور ابواب خیر جمع تھے گننا چاہئے۔چنانچہ یہ امور بالاتفاق بیان کئے گئے۔علم حدیث' فقہ' ادب' نحو' لغت' شعر' فصاحت' زہد' ورع' خاموشی' قیام لیل' عبادت' حج' جہاد' گھوڑے کی سواری' قوت جسمانی' لایعنی باتوں کا ترک' قلت مخالفت ابن معین کا قول ہے کہ جن کتابوں سے انہوں نے حدیث بیان کیا۔بیس یا اکیس ہزار تھیں۔اسماعیل بن عیاش کا قول ہے کہ روئے زمین پر ابن مبارکؒ جیسا کوئی شخص نہیں اور کوئی خصلت خیر ایسی نہیں جو اُن میں نہ تھی۔ابن سعد کہتے ہیں کہ بہت سی کتابیں ابواب علم میں انہوں نے تصنیف کیں۔حسن بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ وہ مجاب الدعوۃ تھے۔ابو وہب کہتے ہیں کہ ابن مبارکؒ کا کسی نابینا پر گذر ہوا اُس نے درخواست کی کہ میرے لئے دعا کریں میں دیکھ رہا تھا کہ ادھر انہوں نے دعا کی اور ادھر اُس کی آنکھوں میں بصارت آ گئی۔یحییٰ بن یحییٰ اندلسی کہتے ہیں کہ ایک بار ہم امام مالکؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابن مبارک آئے امام نے ہٹ کر اُن کو اپنے نزدیک جگہ دی۔ایک شخص حدیث کی قرأت کر رہا تھا بعض بعض مقامات میں امام اُن سے پوچھتے تھے کہ اس باب میں تمہارے پاس کیا ہے وہ دبی آواز سے جواب دیتے تھے بعد برخواست امام مالکؒ نے اُن کے ادب پر تعجب کیا اور فرمایا کہ یہ ابن مبارک فقیہ خراسان ہیں۔خلیلیؒ نے ارشاد میں کہا ہے کہ ابن مبارک متفق علیہ امام ہیں۔اور اُن کی کرامتیں بے شمار ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال سے تھے۔حسن بن عرفہ کہتے ہیں کہ شام میں انہوں نے کسی سے ایک قلم مستعار لیا تھا۔خراسان پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھولے سے ساتھ آ گیا ہے تو صرف اُس کو واپس کرنے کے لئے خراسان سے شام کو تشریف لے گئے۔اور اُس بار امانت سے سبکدوش ہوئے۔امام نسائی کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ ابن مبارکؒ کے زمانہ میں کوئی شخص اُن

سے زیادہ بزرگ اور اعلیٰ درجہ والا اور جمیع خصائل حمیدہ کا جامع موجود تھا۔
سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ محدث نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں اُن کا ذکر ان لفظوں سے کیا ہے وہ امام جس کی امامت وجلالت پر ہر باب میں عموماً اجماع کیا گیا ہے ۔جس کے ذکر سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔جس کی محبت سے مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے۔اور تاریخ ابن خلکان سے اُسی میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید رقہ گیا۔اُسی زمانہ میں عبداللہ بن مبارک بھی رقہ پہونچے۔اُن کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ہر طرف سے لوگ دوڑے اور اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں ہزاروں آدمی ساتھ ہوئے اور ہر طرف گرد چھا گئی۔ہارون الرشید کی ایک حرم نے جو برج کے غرفہ سے تماشا دیکھ رہی تھی حیرت زدہ ہوکر پوچھا کہ یہ کیا حال ہے۔لوگوں نے کہا خراسان کا عالم آیا ہے جس کا نام عبداللہ بن المبارک ہے۔بولی کہ حقیقت میں سلطنت اِس کا نام ہے۔ہارون الرشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں ہوسکتا انتہی۔
امام احمدؒ وغیرہ کی تصریحات کے قرائن سے ظاہر ہے کہ عبداللہ بن مبارک امام وقت اور افضل المحدثین اور تقریباً کل حدیثیں اُن کو ازبر تھیں۔دیکھئے اس تبحر پر اس بات کے قائل تھے کہ ہر محدث امام صاحب کے علوم کی طرف محتاج ہے بلکہ تابعین بھی ہوتے تو اُن کی طرف محتاج ہوتے اور عملی طور پر اس مضمون کو محدثین کے ذہن نشین کردیا کہ بعد تکمیل حدیث عمر بھر امام صاحب ہی کی خدمت میں رہے۔جیسا کہ بستان المحدثین وغیرہ سے ظاہر ہے اور امام صاحب کے انتقال کا بڑا ہی صدمہ اُن پر ہوا۔چنانچہ قبر پر جاکر زار زار روتے اور کہتے کہ خدا آپ پر رحمت نازل کرے۔ابراہیم نخعی اور حماد ابن سلیمان نے مرتے وقت اپنا خلف چھوڑا تھا اور آپ نے اپنا خلف نہیں چھوڑا یعنی دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں جو

آپ کا قائم مقام ہو سکے۔

مسعر بن کدامؒ۔تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ذکر ان لفظوں میں کیا۔ **الامام الحافظ احد الاعلام** اور لکھا ہے کہ انہوں نے علی ابن ثابت وحکم ابن عیینہ وقتادہ وعمرو بن مرہ اور اُن کے طبقہ سے روایت کی ہے اور اُن سے سفیان وابن عیینہ و یحیٰ قطان ومحمد ابن بشر و یحیٰ ابن آدم وابونعیم وخلاد ابن یحیٰ اور خلق کثیر نے روایت کی ہے یحیٰ ابن قطان کہتے ہیں کہ اُن سے اثبت میں نے نہیں دیکھا۔امام احمدؒ نے ثقہ کی مثال دی ہے کہ جیسے شعبہ اور مسعر ۔ وکیعؒ کہتے ہیں کہ مسعر کا شک اوروں کے یقین کے برابر ہے۔ابن عیینہ کہتے ہیں کہ اعمشؒ سے لوگوں نے کہا کہ مسعر نے حدیث میں شک کیا ہے۔انہوں نے کہا اُن کا شک بھی دوسروں کے یقین کے برابر ہے ۔شعبہ کہتے کہ مسعر کا نام اُن کے اتقان کی وجہ سے ہم لوگوں نے مصحف رکھا تھا۔ابوجعفر منصور نے اُن کو والی بنانا چاہا مگر انہوں نے لطائف الحیل سے ٹال دیا اُن کا قول ہے کہ جو شخص سر کہ اور بقول پر صبر کرے وہ کسی کا غلام نہ بنے گا۔حکومت وغیرہ تعلقات دنیوی کو وہ غلامی سمجھتے تھے اسی وجہ سے آزاد رہے ایسے جلیل القدر محدث امام کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کو جب دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے اور حلقہ میں آپ کے روبرو بیٹھتے ۔اور مثل شاگردوں کے سوالات کرتے ۔حالانکہ آپ امام صاحب کے استاد بھی تھے جیسا کہ امام موفق اور سبط ابن جوزیؒ نے لکھا ہے۔کما مر

وکیع ابن الجراح۔تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ”**الامام الحافظ الثبت محدث العراق** “اور لکھا ہے کہ انہوں نے ہشام ابن عروہ اور اعمش اور اسماعیل ابن ابی خالد اور ابن عون اور ابن جریج اور سفیان اور اودی اور خلائق سے روایت حدیث کی ہے اور امام احمد وغیرہ کے استاد ہیں۔امام احمد کہتے ہیں کہ جامعیت علم اور حافظہ میں اُن سے بڑھا ہوا شخص میں نے نہیں دیکھا۔ یحیٰ کہتے ہیں کہ اُن سے افضل میں

نے نہیں دیکھا۔ ابراہیم ابن شماس کا قول ہے کہ اگر میں کچھ تمنا کرتا تو ان امور کی کرتا۔ ابن مبارک کی عقل۔ وکیع کا حفظ عیسیٰ ابن یونس کا خشوع' مروان ابن محمد کہا کرتے تھے جس کی میں نے ثناء وصفت سنی جب دیکھا تو ویسا نہ پایا۔ البتہ وکیع کے جتنے اوصاف سنے اُس سے زیادہ پائے۔ ابن عمار کہتے ہیں کہ وکیع کے زمانہ میں اُن سے افقہ اور حدیث کو زیادہ جاننے والا کوفہ میں کوئی نہ تھا۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے وکیع کا مثل کبھی نہیں دیکھا جو حافظ حدیث ہو اور ورع اور اجتہاد کے ساتھ فقہ میں کلام کرے۔ حماد بن مسعدہ کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری کو بھی دیکھا ہے کہ مگر وہ وکیع کے مثل نہ تھے۔ سیرۃ النعمان میں **تهذیب الاسماء و اللغات** مولفۂ علامہ نوویؒ سے لکھا ہے کہ امام احمدؒ وکیع کی روایت سے کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان لفظوں سے شروع کرتے تھے۔ ''یہ حدیث مجھ سے اُس شخص نے روایت کی ہے کہ تیری آنکھوں نے اُس کا مثل نہیں دیکھا'' یحیٰ ابن معین جو فن رجال کے ایک رکن خیال کئے جاتے ہیں اُن کا قول ہے کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو وکیع پر ترجیح دوں خطیب بغدادی نے تاریخ میں لکھا ہے۔ **کان یفتی بقول ابی حنیفة و کان قد سمع منه شیئاً کثیراً** انتہی۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ اور الخیرات الحسان میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

مقری۔ تذکرۃ الحفاظ میں ان القاب سے اُن کے ترجمہ کی ابتداء کی ہے " **الامـــام المحدث شیخ الاسلام ابو عبدالرحمن** ''اور لکھا ہے کہ انہوں نے ابن عون اور ابو حنیفہ اور کہمس اور شعبہ اور عبدالرحمٰن افریقی اور سعید بن ابی ایوب وحرملہ ابن عمران و یحیی ابن ایوب اور اُن کے طبقہ سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے بخاری وغیرہ نے۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ ابو حاتم اور نسائی وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے اور ابن مبارکؒ سے

جب اُن کا حال پوچھا جاتا تو فرماتے ''زرزدہ'' یعنی زرخالص اور ابن سعد نے کہا ہے کہ اُن کو حدیثیں بہت یاد تھیں۔ تذکرۃ الحفاظ اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔ دیکھئے محدثین میں وہ امام اور شیخ الاسلام سمجھے جاتے تھے اور امام صاحب کے شاگرد تھے اور کمال جوش میں امام صاحب کو شاہ مرداں کہا کرتے تھے۔ کمامر۔

ابراہیم ابن طہمانؒ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو ان لفظوں سے ذکر کیا'' **الامام الحافظ ابو سعید عالم خراسان** ''۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ابواسحاق سبیعی اور ابواسحاق شیبانی اور عبدالعزیز ابن صہیب اور ابوحمزہ اور نصر ابن عمران ضبعی اور محمد ابن زیاد جمحی اور ابوالزبیر اور اعمش اور شعبہ اور سفیان اور حجاج ابن حجاج باہلی سے اور اُن کے سوا ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں اور ابن مبارک اور خود اُن کے استاد صفوان بن سلیم اُن سے روایت کرتے ہیں۔ عثمان ابن دارمی کہتے ہیں کہ ہمیشہ ائمۂ فن ان کی روایت کی خواہش اور رغبت کیا کرتے تھے۔ یحییٰ ابن اکثم کہتے ہیں کہ جن جن لوگوں نے خراسان اور عراق اور حجاز میں حدیث بیان کی ہے۔ اُن سب میں وہ اوثق اور علم میں اوسع تھے۔ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ امام احمدؒ ایک بار تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے کسی نے ابراہیم ابن طہمان کا ذکر کیا امام سیدھے ہو بیٹھے اور فرمایا کہ مناسب نہیں کہ صالحین کا ذکر ہو اور ہم تکیہ لگائے بیٹھیں۔ تذکرہ الحفاظ اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

غور کیجئے کہ جن کا نام سن کر ائمۂ حدیث اس قسم کا ادب کیا کرتے تھے تو جن کے روبرو خود وہ زانوے ادب تہ کئے ہوئے بیٹھتے تھے۔ ان کا کس قدر ادب چاہئے۔ مگر افسوس ہے کہ اِس زمانہ میں اُن کی توہین وتذلیل ضروری سمجھی جاتی ہے۔

یزید بن ہارون۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کیا'' **الحافظ القدوۃ شیخ الاسلام** '' اور لکھا ہے کہ انہوں نے عاصم احول و یحییٰ بن سعید و سلیمان التیمی

وجریری وداؤد ابن ابی ہند وابن عون اور خلق کثیر سے روایت کی ہے۔ اور اُن کے شاگرد امام احمد وغیرہ بکثرت ہیں۔ ابن مدینی کہتے ہیں کہ حفظ میں کسی کو اُن سے زیادہ میں نے نہیں دیکھا۔ یحییٰ ابن یحییٰ کہتے ہیں کہ وہ حافظہ میں وکیع سے بھی زیادہ تھے۔ عاصم ابن علی کہتے ہیں کہ وہ رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے چالیس سال سے زیادہ انہوں نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ ہشیم کہتے ہیں کہ اہل مصر میں اُن کا مثل نہیں۔ ابن اکثم کا بیان ہے کہ ایک بار مامون نے ہم لوگوں سے کہا کہ اگر یزید ابن ہارون کا خیال نہ ہوتا تو میں اپنے اس خیال کو ظاہر کرتا کہ ''قرآن مخلوق ہے'' کسی نے کہا کہ یزید ابن ہارون ایسے کون شخص ہیں جو اُن سے خوف کیا جاتا ہے کہا خوف یہ ہے کہ اگر میں وہ ظاہر کروں اور وہ رد کریں تو لوگ انہی کی پیروی کریں گے جس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ ایک مدت تک اس مسئلہ کو صرف اُن کے خوف سے ظاہر نہ کرسکا۔ یہ تھی اُن کی علمی سطوت کے خلیفۂ وقت اُن سے خائف وترساں تھا۔

سیرة النعمان میں ہے کہ علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات میں اُن کے تلامذہ کی نسبت لکھا ہے کہ اُن کا شمار نہیں ہوسکتا۔ یحییٰ ابن ابی طالب کا بیان ہے کہ ایک بار میں اُن کے حلقۂ درس میں شریک تھا لوگ تخمینہ کرتے تھے کہ حاضرین کی تعداد کم وبیش ستر ہزار تھی۔ کثرت حدیث میں لوگ اُن کی مثال دیا کرتے تھے۔

دیکھئے ایسے جلیل القدر مقتدائے محدثین شیخ الاسلام امام صاحب کے شاگرد تھے جیسا کہ تذکرة الحفاظ اور تبییض الصحیفة وغیرہ میں لکھا ہے اور امام صاحب کو اپنے کل اساتذہ پر ترجیح دیتے اور صاف کہا کرتے کہ اُن کا مثل بہت تلاش کیا گیا مگر نہ ملا کما مر۔

حفص ابن غیاث۔ تذکرة الحفاظ میں اُن کو الامام الحافظ لکھا ہے۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے دادا طلق ابن معاویہ اور اسماعیل ابن ابی خالد واشعث الحدانی

وابو مالک الاشجعی وسلیمان التیمی وعاصم الاحول وعبیداللہ ابن عمرؒ ومصعب ابن سلیمؒ ویحیٰی ابن سعید الانصاری وہشام ابن عروہ واعمش وثوری وجعفر صادق ویزید ابن عبداللہ وابن جریج و لیث ابن ابی سلیم اور خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرھم نے۔ اور اُن کے علم کا حال لکھا ہے کہ وکیع سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ اُن پر حوالہ دیتے۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ وہ ابن ادریس سے بھی زیادہ حدیث جانتے ہیں۔

کردریؒ نے اُن کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے امام صاحب سے اُن کی کتابیں اور آثار سنے ہیں۔

سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے اُن کو کثیر الحدیث لکھا ہے اور مختصر تاریخ بغداد میں اُن کی نسبت لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے وہ مشہور شاگردوں میں ہیں۔

ابو عاصم الضحاک النبیل ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ''الحافظ شیخ الاسلام'' تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے یزید ابن ابی عبید وایمن ابن نابل وشبیب ابن بشر وسلیمان التیمی وعثمان ابن سعد ومعروف ابن خربوذ وابن عون وابن عجلان وابن ابی ذئب وابن جریج واوزاعی وسعید ابن عبدالعزیز وثور ابن یزید الرجبی وجعفر ابن یحیٰی وحنظلہ ابن ابی سفیان وشریح ابن شریح وزکریا ابن اسحاق وثوری وشعبہ وسعید ابن ابی عروبہ وعبدالحمید ابن جعفر وعزرہ ابن ثابت وعمر بن محمد العمری وعثمان ابن الاسود وعمر بن سعید ومالک ابن انس وہشام بن حسان ومظاہر ابن اسلم وقرہ ابن خالد اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے جریر ابن حازم وامام احمد وغیرہ نے۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

یحیٰی ابن زکریا ابن ابی زائدہ ۔ تذکرۃ الحفاظ میں ان الفاظ سے ان کے حالات کی ابتداء کی ہے ''الحافظ الثبت المتقن الفقیہ صاحب ابی حنیفۃ'' اور لکھا ہے کہ وہ

اپنے والد زکریا اور عاصم احول و دواؤد ابن ابی ہند و ہشام ابن عروہ و عبید اللہ ابن عمر، ولیث ابن ابی سلیم وابو مالک الاشجعی سے روایت ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے ۔ وہ امام اور صاحب تصانیف تھے ۔ علی ابن مدینی نے کہا ہے کہ کوفہ میں سفیان ثوری کے بعد اُن سے اثبت کوئی نہ تھا۔ اُن کے زمانہ میں اُن پر علم کا خاتمہ ہو گیا یعنی اُس وقت اُن سے علم میں بڑھا ہوا کوئی نہ تھا۔ سفیان ابن عیینہ کہتے ہیں کہ ابن مبارک اور یحییٰ ابن ابی زائدہ کے جیسا کوئی شخص ہمارے یہاں نہیں آیا۔

سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور مدت تک اُن کے ساتھ رہے یہاں تک کہ علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفة کا لقب دیا ہے ۔ یہ تدوین فقہ میں امام صاحب کے شریک اعظم تھے ۔ امام طحاوی نے لکھا ہے کہ تیس برس تک وہ شریک تھے اگر چہ یہ مدت صحیح نہیں لیکن کچھ شبہ نہیں کہ وہ بہت دن تک امام صاحب کے ساتھ تدوین فقہ کا کام کرتے رہے اور خاص کر تصنیف و تحریر کی خدمت ان ہی سے متعلق تھی انتہی ۔

یحییٰ ابن سعید القطانؒ ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کے ترجمہ کی ابتداء ان القاب سے کی ہے۔ ''الامام العلم سید الحفاظ'' اور لکھا ہے کہ انہوں نے ہشام ابن عروہ' وعطاء ابن السائب و حسین المعلم وخیثمہ ابن عراک' حمید الطّویل وسلیمان التیمی و یحییٰ ابن سعید انصاری' واعمش اور اُن کے طبقہ سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمدؒ وغیرہ نے ۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ کا مثل اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ مجھ سے عبد الرحمٰن نے کہا کہ یحییٰ ابن قطان کا مثل تم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھو گے ۔ ابن مدینی کہتے ہیں کہ اُن سے زیادہ رجال کا حال جاننے والا میں نے نہیں دیکھا ۔ بندار کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ والوں کے امام تھے ۔ ابن معین کہتے ہیں کہ بیس سال تک وہ ہر شب قرآن کا ایک ختم کیا کرتے تھے

اور چالیس سال تک کبھی ایسا نہ ہوا کہ زوال کے وقت وہ مسجد میں نہ ہوں اور جب قرآن سنتے زمین پر گر جاتے ایک بار شعبہ کے ساتھ لوگوں نے کسی بات میں مناظرہ کیا فیصلہ اس پر قرار پایا کہ کوئی حکم مقرر کیا جائے۔شعبہ نے یحییٰ بن سعید کو حکم قرار دیا اور انہوں نے شعبہ کے خلاف میں فیصلہ کیا۔نسائی کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امین یہ حضرات ہیں۔مالک' شعبہ اور یحییٰ قطان۔امام احمدؒ کہتے ہیں کہ ہمارے استادوں میں اُن کا مثل کوئی نہیں تھا۔

سیرۃ النعمان میں فتح المغیث اور جواہر مضیئہ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں اُن کا یہ پایہ تھا کہ وہ حلقۂ درس میں بیٹھتے تو امام احمد و علی بن مدینی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو کر ان سے حدیث کی تحقیق کرتے اور نماز عصر سے جو اُن کے درس کا وقت تھا مغرب تک برابر کھڑے رہتے اور تہذیب التہذیب سے لکھا ہے کہ راویوں کی تحقیق وتنقید میں یہ کمال پیدا کیا تھا کہ ائمۂ حدیث عموماً کہا کرتے تھے کہ یحییٰ جس کو چھوڑ دیں گے ہم بھی چھوڑ دیں گے۔

باوجود اس جلالت شان کے وہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ہم نے جو ابوحنیفہؒ کی رائے سنی اُن میں سے اکثر اقوال کو لیا جیسا کہ امام موفقؒ نے مناقب میں لکھا ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ترجمۂ وکیع میں لکھا ہے کہ وہ اور یحییٰ بن سعید قطان ابوحنیفہؒ کے قول پر فتوی دیا کرتے تھے۔

سیرۃ النعمان میں ہے کہ (یحییٰ بن سعید) اس فضل وکمال کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے حلقۂ درس میں اکثر شریک ہوتے اور اُن کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔

عبدالرزاق بن ہمام۔تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو الحافظ الکبیر لکھا ہے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد اور وہب، معمر عبید اللہ ابن عمر العمری' عبداللہ ابن عمر العمری' ایمن بن نابل' عکرمہ بن عمار' ابن جریج' اوزاعی' مالک' دونوں سفیان' زکریا ابن

اسحاق مکی، جعفر بن سلیمان، یونس بن سلیم الصنعانی، ابن ابی رواد اسرائیل، اسماعیل ابن عیاش اور خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن عیینہ اور وکیع وغیرہ نے احمد ابن صالح مصری کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے پوچھا: کیا آپ نے عبدالرزاق سے بہتر بھی روایت حدیث میں کسی کو دیکھا ہے؟ فرمایا: نہیں، معمر کہتے ہیں کہ ''وہ اس لائق ہیں کہ تحصیل حدیث کے لئے دور دراز مسافت سے اُن کی طرف سفر کیا جائے''۔ ہشام بن یوسف کہتے ہیں کہ عبدالرزاق علم اور حفظ میں ہم سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ابوالازہر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے سنا ہے کہ شیخین کو میں علی رضی اللہ عنہ پر اس وجہ سے فضیلت دیتا ہوں کہ خود علی رضی اللہ عنہ نے اُن کو اپنے آپ پر فضیلت دی ہے اگر وہ فضیلت نہ دیتے تو میں ہرگز فضیلت نہ دیتا۔ میری تحقیر کیلئے یہ کافی ہوگا کہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت رکھوں اور اُن کے قول کی مخالفت کروں۔ صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ شیعیت کی نسبت اُن کی طرف جو کی گئی ہے اُس کا منشا یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ اُن کو زیادہ محبت تھی۔ غرضکہ شیعی بھی تھے تو شیخین رضی اللہ عنہما کو افضل سمجھتے تھے۔

سیرۃ النعمان میں انساب سمعانی اور تاریخ یافعی سے نقل کیا ہے کہ طالبان حدیث بہت دور سے قطع منازل کر کے اُن کی خدمت میں حدیث سیکھنے جاتے تھے۔ یہاں تک بعضوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کے پاس اس قدر دور دراز مسافتیں طے کر کے لوگ نہیں گئے۔ حدیث میں اُن کی ایک ضخیم تصنیف موجود ہے۔ امام بخاری نے اعتراف کیا ہے کہ میں اُس کتاب سے مستفید ہوا ہوں۔ علامہ ذہبی نے اس کتاب کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ ''علم کا خزانہ ہے'' عقود الجمان کے مختلف مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کی صحبت میں وہ زیادہ رہے ہیں انتہی۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔
اب غور کیا جائے کہ کس قدر سرمایۂ حدیث اُن کے پاس ہوگا کہ تمام بلاد اسلامیہ کے طالبان حدیث اُس کی تحصیل کے لئے اُن کی خدمت میں آتے تھے پھر جب انہوں نے امام صاحب کے حلقہ میں شریک ہوکر وہ تمام سرمایہ پیش کردیا تو کیا ممکن ہے کہ امام صاحب کے اجتہادی مسائل مخالف حدیث ہوں۔ اگر تھوڑی بھی عقل ہو تو یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ امام صاحب کا اجتہاد مخالف حدیث ہوتا تو امام صاحب کی شاگردی تو کیا صحبت اور ملاقات بھی باعث جرح ہوجاتی جیسا کہ مسئلہ خلق قرآن میں آپ نے دیکھ لیا کہ اُس میں توقف کرنے والے مستند محدثین اور اُن کے ملاقاتی مطعون اور متروک ہوجاتے تھے برخلاف اُس کے اکابر محدثین امام صاحب کی شاگردی کا اعتراف **علی رؤوس الاشھاد** کیا کرتے اور ائمۂ جرح وتعدیل بطیب خاطر اُن کو امام صاحب کے شاگردوں میں لکھا کرتے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس وجہ سے اُن میں کوئی کلام کرسکے۔ حالانکہ امام صاحب کے مخالفین اور بدگویوں کے مجمعے قائم ہو چکے تھے۔ اگر محدثین کے ساتھ تھوڑا بھی حسن ظن ہوتا تو بہ آسانی یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں اُن حضرات کا بیٹھنا اور مستفید ہونا اس بات پر دلیل قطعی ہے کہ امام صاحب کا اجتہاد ہرگز مخالف حدیث نہ تھا بلکہ وہ حضرات اُس کو احادیث کی تفسیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود ان حضرات نے اس کی تصریح کی ہے۔

اسحاق بن یوسف ازرقؒ ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو الحافظ الثقہ لکھا ہے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابن عون، اعمش، شریک، ثوری مسعر، عمر بن ذر، عوف وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ امام احمد سے ان کا حال دریافت کیا گیا تو انہوں نے قسم کھا کر کہا وہ ثقہ ہیں۔ اسی طرح اور ائمۂ فن نے جو اُن کی توثیق کی ہے اُس میں منقول ہے اور صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

جعفرابن عونؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن خالد، ابراہیم بن مسلم الہجری، اعمش، ہشام ابن عروہ، یحیٰی بن سعید مسعودی، ابوالعمیس، عبدالرحمٰن ابن زیاداور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے اور اُن کی روایتیں صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ اورالخیرات الحسان میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حارث بن نبھانؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہیکہ انہوں نے ابواسحٰق، عاصم بن ابی النجود، اعمش عتبہ بن یقطان، ایوب، معمر وغیرہم سے روایت کی ہے۔ابن حیان نے لکھا ہیکہ وہ صالح شخص تھے۔مگر وہم اُن پر غالب تھا۔اگرچہ اکثر محدثین نے اُن میں کلام کیا ہے مگر ترمذی اورابن ماجہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبیض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حبان بن علی العنزیؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اعمش، سہیل ابن ابی صالح، ابن عجلان، لیث ابن ابی سلیم، عقیل بن خالد الایلی، عبدالملک بن عمیر، جعفر ابن ابی المغیرہ، یزید بن ابی زیاد یونس بن یزید وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مبارک وغیرہ نے۔اگرچہ محدثین نے اُن میں کلام کیا ہے مگر یحیٰی بن معین نے کہا ہے کہ وہ صدوق ہیں۔ابوبکر خطیب کا قول ہے کہ وہ صالح اور دیندار تھے۔حجر ابن عبدالجبار کہتے ہیں کہ میں نے کوفہ میں کوئی فقیہ اُن سے افضل نہیں دیکھا۔ابن ماجہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حماد بن دُلیلؒ۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے ثوری سے روایت کی ہے ابن معین نے اُن کی توثیق کی اور اُن کی روایت ابوداؤد میں موجود ہے اور وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حفص بن عبدالرحمٰن البلخیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے خارجہ ابن مصعب' حجاج بن ارطاۃ' اسرائیل، سعید ابن ابی عروبہ، عاصم الاحول' محمد بن مسلم الطائفی' ابن ابی ذئب' ابن اسحاق وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابوداؤد طیالسی اور ابن مبارک و ابن حبان وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ تین خصلتیں اُن میں جمع ہیں وقار' فقہ اور ورع۔ نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ حاکم نے لکھا ہے کہ اصحاب ابو حنیفہ جو اہل خراسان ہیں اُن میں وہ افقہ تھے۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حکام بن مسلم الرازیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عنبسہ ابن سعید، عمر بن ابی قیس' سعید ابن سابق وغیرہ اہل رائے سے اور حمید طویل' علی ابن عبدالاعلیٰ' عفان بن زائدہ' ثوری اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے یحییٰ بن معین وغیرہ نے۔ مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حمزہ بن حبیب زیات قاریؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابو اسحاق السبیعی، ابواسحاق الشیبانی' اعمش' عدی بن ثابت' حکم بن عتیبہ' حبیب بن ابی ثابت' منصور بن المعتمر ابوالمختار الطائی اور اُن کے سوا ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مبارک وغیرہ نے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ صالح صدوق اور صاحب سنت تھے۔

ابن فضیل کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ صرف حمزہ کے طفیل سے کوفہ کی بلائیں دفع فرماتا ہے۔ اگرچہ اُن کی قرائت پر محدثین کا کلام اُس میں نقل کیا ہے مگر اُس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بالآخر اُس کی مقبولیت بالاجماع ثابت ہوگئی ہے مسلم وغیرہ میں حمزہ کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

خارجہ بن مصعب الضبعیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے زید بن اسلم، سہل بن ابی صالح، ابوحازم، سلمہ ابن دینار، بکیر بن الاشج، خالد الخذاء، شریک بن ابی نمیر، عاصم الاحول، عمرو بن دینار، امام مالک، یونس بن یزید، یونس ابن عبید سے اور اُن کے سوا ایک خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے ثوری وغیرہ نے اگرچہ بعض محدثین نے اُن میں کلام کیا ہے مگر اُن کی روایتیں ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں انتہی ملخصاً۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

داؤد بن نصیر الطائیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عبدالملک بن عمیر، اسمٰعیل بن خالد، حمید الطّویل، سعد بن سعید الانصاری، ابن ابی لیلیٰ اور اعمش وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے وکیع وغیرہ نے۔ ابن عیینہؒ کہتے ہیں کہ داؤد نے علم پڑھا اور فقیہ ہوئے۔ پھر عبادت کی طرف توجہ کی۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ داؤد طائی نے اپنی کتابوں کو دفن کر دیا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے ابن حبان نے اُن کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ محارب بن دثار کا قول ہے کہ اگر داؤد طائی امم سابقہ میں ہوتے تو خدائے تعالیٰ اُن کے حالات کی خبر ہم لوگوں کو دیتا۔ نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ اور نفحات الانس مولانا جامی میں لکھا ہیکہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

زید بن حباب عکلیؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ایمن بن نابل، عکرمہ بن عمار الیمامی، ابراہیم ابن نافع المکی، ابن ابی عباس، حسین بن الواقد المروزی، یونس بن ابی اسحاق، سیف بن سلیمان المکی، عبدالملک بن الربیع، اسامہ بن زید بن اسلم، اسامہ بن زید اللیثی، مالک ابن انس، ثوری، ابن ابی ذئب، قرہ ابن خالد، افلح ابن سعید، ضحاک ابن عثمان الحزامی، عبدالعزیز ابن عبداللہ، معاویہ ابن صالح، یحییٰ ابن ایوب اور خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ وہ تحصیل حدیث کے لئے خراسان مصر اندلس وغیرہ گئے۔ ابوالحسین عکلی کہتے ہیں کہ وہ ذکی حافظ اور عالم تھے۔ ابن یونس نے کہا کہ انہوں نے طلب حدیث میں بہت شہروں کی سیاحت کی ہے۔ مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد تھے۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جس قدر سرمایۂ حدیث انہوں نے شہر بشہر پھر کر حاصل کیا تھا اسی طرح دوسرے محدثین نے۔ وہ گویا امام صاحب ہی کے لئے تھا۔ چنانچہ انہوں نے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوکر وہ سب پیش کر دیا۔

شعیب بن اسحاق بن عبدالرحمٰن الدمشقیؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھاہیکہ انہوں نے اپنے والد اور ابن جریج اوزاعی، سعید بن عروبہ عبیداللہ بن عمر، ہشام بن عروہ وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے اسحاق ابن راہویہ اور ابوکریب وغیرہ نے۔ اور باوجودیکہ لیث ابن سعد اُن کے استاد ہیں۔ مگر انہوں نے بھی اُن سے روایت کی ہے۔ ولید ابن مسلم کہتے ہیں کہ اوزاعی اُن کو اپنے نزدیک جگہ دیتے تھے بخاری اور مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں اور تہذیب التہذیب میں علاوہ شاگردی کے یہ بھی تصریح کی ہے کہ انہوں نے امام صاحب کا مذہب اختیار کیا۔

صباح ابن محاربؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے زیاد بن علاقہ، حجاج ابن ارطاۃ، اسمٰعیل ابن ابی خالد، محمد ابن سوقہ، ہشام ابن عروہ وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے عبدالسلام ابن عاصم وغیرہ نے۔ ابوذرعہ وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے اور اُن کی روایتیں ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

صلت ابن الحجاج الکوفیؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عطاء ابن ابی رباح، یحیٰی کندی، ابن عیینہ، مجالدین ابن سعید وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے اہل کوفہ نے امام بخاری نے بھی اُن کی روایت لی ہے اور کوئی جرح اُن پر نہیں کی۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عائذ ابن حبیب العبسیؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے حمید الطّویل، زرارہ ابن اعین، حجاج ابن ارطاۃ، صالح ابن حسان، عامر ابن السمط، اسمٰعیل ابن ابی خالد وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ امام احمدؒ اُن کی ثناء وصفت بہت کیا کرتے تھے کہتے کہ وہ شیخ جلیل عاقل تھے اُن کی روایتیں نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عباد ابن العوامؒ۔تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو الامام المحدث لکھا ہے اور تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے حمید الطّویل، اسمٰعیل ابن ابی خالد، سعید الجریری، ابوسلمہ، سعید ابن یزید، ابن عون، عوف الاعرابی، حجاج ابن ارطاۃ، حصین بن عبدالرحمٰن، سعید ابن ابی عروبہ،

سفیان بن حسین، ہلال بن حباب یحیٰی ابن ابی اسحاق الحضرمی، ابو مالک الاشجعی، ابو اسحاق الشیبانی وغیرہم سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ ابن عرفہ کہتے ہیں کہ مجھ سے وکیع نے اُن کا حال پوچھا میں نے کہا تمہارے یہاں اُن کا سا ایک بھی نہیں۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ اور الخیرات الحسان میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبدالحمید ابن عبدالرحمٰن الحمانیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے یزید ابن ابی بریدہ، اعمش، دونوں سفیان اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے ابوکریب وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں بخاری مسلم وغیرہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفۃ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبدالعزیز ابن خالد ابن زیاد ترمذیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد اور ابوسعد بقال، سعید ابن ابی عروبہ، ابن جریج، ثوری، ہشام ابن حسان، حجاج ابن ارطاۃ سے روایت کی ہے اور اُن سے احمد ابن حجاج وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں نسائی میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبدالکریم بن محمد الجرجانیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے قیس ابن الربیع، عبدالرحمٰن بن سلیمان، زہیر ابن معاویہ مسعودی، ابن جریج وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے امام شافعیؒ وغیرہ نے۔ ابن حبان نے اُن کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور اُن کی

روایتیں ترمذی میں مذکور ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبدالعزیز ابن ابی رواد۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہیکہ انہوں نے عکرمہ، سالم بن عبداللہ، نافع، محمد ابن زیاد الجمحی، ابوسلمہ الحمصی، اسمٰعیل ابن امیہ، ضحاک ابن مزاحم وغیرہ سے روایت کی ہے اور اُن سے وکیع وغیرہ نے۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ اکثر اُن کی یہ حالت رہتی تھی کہ باتیں کرتے اور اشک اُن کے رخساروں پر جاری رہتے تھے۔ شعیب ابن حرب کہتے ہیں کہ اُن کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت اُن کے پیش نظر ہے۔ بخاری وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبیداللہ ابن عمرو الرقی۔ "تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو الامام الحافظ مفتی الجزیرۃ" لکھا ہے۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عبدالملک ابن عمیر، عبیداللہ بن محمد، یحییٰ ابن سعید الانصاری، اعمش، ایوب، لیث ابن ابی سلیم، معمر، ثوری ابن ابی انیسہ، اسحاق بن راشد وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے علی ابن حجر وغیرہ نے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ کثیر الحدیث تھے یعنی حدیثیں اُن کو بہت یاد تھیں۔ اور فتوی میں اُن سے کوئی منازعت نہیں کرسکتا تھا۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبیداللہ ابن موسیٰ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی خالد ہشام ابن عروہ، ایمن ابن نابل، معروف ابن خربوذ، اعمش، ہارون ابن سلیمان الفراء، محمد ابن عبدالرحمٰن، ثوری، حسن ابن صالح، یونس ابن ابی اسحاق، اوزاعی، ابن جریج، عثمان بن الاسود،

اسرائیل، حنظلہ ابن ابی سفیان، زکریا ابن ابی زائدہ شیبان، عبدالعزیز بن سیاہ، موسیٰ بن عبدة اور ایک جماعت سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے بخاری وغیرہ نے۔ ابوسعد کہتے ہیں کہ وہ کثیر الحدیث تھے۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفۃ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

علی ابن ظبیان الکوفیؒ ۔ میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی خالد سے اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام شافعیؒ کے استاد ہیں اور اُن کی روایتیں ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفۃ اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

علی ابن عاصم الواسطیؒ ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو ''**مُستند العراق الامام الحافظ**'' کے لقب سے ملقب کر کے لکھا ہے کہ انہوں نے سہل بن ابی صالح، عطاء ابن السائب، یزید ابن ابی زیادہ، یحییٰ بکا، بیان بن بشر، حصین بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن عثمان، لیث ابن سلیم اور حمید الطّویل سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

علی بن مسہرؒ ۔ تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو ''**الامام الحافظ**'' کے ساتھ ملقب کر کے لکھا ہے کہ انہوں نے داؤد، اسمٰعیل ابن ابی خالد، ابی مالک الاشجعی، زکریا ابن ابی زائدہ، عاصم الاحول اور اس طبقہ کے محدثین نے روایت کی ہے۔ اور اُن سے بشر بن آدم وغیرہ نے۔ احمد عجلی کہتے ہیں کہ وہ جامع حدیث وفقہ تھے اور ثقہ تھے۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہیکہ وہ کثیر الحدیث تھے۔ خلاصہ میں لکھا ہیکہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

ابونعیم الفضل ابن دکینؒ۔تذکرۃ الحفاظ میں اُن کو ''الحافظ الثبت '' لکھا ہے اور خلاصہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اعمش، زکریا، ابن ابی زائدہ اور ایک خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے بخاری وغیرہ نے۔فسوی کہتے ہیں کہ محدثین کا اتفاق ہے کہ ابونعیم اتقان میں اعلیٰ درجہ پر تھے۔تہذیب التہذیب میں اور بہت سارے اساتذہ کے نام لکھ کر لکھا ہے کہ خلق کثیر سے انہوں نے روایت کی ہے۔خلاصہ میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

الفضل ابن موسیٰ السینائیؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی خالد، اعمش، ہشام ابن عروہ، عبیداللہ بن عمر، طلحہ، عبداللہ بن سعید، عبدالحمید بن جعفر، حنظلہ ابن ابی سفیان، داؤد ابن ابی ہند، حسن ابن ذکوان، عبدالمومن ابن خالد حنفی، حسین ابن واقد، ابن عراک، سعید ابن عبدالطائی، فضل بن غزوان، ابی حمزہ السکری، معتمر ابن ارشد، یونس ابن ابی اسحاق، ثوری اور شریک وغیرہ سے روایت کی ہے اور اُن سے اسحٰق ابن راہویہ وغیرہ نے۔ ابونعیم نے کہا ہے کہ وہ ابن مبارک سے بھی اثبت تھے۔وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ صاحب السنۃ تھے۔اسحٰق ابن راہویہ کا قول ہے کہ میرے اساتذہ میں کوئی اُن سے اوثق میرے خیال میں نہیں۔خلاصہ میں لکھا ہے کہ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

عبدالوارث ابن سعیدؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عبدالعزیز بن صہیب، شعیب ابن الحجاب ابوالتیاح، یحییٰ بن اسحٰق الحضرمی، سعید ابن جمہان، ایوب سختیانی، ایوب بن موسیٰ، جعد بن عثمان، داؤد ابن ابی ہند، خالد بن الخذاء، حسین المعلم، سعید الجریری، سعید بن ابی عروبہ، سلیمان التیمی، عبداللہ بن سوادہ، عزرہ بن ثابت، عبداللہ بن ابی نجیح،

علی ابن الحکم البنانی، قاسم بن مہران، قطن ابن کعب الخزاعی، محمد ابن جحادہ، کثیر بن شنظیر، یزید الرشک، یونس بن عبید، ابوعصام البصری اور خلق کثیر سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے سفیان ثوری وغیرہ نے۔ ابوعمر الجرمی کہتے ہیں کہ میں نے کسی فقیہ کو اُن سے افصح نہیں دیکھا شعبہ اُن کی ثناء وصفت بہت کیا کرتے تھے اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

القاسم بن الحکم العرنیؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے سعید بن عبید الطائی، عبداللہ بن الولید، سلمہ بن نبیط اور یونس بن ابی اسحٰق وغیرہ سے روایت کی ہے۔ اور ترمذی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

القاسم بن معن المسعودیؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اعمش، عاصم الاحول، عبدالملک بن عمیر، منصور بن معتمر، طلحہ بن یحییٰ داؤد بن ابی ہند، محمد بن عمر، ہشام بن عروہ، یحییٰ بن سعید، عبدالرحمٰن مسعودی وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مہدی وغیرہ نے۔ اور ان کی روایتیں ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

قیس بن ربیعؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابواسحٰق سبیعی، مقدام بن شریح، عمرو بن مرہ، ابوحفص عمران بن ابی جحیفہ، عثمان بن عبداللہ، محمد بن حکم الکاہلی، ابن ابی لیلیٰ، ابوہاشم الرمانی، اغر بن صباح، سماک بن حرب، اعمش سدی، اسود بن قیس، محارب بن دثار، ہشام بن عروہ اور ایک جماعت سے روایت کی ہے۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ سفیان جب اُن کا ذکر کرتے بہت ثناء وصفت کرتے اُن کی روایتیں ابوداؤد وترمذی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

محمد بن بشر العبدیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی خالد' ہشام بن عروہ' عبید بن عمر العمری' یزید بن زیاد' اعمش ، زکریا ابن ابی زائدہ' ثوری' شعبہ' سعید بن ابی عروبہ' مسعر ' نافع بن عمر الجمحی' عبدالعزیز بن عمر' حجاج بن ابی عثمان الصواف' ابی حبان التیمی ' فطر ابن خلیفہ' محمد بن عمرو اور عمر بن میمون وغیرہم سے روایت کی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں جو لوگ اُس وقت کوفہ میں تھے سب سے وہ احفظ تھے اور لکھا ہے کہ حدیثیں اُن کو بکثرت یاد تھیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

محمد ابن الحسن بن آتش الصغانیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ہمام بن منبہ' ابراہیم بن عمر و الصغانی' رباح صغانی ،سلیمان بن وہب الجندی' عمر بن عبدالرحمٰن' ابوبکر بن ابی شیبہ اور بہت سے محدثین سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ ابو حاتم نے اُن کی توثیق کی اور ابن حبان نے اُن کو ثقات میں لکھا ہے۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

محمد بن خالد الوہبیؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل بن ابی خالد' عبداللہ بن الوصافی' عبدالعزیز بن عمر' ابن جریج' معروف بن واصل' عبدالرحمٰن بن سلیمان وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن روح وغیرہ نے ۔اُن کی روایتیں ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں ۔تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب العبدیؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد اور بشر بن الحکم' ابوالنصر ہاشم' لیلٰی بن عبید شبابہ' ہودہ بن خلیفہ' واقدی' یعقوب بن محمد الزہری'

سلیمان بن داؤد الہاشمی، اصمعی، علی ابن الحسن، ابن شقیق، محاضر بن المورع، یحیٰی بن بکیر الکرمانی، محمد بن ابی یحیی الکنانی، علی بن عثام العامری، محمد بن زیاد اور خلق کثیر سے روایت کی ہے۔ ابوداؤد و ترمذی و نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

محمد بن یزید الواسطیؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی خالد، ابوالاشہب، جعفر بن خیان، سفیان بن حسین، ہاشم بن رجا، مجالد بن سعید، محمد ابن اسحاق ابن یسار، مسلم بن سعید، ابوایوب العلاء القصاب، اسمٰعیل بن مسلم المکی اور عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ وکیع کہتے ہیں کہ وہ ابدال سے تھے۔ ابوداؤد و ترمذی اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

مروان بن سالمؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے صفوان بن عمرو، اعمش، عبید اللہ بن عمرو، ابن جریج، اوزاعی، عبدالعزیز بن رواد اور ابوبکر بن ابی مریم وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے عبدالمجید بن رواد وغیرہ نے۔ ابوداؤد اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفۃ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

مصعب ابن مقدامؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے فطر بن خلیفہ، زائدہ، عکرمہ بن عمار، مبارک ابن فضالہ، مسعر، ثوری، داؤد بن نضر، اسرائیل، حسن بن صالح، فضل بن غزوان وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے اسحٰق بن راہویہ وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

المعافی بن عمران الموصلیؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے حریز بن عثمان،

ابن جریج، مالک بن مفول، ثوری، اوزاعی، مسعودی، عبداللہ بن عمر العمری، سلیمان بن بلال، صخر ابن جویریہ، ابراہیم بن طہمان، اسرائیل، ثور بن یزید، حماد بن سلمہ، حنظلہ ابن ابی سفیان، عبدالحمید بن جعفر، عثمان بن الاسود، سیف بن سلیمان المکی، سعید بن ابی عروبہ، زکریا ابن ابی اسحٰق، ہشام بن سعد اور ایک خلق کثیر سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مبارک وغیرہ نے۔ ابوزکریا نے تاریخ موصل میں لکھا ہے کہ انہوں نے طلب علم کے لئے آفاق میں سفر کیا ہے۔ بشر بن حارث کہتے ہیں کہ معافی علم، فہم اور خیر سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن کا قول ہے کہ مجھے آٹھ سو شیوخ سے ملاقات ہے۔ بخاری، ابوداؤد اور نسائی میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

مکی ابن ابراہیم البلخیؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے جعید بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن سعید، ابن ابی ہند، ایمن ابن نابل، یزید بن عبید، بہز بن حکیم، ابن جریج، ہشام بن حسان، ہشام الدستوانی، جعفر صادق، یعقوب بن عطا، ابن رباح، ہاشم بن ہاشم، یحییٰ بن سہیل، فطر بن خلیفہ، حنظلہ ابن ابی سفیان اور عبدالعزیز بن ابی رواد وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے بخاری وغیرہ نے۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب التہذیب، تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

النعمان بن عبدالسلام الاصبهانیؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے سلمہ بن وردان، ابی خلدہ، خالد بن دینار، ابن جریج، ثوری، ابن ابی ذئب، مسعر، حماد بن سلمہ، ابن ابی زناد، شعبہ، ورقہ اور خلق کثیر سے روایت کی۔ اور اُن سے عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

نوح بن دراج القاضیؒ ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل ابن ابی

خالد، ہشام بن عروہ، فطر بن خلیفہ، ابن اسحٰق اور اعمش وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے علی بن حجر وغیرہ نے۔ تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

نوح ابن ابی مریمؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ اپنے والد اور زہری، ثابت الھنانی، یحییٰ ابن سعید الانصاری، عبداللہ بن عمرو، ابن ابی لیلیٰ، بہز ابن حکیم، ابن اسحٰق، اعمش، مقاتل بن حیان اور یزید النحوی وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے علی بن موسیٰ غنجار وغیرہ نے۔ تہذیب الکمال اور تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

ہریم بن سفیانؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسمٰعیل بن ابی خالد، بیان بن بشر، اعمش، منصور، ابی اسحٰق، شیبانی، عبداللہ العمری، لیث بن ابی سلیم، سہیل بن ابی صالح، عبد ربہ ابن سعید الانصاری، مجالد بن سعید وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابونعیم نے۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفۃ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

ہودہ بن خلیفہؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے سلیمان تیمی، عبداللہ بن عون، ابن جریج، ہشام بن حسان، عوف الاعرابی، یونس بن عبید وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے امام احمد وغیرہ نے۔ ابن حبان وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے اور ابوداؤد میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال تہذیب التہذیب اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

ہیاج ابن بطام البرجمیؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے حمید الطّویل، اسمٰعیل ابن ابی خالد، عنبر بن عبدالرحمٰن القرشی، عوف الاعرابی، محمد بن اسحٰق، داؤد بن ابی ہند

' خالد الحذاء، محمد بن عمرو ابن علقمہ' یزید بن کیسان اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے محمد بن بکار وغیرہ نے ۔سعید بن ہناد کہتے ہیں کہ میں نے اُن سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا۔ ایک بار انہوں نے بغداد میں حدیث بیان کی جس میں لاکھ آدمی جمع ہو گئے ۔اور وہ اعلم و افقہ تھے۔اُن کی روایتیں ابن ماجہ میں موجود ہیں۔تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

یحییٰ بن یمانؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ہشام بن عروہ' اعمش ' اسمٰعیل بن ابی خالد' معمر' المنہال بن خلیفہ' ثوری' حمزۃ الزیات وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے یحییٰ بن معین وغیرہ نے بخاری۔مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

یزید بن زریعؒ ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے سلیمان التیمی ' حمید الطّویل' ابی سلمہ' سعید بن یزید' عمر بن میمون' ایوب' حبیب المعلم ' حبیب بن اشہد' خالد الحذاء ' حجاج ابن ابی عثمان الصواف' داؤد بن ابی ہند' سعید بن ایاس الجریری' سعید ابن ابی عروبہ' ہشام بن حسان' یونس بن عبید، ابن عون' شعبہ' ثوری' عمر بن محمد العمری' معمر بن راشد' ہشام الدستوانی' عوف الاعرابی' حسین المعلم ' روح بن القاسم وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مبارک وغیرہ نے ۔ بہز بن الحکیم کہتے ہیں کہ وہ متقن اور حافظ تھے اور اُن کا قول ہے۔"ما رایت مثلہ و مثل صوت حدیثہ "۔ابوحاتم نے اُن کی نسبت ثقہ امام کہا ہے۔اور ابن سعد کا قول ہے کہ کان ثقة حجة کثیر الحدیث ۔کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔

تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

یونس بن بکیرؒ۔تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے ابی خلدہ، خالد بن دینار

السعدی، خالد بن دینار النیلی، طلحہ بن یحییٰ، اسباط بن نصر، ہشام بن عروہ، محمد بن اسحٰق، عمرو بن دینار، عثمان بن عبدالرحمٰن، نصر بن ابی عمر الخراز وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے یحییٰ بن معین وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

ابواسحٰق فزاریؒ۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے خالد الخذاء، حمید الطّویل، ابی طوالہ، مالک، موسیٰ بن عقبہ، اعمش اور خلق کثیر سے روایت کی ہے۔ اور اُن سے ثوری وغیرہ نے اُن کو حدیثیں بکثرت یاد تھیں۔ ابوحاتم نے اُن کو امام کہا ہے۔ فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ تشریف رکھے ہیں۔ اور حضرت کے بازو میں تھوڑی جگہ خالی ہے۔ میں نے وہاں بیٹھنا چاہا۔ فرمایا یہ ابواسحٰق فزاری کی جگہ ہے۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

موسیٰ بن نافع ابوشہاب الاکبر الحناطؒ۔ خلاصہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے سعید بن جبیر، عطاء اور ایک جماعت سے روایت کی ہے اور اُن سے ابونعیم وغیرہ نے۔ اُن کی روایتیں بخاری مسلم وغیرہ میں موجود ہیں۔ تہذیب الکمال اور تبییض الصحیفۃ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں۔

حماد بن زیدؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ثابت بنانی، انس ابن سیرین، عبدالعزیز بن صہیب، عاصم الاحول، محمد بن زیاد، ابوحمزہ ضبعی، جعد، ابوحازم، سلمہ بن دینار، شعیب بن حبحاب، صالح بن کیسان، عبدالحمید صاحب الزیادی، ابی عمران الجونی، عمرو بن دینار، ہشام بن عروہ، عبیداللہ بن عمر وغیرہ تابعین اور تبع تابعین سے روایت کی ہے اور اُن سے ابن مبارک وغیرہ نے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں امام چار شخص تھے کوفہ میں سفیان ثوری، حجاز میں امام مالک، شام میں اوزاعی اور بصرہ میں حماد بن زید۔ اور

کہا کہ اُن سے زیادہ حدیث جاننے والے کو میں نے نہیں دیکھا۔ یحییٰ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ اُن سے زیادہ حافظہ والا میں نے نہیں دیکھا۔ امام احمد کہتے ہیں کہ حماد بن زید ائمۂ مسلمین میں ہیں جس روز اُن کا انتقال ہوا یزید بن زریع نے کہا کہ آج سید المسلمین کا انتقال ہوا ۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری کو اُن کے روبرو دوزانو بیٹھے دیکھا۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں ۔ الخیرات الحسان میں امام علی بن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں ۔

ہشام بن عروہؒ۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے والد اور عبداللہ بن زبیر' عبداللہ بن عثمان' عباد بن عبداللہ' یحییٰ بن عباد' عباد بن حمزہ' فاطمہ بنت المنذر' وہب ابن کیسان' صالح ابن ابی صالح السمان' عبداللہ ابن ابی بکر' عبدالرحمٰن بن سعد' محمد بن ابراہیم التیمی' محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم سے روایت کی ہے اور اُن سے ایوب سختیانی وغیرہ نے ۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ ثبت اور حجت تھے ۔ اور حدیثیں اُن کو بہت یاد تھیں ۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ فن حدیث میں وہ امام تھے ۔ کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں ۔ الخیرات الحسان میں علی ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد ہیں ۔

یحییٰ بن معینؒ۔ تذکرۃ الحفاظ میں ان الفاظ سے اُن کو ملقب کیا ہے ''الامام الفرد سید الحفاظ ''۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ انہوں نے عبدالسلام بن حرب' عبداللہ بن مبارک' حفص بن غیاث' جریر' ہشام بن یوسف' عبدالرزاق' ابن عیینہ' وکیع ابن عدی' غندر' عمر بن عبدالرحمٰن' حجاج بن یوسف' حاتم بن اسمٰعیل' اسمٰعیل بن مخالد' حسین بن محمد' عبدالصمد' عباد بن عباد' سکن بن اسمٰعیل' مروان بن معاویہ' قطان' ابو عبیدۃ بن الحداد' ابی اسامہ' حماد بن خالد' عبدالرحمٰن بن مہدی' اور خلق کثیر سے روایت کی ہے ۔ اور اُن سے بخاری و مسلم وغیرہ نے ۔ ابن مدینی کہتے ہیں کہ علم یحییٰ بن آدم پر منتہی ہوا ۔ اور اُن کے بعد

یحییٰ بن معین پر۔ اور اُن سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ علم ابن مبارک پر منتہی ہوا۔ اور اُن کے بعد یحییٰ بن معین پر ہارون بن معروف کہتے ہیں کہ شام سے ایک محدث ہمارے یہاں آئے۔ سب سے پہلے میں اُن کے یہاں گیا اور املا (یعنی روایتیں لکھوانے) کی درخواست کی شیخ نے اپنی کتاب سے لکھوانا شروع کیا اس عرصہ میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ پوچھا کون ہے کہا احمد بن حنبل۔ اُن کو آنے کی اجازت دی۔ اور اسی طرح لکھوائے جاتے تھے اُن کے بعد احمد دورقی اور عبداللہ رومی اور زہیر بن حرب آئے اور شیخ برابر لکھواتے رہے کہ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی پھر آواز آئی۔ شیخ نے کہا کون ہے؟ کہا یحییٰ بن معین یہ سنتے ہی شیخ کے ہاتھوں میں لرزہ پڑ گیا اور کتاب ہاتھ سے گر گئی۔

مولانا مولوی حافظ محمد عبدالحیؒ نے **الرفع والتکمیل** میں فتح المغیث سے نقل کیا ہے کہ راویوں میں کلام کرنے والے تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ کہ تمام راویوں میں کچھ نہ کچھ کلام کرتے ہیں۔ جیسے یحییٰ بن معین اور ابی حاتم۔ پھر باقی اقسام بیان کر کے لکھا ہے کہ جرح میں تشدد کرنے والے کسی کی توثیق کریں تو اُس کا قول دانتوں سے پکڑو یعنی پوری حفاظت کرو اور اُن کی توثیق کو دستاویز بناؤ۔

تاریخ ابن خلکان میں لکھا ہے کہ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ یہ حضرات علم میں منتہی تھے۔ یحییٰ بن ابی کثیر اور قتادہ بصرہ میں اور اسحٰق اور اعمش کوفہ میں اور ابن شہاب اور عمرو بن دینار حجاز میں اور ان سب کا علم سعید بن عروبہؒ اور شعبہ اور معمر اور حماد بن سلمہ اور ابوعوانہؒ اور سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور مالک بن انس اور ابی زائدہ اور وکیع اور ابن مبارک کو پہونچا مگر ابن مبارک کا علم ان سب سے وسیع تر تھا۔ اور نیز ابن مہدی اور یحییٰ ابن آدم ان ہی حضرات میں شامل ہیں۔ پھر ان سب کا علم یحییٰ بن معین کو پہونچا۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو یحییٰ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں ابن المدینی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے

کہ ہم نہیں جانتے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر اب تک کسی نے یحییٰ بن معین کے برابر حدیثیں روایت کی ہوں۔اورانہی کا قول ہے کہ تمام آدمیوں کا علم اُن کو پہونچا ہے۔

کردریؒ نے لکھا ہے ''**ذکر ابو المعالی الاسفرانی عن یحییٰ بن معین قال جالسناہ (ای ابا حنیفة) و سمعناہ و کتبنا منه و اذا نظرت الی وجهه عرضنا فی وجهه انه یتقی الله**''، یعنی یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ ہم ابوحنیفہؒ کے ساتھ بیٹھے اوراُن کے افادات سنے اور لکھے۔اُن کی یہ حالت تھی کہ جب ہم اُن کے چہرہ کی طرف دیکھتے تو صاف معلوم ہوتا کہ اُن کو خدائے تعالیٰ کا بہت خوف ہے۔اس روایت میں شاید یہ کلام کیا جائیگا کہ یحییٰ بن معین کا انتقال ۲۳۳ھ دوسوتینتیس ہجری میں ہےاورابن خلکانؒ نے اُن کی عمر پچھتر یا ستہتر سال کی علی اختلاف الروایہ لکھی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی ولادت امام صاحب کے انتقال کے بعد ہے۔کیونکہ امام صاحب کا انتقال ۱۵۰ھ ایک سو پچاس میں ہے۔مگراس کا جواب یہ ہے کہ حساب میں کچھ غلطی ہوئی ہوگی۔چنانچہ ابن خلکانؒ نے خود اعتراف کیا ہے کہ خطیب بغدادی نے جوتاریخ لکھی ہے وہ یقیناً غلط ہے۔یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بعض لوگوں کے قویٰ قوی ہوتے ہیں کہ باوجود کبیر السن ہونے کے اپنے کم عمروں سے ہر بات میں قوی ہوتے ہیں اور دیکھنے میں بھی کم عمر نظر آتے ہیں۔اس لئے ممکن ہے کہ تقریباً سوسال کی اُن کی عمر ہو بہر حال اس روایت کی وجہ سے احتمال ملاقات قطعی طور پر غلط ثابت نہیں ہوسکتا۔اوراگر ملاقات نہ بھی ہو تو اس میں شبہ نہیں کہ امام صاحب کو وہ اپنے مقتدا ضرور سمجھتے تھے جس پر کئی قرینے دلالت کرتے ہیں۔ایک باراُن سے سوال کیا گیا کہ غیر محفوظ روایت بیان کرنا درست ہے یا نہیں۔انہوں نے جواب میں امام صاحب کا قول پیش کیا کہ وہ جائز نہیں سمجھتے تھے جس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کے ساتھ اُن کو ایک خاص نسبت تھی۔یہ بھی اوپر معلوم ہوا کہ کسی نے امام صاحب کا حال اُن سے پوچھا تو ''ثقہ ثقہ''

مکرر رکہہ کرقسم کھائی کہ اُن کا رتبہ اس سے بلند ہے کہ کسی بات میں وہ جھوٹ کہتے۔مکرر توثیق کر کے قسم کھانا صاف بتلا رہا ہے کہ امام صاحب کے ساتھ اُن کو کمال عقیدت تھی۔امام موفقؒ نے لکھا ہے کہ کسی نے یحییٰ بن معین سے پوچھا کیا سفیانؒ نے ابوحنیفہؒ سے روایت کی ہے کہا ہاں ابوحنیفہ ثقہ اور حدیث وفقہ میں صدوق اور دین میں مامون تھے۔اور نیز موفقؒ نے مناقب میں یحییٰ بن معینؒ کا قول نقل کیا ہے کہ'' **الفقه فقه ابی حنیفة علیه ادرکت الناس** '' یعنی قابل اعتبار اور مُستند فقہ پوچھو تو ابوحنیفہؒ کی فقہ ہے۔اُسی پر میں نے لوگوں کو پایا ہے جب اُن کے نزدیک فقہ حنفیہ اس درجہ کی موثق اور متفق علیہ مسلم تھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا عمل اسی فقہ پر تھا۔اگر اس کو قابل عمل اور مطابق قرآن وحدیث نہ سمجھتے تو صاف کہہ دیتے کہ وہ مخالف ہے بلکہ اُس کی وجہ سے خود امام صاحب پر جرح کر دیتے کہ انہوں نے مخالف فقہ بنا کر لوگوں کو گمراہ کیا جیسے آخری زمانہ کے بعضے مولوی کہا کرتے ہیں کہ ایک لحاظ سے ان مولویوں کا کہنا ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ'' **الانسان عدو ما جهل** ''۔

کل حدیثیں امام صاحب کے پیش نظر تھیں

البتہ بعضے مسائل بخاری اور مسلم کی حدیثوں کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔اگر یحییٰ بن معین کا سا تبحر فن حدیث میں ہوتا تو وہ بھی یہی کہتے'' **الفقه فقه ابی حنیفة** ''۔مگر وہ تبحر کس کو نصیب ہوسکتا ہے وہ تو یحییٰ بن معین ہی کا حصہ ہوگیا۔اس اُمت مرحومہ میں وہ ایک ہی شخص تھے جنہوں نے تمام احادیث نبویہ کو ازبر کر لیا تھا جس کی گواہی امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ اکابر دے رہے ہیں۔الغرض جب انہوں نے تمام مسائل فقہیہ کو جانچ لیا کہ بالکل مطابق احادیث نبویہ ہے۔اُس وقت فرمایا **الفقه فقه ابی حنیفة** تاکہ محدثین معلوم

کرلیں کہ اگر بعض مسائل چند حدیثوں کے مخالف ہیں تو دوسرے حدیثوں کے موافق ہیں۔ جن کی اُن کو خبر نہیں۔

کیوں نہ ہو جتنے حدیثیں یحییٰ بن معینؒ کو یاد تھیں وہ سب تدوین فقہ کے وقت امام صاحب کے پیش نظر تھیں اس لئے کہ پہلے تو خود انہوں نے چار ہزار استادوں سے حدیثوں کو حاصل کیا تھا پھر جتنے طلبہ درس میں آتے اُن میں اکثر اس سرمایہ کیساتھ آتے جو اجتہاد کے لئے کافی ہو سکے۔ کیونکہ امام صاحب نے روایت حدیث کا طریقہ تو اختیار کیا ہی نہ تھا جس کے طالب ہر قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ وہ تو اجتہاد کا طریقہ سکھاتے تھے جس کے لئے حدیث کا کافی سرمایہ درکار رہے۔ اس لئے ہر طالب علم کو اُس حلقہ میں شریک ہونے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اسی فہرست میں دیکھ لیجئے کہ وہ حضرات محدثین کے نزدیک کس درجہ کے ہیں۔ اور تذکرة الحفاظ میں کیسے کیسے الفاظ اُن کے مذکور ہیں۔ مثلاً الامـــــام ' الحـافـظ احـد الاعـلام ' الثبـت ' شیـخ الاسـلام ' الـقـدوة ' المتقن ' سید الحفاظ ' الحافظ الکبیر ' الفرد ' کثیر الحدیث وغیرہ۔ کیا ممکن ہے کہ جن کے یہ القاب ہوں وہ معمولی مولوی ہوں۔ یہ تو اُن کے ذاتی مسائل تھے جو علمی حیثیت سے اُن کو تمام محدثین میں ممتاز کر رہے ہیں جن سے اُن کا ذاتی تجربہ اور کثرت سرمایۂ حدیث صاف معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہر ایک نے جن محدثین سے وہ سرمایہ حاصل کیا ہے اُن کا تو شمار ہی نہیں اس لئے کہ دس بیس نام لکھ کر وغیرھم یا عن خلق یا عن جماعة وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ ان تمام حضرات کے اساتذہ کی جماعتیں اور ہر جماعت کے افراد کتنے ہوں گے۔ فن رجال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں تحصیل حدیث کا شوق حد سے زیادہ تھا بعض شائقین ایسے بھی تھے کہ اُن کے اساتذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور صدہا کی تعداد تو ایک معمولی بات تھی۔ اب دیکھئے کہ امام صاحب کے تلامذہ خود بے شمار تھے جیسا کہ سابقاً

معلوم ہوا تو اُن کے اساتذہ کا کیا حال ہو۔ اُن کو جانے دیجئے تقریباً ایک ہزار جن کی فہرست بعضے محدثین نے قلمبند کی ہے، ان ہی کے اساتذہ کا خیال کر لیجئے کہ کتنے ہوں گے۔ اس سے بھی تنزل کر کے اگر انہی حضرات کے اساتذہ کا خیال کر لیا جائے جن کی فہرست یہاں لکھی گئی تو بھی ہزار ہا کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ پھر فن رجال کی کتابوں سے واضح ہے کہ یہ حضرات کسی ایک خاص شہر کے رہنے والے نہ تھے۔ بلکہ کوئی حجازی ہے تو کوئی عراقی ومصری وغیرہ۔ غرضکہ فن رجال کی گواہی سے یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی مقامات میں کوئی مقام وموضع ایسا نہ نکلے گا جس میں کوئی محدث ہو اور امام صاحب کے شاگردوں نے وہاں کا سرمایہ حاصل نہ کر لیا ہو۔ اِن قرائن واسباب سے ثابت ہے کہ امام صاحب کے اجتہاد کے وقت کل روئے زمین کے احادیث کا سرمایہ امام صاحب کے حلقہ میں پہونچ چکا تھا جس کو بحسب ضرورت اہل حلقہ پیش کیا کرتے تھے۔

محدثین، امام صاحب کے دعا گو تھے

محدثین جو امام صاحب کے حلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے وہ مخالفانہ شرکت نہ تھی بلکہ استفادہ مقصود تھا چنانچہ اُن کی خوش اعتقادی ان کے ان دُعاؤں اور بیانوں سے ظاہر ہے۔

ص۔ مسعرؒ سجدہ میں امام صاحب کے لئے دعا کرتے اور اُس کو ذریعہ تقرب الٰہی سمجھتے تھے چنانچہ ان کی دُعا کے الفاظ یہ ہیں ”**اللھم انی اتقرب الیک بدعائی لابی حنیفة**“۔

ابو عاصم نبیل کہتے ہیں مجھے امید ہے کہ ہر روز ابو حنیفہؒ کے اعمال ایک صدیق کے اعمال کے برابر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں کسی نے اُس کی وجہ دریافت کی فرمایا اس لئے کہ اُن سے اور اُن کے اقوال سے لوگوں کو نفع پہونچا۔

م ص ت۔ عبداللہ بن داؤد الخریبی کہتے ہیں کہ اسلام اور اہل اسلام پر واجب ہے کہ نماز

میں ابوحنیفہؒ کے لئے دعا کیا کریں کیونکہ انہوں نے احادیث اور فقہ کو محفوظ کر دیا۔
فقہ کو محفوظ کرنا تو ظاہر ہے۔ احادیث کو اس طرح محفوظ کیا کہ مختلف احادیث سے جو مضمون مستفاد ہوتا ہے اجتہاد کر کے ماحصل جواب لباب احادیث اور مقصود شارع ہے اُس کو محفوظ کر لیا۔
ک ص۔ ابن سماک محمد عجلی جب وعظ کہتے تو خاتمہ پر امام صاحب کے حق میں دُعائے خیر کیا کرتے۔ اور کل حضار کو آمین کہنے کی ہدایت کرتے۔ میزان الاعتدال میں لکھا کہ ابن سماک وعظ میں سرآمد روزگار تھے اُن کی پُر اثر تقریر کی یہ تاثیر تھی کہ جو اُس کو سنتا اُس پر خوف الٰہی طاری ہوتا۔ ہارون رشید نے ایک بار اُن کا وعظ سنا روتے روتے اُن کی یہ حالت ہوئی کہ بیہوش ہو گئے۔ کردریؒ نے ابن سماک کا حال لکھا ہے کہ وہ اس قدر روتے تھے کہ اُن کی آنکھوں میں خلل آ گیا تھا۔
م ص۔ ابوالولید کہتے ہیں کہ شعبہؒ کی مجلس میں جب ابوحنیفہؒ کا ذکر آتا تو وہ آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے۔ محمد بن میمون کہتے ہیں کہ اُن کی تقریر سننے سے اس قدر خوشی ہوئی کہ لاکھ اشرفی ملنے سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی اور بہت ساری روایتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ محدثین جو حلقۂ درس میں شریک رہا کرتے وہ امام صاحب کے معتقد تھے اور اس بات کے مجاز تھے کہ مناظرہ کر کے اپنے اپنے شکوک کو صاف کر لیا کریں۔ جس کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اب غور کیجئے کہ جب ہر مسئلہ میں کیفیت انجلائیہ پیدا ہوتی ہوگی تو اُس کو بطیب خاطر مان لینے اور اُس کے مطابق عمل کرنے میں کیا تامل کیونکہ مقصود فقہ سے یہی معلوم کرنا ہے کہ ہر ایک واقعہ میں عمل کس طرح کیا جائے۔ پھر جب وہ حضرات مطابق فقہ حنفیہ عمل کرتے تو اُن کے تلامذہ اور معتقدین و احباب بھی ان ہی کی اتباع کیا کرتے یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں دور دور تک فقہ حنفیہ کی شہرت ہو گئی۔ جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا یہی بات تھی جو یحییٰ بن معین فرماتے ہیں ''الفقہ فقه ابی حنیفة

علیه ادرکت الناس"۔

یحیٰ بن معین امام شافعی کے مخالف کیوں ہوئے

اوپر یہ بات معلوم ہوئی کہ امام احمدؒ جب امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یحیٰ بن معین سے بھی شریک حلقۂ درس ہونے کو کہا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔طبقات شافعیہ سے معلوم ہوتا ہیکہ یحیٰ بن معین نے امام شافعیؒ کی سخت مخالفت کی اور جرح کئے۔ چنانچہ طبقات میں لکھا ہے"**ثم اندفع ابن عبدالبر فی ذکر کلام جماعة من النظراء بعضهم فی بعض و عدم الالتفات الیه لذلک الی ان انتهی الی کلام ابن معین فی الشافعی و قال انه مما نقم علی ابن معین و عیب به و ذکر قول احمد ابن حنبل من این یعرف یحییٰ بن معین الشافعی وهو لا یعرف الشافعی و لا یعرف ما یقوله الشافعی**۔"اس مخالفت کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ باوجود فقہ حنفیہ عالمگیر ہونے اور اُس پر عمل جاری ہونے کے امام شافعیؒ نے دوسرے فقہ کی بنیاد ڈالی جو ضرورت سے زیادہ تھی۔یہی بات امام احمدؒ کے قول سے مستفاد ہے جوفرماتے ہیں کہ یحیٰ بن معین شافعیؒ کو پہچانتے ہی نہیں۔ ورنہ بغیر معرفت کے کسی پر جرح کرنا نہ عقلاً درست ہوسکتا ہے نہ شرعاً۔غرضکہ بغیر معرفت کے اسی وجہ سے انہوں نے جرح کیا کہ خلاف اجماع کوئی نئی بات نکالنا خود ایک قابل جرح بات ہے۔ یہ بحث دوسری ہے کہ امام شافعیؒ چونکہ مجتہد تھے اُن کوضرور تھا کہ اپنے اجتہاد کے مطابق فتوی دیں اور فقہ مدون کریں۔ یہاں کلام صرف یحیٰ بن معینؒ کے جرح میں ہے۔ بہرحال یحیٰ بن معینؒ امام صاحب کے اگر شاگرد نہیں تو معتقد ضرور تھے۔اورتعجب نہیں کہ مقلد بھی ہوں جیسا کہ اُن کے فتویٰ دینے اور فقہ حنفیہؒ پر اجماع بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اب اہل انصاف غور فرماویں کہ جب ایسے ایسے اکابر

محدثین امام صاحب کے شاگرد ہیں جن میں امیر المؤمنین فی الحدیث بھی شامل ہیں تو کیا محدثین کے طرفدار عقلاً یا شرعاً اس بات کے مجاز ہوں گے کہ امام صاحب کی توہین کریں اگرچہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے۔

چوں بہرا سد مگس از فر باز نیست زمرغان اولی اجنحہ

مگر مقتدایان قوم کو ضرور ہے کہ اپنے بزرگوں کے بزرگ کی تعظیم کی ہدایت کیا کریں۔

م ک۔ ابو عصمہ سعد بن معاذ کے روبرو ذکر آیا کہ ایک قوم ایسی بھی ہے کہ وہ ابن مبارک کو ابو حنیفہؒ سے اعلم کہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ مثل رافضیوں کے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کو اپنا امام قرار دیتے ہیں اور انہوں نے جن کو امام قرار دیا اُن کو امام نہیں سمجھتے۔ فی الحقیقت عبداللہ ابن مبارک کا سا علم کسی کو ہو تو وہ امام صاحب کی قدر جانے باوجودیکہ انہوں نے اکابر محدثین سے سرمایۂ حدیث وافی و کافی حاصل کیا تھا۔ مگر جب امام صاحب کی خدمت میں پہونچے تو عمر بھر وہیں کے ہو رہے اور امام صاحب کی زندگی تک کہیں جانے کا قصد نہ کیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ قرآن و حدیث کا لب لباب سوائے امام صاحب کے اور کہیں حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لب لباب یعنی فقہ کو حاصل کرنے اور استخراج مسائل کا طریقہ معلوم کرنے کی غرض سے دور دراز مسافتیں طے کر کے محدثین امام صاحب کے حلقہ میں آتے تھے۔

امام صاحب کے اجتہاد کا حال

اب ہم امام صاحب کے اجتہاد کا تھوڑا سا حال بیان کرتے ہیں اُمید ہے کہ اہل انصاف اُس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

خ۔ عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اُس حدیث کو قبول کرتے تھے جس کی

صحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اور ناسخ و منسوخ کی معرفت اُن کو بخوبی حاصل تھی۔ احادیث ثقات کے ہمیشہ طالب رہا کرتے تھے جن امور میں علمائے کوفہ کا عمل در آمد مطابق حق پاتے اُس کی پیروی کرتے۔ باوجوداس کے لوگ اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو ہم سکوت کر کے اُس سے استغفار کرتے ہیں۔

یہ امیر المومنین فی الحدیث کا حال ہے کہ امام صاحب کے مخالفوں کی ظلم و زیادتی سے کیسی مظلومی ظاہر کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم سب سُن کر سکوت کرتے ہیں۔ اگرچہ اس موقع میں سکوت بھی ایک اعلیٰ درجہ کا جواب ہے۔ بمصداق ''جواب جاہلاں باشد خموشی'' مگر چونکہ اُس میں اظہار حق نہیں ہوتا اس لئے اُس کو بُرا بلکہ گناہ سمجھتے اور اُس سے استغفار کیا کرتے۔

م ت خ۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بسر و چشم ہمیں قبول ہے اور صحابہ کے اقوال کسی مسئلہ میں مختلف وارد ہوں تو ہم کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں لیکن ان سے خارج نہیں ہوتے البتہ تابعین کے اقوال کی مزاحمت کرتے ہیں یعنی جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا ہے ہم بھی کرتے ہیں۔

م ص ک۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی واقعہ پیش ہوتا تو امام صاحب ہم لوگوں سے پوچھتے کہ کوئی اثر تمہارے نزدیک ہے پھر اگر کوئی اثر یعنی قول صحابی ہمارے یا اُن کے پاس ہوتا تو اُس کو قبول کرتے اور اگر آثار مختلف ہوتے تو اکثر کو لیتے اور جو کوئی اثر نہ ملتا تو قیاس کرتے اور قیاس بھی معتبر ہوتا تو استحسان پر حکم کرتے۔

یہاں یہ خیال نہ کیا جائے کہ امام صاحب کو اس پوچھنے سے استفادہ مقصود ہوتا تھا اور خود وہ آثار و احادیث کو نہیں جانتے تھے جیسا کہ اِس زمانہ کے بعضے مولوی خیال کرتے ہیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو جوق جوق محدثین دور دور سے کیوں آتے خیال کر لیتے کہ ایسے شخص کے

پاس جانے سے کیا فائدہ جو ہر ایک مسئلہ میں اپنے شاگردوں کا محتاج ہے۔ بلکہ شاگرد لوگ خود کہدیتے کہ حضرت آپ تو ہر واقعہ میں اُلٹے ہم ہی سے پوچھتے ہو پھر آپ کی استادی کس مصرف کی غرضکہ اس سوال سے مقصود دوسرا تھا جس میں کئی امور اس میں ملحوظ ہیں ایک یہ کہ ہر شخص کا حال معلوم ہو کہ احادیث کتنے اُس کو یاد ہیں اور کن آثار سے اُس واقعہ کا حکم وہ ثابت کرتے ہیں۔ دوسرے طلبہ کی حوصلہ افزائی کہ ہر شخص کو اپنے ذخیرۂ معلومات میں غور کر کے واقعہ سے متعلق احادیث وآثار پیش کرنے کی طرف توجہ ہو۔ اور مواقع استدلال کو عمدگی سے بیان کرسکیں۔ جس سے ملکۂ اجتہاد پیدا ہو۔ تیسرے تلاحق افکار سے ایسا سرمایہ پیش ہوجائے کہ حضّار حلقہ کو اُس مسئلہ میں بصیرت تامہ حاصل ہوجائے۔ یہی وجہ تھی کہ اعمشؒ سے جب کوئی شخص فتویٰ پوچھتا تو فرماتے کہ ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں جاؤ وہاں جو مسئلہ پیش ہوتا ہے وہ اُن کی باہمی مباحثوں سے نہایت روشن ہوجاتا ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ چوتھے یہ پوچھنا بعینہ ایسا تھا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تھا کہ رطب سوکھ کر کیا کم ہوجاتی ہے حالانکہ حضرت اُس کو جانتے تھے مگر مقصود یہ تھا کہ صحابہ ہی کی زبان سے حکم کہلا دیا جائے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔

ک خ۔ حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام صاحب فرمایا کرتے تھے جب نص قرآنی یا حدیث یا اجماع کسی مسئلہ میں موجود ہو تو کسی کو حق نہیں کہ اپنی رائے سے کوئی بات کہے ہاں جب صحابہ کا اختلاف کسی بات میں ہوتا ہے تو ہم وہ قول اختیار کرتے ہیں جو کتاب یا سنت کے قریب ہو جو اُس سے متجاوز ہو ہم اُس میں اجتہاد کرتے ہیں۔ کیونکہ فقہاء کے لئے توسیع کی گئی کہ اجتہاد کریں بشرطیکہ اختلاف کو جان لیں اور عمدگی سے قیاس کریں۔ سلف صالح کا یہی طریقہ رہا ہے۔

م۔ ابوحمزہ سکری کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے سنا ہے کہ کسی مسئلہ میں کوئی حدیث

وارد ہوتو ہم اُس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی بات نہیں مانتے۔اور اُس کو قبول کر لیتے ہیں اور صحابہ سے مختلف اقوال وارد ہوں تو کسی ایک کو اختیار کرتے ہیں۔

ک۔عبدالکریم بن ہلال کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے سنا ہے کہ جو حکم خدا اور رسول کا ہمیں پہونچتا ہے ہم اُس سے تجاوز نہیں کرتے۔اور جس بات میں صحابہ کا اختلاف ہو تو ہم کسی ایک قول کو اختیار کرتے ہیں اور اُن کے سوا کسی کا قول مناسب ہو تو لے لیتے ہیں ورنہ ترک کر دیتے ہیں۔

م ک۔امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ ایک بار اعمشؒ سے مجھے ملاقات ہوئی اُنہوں نے فرمایا تمہارے استاد نے ابن مسعود کی مخالفت کی۔اس لئے کہ لونڈی کی بیع کو طلاق نہیں قرار دیا۔ حالانکہ ابن مسعودؓ اُس بیع کو طلاق قرار دیتے ہیں۔میں نے کہا حضرت آپ ہی سے ہمیں روایت پہونچی ہے کہ وہ بیع طلاق نہیں ہوسکتی۔فرمایا کس طرح؟ میں نے کہا آپ کی روایت ہے''**عن ابراهيم عن الاسود عن عائشة رضى الله عنها انه عليه السلام خير بريرةؓ بعد ما اشترتها عائشة**'' یعنی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب میں نے بریرہ کو خریدا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے اپنے شوہر کے نکاح میں رہے چاہے چھوڑ دے۔فرمائے اگر لونڈی کی بیع طلاق ہوتی تو اختیار دینے سے کیا فائدہ۔فرمایا کیا یہ حدیث اسی باب میں ہے میں نے کہا جی ہاں۔فرمایا ابو حنیفہؒ کو مواقع علم کا خوب احساس ہے اور خوب سمجھتے ہیں پھر فرمایا تم لوگ جادو کرتے ہو اور اس جملہ کو مکرر فرمایا۔ابن مسعودؓ ہر چند صحابی اور امام صاحب کے اساتذہ کے سلسلہ میں ہیں مگر حدیث مرفوع کی وجہ اُن کے قول پر عمل نہیں کیا۔دیکھئے اس حدیث میں صرف خیار مذکور ہے طلاق کا نام بھی نہیں مگر مسئلہ طلاق جو اُس وقت مختلف فیہ تھا اُس میں امام صاحب نے اس حدیث سے استدلال کیا اور باوجود اس حدیث کی شہرت کے محدثین کا ذہن اُدھر منتقل نہ ہوا اسی وجہ سے اعمشؒ نے سوال فرمایا

’’کیا وہ اسی باب میں ہے‘‘ محدثین اسی بات میں امام صاحب کے محتاج تھے کہ مواقع استدلال خوب جانتے ہیں کہ کس موقع سے کونسی بات پیدا کی جاتی ہے۔

م۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ محمد بن واسع جب خراسان گئے تو قبصیہ بن ذویب نے کہا کہ تمہارے یہاں صاحب دعوت آئے ہیں یہ سنکر بہت سے لوگ اُن کے یہاں گئے اور مسائل فقہیہ اُن سے پوچھنے لگے کہا فقہ ایک جوان کی صناعت ہے جو کوفہ میں ہے جس کی کنیت ابوحنیفہؒ ہے لوگوں نے کہا وہ حدیث نہیں جانتے ابن مبارک نے کہا تم یہ کس طرح کہتے ہو ایک بار کا اتفاق ہے کہ **بیع الرطب بالتمر** کا مسئلہ کسی نے اُن سے پوچھا اُنہوں نے کہا مضائقہ نہیں محدثین نے کہا حدیث سعید کو کیا کرو گے کہا وہ حدیث شاذ ہے کیونکہ زید بن عیاش کی روایت نہیں لیجاتی ابن مبارک کہتے ہیں کہ جو شخص ایسی بات کہے کیا ہوسکتا ہے کہ وہ حدیث نہ جانتا ہو۔

کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ احمد بن یونس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ صحیح حدیثوں کی اتباع میں نہایت اہتمام کیا کرتے تھے۔

م ک۔ فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کی عادت تھی کہ جو صحیح حدیث کسی مسئلہ میں ہوتی اُس کی اتباع کرتے۔

وہبؒ کہتے ہیں کہ عبدالعزیز بن رزمہ امام صاحب کی حدیث دانی کا حال بیان کرتے تھے ایک بار اثنائے بیان میں کہا کہ ایک بار کوفہ میں ایک محدث آئے جن کی شہرت ہوئی امام صاحب نے اہل حلقہ سے فرمایا کہ خبر لو کوئی حدیث اُن کے یہاں ایسی بھی ہے جو ہمارے یہاں نہیں ہے۔ پھر ایک بار اور دوسرے ایک محدث آئے اُس وقت بھی ایسا ہی فرمایا۔ دیکھئے باوجودیکہ امام صاحب کو اتنی حدیثیں یاد تھیں کہ اُس زمانہ میں اُن کا مثل نہ تھا جیسا کہ متعدد شہادتوں سے ثابت ہے اور اہل حلقہ تمام محدّث تھے مگر اس خیال سے کہ شاید

کوئی حدیث نئ مل جائے ہمیشہ حدیثوں کی تلاش جاری تھی ۔کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ کسی نے عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ حدیث میں جووارد ہے ''اصحاب الرای اعداء السنة ''اس سے مراد ابوحنیفہ ہیں کہا سبحان اللہ ابوحنیفہؒ کی تو نہایت درجہ کی یہ کوشش تھی کہ عمل مطابق سنت ہو۔ چنانچہ کسی مسئلہ میں وہ سنت سے علحدہ نہیں ہوتے تھے۔وہ اعدائے سنت میں کیونکر ہوسکتے ہیں اُس حدیث سے مراد اہل ہوا اور جھگڑالو لوگ ہیں جو کتاب اور سنت کو چھوڑ کر اپنی خواہشوں کی پیروی کیا کرتے ہیں۔ دیکھئے کیسے جلیل القدر امام المحدثین کی گواہی سے ثابت ہے کہ امام صاحب کسی مسئلہ میں سنت سے علحدہ نہیں ہوتے تھے۔

اصول بزدوی میں لکھا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک سنت کو یہ قوت حاصل ہے کہ اُس سے کتاب یعنی قرآن کے نسخ کو جائز رکھتے ہیں اور حدیث اگرچہ مرسل ہو اُس پر بھی عمل کرتے ہیں۔اور روایت مجہول کو بھی قیاس پر مقدم رکھتے ہیں۔اور قیاس کو صحابہ کے قول پر مقدم نہیں کرتے۔اس خیال سے کہ شاید انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ بات سنی ہو۔

خ۔ابن حزم کا قول ہے کہ اصحاب ابوحنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قیاس پر مقدم ہے۔

ک۔زفرؒ کہتے ہیں کہ مخالفوں کے کلام پر ہرگز التفات نہ کرو امام صاحب نے جو کچھ کہا کتاب اور سنت یا اقوال صحابہ سے کہا اس کے بعد انہی پر قیاس کیا۔

ک م ص۔اور کشف بزدوی میں لکھا ہے کہ یحیٰی بن آدم کہتے ہیں کہ احادیث بھی مثل آیات قرآنیہ کے ناسخ ومنسوخ ہیں اور نعمانؒ یعنی امام صاحب نے تمام احادیث میں غور کر کے اُن احادیث کو جمع کرلیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں صادر ہوئے ہیں اور انہی کے مطابق فتویٰ دیا۔اس روایت میں اختلاف ہے۔بعضے کتابوں میں ہے کہ کوفہ میں جو ناسخ ومنسوخ پہونچیں اُن کو امام صاحب نے محفوظ کرلیا تھا۔اگرچہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو

کوفہ خود مرکز علم بنا ہوا تھا جس کا حال اوپر معلوم ہوا مگر چونکہ امام صاحب نے چار ہزار شیوخ سے حدیث لی ہے اس لحاظ سے وہی روایت مقدم ہوگی جس میں عموم ہے۔

م ص۔ حسن بن صالح کہتے ہیں کہ امام صاحب احادیث میں ناسخ ومنسوخ کی تفحص کیا کرتے اور اُس حدیث پر عمل کرتے جو اُن کے نزدیک ثابت ہوتی خواہ وہ حدیث مرفوع ہو یا صحابہ کا قول ہو۔ اور فرمایا کرتے کہ قرآن کی طرح احادیث میں بھی ناسخ ومنسوخ ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اواخر افعال اُن کو خوب یاد تھے جو اُن کے شہر میں پہونچے تھے۔

مختصر کتاب النصیحۃ لاھل الحدیث مولفہ خطیب بغدادی میں لکھا ہے کہ ابو نعیم کہتے ہیں کہ جب کبھی زفرؒ پر میرا گذر ہوتا تو وہ کہتے کہ آؤ کہ تمہاری حدیثوں کو چھانیں۔ چنانچہ اپنی مرویات کو پیش کیا کرتا اور وہ فرماتے کہ یہ حدیث لینے کے قابل ہے اور یہ نہیں اور یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب کے حلقہ میں تمام حدیثیں جچی ہوئی تھیں کہ فلاں ناسخ اور فلاں منسوخ وغیرہ۔

ک۔ ابراہیم بن سلیمان زیات کہتے ہیں کہ اسرائیل کے روبرو امام صاحب کا ذکر آیا انہوں نے کہا کہ اس زمانہ کے لوگ جن امور کی طرف محتاج ہیں اُن کو وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ لوگ اُس زمانہ میں انہی احکام کی طرف محتاج تھے جو صحیح صحیح احادیث وآثار سے ثابت ہوں۔ اسرائیلؒ کی شہادت سے ثابت ہے کہ امام صاحب اُن احکام کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ کردریؒ نے لکھا ہے کہ یہ اسرائیل ابن یونس کوفی ہیں جو حفظ اور ضبط اور اتقان میں باعث فخر اہل کوفہ تھے۔

ک۔ حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ میں امام صاحب سے اُن کی کتابیں اور آثار سنے اُن سے زیادہ ذکی اور اُن آثار کو زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا جو مفید اور احکام میں صحیح ہوں۔

امام صاحب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے قدم بہ قدم تھے

م ص ک۔ زرنجریؒ کہتے ہیں کہ امام صاحب کی زیادہ کوشش یہ تھی کہ صدیق اکبر کے اقوال پرعمل ہو چنانچہ تمام افعال وخصال میں عموماً آپ کی اتباع کیا کرتے تھے جس طرح صدیق اکبرؓ علم فقہ، تقویٰ، ورع، عبادت، زہد، سخاوت اور جود میں سب صحابہ سے بڑے ہوئے تھے اسی طرح امام صاحب ان تمام صفات میں اپنے اقران میں ممتاز تھے یہاں تک کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دوکان مکہ معظّمہ میں بزازی کی تھی امام صاحب نے بھی بزازی ہی کی دوکان لگائی انتہی۔

ان اُمور کے علاوہ اور بہت باتوں میں اتباع وتتبع کتب سے ثابت ہے مثلاً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باوجود کثرت معلومات کے حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے امام صاحب کا بھی یہی حال رہا۔ یہاں تک کہ مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ وہ حدیث جانتے ہی نہ تھے۔ جس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بات بہت کم کیا کرتے تھے یہاں تک کہ منہ میں کنکریاں رکھ لیا کرتے تھے اسی طرح امام صاحب کا بھی باتیں کم کرنا ثابت ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا اور جب کوئی واقعہ پیش ہوتا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صحابہ سے اُس باب میں استفسار فرماتے اسی طرح امام صاحب بھی ہر واقعہ میں اپنے اصحاب سے استفسار فرماتے جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ اور جس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کر کے محفوظ کر دیا جیسا کہ کتب احادیث میں مصرح ہے۔ اسی طرح امام صاحب نے فقہ میں احادیث کو محفوظ کر دیا۔ جس کا اعتراف خود محدثین کو ہے۔ اور جس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے اور قیاس سے مانعین زکوٰۃ کے قتل کا فتویٰ دیا اور باوجود صحیح حدیث پیش ہونے کے اپنی رائے اور قیاس پر اڑے رہے اور صحابہ کی ایک نہ مانی۔ اسطرح امام

صاحب نے بھی باوجود مخالفت اہل حدیث کے کسی کی نہ مانی ۔ اور بحسب ضرورت اپنی رائے سے قیاس کرتے رہے پھر جس طرح اہل انصاف نے صدیق اکبرؓ کی رائے کو مان لیا ۔اسی طرح امام صاحب کی رائے کو بھی مان لیا۔غرضکہ امام صاحب کو صدیق اکبرؓ کیساتھ ایک خاص طور کی مناسبت معنوی تھی اسی مناسبت نے یہ اثر دکھلایا کہ جس طرح وہ صدیقوں میں صدیق اکبرؓ کہلائے ۔امام صاحب اماموں میں امام اعظم کہلائے ۔جس لقب کو خود محدثین نے تسلیم کرلیا ہے''**ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم**''۔

م ص خ ۔ابوغسان کہتے ہیں کہ میں نے اسرائیل سے سُنا ہے کہ نعمان بہت اچھے شخص تھے اُن کو وہ حدیثیں جن سے فقہی مسائل نکلتے ہیں کس قدر یاد تھیں اور کس قدر اُن کی تفحص اور تلاش میں رہا کرتے تھے انتہی ۔یہی روایت ردالمختار میں بھی ہے امام صاحب کو احادیث فقہیہ اس قدر یاد تھیں کہ اسرائیلؒ جیسے شخص کو کمال درجہ کا تعجب تھا چنانچہ اُن کی اس عبارت سے ظاہر ہے''**کان نعم الرجل نعمان ما کان احفظہ لکل حدیث فیہ فقہ و اشد فحصہ عنہ**'' ۔اسرائیل وہ شخص ہیں کہ امام احمدؒ جیسے سیدالحفاظ اُن کے حافظہ پر تعجب کرتے ہیں۔حالانکہ امام ممدوحؒ کو سات لاکھ سے زیادہ صحیح حدیثیں یاد تھیں دیکھئے تہذیب التہذیب میں ہے''**عن ابن حنبل کان (اسرائیل بن یونس) شیخاً ثقة و جعل یتعجب من حفظہ**''۔اب غور کیجئے کہ جن کے حافظہ پر امام احمدؒ جیسے حافظہ والے شخص تعجب کرتے ہیں جب وہ امام صاحب کے حفظ احادیث فقہیہ پر تعجب کرتے ہوں تو کس قدر احادیث فقہیہ امام صاحب کو یاد ہوں گے اس کے بعد بھی زمانہ کے مولویوں کا بھی قول سُن لیجئے وہ کہتے ہیں کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں یاد تھیں ہمیں اُس کی شکایت نہیں کیونکہ مخالفت میں ایسی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں مگر حیرت اس پر ہے کہ امام صاحب کی شاگردی کا

جن اکابر محدثین کو اعتراف ہے اور خود محدثین اُن کو شاگرد لکھتے آئے ان میں کوئی امیر المومنین فی الحدیث ہیں اور کوئی شیخ الاسلام اور حافظ وغیرہ وغیرہ جس کا حال اوپر معلوم ہوا ایسے جلیل القدر محدثین کو ان صاحبوں نے کیا سمجھ لیا ہے۔ ہمارے مشاہدہ سے تو ثابت ہے کہ کیسا ہی اعلیٰ درجہ کا پاگل طالب علم ہو ایسے شخص کی شاگردی کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتا جس کا کل سرمایۂ علم سترہ حدیثیں ہو کوئی عقلمند ان حضرات پر یہ الزام ہرگز نہیں لگا سکتا خصوصًا وہ جو اُن کو مقتدا بھی سمجھتا ہو۔۔

م۔ یحییٰ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک محدث نے مجھ سے کہا کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے پانسو مسئلے پوچھے سب میں انہوں نے فتویٰ دیا اُس کے بعد سفیان ثوریؒ سے پوچھا انہوں نے ہر مسئلہ پر ایک حدیث پڑھ دی۔ مطلب یہ کہ کوئی جواب امام صاحب کا خلاف حدیث نہ تھا۔ صرف حدیث پڑھ کر نہیں سناتے تھے مگر جو حکم بیان کرتے مطابق حدیث ہوتا۔ کیوں نہ ہو وہ تو قرآن وحدیث ہی کا خلاصہ ہوتا تھا پھر مخالف کیونکر ہو سکے۔ سفیان ثوریؒ جیسے متبحر ہوں تو ہر مسئلہ پر ایک حدیث پڑھ دیں۔ لاکھوں حدیثوں میں سے چند حدیثیں کوئی شخص پڑھ لے وہ بھی ناظرہ تو کل مسائل فقہیہ کا ماخذ اُس کو کیونکر معلوم ہو سکے۔ اسی وجہ سے ہمارے عنایت فرما حضرات غیر مقلدین فقہ پر بہت خفا ہیں اور مقتضائے طبیعت بھی بمصداق ''الانسان عدو ما جهل'' یہی ہے مگر حسن ظن سے اگر کام لیں تو یہ عداوت جاتی رہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ امام صاحب پر حسن ظن کریں۔ بلکہ ہماری درخواست یہ ہے کہ اپنے ہی مقتدا محدثین پر حسن ظن کریں تو رفع خصومت کے لئے کافی ہے۔

م ص ک۔ اسد بن عمرو کہتے ہیں کہ امام صاحب کہا کرتے تھے کہ جب میں کوئی بات تم سے ایسی کہوں کہ صحابہ سے اُس میں کوئی روایت نہ ہو تو تلاش کرتے رہو یہاں تک کے کوئی اثر اور روایت مل جائے۔ ایک روز فرمایا کہ اگر مرد اپنی عورت سے کہے کہ میں تین مہینے تجھ

سے قربت نہ کرونگا تو اُس سے ایلا ثابت نہ ہوگا۔اور کوئی اثر اس میں بیان نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ اس مسئلہ میں اثر تلاش کرو۔ ایک مدت کے بعد سعید بن عروبہ جو اُس زمانہ میں علم اختلاف میں سب سے بڑے ہوئے تھے آئے ہم نے اُن سے دریافت کیا۔انہوں نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ میں تین مہینے اپنی عورت سے قربت نہ کرونگا اس سے ایلا نہیں ہوتا۔ہم نے یہ سنکر امام صاحب کو خوشخبری دی کہ جو آپ نے کہا تھا اثر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی وہی ثابت ہے مگر یہ فرمائے کہ کس دلیل سے وہ آپ نے کہا تھا۔فرمایا اس آیۂ شریفہ سے ''**للذین یؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر**'' ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی مسئلہ میں امام صاحب اپنا استدلال بیان نہی کرتے تھے مگر کوئی آیت یا حدیث ضرور آپ کے پیش نظر رہا کرتی تھی۔

م ص ک۔عمرو بن ہارون کہتے ہیں کہ میں نے ابن جریج سے سنا ہے کہ کہ ابوحنیفہؒ نے کوئی فتویٰ بغیر اصل محکم کے نہیں دیا اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں انہوں نے یہی لحاظ رکھا۔انتہی ۔ دیکھئے ابن جریج کس اطمینان سے فرمارہے ہیں کہ تمام فتوے یعنی مسائل فقہ کسی نہ کسی اصل محکم سے متعلق ہیں۔ابن جریج کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔تہذیب التہذیب سے ظاہر ہے کہ وہ مصنفین میں پہلے شخص ہیں اُن کی سی تدوین علم کسی نے نہیں کی وہ محدث اور فقہیہ اعلیٰ درجہ کے تھے اکابر محدثین بکثرت اُن کے شاگرد ہیں ۔کیا ایسے شیخ الشیوخ کا اس بات پر اطمینان کہ فقہ ایک مستند چیز ہے ہمارے لئے کافی نہیں۔

م۔عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں بہت سارے شہروں میں بڑے بڑے علمائے نامی وگرامی کے یہاں گیا مگر جب تک ابوحنیفہؒ سے ملاقات نہ ہوئی اصول حلال وحرام مجھے معلوم نہ ہوئے۔دیکھئے ابن مبارکؒ نے کیسے کیسے نامی وگرامی کی شاگردی کی۔مگر کسی نے حلال وحرام کے اصول نہ بتلائے۔اور خود اُن کو کتنی حدیثیں یاد تھیں کہ امیر المومنین

فی الحدیث کہلاتے تھے، باوجوداس کے نہ اُن کے اساتذہ سے ہوسکا نہ اُن سے کہ اصولِ حلال وحرام کو مشخص کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصول حلال وحرام سے ائمۂ محدثین ناواقف تھے۔ اور یہ کام ایسا مشکل تھا کہ باوجود ضرورت کے کسی کی ہمت اُس طرف مبذول نہ ہوئی اورامام صاحب نے اُس کو اپنے ذمہ لیا۔ اورنہایت عمدگی سے انجام دیا۔ شاید یہاں یہ کہا جائیگا کہ اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے یہ بدعت ایجاد کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بدعت بھی ہے تو بدعت حسنہ ہے جس کی فضیلت حدیث شریف ''من سن سنة حسنة فله اجر من عمل به '' سے ثابت ہے اورایسی قابل قدر ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث اُس کی شکرگذاری میں رطب اللسان ہیں۔ اوراکابر محدثین نے امام صاحب کی اس منت کا اعتراف کیا ہے۔

غرضکہ اکابر محدثین کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ امام صاحب نے جب فقہ کی بنیاد ڈالی اُس وقت آپ کا ذاتی سرمایۂ حدیث اس قدر تھا کہ کوئی محدث آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا اورعلم ناسخ ومنسوخ وغیرہ لوازم اجتہاد میں بےنظیر سمجھے جاتے تھے۔ پھر صدہا محدثین جو ہرملک ودیار سے سرمایۂ حدیث فراہم کرکے لاتے اوروقتاً فوقتاً بحسب ضرورت پیش کرتے وہ علاوہ اُس کے تھا۔

تمت

حضرت شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ نظامیہ

حقیقۃ الفقہ حصہ اول و دوم کی طباعت عمل میں لائی گئی اور صد سالہ عرس

شریف کے موقع پر حضرت بانی علیہ الرحمۃ کی ذیل میں مذکور کتب کی اشاعت ہوئی۔

کتاب العقل: اس کتاب میں بتلایا گیا ہے کہ عقل کہاں تک دینی امور میں کام کرسکتی ہے۔

انوار احمدی: اس کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فضائل بیان کئے گئے

ہیں، اور ختم نبوت کے اثبات پر مدلل عقلی و نقلی بحث کی گئی ہے۔

افادۃ الافہام حصہ اول و دوم: اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کی کتاب ازالۃ

الاوہام کا مدلل و تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کی تصنیف کردہ کتابیں، انوار التمجید فی ادلۃ

التوحید' انوار الحق' انوار اللہ الودود' خلق افعال اور شمیم الانوار کی طباعت عمل میں

لائی گئی، اس کے علاوہ فوز المرام' عمران القلوب' الانوار البھیۃ فی الاستعانۃ من

خیر البریۃ اور دیگر اہم کتب شائع ہوئیں۔

حقیقۃ الفقہ

جلد دوم

تالیف حقائق آگاہ فقاہت دستگاہ حضرت شیخ الاسلام عارف باللہ
امام محمد انوار اللہ فاروقی فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ بانی جامعہ نظامیہ

فہرست مضامین حقیقۃ الفقہ حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلیٰ رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن.

امابعد! اب تھوڑا سا حال فقہ حنفیہ کی تدوین اور اُس کی شہرت اور مقبولیت اور اُس پر اجماع ہونے کا بھی سُن لیجئے۔

امام صاحب کی پیدائش ۸۰ھ (اَسی) ہجری میں ہے، جو صحابہ کی موجودگی اور اعلیٰ درجہ کی برکت کا زمانہ تھا اور انتقال ۱۵۰ھ (ایک سو پچاس) ہجری میں ہوا، اس ستر سال کی عمر کا ایک بڑا حصہ آپ نے تحصیل علم میں صرف کیا، اُس کے بعد حماد بن سلیمان کے حلقہ میں فقہ حاصل کرنے کی غرض سے گئے، چنانچہ ''تبییض الصحیفه'' میں امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ امام صاحب فرماتے ہیں: ہر روز میں اُن کے حلقہ میں جایا کرتا اور جو کچھ اُن سے سنتا یاد رکھتا، جب دوسرے روز وہ پڑھے ہوئے سبق کا اعادہ کراتے تو دوسرے ہمدرس اکثر خطا کرتے اور میں بے کم و کاست بیان کر دیتا، اس وجہ سے حمادؒ نے حکم دیا کہ صدر حلقہ میں سوائے ابوحنیفہ کے کوئی نہ بیٹھے۔ دس سال تک یہ حاضر باشی اور استفادہ رہا، ایک روز میرے نفس نے خواہش کی کہ تفقہ میں بہرہ کافی حاصل ہوگیا ہے اس لئے اپنا حلقہ علٰحدہ بنالیا جائے، چنانچہ اس ارادہ سے میں نکلا، جب مسجد میں داخل ہوا اور حماد رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو جرأت نہ ہوئی کہ استاذ کے مقابلہ میں خودسری کا دعویٰ کروں؛ چنانچہ حسب عادت، شیخ کے حلقہ میں بیٹھ گیا۔ قضارا اُسی رات اُن کو خبر پہونچی کہ بصرہ میں اُن کے کوئی قرابتدار تھے اُن کا انتقال ہوا اور سوائے اُن کے کوئی دوسرا وارث نہیں، یہ سنتے ہی مجھے اپنا جانشین کر کے وہ روانہ ہوگئے اور دو مہینے تک میں اُن کی خدمت کو انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں ساٹھ مسئلے ایسے پیش ہوئے کہ اُن کا حکم میں نے سنا نہ تھا، اُن کا جواب تو دے دیا مگر وہ لکھ رکھا۔ جب وہ واپس تشریف لائے، میں نے وہ مسائل اور اپنے جوابات پیش کئے، انہوں نے چالیس مسئلوں میں اتفاق کیا اور بیس مسئلوں میں مخالفت کی، اُس کے بعد میں نے قسم کھائی

کہ اب اُن کے حلقہ کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔

تدوینِ فقہ

اب غور کیجئے کہ فقہ کیسی چیز ہے کہ امام صاحب کا وہ تبحر علمی اور اُس پر وہ خداداد طبیعت اور حافظہ، فہم وفراست جس پر اکابر محدثین رشک کرتے تھے۔ باوجود اس کے دس برس تک ایک محقق شفیق استاذ سے سیکھتے رہے، مگر ہنوز ایک ثلث کی کسر باقی رہ گئی پھر استاد کے انتقال تک انہی کی خدمت میں رہے اور اُن کے انتقال کے بعد جب مسلمانوں کو ضرورت ہوئی تو جب بھی فتویٰ دینے پر جرأت نہیں کی۔ چنانچہ امام موفقؒ نے لکھا ہے کہ جب حمادؒ کا انتقال ہوا اور اُن کے اصحاب نے امام صاحب کو اُن کی جانشینی پر مجبور کیا تو امام صاحب نے قبول نہ کیا، آخر اس بات پر فیصلہ ہوا کہ اُن میں سے دس صاحب ایک سال تک امام صاحب کے ساتھ رہ کر ہر مسئلہ کے فتویٰ میں تائید دیا کریں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد تدوین فقہ کی بنیاد ڈالی اور ایک مجلس ایسی قائم کی جس کے اراکین اہل حدیث تھے۔

ردالمحتار میں لکھا ہے کہ تدوین فقہ کے وقت امام صاحب کے یہاں ایک ہزار علماء کا مجمع تھا، جن میں چالیس علماء اس پایہ کے تھے کہ درجۂ اجتہاد کو پہنچ گئے تھے، اُن سے آپ نے فرمایا: دیکھو! فقہ کو میں نے لگام تو لگا دی ہے اور تمہارے لئے زین بھی کس دی ہے، اب تم میری مدد کرو، پھر جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اُن سے مشورت کرتے اور جو کچھ اخبار وآثار ان کو یاد ہوتے سنتے اور جو خود کو یاد ہوتے بیان کرتے، پھر بعضے مسائل میں ایک ایک مہینے تک مناظرہ ہوتا، جب بالاتفاق وہ مسئلہ طے ہو جاتا تو ابو یوسفؒ سے اُس کے لکھنے کو فرما دیتے اس طرح اصول مدوّن ہوئے۔ انتہی۔

اب غور کیجئے کہ جو مسئلہ اتنی تحقیقات سے اور صدہا محدثین کے اتفاق سے طے ہوتا تھا تو

کیا ممکن ہے کہ مخالف قرآن وحدیث ہوتا ہوگا؟

امام صاحب کو خطا پر کہنے والے مثلِ جانوروں کے ہیں

سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ خطیب بغدادی نے وکیع بن الجراح کے حال میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر وکیع کے پاس چند اہل علم جمع تھے، کسی نے کہا کہ اس مسئلہ میں ابو حنیفہ نے غلطی کی ہے، وکیع بولے کہ ابو حنیفہ کیونکر غلطی کر سکتے ہیں؟ ابو یوسف وزفر قیاس میں، یحییٰ بن زائدہ، حفص بن غیاث، حبان، مندل حدیث میں، قاسم بن معن لغت وعربیت میں، داؤد طائی، فضیل بن عیاض زہد وتقویٰ میں، اس رتبہ کے لوگ جس شخص کے ساتھ ہوں وہ کہیں غلطی کر سکتا ہے؟ اور اگر کرتا بھی تو یہ لوگ اُس کو کب غلطی پر رہنے دیتے۔

خ۔ ایک شخص نے وکیع سے کہا کہ ابو حنیفہ نے خطا کی، انہوں نے جھڑک کر کہا: جو شخص ایسی بات کہے وہ مثل جانوروں کے ہے بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر۔ اُن کے نزدیک ابو یوسف اور محمد جیسے ائمہ فقہ تھے اور بہت سے ائمہ حدیث اور بہت سارے ائمہ لغت وعربیت اور فضیل اور داؤد طائی جیسے ائمۂ زہد وورع موجود تھے، جس کے اصحاب ایسے ہوں وہ کبھی خطا نہیں کرتا اور اگر کی بھی تو اُس کو حق کی طرف وہ لوگ پھیر دیتے ہیں۔ انتہی۔

کردریؒ نے اسی قسم کا قول ابن عکرمہؒ کا نقل کیا ہے چند ماہرینِ فنِ حدیث ولغت وغیرہ کے نام جو لکھے ہیں صرف تمثیل کے طور پر ہیں ورنہ وہاں تو صدہا علماء کا مجمع ہمیشہ رہا کرتا تھا، جس کا حال اوپر معلوم ہوا۔

یہ روایت اوپر لکھی گئی ہے کہ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ میں ابو حنیفہ کی مجلس میں صبح و شام جایا کرتا تھا، ایک بار حیض کے مسئلہ میں گفتگو شروع ہوئی اور تین روز تک صبح وشام ہوا کی، آخر تیسرے روز قریب شام اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا، جس سے تمام اہل حلقہ کی

مسرت اُس مسئلہ کے طے ہونے پر سمجھی جاتی تھی۔
اس سے ظاہر ہے کہ جب تک اہل حلقہ کے دلوں میں اذعانی اور انشراحی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی کوئی مسئلہ کتاب میں نہیں لکھا جاتا تھا۔
یہ روایت بھی اوپر لکھی گئی کہ ایک رات زفرؒ نے بعد نماز عشاء کسی مسئلہ میں اپنا شک ظاہر کیا، امام صاحب نے جواب دیا مگر اُن کی تسکین نہ ہوئی اور مناظرہ طول کھینچا یہاں تک کہ رات بھر مناظرہ ہوتا رہا، آخر صبح امام صاحب ہی کے قول پر فیصلہ ہوا۔
اس سے ظاہر ہے کہ شاگردوں کو عام اجازت تھی کہ وقت بے وقت اپنے شبہات رفع کرلیا کریں۔
اب غور کیا جائے کہ جب امام صاحب نے نہ صرف خارج وقتِ درس بلکہ ایسے وقت میں کہ دنیا میں کوئی استاذ شاگردوں کے رفع شبہات کے لئے وہ وقت نہ دے گا، اُن کے شبہات کو رفع کیا تو خاص وقت میں کس قدر وہ اس کام کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے اور کون شاگرد ہوگا کہ ایسے شفیق استاذ سے اپنے شبہات صاف نہ کرلیتا ہوگا؟
اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ مسائل فقہیہ میں جو جو شبہات مخالف حدیث کے محدثین کو ہونا چاہیئے وہ سب امام صاحب کے حلقۂ درس میں پیش ہو چکے اور اُن کے جوابات معلوم ہونے کے بعد صدہا محدثین نے اُن کو مدون کرنے کی اجازت دی ہے، جس سے ثابت ہے کہ فقہ کا ہر ایک مسئلہ صدہا اساتذۂ محدثین کے اتفاق سے طے ہو چکا ہے۔

امام صاحب کے ساٹھ ہزار تراسی اقوال ہیں

م۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اسلام میں ابو حنیفہ کے ساٹھ ہزار قول ہیں انتہی۔ یعنی اتنے مسئلے فقہ کے آپ نے لکھے ہیں یہ روایت نقل کرکے امام موفقؒ نے ایک ثقہ کا قول ذکر کیا ہے کہ تراسی ہزار (83,000) مسئلے امام صاحب نے لکھے ہیں، جن میں اڑتیس ہزار عبادات میں ہیں اور پینتالیس ہزار (45,000) معاملات میں۔
چونکہ امام مالکؒ امام وقت اور مرجع اہلحدیث تھے اور علاوہ اس کے آپ کی اقامت

مدینہ طیبہ میں تھی، جہاں محدثین اور علماء کا آنا ضروری ہے، اس لئے امام صاحب کے حلقۂ درس میں جو محدثین شریک رہتے تھے اُن سے بھی ملاقات ہوا کرتی تھی، اُن کی زبانی مسائل فقہ کی تعداد جو بتواتر معلوم ہوئی اُس کی انہوں نے خبر دی، اسی وجہ سے کوئی شک کا لفظ نہیں فرمایا اور نہ اس امر سے انکار اور نفرت ظاہر کی۔ یہ بات قابل تصدیق ہے کہ اگر یہ مسائل فقہیہ جس کی خبر امام مالکؒ نے دی ہے اگر خلاف قرآن وحدیث ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ کھلے طور پر کہہ دیتے کہ وہ سب خلاف قرآن وحدیث ہیں اور کم سے کم اپنی نارضامندی تو اُس سے ظاہر کرتے، مگر نارضامندی کیسی؟ وہ تو امام صاحب کے اقوال کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ امام موفقؒ نے ''مناقب'' میں لکھا ہے کہ محمد بن عمر الواقدی کہتے ہیں کہ امام مالکؒ اکثر ابوحنیفہؒ کے اقوال کی تلاش کیا کرتے، اگرچہ ظاہراً بیان نہ کرتے، مگر اکثر اُن اقوال کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ انتہی۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر اُن کے اور امام صاحب کے اقوال میں مطابقت یا مناسبت ہوا کرتی ہے، جیسا کہ کتب فقہ سے ظاہر ہے۔

امام صاحب کے تلامذہ کے اختلاف کی وجہ

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ امام صاحب کے تلامذہ نے امام صاحب سے جو اختلاف کیا ہے اُس کی کیا وجہ؟

اُس کا جواب موفقؒ نے ''مناقب'' میں لکھا ہے کہ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ جن مسائل میں ابو یوسفؒ نے امام صاحب کا خلاف کیا ہے اُس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے امام صاحب کے اقوال کی وجہ نہیں سمجھی انتہی۔

فی الحقیقت امام صاحب کی نظر نہایت غامض تھی۔ چنانچہ پیشتر اس کا حال معلوم ہوا۔ اور امام ابو یوسفؒ خود بھی کہتے ہیں کہ جس مسئلہ میں میرا اور امام صاحب کا قول موافق ہوگیا تو میرے دل میں قوت اور نور پیدا ہوتا تھا اور جس مسئلہ میں اُن کے قول کو چھوڑ دیا تو دل میں ضعف اور شک پہاڑوں کے برابر رہتا تھا۔

خالد بن صبیحؒ کہتے ہیں کہ یہ بات میں نے خود ابو یوسفؒ سے سنی ہے۔ **ذکرہ الامام الموفق فی المناقب۔**

قرائن پر غور کرنے سے اس اختلاف کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ جن مسائل کی تحقیق کے وقت وہ غیر حاضر رہے اور امام صاحب کی تقریر اُن مسائل میں نہیں سنی اُن میں غور اور اجتہاد کرنے کی اُن کو ضرورت ہوئی، ورنہ تقریر اگر سن لیتے تو خود حالت اذعانی اور انکشافی پیدا ہوجاتی۔ جس کے بعد اجتہاد کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ کیونکہ وہاں یہ قاعدہ ٹھہرا ہوا تھا کہ جب تک کوئی مسئلہ پورے طور پر طے نہ ہوجاتا لکھنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض مسائل میں ایک ایک مہینے تک مناظرے ہوتے رہتے اور اثنائے مناظرہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ امام صاحب اپنے قول سے رجوع کرجاتے تھے، مگر آخری تقریر جس پر فیصلہ کا انحصار تھا ایسی ہوا کرتی تھی کہ اُس کے مقابلہ میں کوئی سر نہ اُٹھا سکتا، بلکہ سب کے دلوں میں اُس سے ایک انبساطی کیفیت پیدا ہوتی، جس سے بے اختیار نعرۂ اللہ اکبر بلند ہوتا تھا۔

الغرض جب تمام اہل حلقہ اُس کو تسلیم کرلیتے، اُس وقت امام صاحب اُس کو لکھنے کا حکم دیتے۔ یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں کہ امام ابو یوسفؒ جیسے شخص کسی مسئلہ میں اپنا شک بیان کرتے رہیں اور امام صاحب اُس پر توجہ نہ کرکے اُس مشکوک مسئلہ کو طے شدہ مسئلوں میں تصور کرلیتے ہوں گے۔ پھر طرفہ یہ کہ امام صاحب ابو یوسفؒ ہی کو طے شدہ مسائل لکھنے کو کہا کرتے تھے جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ اگر اُن کو کسی مسئلہ میں شک رہ جاتا تو کہہ دیتے کہ حضرت خود مجھی کو اس میں اب تک شک باقی ہے، پھر اُس کو طے شدہ مسائل میں کیونکر لکھوں؟ بہرحال یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ابو یوسفؒ کسی مسئلہ کی تحقیق میں شریک رہے ہوں اور اُن کو شک رہ گیا ہو۔

ہاں ! یہ ممکن ہے کہ بعض مسائل کی تحقیق میں وہ شریک نہ ہوسکے ؛ کیونکہ تدوین فقہ سالہاسال سال ہوتی رہی ، اس مدت مدیدہ میں بالالتزام ہرروز صبح سے شام تک حاضر رہنا تقریباً ناممکن تھا ، اس غیر حاضری کے زمانہ میں جو مسائل طے ہوگئے تھے اُن میں اُن کو اجتہاد کرنے کی ضرورت تھی ؛ کیونکہ وہ بھی آخر مجتہد تھے ، پھر امام صاحب کے جن اقوال کی وجہ اُن کی سمجھ میں نہ آئی مجبوراً انہوں نے اُن میں خلاف کیا ۔

''اذاصح الحدیث فهو مذهبی'' کا مطلب

اگرچہ مقتضائے قیاس یہ تھا کہ حنفی المذہب کو صرف ابوحنیفہؒ کی اتباع چاہئے ، ابو یوسفؒ کا قول ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ، مگر چونکہ ابو یوسفؒ امام صاحب کے اعلیٰ درجہ کے شاگرد ہیں ، اورانہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ اپنا ذاتی کوئی قول نہیں بلکہ امام صاحب کے کسی قول کو اختیار کرلیتے ہیں ، اس لئے اُن کی اتباع بھی امام صاحب ہی کی اتباع ہے ، چنانچہ ردالمحتار میں لکھا ہے :۔ ''و فی اٰخر الحاوی القدسی : و اذا اخذ بقول واحد منهم يعلم قطعاً انه يكون به اٰخذا بقول ابی حنيفة ، فانه روی عن جميع اصحابه من الكبار كأبی يوسف و محمد و زفر والحسن ، انهم قالوا '' ماقلنا فی مسئلة قولا الا وهو روايتنا عن ابی حنيفة '' و اقسموا عليه ايماناً غلاظاً''

دیکھئے جب ابو یوسفؒ وغیرہ تلامذۂ امام صاحب سخت سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ کوئی قول اُن کا ذاتی نہیں بلکہ وہ بھی امام صاحب ہی کے قول ہیں ، تو اُن حضرات کی اتباع سے حنفی شخص حنفیت سے خارج نہیں ہوسکتا ، کیونکہ ممکن ہے کہ جو قول امام صاحب کی طرف منسوب ہے وہ مرجوع عنہ ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ جب ایک مسئلہ میں متعدد قول امامؒ صاحب کے مروی ہوں تو قطعی طور پر مفتی بہ قول معلوم کرنا ہر شخص کا کام نہیں ۔ اس لئے

فقہائے حنفیہ میں جواصحاب الترجیح سمجھے گئے ہیں انہوں نے جس روایت کومفتی بہ کہد یا وہی امام صاحب کامفتیٰ بہ قول سمجھا جائے گا،جس سے تقلید شخصی امام صاحب کی ثابت ہوگی۔

اس مقام میں صاحب ردالمحتار نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جوقول امام صاحب کا ظاہر الروایہ سے خارج ہووہ مرجوع عنہ ہے،اس لئے ابو یوسف وغیرہ کے اقوال پرعمل جائز نہ ہونا چاہئے۔اس لئے کہ ہم حنفی ہیں یوسفی وغیرہ نہیں۔

پھراُس کا یہ جواب دیا ہے کہ امام صاحب نے اُن صاحبوں کواجازت دی تھی کہ جوقول اپنی دانست میں مُوَجَّہ پائیں اُسی پرعمل کریں۔اور یہ بھی فرمایا تھا کہ ''**اذا صح الحدیث فھو مذھبی**'' اس وجہ سے ان حضرات نے جس قول کومطابق حدیث پایا اُس پرعمل کیا، اِس صورت میں ظاہرالروایہ سے خارج اقوال بھی **من جمیع الوجوہ مرجوع عنہ** نہ ہوئے اوراُن کی اتباع سے ہماری حنفیت میں فرق نہ آئیگا۔انتہی ملخصاً۔

اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ظاہرالروایہ کے کسی قول سے امام صاحب نے رجوع کیا ہی نہیں۔ابو یوسفؒ صاحب نے ظاہر حدیث پرعمل کیا ہے،تو بھی ابو یوسفؒ حنفیت سے خارج نہیں ہوسکتے۔اس لئے اگروہ مجتہد بھی ہیں تو مجتہد فی المذہب ہیں مجتہد مطلق نہیں۔ کیونکہ جوقواعد اجتہاد امام صاحب نے قرار دیئے ہیں وہ اُن سے خارج نہیں ہوسکتے تھے، اس لئے اصحاب الترجیح اگرامام ابو یوسفؒ کے قول پرمثلاً فتویٰ دیں تو وہ بھی دراصل امام صاحب ہی کا قول سمجھا جائیگا۔

یہ بات یادرہے کہ ''**اذا صح الحدیث فھو مذھبی**'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف اسناد کی صحت کافی بلکہ کسی حدیث پرعمل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ حدیث منسوخ نہ ہو؛ حالانکہ منسوخ حدیث کی اسناد صحیح بھی ہوا کرتی ہے اور یہ بھی ضرور ہے کہ قرآن کے یا قیاس صحیح کے معارض نہ ہوجیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حدیث ''**من قال لا الہ الا اللہ**'' پرعمل نہیں کیا،اس وجہ سے کہ قیاس صحیح کے معارض تھی۔

غرضکہ آخری زمانہ والے امام صاحب کے اس قول سے نفع نہیں اُٹھا سکتے، اس لئے کہ جب تک آدمی مجتہد نہ ہو تمامی ضروری امور کی پابندی کر کے حدیث سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں کر سکتا۔

توثیقِ کتبِ فقہ

تقریر بالا سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امام صاحب نے صدہا محدثین کے مجمع میں ہزار ہا مسئلے فقہ کے قرآن و حدیث سے استنباط کئے اور اُن کے اتفاق آراسے فن فقہ کو مدون کیا۔
اب ہم چند اقوال اکابر محدثین کے نقل کرتے ہیں جو فقہ حنفیہ کے باب میں وارد ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ محدثین رحمہم اللہ کتب فقہ کو کس وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔
م ک۔ عبداللہ بن داؤد الخریبی کہتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ جہل کی ذلت سے نکل کر فقہ حاصل کرے اُس کو چاہئے کہ ابوحنیفہ کی کتابوں کو دیکھے۔
دیکھئے انہوں نے فقہ حنفیہ کو ''علم'' اور اُس کے نہ جاننے کو ''جہل'' قرار دیا۔
ک۔ حرملہ کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ابوحنیفہ کی کتابیں نہ دیکھے اُس کو فقہ میں تبحر نہیں ہو سکتا۔
سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک بارِ شتر علم حاصل کیا ہے۔ اور اُس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ کے کم نظروں کو اس روایت سے تعجب ہوگا اور اُس کو حنفیوں کی من گھڑت سمجھیں گے، مگر اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ نووی نے، جو مشہور محدث ہیں، اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ دیکھو تہذیب الاسماء واللغات نووی۔
ترجمۂ امام محمد کشف بزدوی میں لکھا کہ ابی عبید قاسم بن سلام امام شافعی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ جو فقہ سیکھنا چاہے تو ابوحنیفہ کے اصحاب کی صحبت اختیار کرے، خدا کی قسم! میں صرف ابوحنیفہؒ کی کتابوں کے مطالعہ سے فقیہ ہوا، اگر اُن کا زمانہ

میں پاتا تو اُن کی مجلس کو کبھی نہ چھوڑتا۔

م ص ۔عبداللہ بن مبارک نے ایک روز یہ روایت بیان کی : **"حدثنا زائدة ، عن هشام ، عن الحسن قال : انظروا ممن تاخذون هذا الحديث فانه دينكم"** ۔یعنی حسن بصری نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ حدیث کو دیکھ سمجھ کے لیا کرو کیونکہ وہ تمہارا دین ہے۔

ابن مبارک نے یہ روایت بیان کر کے کہا کہ جب حدیث کو ثقہ سے لینے کی ضرورت ہے تو رائے تو بطریق اولیٰ ثقہ سے لیجائے۔ پھر کہا: جب کوئی ثقہ تم سے ابوحنیفہ کا قول بیان کرے تو اُس کو معتبر سمجھو۔

دیکھئے! ابن مبارکؒ نے فقہ کو کس قدر مہتم بالشان سمجھا کہ اُس کو بھی مثل حدیث کے ثقہ سے لینے کی ضرورت بیان کی۔

ص ۔ابواسحٰق کہتے ہیں کہ مجھے اُن لوگوں پر رحم آتا ہے جن کو ابوحنیفہ کے علم سے کچھ نصیب نہ ہوا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو فقہ سے عاری ہیں۔

امام صاحب نے فقہ کی تدریس کی

م ۔عبدالعزیز بن خالد الصفانی کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ کی کتابیں اُن سے پڑھیں اور بعد فراغت، میں اُن سے پوچھا: کیا ان کتابوں کی روایت آپ سے کروں؟ آپ نے اُس کی اجازت دی، میں نے کہا: کیا **سمعت** کا لفظ بھی کہوں؟ فرمایا: **سمعت** اور **حدثنی** اور **اخبرنی** سب کے ایک معنی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ فقہ کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی جاتی تھیں اور مثل حدیث اُن کی روایت کی جاتی تھی۔

م ۔ حفص بن غیاث کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے اُن کی کتابیں پڑھیں اور آثار سنے۔ کسی شخص کو نہ اُن سے زیادہ ذکی پایا نہ اُن امور کا عالم جو احکام کے باب میں فاسد اور صحیح ہیں۔

م ک ۔ یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ وہب بن جریر سے میں نے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ میرے والد جریر بن عازم ابوحنیفہ کی کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب مجھے دیا کرتے اور وہ اُن لوگوں میں ہیں جو امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے۔

جریر بن عازم کا حال ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے کہ وہ تابعی ہیں۔

حماد بن سلمہ جن کی جلالتِ شان محدثین پر پوشیدہ نہیں، سب سے زیادہ اُن کی تعظیم کرتے تھے اور شعبہ استفادہ کی غرض سے اُن کے یہاں آیا کرتے۔ امام احمد کہتے ہیں کہ وہ صاحب سنت تھے۔

اب غور کیجئے کہ ایسے جلیل القدر امام، صاحب سنت جب خود امام صاحب کے حلقہ میں بیٹھتے ہوں اور اپنے فرزند کو اُن کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دیتے ہوں تو فقہ حنفیہ کو کس قدر موثق کہنا چاہئے؟

اور یہ بات مکرر معلوم ہوچکی کہ امام صاحب کا استدلال قرآن و حدیث سے ہوتا تھا، اس لئے کسی کو چوں و چرا کی گنجائش نہ ہوتی؛ بلکہ اُس سے ایک اذعانی اور انشراحی کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی تھی، اس قرینہ سے اگر جریر کو حنفی المذہب کہیں تو بھی بے اصل و بے موقع نہ ہوگا۔

اب اگر جریر جیسے جلیل القدر تابعی کا قول و فعل بھی قابل اعتبار نہ سمجھا جائے تو اُس کا علاج نہیں!

ک ۔ محمد بن داؤد کہتے ہیں کہ میں ایک بار عیسیٰ بن یونس کے پاس گیا، دیکھا کہ ابوحنیفہ کی کتابیں اُن کے روبرو رکھی ہیں اور وہ پڑھ رہے ہیں، میں نے کہا: کیا آپ اُن سے روایت

کرتے ہیں؟ کہا: میں اُن کی زندگی میں اُن سے راضی تھا، کیا انتقال کے بعد ناراض ہو جاؤں؟

جو شخص فقہ نہ پڑھے گمراہ ہے

م ک۔ معروف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں ایک بار علی بن عاصم کے یہاں تھا، انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا: تم لوگ علم اور فقہ سیکھو! ہم نے کہا: کیا آپ سے جو ہم سیکھتے ہیں وہ علم نہیں؟ فرمایا: اگر علم پوچھو تو ابو حنیفہ کا علم ہے۔

اور لکھا ہے کہ علی بن عاصم کو امام صاحب کے ساتھ ایسا خلوص تھا کہ طالب علموں کو جب منظور ہوتا کہ اُن کو خوش کریں تو امام صاحب کا ذکر چھیڑ دیتے، وہ نہایت خوشی سے بہت سے حالات اور واقعات امام صاحب کے بیان کرتے۔

اُن کا قول ہے کہ اگر ابو حنیفہ کے علم کے ساتھ اُن کے تمام زمانہ والوں کا علم تولا جائے تو انہی کا علم وزن میں غالب ہوگا۔

اور یہ بھی فرماتے کہ جو شخص ابو حنیفہؒ کے اقوال کو نہ دیکھے وہ جہل کی وجہ سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیگا اور گمراہ ہو جائیگا۔ انتہی۔

''تذکرۃ الحفاظ'' میں علی بن عاصم کی تعریف میں لکھا ہے ''**الامام الحافظ کان من اهل الدین و الصلاح و الخیر البارع و کان شدید التقوی**''۔

دیکھئے! ایسے دیندار، متقی امام المحدثین جب یہ فرمارہے ہیں کہ ''**العلم علم ابی حنیفة**'' اور ''جو شخص فقہ نہ پڑھے وہ گمراہ ہے'' تو فقہ حنفیہ کس قدر قابل وثوق ہوئی؟ کیا ممکن ہے کہ ایسے متقی حضرات ایسی چیز کی تعریف کئے ہوں جو خلاف قرآن و حدیث ہو؟ پھر جب فقہ حنفیہ کے ترک کرنے کو وہ باعث ضلالت کہتے ہیں تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام صاحب کے مقلد تھے۔

م ک ۔ محمد ابن سعدان کہتے ہیں کہ میں اور یحییٰ بن معین اور علی بن المدینی اور احمد بن حنبل اور زہیر بن حرب وغیرہ محدثین یزید بن ہارون کے یہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے اُن سے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ اہل علم کے یہاں جاؤ! علی بن مدینی نے کہا: کیا وہ آپ کے پاس نہیں آئے؟ یعنی آپ خود اہل علم میں ہیں۔ فرمایا: اہل علم اصحاب ابو حنیفہ ہیں اور تم لوگ عطار ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ عمل کرنے کے لئے وہ فقہ ہی کو خصوصاً فقہ حنفیہ کو ضروری سمجھتے تھے اور حدیث کا کتنا ہی سرمایہ ہو اُن کی دانست میں فتویٰ کے لئے کافی نہ تھا۔

م ۔ ابو مسلم نے یزید بن ہارون سے پوچھا کہ ابو حنیفہ اور اُن کی کتابوں کے باب میں آپ کیا فرماتے ہو؟ کہا: اگر تم چاہتے ہو کہ فقاہت اور سمجھ حاصل ہو تو اُن کی کتابوں کو دیکھو! میں نے کسی فقیہ کو نہیں دیکھا کہ اُن کے اقوال کے دیکھنے کو مکروہ سمجھا ہو۔ سفیان ثوری نے اُن کی کتاب الرہن کو تدبیر سے حاصل کر کے اس کی نقل لی۔

دیکھئے! اُس زمانہ کے فقہاء جو اعلیٰ درجہ کے محدث ہوا کرتے تھے جیسا کہ ''تذکرۃ الحفاظ'' وغیرہ کتب رجال سے ظاہر ہے، اگر فقہ حنفیہ کو مخالف احادیث پاتے تو اُس کے مطالعہ سے روکنا اُن کا فرض تھا؛ حالانکہ بجائے روکنے کے اُس کے مطالعہ کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

م ک ص ۔ یزید بن ہارون سے کسی نے پوچھا: آدمی کب فتویٰ دینے کے لائق ہوتا ہے؟ کہا: جب ابو حنیفہ کے جیسا ہو، پھر فرمایا کہ اُن کی کتابوں اور علم سے آدمی مستغنی نہیں ہوسکتا اُن سے آدمی کو سمجھ پیدا ہوتی ہے۔

سابقاً یہ معلوم ہوا کہ یزیدن بن ہارون کو حدیثیں اِس کثرت سے یاد تھیں کہ اس باب میں وہ ضرب المثل تھے، اُن کے تلامذہ کی یہ کثرت تھی کہ اُن کا شمار نہیں ہوسکتا، اُن کے

حلقۂ درس میں کم وبیش ستر ہزار طالبینِ حدیث جمع رہتے تھے۔ اور اُن کے تدین کی یہ کیفیت تھی کہ خلیفۂ وقت اُن کے خوف سے ایک بات خلاف حدیث شائع نہ کرسکا۔

اب غور کیا جائے ! کیا ممکن ہے ایسے جلیل القدر، راست باز، مرجع خلائق، امام المحدثین نے امام صاحب کے علم یعنی فقہ کی تعریف کسی کے خوف یا رعایت سے کی ہوگی؟ خلیفۂ وقت کو تو انہوں نے صاف کہلا دیا کہ غیر معروف بات کو رواج دینا جائز نہیں جیسا کہ "تذکرۃ الحفاظ" میں ہے اور فقہ کی نسبت فرمارہے ہیں کہ علم پوچھو تو وہی ہے اور محدثین کو اُس سے بہرہ نہیں اور فقہ کی کتابیں دیکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور کسی نے پوچھا تک نہیں کہ حضرت فقہ تو بدعت اور ابوحنیفہ کی رائے ہے، جس پر عمل کرنے سے آدمی مشرک بن جاتا ہے، اُسی کو آپ علم کہہ رہے ہو۔

پھر یحییٰ بن معینؒ جیسے محدث کو جو جرح وتعدیل میں نہایت متشدد شخص ہیں، صاف کہہ دیا کہ تم لوگ عطار ہو اور وہ دم نہ مار سکے بلکہ وہ بھی ہمیشہ امام صاحب کے مداح ہی رہے؛ یہاں تک کہ اُن کے اقوال کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی المذہب تھے، کیا اتنے قرائن کے بعد بھی کوئی منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ فقہ حنفیہ مخالف قرآن وحدیث ہے؟

ک ۔ محمد بن یزید کہتے ہیں کہ میں عامرؒ کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا، ایک بار انہوں نے کہا: کیا تم نے ابوحنیفہ کی کتابیں بھی دیکھی ہیں؟ میں نے کہا: میں حدیث طلب کررہا ہوں، مجھے اُن کی کتابوں سے کیا مطلب؟ فرمایا: میں ستر (70) سال آثار طلب کرتا رہا مگر جب تک ابوحنیفہ کی کتابیں نہیں دیکھیں اچھی طرح استنجا کرنے کا طریقہ بھی مجھے معلوم نہ ہوا!۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اکابر محدثین، فقہ حنفیہ کو کس قدر ضروری سمجھتے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ امام صاحب کے مقلد تھے۔

ک ۔ عطیہ بن اسباط کہتے ہیں کہ ابن مبارک جب کوفہ کو آتے تو زفرؒ سے امام

صاحب کی کتابیں مستعار لیکر اُن کی نقل لیتے، ایسا کئی بار اتفاق ہوا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ امام مالک افقہ ہیں یا ابوحنیفہ؟ فرمایا: ابوحنیفہ تمام روئے زمین کے لوگوں سے افقہ ہیں۔ انتہی۔

ابن مبارکؒ جو بار بار امام صاحب کی کتابوں کی نقل لیا کرتے تھے، اِس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں فقہ کی کتابیں بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ اور باوجود یکہ وہ مدتوں امام صاحب کی صحبت میں رہ چکے تھے مگر امام صاحب کے علوم سے اُن کو سیری نہ ہوئی اور فقہ کی کتابوں کے شیدا تھے۔

م۔ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ علماء میں ''قاضی القضاۃ'' ہیں۔

عبدالرحمٰن بن مہدی وہ شخص ہیں کہ امام ذہبیؒ نے اُن کو ''**الحافظ الکبیر و العلم الشھیر**'' لکھا ہے اور امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ یحییٰ بن قطان سے بھی افقہ ہیں اور لکھا ہے کہ ابن مدینی قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ اُن کا مثل میں نے نہیں دیکھا۔

جب ایسے جلیل القدر محدث نے امام صاحب کو ''قاضی القضاۃ'' علماء کے زمرہ میں قرار دیا تو علماء کے اختلافی مسائل میں اُن کا فیصلہ قابل نفاذ سمجھا جائیگا۔ اسی فیصلہ کو حنفیہ نے اپنا دستور العمل قرار دیا۔ اب اِس فیصلہ پر طعن کرنا اہل حدیث کی شان سے بعید ہے۔

م۔ یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ حسن بن صباح ابن حی الہمدانی کے روبرو ابوحنیفہ کے واقعات اور مسائل فقہیہ بیان کئے جاتے تو وہ اُن کی تحسین کیا کرتے تھے۔

تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ حسن بن صباح بڑے متقی اور فقیہ اور زاہد شخص تھے، اُن کے مزاج میں اس شدت کی احتیاط تھی کہ حکام کے فسق و فجور کی وجہ سے جمعہ کی نماز درست نہیں سمجھتے تھے۔

عبداللہ بن داؤد الخریبی کہتے ہیں کہ کسی مسجد میں میں امامت کیا کرتا تھا ایک روز میں نے ابوحنیفہؒ کی تعریف کی، جب نماز کے لئے کھڑا ہوا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مصلے

سے ہٹا دیا۔لکھا ہے کہ اس واقعہ سے پیشتر خریبیؒ حسن بن صباح کی تعریف کیا کرتے تھے اور اس کے بعد نہ انھوں نے ان کی تعریف کی نہ اُن سے روایت کی بلکہ بددعاء کیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں وہ مخالفوں کے کہنے سننے سے امام صاحب کے سخت مخالف تھے، پھر جب واقعی حالات امام صاحب کے اُن کو معلوم ہو گئے تو بجائے مخالفتِ فقہ حنفیہ کی تحسین کرنے لگے،جس کی گواہی یحییٰ بن آدم دے رہے ہیں۔کیوں نہ ہو وہ خود فقیہ اور مجتہد تھے،جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

التعلیق الممجد میں مولانا عبدالحیؒ نے انساب سمعانی سے امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جس مسئلہ میں تین شخصوں کا اتفاق ہو تو اُن کی مخالفت سننے کے قابل نہیں۔ کسی نے پوچھا: تین شخص کون؟ فرمایا: ابوحنیفہ اور ابویوسف اور محمد بن الحسنؒ۔

م۔ ابونمیلہ کہتے ہیں کہ محمد بن طلحہ نے مجھ سے کہا کہ جب تم ابوحنیفہ کا قول کسی ثقہ سے پاؤ تو اُس پر اعتماد کرو کیونکہ اُن کا جو قول ہوتا ہے وہ نہایت پختہ ہوتا ہے۔ یہ کتب فقہ جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں امام صاحب ہی کے پختہ اقوال ہیں جو ثقات کے ذریعہ سے ہم تک پہونچے ہیں۔

م ص۔ یزید بن ہارون کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا مثل اُن کے فن یعنی فقہ میں متقدمین میں بھی کوئی سنا نہیں گیا،اُن کے اقوال کو وہی شخص دوست رکھتا ہے جو ذکی ہو اور وہی اُن کو ضبط کرتا ہے جو ذی فہم ہو۔

فقہائے حنفیہ کا ذکی اور ذی فہم ہونا اور فقہ حنفیہ ''محبوب القلوب'' ہونا ایسے جلیل القدر امام المحدثین کے ارشاد سے ثابت ہے۔

ان روایتوں سے فقہ حنفیہ کی توثیق صراحۃً ثابت ہے، ان کے سوا جتنی روایتیں امام صاحب کی تفقہ کی تعریف وتوصیف میں وارد ہے جو بکثرت منقول ہیں جن میں سے اکثر لکھی

گئیں، وہ سب کتبِ فقہ کی توثیق پر دال ہیں، کیونکہ اس تفقہ کا نتیجہ علم فقہ اور کتب فقہیہ ہیں۔

م ک۔ ابوعبدالرحمٰن مقری کہتے ہیں کہ جو لوگ فقہ اور اُس کی فضیلت اور تقدم کو نہیں جانتے وہ زندہ نہیں بلکہ مردے ہیں۔

غرضکہ اکابر محدثین نے فقہ حنفیہ کی توثیق و تحسین کی اور اُس کو سبقاً سبقاً پڑھا اور اُس کے مطالعہ کو ترغیبیں دیں۔ اور فرمایا کیئے کہ اگر علم ہے تو وہی فقہ ہے، جہل سے نکلنے کے لئے اُس کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اُس کے بغیر تبحر حاصل نہیں ہوسکتا بلکہ اُس سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا، بغیر اس کے کوئی مسئلہ پورے طور پر معلوم نہیں ہوسکتا؛ حتی کہ استنجا کرنا۔ اور نہ حلال وحرام اور حق و باطل میں بغیر اس کے آدمی تمیز کرسکتا ہے اور اسی کو اختلافی مسائل میں قولِ فیصل اور اُس پر اجماع ہونے کی خبریں دیں۔

اب غور کیجئے کہ ایسی مستند چیز کی نسبت آخری زمانہ والوں کا یہ کہنا کہ "فقہ مخالف حدیث ہے" کس قدر بے باکی ہے؟

یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتی ہے کہ مخالفتِ حدیث تو وہ شخص جانے جس کو احادیث کا مطلب اور مواقعِ استدلال معلوم ہوں!۔ اور جب اعمش اور اوزاعی جیسے اکابر شیوخ محدثین نے اپنے قصور فہم کا اعتراف کر کے امام صاحب سے صاف کہدیا کہ یہ آپ ہی کا کام ہے، ہم سے نہیں ہوسکتا۔ تو آخری زمانہ کے مولوی چند کتابیں پڑھ کر اور اُن کا لفظی ترجمہ کر کے فقہ کو مخالفِ حدیث بتائیں تو یہ کس قسم کی بات ہوگی؟

امیر المومنین فی الحدیث فرما رہے ہیں کہ احادیث کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے، یعنی فقہ کی اور یہ حضرات کہتے ہیں کہ فقہ کے لئے ہماری ضرورت ہے کہ کونسا مسئلہ موافقِ حدیث ہے اور کونسا مخالف تاکہ اُس کی تنقید کریں۔

مسائلِ فقہ کے دلائل اس وقت طلب کرنا بے موقع ہے

اگر اہل انصاف غور فرمائیں تو بآسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ جب اکابر محدثین نے ردو قدح، تحقیق وتنقید کے بعد فقہ کو تسلیم کرلیا تو اب از سرنو اس امر کی تحقیق کہ کونسا مسئلہ موافقِ حدیث ہے اور کونسا مخالف۔ تکلیف مالا یطاق ہے۔

اس لئے ہر مسئلہ کہ تحقیق امام صاحب نے محدثین کے ایسے مجمع میں کی کہ جس میں تمام روئے زمین کے محدثین کا سرمایہ حدیث موجود تھا اور ایک ایک مسئلہ میں کئی کئی روز بحث ہوتی رہی جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ اب وہ سرمایۂ حدیث کہاں؟ اُس کو تو خود محدثین نے کھودیا اور موقع استدلال اور طریقۂ استخراج جو خاصہ امام صاحب کا تھا اُس کو جاننے والا کون ہے؟ اور ہر مسئلہ میں جو مناظرہ ہوتا تھا وہ قلمبند تو ہوا ہی نہیں؛ جس سے تمام دلیلیں بالتفصیل معلوم ہوں بلکہ طے ہونے کے بعد صرف حکم لکھدیا جاتا تھا۔

پھر ہر مسئلہ کی دلیلیں معلوم ہونے کی کیا صورت؟ مقلدوں سے اس وقت دلائل طلب کرنا اُن کو مجتہد قرار دینا ہے، جو ظلم اور تکلیف مالا یطاق ہے۔ اگر اس وقت مخالفینِ اسلام مسلمانوں سے کہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے ثابت کرنے کی غرض سے شق القمر وغیرہ معجزے دکھلائے ہیں تو تم بھی وہی معجزے دکھلاؤ تاکہ ہم بھی ایمان لائیں تو کیا اُن کا یہ قول قرین انصاف ہوگا؟ ہرگز نہیں! ہم اُن کے جواب میں یہی کہیں گے کہ معجزے دکھانا نبی کا کام ہے، سو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزارہا معجزے دکھلا کر ایک لاکھ سے زیادہ کافروں کو مسلمان بنایا، ہمارے لئے یہی حجت کافی ہے کہ اُن لاکھ مسلمانوں سے کروڑہا مسلمانوں نے اسلام حاصل کیا، جو ہم تک بتواتر پہونچا ہے۔ اسی طرح فقہی مسائل کی دلائل طلب کرنے والوں سے ہم یہی کہیں گے کہ دلائل قائم کرنا امام مجتہد کا کام ہے، سو ہمارے امام نے بفضلہٖ تعالیٰ اکابر محدثین کے مجمع میں دلائل قائم کرکے اُن کو منوادیا

اور احکامِ خدا و رسول پہونچا کر راہی ملک بقا ہوئے۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ جو احکام بتواتر ہم تک پہونچے ہیں یعنی ہزار ہا کتب فقہ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ امام صاحب کے اقوال ہیں، اُن کو تقلیداً مان لیں، ہم امتی مقلدوں کو نہ معجزے دکھلانے کی ضرورت ہے نہ دلائل قائم کرنے کی احتیاج۔ اس پر بھی فقہا نے رہی سہی حدیثوں سے بہت کچھ استدلال پیش کر دیئے ہیں، جو مقلدوں کے مزید اطمینان کے لئے کافی ہیں۔

الحاصل امام صاحب کا تجرِ علمی اور قوتِ اجتہادی اور سب سے زیادہ احادیثِ احکام کو جاننا اور محدثین کے مقابلہ میں مسائل کا طے ہونا اور اُن کے اقوال میں احادیث کے مضامین محفوظ ہو جانا اور اُن کا قول پختہ اور قابل قبول ہونا جب اکابر محدثین کی شہادتوں سے ثابت ہو گیا تو ان حضرات کے صدق بیانی کے اعتماد پر ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ امام صاحب کا کوئی قول مخالفِ حدیث نہیں اور بعض اقوال جو ظاہراً مخالفِ حدیث معلوم ہوتے ہیں وہ دراصل مخالف نہیں۔

جن محدثین پر صحیح حدیثوں کا مدار ہے، انہوں نے فقہ کو مطابقِ حدیث کہا

اب اور سنئیے! ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام ذہبیؒ نے ابن المدینیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اکثر احادیثِ صحیحہ کے اسنادوں کا مدار ابن شہاب اور عمرو بن دینار اور قتادہ اور یحییٰ بن کثیر، ابو اسحاق اور اعمش رحمہم اللہ پر ہے، پھر ان حضرات کا علم امام مالک اور ابن اسحٰق اور ابن جریج اور ابن عیینہ اور سعید بن عروبہ اور حماد بن سلمہ اور ابو عوانہ اور شعبہ اور سفیان ثوری اور اوزاعی اور ہشیم رحمہم اللہ کی طرف منتقل ہوا، پھر اُن کا علم یحییٰ بن قطان اور یحییٰ بن زکریا اور ابی زائدہ اور وکیع رحمہم اللہ کی طرف منتقل ہوا، پھر اُن کا علم ابن مبارک اور ابن مہدی اور یحییٰ ابن آدم میں آیا۔ حاصل یہ کہ ہر طبقہ کا علم یعنی صحیح صحیح حدیثیں منتقل

ہوتی ہوئی ابن مبارک اور یحییٰ ابن آدم اور ابن مہدیؒ کو پہونچیں ۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ ان تینوں حضرات نے امام صاحب کی کیسی کیسی تعریفیں کر کے فقہ کی توثیق کی اور علاوہ اُن کے مذکورہ طبقات کے اساتذہ بھی امام صاحب کے مداح اور اُن کے اجتہاد اور تفقہ کو مانتے رہے ۔ اور ظاہر ہے کہ جب صحیح روایتوں کا مدار انہی حضرات پر ہے تو صحاح ستہ کا مدار اُن ہی کی روایتوں پر ہوا ۔

غرضکہ ان حضرات کی گواہیوں سے یہ تو یقیناً ثابت ہو گیا کہ ''فقہ'' احادیث کے بڑے حصہ کے تو مخالف نہیں ؛ ورنہ یہ حضرات بجائے تعریف امام صاحب کی شکایت کرتے ۔

اب رہا صحیح حدیثوں کا چھوٹا جو حصہ صحاح ستہ کے سوا دوسری کتابوں میں منقول ہے، سو دوسرے محدثین کی گواہی سے یہ ثابت ہے کہ فقہ اُس کے بھی مخالف نہیں ، ورنہ وہ حضرات جن کے اسمائے گرامی کی فہرست لکھی گئی بجائے تعریف ، شکایت کرتے ۔ ان محدثین کی توثیق سے بھی فقہ کا موافقِ احادیث ہونا ثابت ہو گیا ۔

خزانہ دارانِ حدیث نے فقہ کی توثیق کی ،کُل حدیثوں کے عالم نے فقہ حنفیہ کو مان لیا

تلقیح میں ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ خزان علم یعنی حدیث کے خزانہ دار چھ (6) شخص ہیں : (1) اعمش ' (2) امام مالک ' (3) اوزاعی ' (4) مسعر بن کدام ' (5) شعبہ اور (6) ثوری رحمہم اللہ ۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ یہ تمام حضرات امام صاحب کے تفقہ کے قائل اور مدّاح اور بعض تو مقلد رہے ، جس سے فقہ کی توثیق بخوبی ہوگئی ، اس لئے کہ ان خزانہ دارانِ حدیث کی جانچ میں جب تک فقہ موافقِ حدیث ثابت نہ ہوئی ہو ممکن نہیں کہ خلافِ واقع اُس کی تعریف و توصیف کر کے صرافان حدیث کی نظر میں اپنے آپ کو بے اعتبار بنا دیتے ، یہ تو ان حضرات کے کمال مرتبت اور علوشان پر دلیل ہے کہ باوجود امام صاحب کی

مدح سرائی اور فقہ کی قدر افزائی کے اور محدثوں کے حملوں سے بچ گئے ۔ ورنہ ''میزان الاعتدال'' وغیرہ سے تو ظاہر ہے کہ بہت سے محدث صرف اسی جرم میں دائرۂ عدالت سے خارج کر دیئے گئے کہ وہ امام صاحب کے مقلد یا مداح تھے۔

یحییٰ بن معینؒ نے جو امام صاحب کی اور فقہ حنفیہ کی تعریفیں کیں اوپر مذکور ہوئیں، یہاں قابلِ بحث یہ بات ہے کہ اگر بالفرض کوئی محدث ''فقہ'' کی تعریف نہ کرتا اور صرف ابن معینؒ اُس کی تعریف وتوثیق کرتے کافی تھا، اس لئے کہ اُن کی نظر تمام حدیثوں پر تھی؛ جیسا کہ ابن المدینی کے قول سے ظاہر ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر اب تک کسی نے یحییٰ ابن معین کے برابر حدیثوں کی روایت کی ہو۔

اور کہا کہ تمام آدمیوں کا علم اُن کو پہونچا ہے۔

اور امام احمدؒ کے اِس قول سے بھی یہی ثابت ہے، جو فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو یحییٰ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔ **کما فی التذکرہ و الخلاصہ** غرضکہ اکابر محدثین کی گواہی سے ثابت ہے کہ یحییٰ ابن معین کی نظر کل حدیثوں پر تھی۔

جو لوگ فقہ کو حدیث کے مخالف کہتے ہیں اُس کا سبب اُن کی کم علمی ہے

اب غور کیجئے کہ امام صاحب کا کوئی قول اُن کل حدیثوں کے مخالف ہوتا، جو اس باب میں وارد ہیں تو وہ کبھی فقہ کی تعریف وتوصیف نہ کرتے بلکہ توہین کرنا اُن کا فرض تھا۔

اس سے امیر المومنین فی الحدیث ابن المبارکؒ کے اُس قول کی تائید بھی ہوگئی جو فرماتے ہیں کہ ''جو شخص امام صاحب کی بدگوئی کرتا ہے اُس کا سبب تنگیٔ علم ہے''۔

اس لئے کہ یحییٰ ابن معینؒ کا سا وسیع علم ہو تو معلوم ہو کہ جو قول بظاہر کسی حدیث کے مخالف ہے دوسری حدیثوں کے موافق ہے؛ جو اس باب میں وارد ہیں۔اور جس کو دوسری

حدیثیں معلوم ہی نہ ہو تو وہ چند مخالف حدیثوں کو دیکھ کر ضرور بدگوئی پر آمادہ ہو جائیگا، کیونکہ اُس کی دانست میں تو یہی ہوگا کہ امام صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، پھر کون مسلمان ہوگا کے ایسے مخالف شخص کو برا نہ کہے؟ اس سے ظاہر ہے کہ جو بعد والے بعض محدثین امام صاحب کے اقوال کو مخالف حدیث کہتے ہیں، اُن کو وہ حدیثیں پہونچی ہی نہیں، جن کے موافق وہ اقوال ہیں اور اگر پہونچی بھی تو اُن کا مطلب نہیں سمجھا، کیونکہ احادیث کا مطلب سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں۔ اس کا تصفیہ شیخ الشیوخ اعمش اور اوزاعی رحمہم اللہ نے کر دیا کہ محدثین ''عطار'' ہیں اور امام صاحب ''طبیب''۔ اور امیر المومنین فی الحدیث نے صاف کہہ دیا کہ حدیث فہمی کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے۔

اب دیکھئے کہ جو لوگ بڑے غصہ سے کہتے ہیں کہ ''فقہ کے مسئلوں کو ماننا کھلا نفاق اور حماقت ہے'' کس قدر زیادتی ہے۔ انصاف تو یہ تھا کہ یہ حضرات اپنی تنگئ علم اور کم فہمی پر افسوس کرتے ؛ مگر افسوس ہے کہ تنگی حوصلہ سے اپنا قصور نہیں دیکھتے اور اکابر محدثین پر نفاق اور بے علمی کا الزام لگاتے ہیں۔

ایک قوی اعتراض اور اس کا جواب

یہ بات اوپر معلوم ہو چکی ہے کہ پوری حدیثوں کا سرمایہ کم از کم ایک کروڑ حدیث چاہئے، جس کی خبر امام احمد بن حنبلؒ نے دی ہے اور اگر صحیح سات لاکھ حدیثیں جو امام احمد کو یاد تھیں یا ایک ہی لاکھ جو امام بخاریؒ کو یاد تھیں، موجود ہوتیں تو کسی قدر معلوم ہو سکتا کہ فقہ موافق حدیث ہے، یا مخالف۔ بخلاف اس کے جن حدیثوں پر اعتماد کر کے مخالفت بیان کی جاتی ہے وہ تو بہت تھوڑی ہیں۔

''جواہر الاصول'' میں ابوالفیض محمد بن علی الفارسیؒ نے لکھا ہے کہ بخاری و مسلم میں

بحذف مکررات صرف چار ہزار (4,000) حدیثیں ہیں، وہ بھی فقط احادیث مرفوعہ نہیں، اُن میں صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال وغیرہ بھی شامل ہیں، پھر وہ بھی صرف احکام ہی سے متعلق نہیں بلکہ اُن میں فضائل اور قصص وحکایات وغیرہ بھی شریک ہیں۔

اب صرف چند حدیثوں کو دیکھ کر فقہ کو مخالفِ حدیث قرار دینا، جس کی توثیق اکابر محدثین نے کی ہے، کس قدر ظلم و بیداد ہے؟ اور طرفہ یہ کہ لوگوں کے بہکانے کی غرض سے کہا جاتا ہے کہ جب کوئی حدیث مخالفِ مذہب پہونچی تو اُس کو چھوڑ کر کسی امام غیر معصوم کی تقلید کریں تو قیامت میں خدا کو کیا جواب دیں گے؟

درست ہے! خدائے تعالیٰ کے روبرو جوابدہی مشکل ہے! خدا کرے کہ محاسبہ کی نوبت نہ آئے۔ ورنہ اُس کا بھی جواب دینا ہمیں مشکل ہوگا کہ صدہا محدثین میں سے بخاری کو کیوں مثل معصوم بنالیا، جن کی کتاب آسمانی قرار دے کر دوسری کتابوں کو اس کے مقابلہ میں ساقط الاعتبار کردیا، کیا کوئی آیتِ قرآنی یا حدیثِ متواتر اس باب میں پہونچی تھی؟ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری کو دین میں وجاہت حاصل ہے اور اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے وہ خدائے تعالیٰ کے محبوب ہیں، تو ہمیں امیدِ قوی ہے کہ اگر یہ ہمارا خیال جرم اور قابل بازپُرس بھی ہو تو ہماری خوش اعتقادی کے باعث ہماری شفاعت وہ کریں گے۔ اسی طرح امام اعظم اکابر محدثین کے کہنے پر اپنے اور خدائے تعالیٰ کے درمیان میں جو واسطہ قرار دیا، اُس میں بھی ہمیں بڑی بڑی اُمیدیں ہیں اور بڑا عذر تو ہمارا یہ ہوگا کہ امام بخاریؒ نے کُل صحیح حدیثوں کو جمع کر کے ہم تک پہونچایا ہی نہیں، انہوں نے بلکہ کُل محدثین نے لاکھوں صحیح حدیثوں کو تلف کردیا اور محدثین ہی کی گواہیوں سے ہمیں ظن غالب ہوگیا تھا کہ امام صاحب نے حدیثوں کی مخالفت نہیں کی بلکہ اُن کے مضامین کو فقہ میں ہمارے لئے محفوظ کردیا تھا، اس لئے ہم نے اُن کی تقلید کی۔

اور چونکہ امام صاحب کو دین میں اعلیٰ درجہ کی وجاہت حاصل ہے اور خدائے تعالیٰ کے محبوب ہیں، یقین ہے کہ ہماری خوش اعتقادی ہے، ہماری شفاعت ضرور کریں گے۔ اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ بمقتضائے "**انا عند ظن عبدی بی**" حق تعالیٰ اُن کی شفاعت کو قبول بھی فرمائیگا۔ **واللہ ذو الفضل العظیم**۔

فقہ حنفیہ نہایت سرعت سے بلادِ اسلامیہ میں شائع ہوئی اور اس کا سبب

اب غور کیجئے کہ جب خزانِ حدیث اور جامعِ کُل احادیث اور وہ حضرات جن پر احادیثِ صحیحہ کا مدار ہے اور دوسرے صدہا شیوخ محدثین اپنے اپنے شاگردوں سے فقہ حنفیہ کی تعریف وتوثیق بیان کرتے ہوں گے تو کس سرعت سے وہ بلاد اسلامیہ میں پہونچ گئی ہوگی؟ کیونکہ اسلامی شہروں میں کوئی شہر ایسا خیال نہیں کیا جا سکتا جس کے سربرآوردہ محدثین ان حضرات کے فیض صحبت سے محروم رہ گئے ہوں گے۔ کیا اتنی کھلی دلیل اور واضح قرینہ کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فقہ حنفیہ ابو یوسف کی قضاءت کے باعث مشہور ہوئی جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔

م ک۔ سفیان بن عُیینہؒ کہتے ہیں کہ اوائل میں خیال کیا جاتا تھا کہ ابوحنیفہ کی رائے کوفہ کے پُل سے تجاوز نہ کرے گی، مگر تھوڑی مدت میں آفاق میں پہونچ گئی۔۔

سفیان بن عیینہؒ وہ شخص ہیں کہ "تذکرۃ الحفاظ" میں اُن کو "**العلامہ، الحافظ، الامام، الحجۃ، عُیینہ واسع العلم، کثیر" القدر**" لکھا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے ستر (۷۰) حج کئے، اکثر لوگ انہی کے ملاقات کے خیال سے حج کو جایا کرتے، اُن کے پاس خلق کا ہجوم رہتا تھا۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اُن سے زیادہ حدیث جاننے والا میں نے نہیں دیکھا۔

فقہ کی غیر معمولی شہرت جو ابن عُیینہ بیان فرما رہے ہیں کوئی قابل تعجب بات نہیں، اس

لئے کہ قطع نظر اور اسباب شہرت کے صرف ایسے جلیل القدر امام مرجع انام کا فقہ کی توثیق کرنا ایک قوی ذریعہ ہے۔

دیکھئے! جب محدثین صرف اُن کی ملاقات کے لئے حج کو جایا کرتے تھے تو اور حجاج اور محدثین اُن کی ملاقات کو کیسی نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ بلادِ اسلامیہ میں کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جس کے لوگ جوق جوق نہ جاتے ہوں گے۔ پھر جب وہ امام صاحب کے اعلیٰ درجہ کے مداح تھے۔ چنانچہ سابقاً معلوم ہوا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ امام صاحب اپنے زمانہ میں بے نظیر شخص تھے اور جس کو فقہ کی ضرورت ہو امام صاحب کے اصحاب کی صحبت اختیار کرے۔ تو غور کیجئے کہ کس سرعت سے فقہ حنفیہ کی شہرت بلادِ اسلامیہ میں ہوئی ہوگی۔

بہرحال مختلف ذرائع سے تھوڑے سے عرصہ میں فقہ حنفیہ کو وہ شہرت ہوئی کہ محدثین کو رشک ہونے لگا؛ چنانچہ صرف اس غرض سے کہ فقہ کی طرف سے لوگوں کی توجہ پھیر دیں بعض محدثین نے حدیثیں بنا ڈالیں جس کا حال اوپر معلوم ہوا۔

ک۔ ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی مجلس میں دن بھر اور رات کے ایک حصہ میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا اور لوگ طوعاً و کرہاً اُن کے منقاد ہوتے جاتے تھے۔

ابونعیمؒ کے ترجمہ میں ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ شیوخ و انساب اور رجال کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔

ابن معینؒ کہتے ہیں کہ اُن سے اور عفان سے افضل شخص میں نے نہیں دیکھا۔

احمد بن صالح کہتے ہیں کہ اُن سے اصدق میں نے نہیں دیکھا۔

اب غور کیجئے کہ ایسے جلیل القدر، اصدق محدث کی گواہی سے ثابت ہے کہ لوگ طوعاً و کرہاً امام صاحب کے منقاد ہوتے جاتے تھے، جس کی وجہ بھی انہوں نے اشارۃً بیان کر

دی، ہر وقت لوگوں کا ہجوم اُن کے ہاں رہا کرتا تھا۔ کیونکہ امام صاحب کی تقریر سننے کے بعد اہل انصاف کے دلوں میں ضرور اذعانی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی، جس سے وہ منقاد ہوجاتے اور کثرت کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس انقیاد کا مفہوم سوائے تقلید کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ رہا ''طوعاً وکرہاً منقاد ہونا'' سو اُس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب زبردستی سے اُن کو اپنے مقلد بناتے تھے، کیونکہ امام صاحب کو کسی قسم کی حکومت نہ تھی بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ امام صاحب کے دلائل ایسے مستحکم ہوتے تھے کہ کسی کو انکار کرنے کی مجال نہ تھی، اس لئے قوت دلائل کے مقابلہ میں مجبور ہوکر امام صاحب کے قول کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔

م ک۔ یحیی بن آدم کہتے ہیں کہ ''اگر ابوحنیفہ کو دنیا کا کوئی لگاؤ ہوتا تو باوجود حاسدوں کی کثرت کے اُن کا کلام آفاق میں پورے طور نافذ نہ ہوتا''۔

اس سے بھی ثابت ہے کہ تمام آفاق یعنی بلاد اسلامیہ میں فقہ حنفیہ ہی کی تقلید کی جاتی تھی۔

یہاں قابل غور یہ بات ہے کہ امام صاحب کا مذہب منتہائے بلاد اسلامیہ تک کیونکر شائع ہوا اور اکابر محدثین نے کیوں اُن کی تقلید کی؟ نہ امام صاحب کا ذاتی تسلط تھا، نہ سلطنت کی طرف سے اُن کو کسی قسم کی مدد ملی بلکہ حکومت اُن کی دشمن تھی، جس کی وجہ سے وہ قید ہوئے اور فتوے دینے سے روک دیئے گئے تھے۔ ایسی بیکسی کی حالت میں اُن کے فتوے اور فقہ کو فروغ ہونے کی کیا صورت تھی؟ بجز اس کے کوئی بات نہیں تھی کہ اُن کے صدق واخلاص، قوتِ دلائل نے اکابرِ دین کی حق پسند طبیعتوں میں پورا اثر کیا، جس سے وہ بغیر فرمائش ودرخواست کے اُن کی تقلید کی۔

م۔ یحیٰ بن سعید قطان کہتے ہیں کہ جن مسائل کی ضرورت لوگوں کو ہر وقت پڑتی ہے اُن کو بیان کرنے والا سوائے ابوحنیفہؒ کے کوئی دوسرا شخص نہیں۔

اوائل میں اُن کی یہ حالت نہ تھی، لیکن بہت جلد اُن کا معاملہ اس درجہ تک پہونچ گیا اور

سرعت سے ترقی ہوئی۔

فقہ کے باب میں مناظرۂ محدثین

م ک ۔ یحیٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ کوفہ کی مسجد فقہ سے بھری ہوئی تھی، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ اور حسن بن صالح اور شریک جیسے فقہاء کثرت سے تھے، لیکن ابوحنیفہ کے مقابلہ میں اُن کی کساد بازاری ہوئی اور اُن ہی کے اقوال پر خلفاء اور حکام اور امراء فیصلہ کرنے لگے، اور تمام بلاد میں اُن کے اقوال دائر سائر ہوئے اور اُسی پر عمل قرار پایا۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسی وقت تمام بلاد اسلامیہ میں عموماً امام صاحب کی تقلید اور فقہ حنفیہ پر عمل تھا اور ہر چند حاسدوں نے فکریں کیں کہ فقہ حنفیہ کو ضرر پہنچائیں مگر نہ ہوسکا، چنانچہ کردری اور موفقؒ نے لکھا ہے کہ فتح بن عمرو الورّاق کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں نضر بن شمیلؒ مرو میں تھے، میں بھی وہاں تھا، وہاں کے بعض محدثین نے کمال تعصب سے امام صاحب کی کتابیں نہر جاری میں دھلوا ڈالیں۔ یہ خبر خالد بن صبیح قاضی مرو کو پہونچی اور وہ اُن کے قرابت دار۔ جن میں پچاس سے زیادہ ایسے ممتاز اشخاص تھے کہ خدمت قضا کی لیاقت رکھتے تھے۔ سوار ہوکر فضل بن سہل کے یہاں گئے اور اُن کے ساتھ ابراہیم بن رستم اور سہل بن مزاحم بھی تھے، سب نے فضل سے اس باب میں استغاثہ کیا، انہوں نے خلیفہ مامون کی خدمت میں عرض حال کی، مامون نے پوچھا: وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے یہ تعدی کی؟ کہا: کم عمر لوگ ہیں، جن میں اسحاق بن راہویہؒ احمد بن زبیر اور فضل ہیں مگر نضر بن شمیل بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ حکم ہوا کہ کل دونوں جماعتوں کے لوگوں کو مناظرہ کے لئے دربار میں حاضر رکھو، میں خود دیکھوں گا کہ کس کی حجت قوی ہے اور خود میں فیصلہ کروں گا۔ یہ خبر اسحاق اور اُن کی جماعت کو پہونچی، انہوں نے مشورت کی کہ گفتگو کون کرے گا، نضر بن شمیل تو خلیفۃ المسلمین کے مقابلہ میں نہ کلام میں تاب لاسکتے ہیں نہ حدیث میں آخر یہ

رائے قرار پائی کہ احمد بن زبیر گفتگو کریں، وقت مقرر پر جب دونوں جماعتیں حاضر دربار ہوئیں، خلیفۃ المسلمین برآمد ہوئے اور سب پر سلام کر کے نضر بن شمیل کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا آپ لوگوں نے ابوحنیفہ کی کتابوں کو کیوں دھلوادیا؟ نضر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا، احمد بن زبیر نے کہا کہ امیر المومنین! کیا مجھے بات کرنے کی اجازت ہے؟ فرمایا: ہاں! اگر عمدگی سے بات کر سکتے ہو تو کرو۔

کہا: ہم نے اُن کتابوں کو قرآن وحدیث کے مخالف پایا، فرمایا کہ کس مسئلہ میں؟ احمد بن زبیر نے خالد بن صبیح سے ایک مسئلہ پوچھا کہ ابوحنیفہؒ کا اُس میں کیا قول ہے؟ انہوں نے بیان کیا، احمد نے اُس کے خلاف میں ایک حدیث پڑھی یہ سنکر خود مامون نے امام صاحب کے قول کی تائید میں کئی حدیثیں پڑھیں، جن کو وہ لوگ جانتے بھی نہ تھے۔ جب بہت دیر تک مناظرہ ہوا اور وہ ساکت ہو گئے تو مامون نے کہا کہ اگر فقہ کو ہم مخالفِ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاتے تو اُس پر عمل کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ پھر فرمایا: خبردار! آئندہ کبھی اس قسم کی حرکت نہ کرنا، اگر تم میں یہ بزرگ نہ ہوتے تو تم لوگوں کو میں ایسی سخت سزا دیتا کہ کبھی نہ بھولی جاتی۔ اُس کے بعد خلیفۃ المسلمین مامون نے ایک مجلس کی، جس میں دوسو فقیہ رہا کرتے، اگر کوئی اُن میں سے مرجاتا تو تکمیل کی جاتی، اس مجلس کے کل ارکان اجلاس شاہی میں ہمیشہ حاضر رہا کرتے تھے۔ انتہی

معلوم نہیں نضر بن شمیلؒ کو حاسدوں نے کس تدبیر سے اپنے ساتھ کرلیا تھا، ورنہ وہ تو امام صاحب کے مداحوں میں ہیں۔

بہر حال اس موقع میں بھی منجانب اللہ فقہ کی تائید ہوئی، اور خود خلیفۃ المسلمین کو وہ حدیثیں یاد آ گئیں جن کی اُس معرکہ میں ضرورت تھی۔

اہل انصاف، اکابر محدثین کے اقوال وافعال کو امام صاحب سے متعلق بیان کئے گئے ہیں

پیش نظر رکھ کر غور کریں تو یہ بات مبرہن ہو جائے گی کہ ان حضرات کی خوش اعتقادی کا اثر اُن کے اتباع اور احباب میں ضرور ہوا، جس سے امام صاحب کو انہوں نے مقتدا مان لیا۔

یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب جس کی تعریف یا شکایت کرتے ہوں گے تقریباً کل ہندوستان میں وہ بات مسلم ہو جاتی ہوگی، اسی طرح ابن تیمیہ کے اقوال کا ایک جماعت پر یہ اثر ہے کہ ولی کو شیطان بنا دینا ایک ادنیٰ سی بات ہے ۔کیا اعمش ، اوزاعی، وکیع اور ابن مبارک رحمھم اللہ وغیرہ صدہا محدثین کے اقوال کا اثر ان صاحبوں کے اقوال کے برابر بھی نہ ہوگا؟ حالانکہ اُن حضرات کے اقوال پر تمام اہل سنت و جماعت کے اعتقادات کا مدار ہے۔

غرضکہ اہل حق نے جس طرح احادیث کو انہی حضرات کے اعتبار پر مان لیا تھا، امام صاحب کے مقتدا ہونے کو بھی انہی حضرات کے اقوال سے تسلیم کر لیا۔یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے آج تک قرناً بعد قرن لاکھوں علماء اور صلحاء امام صاحب کی تقلید کرتے آئے اور اس تواتر سے وہ مُسلّم مذہب ہم تک پہونچا۔

ابو یوسف کی وجہ فقہ حنفیہ شائع نہیں ہوئی

اب دیکھئے! جو کہا جاتا ہے کہ مذہب حنفیہ ابو یوسفؒ صاحب کی خدمت قضاء کے دباؤ سے شائع ہوا، اس میں کس قدر اکابر محدثین کی در پردہ بے قدری ہے۔ادنیٰ تامل سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ قول ایسا ہے جیسے بعضے کہا کرتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا **''معاذ اللہ''** اسلام فی نفسہ ایسا پُر زور دین ہے کہ جس کو عقلِ سلیم ہو اور اصولِ دین سے واقف ہو جائے ممکن نہیں کہ اسلام کو قبول نہ کرے۔

غرضکہ بہت سی روایتوں سے ثابت ہے کہ مخالفِ فقہ مخذول ہوتے گئے اور فقہ حنفیہ کی شہرت جمیع بلاد اسلامیہ میں بہت جلد بلکہ امام صاحب ہی کے زمانہ میں ہوگئی اور اُس کے

اسباب مختلف ہوئے ، ایک سبب یہ تھا کہ نئی بات ہونے کی وجہ سے اکابر محدثین اُس کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور بعد تحقیق جب اُس کی توثیق کی تو اوساط الناس اورعوام نے اُس کو قبول کرلیا۔

دوسرے : حاسدوں نے اس خیال سے کہ لوگ بدظن ہوں ، نئی نئی فقہ کی باتیں پہونچانے میں کوششیں کیں ، جن کو جانچ کر محدثین نے مان لیا۔غرض دوست ، دشمن نے نہایت سرگرمی سے ہاتھوں ہاتھ تمامی بلاد اسلامیہ میں فقہ حنفیہ کو پہونچا دیا۔

تیسرے : اکابر محدثین نے امام صاحب کے اقوال پر فتوی دیئے اور تقلید کی ، جن میں سے چند محدثین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اکابرِ محدثین نے امام صاحب کی تقلید کی

اب یہاں قابل توجہ یہ بات ہے کہ ''فقہ'' جس پر تمام اقسام کے اعتراض کئے جاتے ہیں کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ وہی فقہ ہے جو امام صاحب ہی کے زمانہ میں علماء کے جلسوں میں پیش ہوگئی تھی ، اس کو دیکھ کر ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھی ۔ اسی کو حاسدوں نے امام صاحب کی بدنامی کا ذریعہ بنا رکھا تھا ، اسی کو دیکھ کر کوئی کہتا تھا کہ وہ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں ۔ کوئی کہتا تھا : وہ حدیث جانتے ہی نہیں ، اس وجہ قیاس کیا کرتے ہیں ۔ اسی کو پیش کر کے طالبین حق کو اُن کی صحبت سے روکتے تھے ، کوئی اُن کو بدعتی کہتا ، کوئی مرجی قرار دیتا ۔ اور خدا جانے اس کے سوا کیا کیا الزام لگاتے تھے ۔ مگر ''**الحمد لله**'' اسی زمانہ کے مُتَدَیِّنْ اہل حدیث نے جو تقریباً کل بعد والے محدثین کے اساتذہ اور معتمد علیہ جمیع اہل سنت و جماعت کے ہیں ، تمام اُن افتراؤں کو رد کر کے اُس مطعون فقہ کو مستند اور قابل اعتماد بنا دیا ۔ اور معترضین کی نسبت صاف کہد یا کہ وہ حاسد اور کم علم اور بے سمجھ لوگ ہیں

اورصرف زبانی گفتگونہیں بلکہ تقلید کر کے عملاً ثابت کر دیا کہ فقہ حنفیہ قابل تقلید ہے۔

یہ بات اوپر معلوم ہوچکی ہے کہ وکیعؒ اوائل میں امام صاحب کے سخت مخالف تھے، یہاں تک کہ محدثین سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم لوگ فقہ حدیث سیکھ لوگے تو اصحاب الرائے تم پر غالب نہ آئیں گے۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا ہے کہ سائب کہتے ہیں کہ ہم ایک بار وکیعؒ کے پاس بیٹھے تھے اور اصحاب الرائے سے بھی ایک شخص موجود تھے، وکیعؒ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار کیا ہے اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ وہ ''مثلہ'' ہے۔ اُس شخص نے کہا: ابوحنیفہ ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اشعار مثلہ ہے۔ سائب کہتے ہیں کہ وکیع یہ سنتے ہی غضبناک ہوگئے اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان کرتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ابراہیم نے کہا؟ تم اس قابل ہو کہ قید کر دیئے جائیں، اور جب تک اس اعتقاد سے توبہ نہ کریں رہا نہ کئے جائیں۔

دیکھئے! ایسی حرارت والے محدث جب امام صاحب کے حالات اور طریقۂ اجتہاد پر مطلع ہوئے تو اس قدر اُن کے معتقد ہوگئے کہ یہ آرزو کرنے لگے کے امام صاحب کے تفقہ کا عُشرُ ہی اپنے کو حاصل ہو جائے اور اہلحدیث سے کہا کرتے تھے کہ جب تک تم اصحاب ابوحنیفہؒ کے ساتھ نہ بیٹھو اور اُن کے اقوال کی تفسیر نہ بیان کریں، تم میں سمجھ نہ پیدا ہوگی اور حدیث کا سننا کچھ نفع نہ دیگا۔ اور خود بھی امام صاحب ہی کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے، جیسا کہ ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے۔

اب غور کیجئے کہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دینے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہوسکتے ہیں کہ جس طرح علماء حنفیہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں وہ بھی دیتے تھے اور اُن کے جیسے مقلد تھے۔

''تذکرۃ الحفاظ'' وغیرہ میں لکھا ہے کہ یحیٰ قطان ، ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یحیٰ وہ شخص تھے کہ جب گفتگو کسی مسئلہ میں کرتے تو فقہاء کو ساکت کر دیتے تھے۔

ک۔ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ یحیٰ بن آدم جو فن رجال کے عالم اور اُن کے اقوال کو خوب جانتے تھے، فقہ اور حدیث سے بہت واقف تھے۔ اُن کا میلان ابو حنیفہؒ کی طرف شدت سے تھا۔ میلان سوا اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیتے ہوں گے۔

ک۔ حسن بن عرفہ کہتے ہیں کہ ''ہم جھوٹ نہ کہیں گے فقہ میں ہمارے امام ''ابو حنیفہؒ'' ہیں''۔

''تہذیب التہذیب'' میں حسن بن عرفہ کا حال لکھا ہے کہ وہ ابو داؤد و ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کے استاذ تھے۔ یحیٰ بن معین وغیرہ نے اُن کو صدوق کہا ہے۔

دیکھئے ایسے مستند شیخ کی نسبت جھوٹ کا خیال کیونکر ہوسکتا تھا، مگر انہوں نے دیکھا کہ محدثین جو امام صاحب سے بدگماں ہیں کہیں مبالغہ پر اپنا کلام محمول نہ کریں ، اس لئے تصریح کر دی کہ امام صاحب کو جو ہم امام کہتے ہیں وہ جھوٹ نہیں ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی امام صاحب کے مقلد تھے۔

ک۔ مقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ میں نے تابعین اور اُن کے بعد کے لوگوں کو دیکھا ، مگر ابو حنیفہ کے جیسا شخص نہیں دیکھا ، جس کو اُن کی سی بصیرت اور ادراک غوامض ہو۔ وہ امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیتے اور کہتے کہ یہ شیخ کوفی کا قول ہے۔

م۔ عبد العزیز رواد پر کوئی مسئلہ مشتبہ ہوتا تو امام صاحب سے لکھ کر پوچھ لیا کرتے۔

جن کو غایت درجہ کا خوفِ الٰہی تھا، امام صاحب کی تقلید کو باعث نجاست سمجھتے تھے

''تہذیب التہذیب'' میں عبد العزیزؒ کے حال میں لکھا ہے کہ ابن مبارکؒ کہتے کہ خوف الٰہی کا اُن پر یہ غلبہ تھا کہ وہ باتیں کرتے اور اشک اُن کے رخساروں پر جاری رہتے تھے۔ اشعث بن حزب کہتے ہیں کہ ان کی حالت سے یہ نمایاں تھا کہ قیامت اُن کے پیش نظر ہے۔

اب قیاس کیجئے کہ دین میں اُن کو کس قدر احتیاط ہوگی، ایسے محتاط شخص جب ہر بات میں امام صاحب کے قول پر عمل کرتے تھے تو غور کیجئے کہ فقہ حنفیہ میں کس قدر احتیاط ملحوظ ہے۔
اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ اُس زمانہ میں بڑے بڑے محدثین اور فقہاء مثل امام مالک و ثوریؒ وغیرہ موجود تھے، مگر اُن کو امام صاحب ہی کے علم پر اعتماد تھا۔ اس وجہ سے وہ ہر مسئلہ امام صاحب سے پوچھ کر اُس پر عمل کرتے تھے، اسی کا نام تقلید شخصی ہے، جس کو آخری زمانہ والے شرک بتاتے ہیں۔

م ۔ جریر بن عبدالحمید کہتے ہیں: مغیرہ نے کسی مسئلہ میں فتویٰ دے کر کہا کہ یہ بات مجھے پہونچی ہے کہ وہ جوان خزاز جو دار عمرو بن حریث میں رہتا ہے یعنی ابوحنیفہ اُس کا بھی یہی قول ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ جب مغیرہ کوئی فتویٰ دیتے اور لوگ اُن سے جھگڑتے تو وہ کہہ دیتے کہ یہ قول ابوحنیفہ کا ہے۔ انتہی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نام سن کر جھگڑنے والے خاموش ہوجاتے تھے؛ کیونکہ امام صاحب کی شہرت ہوگئی تھی اور محدثین کہا کرتے تھے کہ اُن کی جو بات ہوتی ہے پختہ ہوتی ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغیرہؒ امام صاحب کے مقلد تھے۔

م ۔ ابومعاویہ کہتے ہیں کہ ہمارے شیوخ فتویٰ تو دیتے مگر اُن پر ہیبت طاری رہتی تھی، پھر جب سنتے کہ ابوحنیفہؒ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے، تو خوش ہوجاتے۔ راوی نے اُن سے پوچھا: وہ کون لوگ ہیں؟ کہا: اُن میں سے ایک ابن ابی لیلی ہیں۔

دیکھئے! ابن ابی لیلیٰ باوجودیکہ امام صاحب کے سخت مخالف تھے، مگر ان کی بھی نظر امام صاحب ہی کے فتویٰ کی طرف لگی رہتی تھی، اور بجائے اس کے کہ مخالفت کا اثر کوئی اُس پر ڈالیں اُس سے مستفید ہوتے تھے۔ اس لئے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کا قول کس قدر مستحکم ہوتا ہے!

م ص ۔ ایک بار ابوامیہ جزری جو امام صاحب کے زمانہ میں اہل جزیزہ کے امام تھے،

اُن سے کسی نے فتویٰ پوچھا، انہوں نے اپنے اجتہاد سے جواب دیا، کہیں اُس جلسہ میں ابو حمزہ بھی بیٹھے تھے؛ جو امام صاحب کے شاگرد ہیں، انہوں نے کہا کہ حضرت اس کا یہ جواب نہیں بلکہ امام صاحب نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ سنتے ہی انہوں نے مستفتی کو بلوایا اور اپنا فتویٰ واپس لیکر امام صاحب کے قول پر فتویٰ دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے امام صاحب کی تقلید کی۔

ص ک ۔عیسی بن یونسؒ امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔عیسیٰ بن یونس وہ شخص ہیں کہ حماد اور ابن مدینی جیسے اکابر محدثین اُن کے شاگرد ہیں اور کل صحاح ستہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ **کما فی الخلاصۃ** ۔ایسے جلیل القدر امام المحدثین امام صاحب کے مقلد ہیں۔

ک ۔عبداللہ بن عبید اللہ کہتے ہیں کہ میرے والد نے مسجد الحرام میں ایک مسافر شخص سے مناظرہ کیا، جس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، پھر پوچھا تم کس شہر کے ہو؟ کہا: طنجہ کے ''جو بلاد مغرب کی انتہا پر ہے اور اُس کے پرے اسلام نہیں، یہاں سے وہ مقام تخمیناً ڈیڑھ ہزار فرسخ پر واقع ہے۔ کہا: یہ دقیق مسائل تمہارے یہاں کہاں سے آ گئے؟ کہا: ابو حنیفہؒ کی کتابیں ہمارے یہاں پہونچ گئی ہیں اور امام مالک اور اوزاعی کے اقوال بھی وہاں بیان کئے جاتے ہیں؛ لیکن فتویٰ ابوحنیفہؒ کی رائے پر دیا جاتا ہے۔

اِس کو تائید منجانب اللہ کہتے ہیں۔ دیکھئے! باوجودیکہ امام مالک اور اوزاعیؒ کی جلالت شان پوشیدہ نہیں اور اُسی زمانہ میں وہ استاذ الاساتذہ مانے جاتے تھے، اور امام صاحب کی کتابوں کے ساتھ اُن کے اقوال بھی وہاں پہونچ گئے تھے مگر تقلید امام صاحب ہی کی، کی گئی۔ اس کا وہی سبب تھا جس کی تشخیص یحییٰ بن آدمؒ نے کی کہ امام صاحب کے خلوص نے اُن کے کلام کو آفاق میں پورے طور نافذ کر دیا'' **ذلک فضل اللہ یؤیہ من یشاء**''۔

یہ روایت اوپر لکھی گئی ہے کہ اعمشؒ جب حج کو گئے اور امام صاحب بھی وہاں موجود تھے تو انہوں نے امام صاحب پر فرمائش کی کہ مناسک حج کے مسائل عمل کرنے کے لئے لکھدیں اور اپنے شاگردوں سے بھی فرمایا کہ وہ مسائل لکھ لیں۔

دیکھئے ! اعمشؒ طبقۂ تابعین میں سربرآوردہ شخص ہیں ۔ امام ذہبی نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے: ''**كان الاعمش اقرأهم لكتاب الله و احفظهم للحديث و اعلمهم بالفرائض ... وكان رأسا في العلم النافع والعمل الصالح** ''
ایسے جلیل القدر تابعی نے جن کو تمام محدثین سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں اور فرائض سب سے زیادہ جانتے تھے، اسلامی ایک فرض اور رکن اعظم یعنی حج کے تمامی مسائل میں امام صاحب کی تقلید کی، تو اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ امام صاحب کی نظر۔فن حدیث میں کیسی وسیع اور قوت اجتہادی کس درجہ قابل وثوق تھی !۔

اعمشؒ کی اس تقلید سے علاوہ اس کے کہ امام صاحب کی جلالت شان ظاہر ہو، حضرات حنفیہ کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ ایسے امام کے مقلدر ہیں جن کی تقلید کو ایک جلیل القدر تابعی، شیخ الشیوخ نے ضروری سمجھا۔

فقہ حنفیہ پر اُسی زمانہ میں اجماع ہو گیا تھا

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث فہمی کوئی اور ہی چیز ہے، جس کی طرف اکابر محدثین محتاج تھے۔اسی وجہ سے ابن مبارکؒ نے فرمایا ہے کہ آثار وحدیث تو ضروری ہیں، مگر اُن کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے۔

یحییٰ بن مَعِینؒ کا قول ابھی نقل کیا گیا کہ ''**الفقه فقه ابي حنيفة ، عليه ادركت الناس**'' یعنی معتبر فقہ ابوحنیفہؒ کی ہے، اُسی پر میں نے لوگوں کو پایا ہے۔

یحییٰ بن معین وہ شخص ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ اُن کی نسبت فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو یحییٰ نہ جانتے ہوں وہ حدیث ہی نہیں۔ اس کے سوا اور بھی اقوال مذکور ہو چکے ہیں۔

اب غور کیا جائے کہ جب تمام دنیا کی حدیثیں اُن کو یاد تھیں تو تمام نہیں تو اکثر علماء سے تو اُن کو ملاقات ضرور تھی، کیونکہ اُس زمانہ میں حدیثیں رجال ہی سے لیجاتی تھیں، پھر جب وہ ''**ادرکت علیه الناس**'' کہہ رہے ہیں تو اُس کا مطلب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ جاہلوں کو انہوں نے فقہ پڑھتے پڑھاتے دیکھا تھا: کیونکہ وہ فقہ کی تعریف میں جملہ کہہ رہے ہیں، ایسے موقع میں جاہلوں کے قول وفعل سے استدلال کرنا عقل کے بالکل مخالف ہے جاہلوں کی طرف وہ امر منسوب کئے جاتے ہیں جن کی توہین مقصود ہوتی ہے۔ اس دلیل سے یہ ماننا پڑیگا کہ ''**علیه ادرکت الناس**'' سے اُن کی مراد اُن کے اساتذہ اور علماء ہیں، جن سے اُن کو ملاقات تھی اور اُن کے پورے کلام کا مطلب یہ ہوا کہ یوں تو فقہ اوروں کی بھی ہے؛ مگر معتبر فقہ پوچھو تو ابوحنیفہ کی ہے اور یہ فقط میری رائے نہیں بلکہ علماء اور شیوخ کے ایک جم غفیر کو میں نے اُسی فقہ پر پایا ہے۔

اب غور کیجئے کہ جب اُس زمانہ کے عموماً اہل علم فقہ حنفیہ پر عمل کرتے تھے، تو اگر یہ کہا جائے کہ اُسی زمانہ میں اجماع ہو گیا تھا کہ فقہ حنفیہ موافق حدیث ہے تو کیا نقصان؟

یہاں شاید یہ شبہ ہوگا کہ اُس زمانہ میں بعض علماء فقہ حنفیہ کے مخالف بھی تھے۔ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ مخالف، یا حاسد تھے یا کم فہم، جیسا کہ ابن مبارکؒ وغیرہ محدثین رحمھم اللہ کی تصریح سے ثابت ہے اور ابراہیم بن رستم نے تصریح کی ہے کہ جو شخص گمان کرے کہ میں ابو حنیفہؒ سے مستغنی ہوں وہ جاہل ہے۔ غرضکہ جہال، کم فہم اور حاسدوں کے قول قابل اعتبار نہیں ہوسکتے۔ اس وجہ سے ابن معینؒ نے ''**علیه ادرکت الناس**'' **مطلقاً** کہدیا۔

اور قطع نظر اس کے امام صاحب کے مخالف بھی آپ کے اقوال کا انکار نہیں کرسکتے تھے،

جیسا کہ ابونعیمؒ کے قول سے معلوم ہوا کہ لوگ طوعاً و کرہاً اُن کے منقاد ہوتے جاتے تھے، چنانچہ ''الانتصار'' میں یحییٰ بن آدم کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے بہت سارے مسائل میں نے شریک سے سنے ہیں، جو اُن سے روایت کیا کرتے تھے، کسی نے کہا: اُن کو تو ابوحنیفہؒ کے اقوال پسند نہ تھے، کہا: پسند تھے، اور سنا بھی کرتے تھے؛ لیکن حسد کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ انتہی اس سے ظاہر ہے کہ گو وہ مخالف تھے، مگر امام صاحب کے اقوال کو مانتے ضرور تھے۔

غرضکہ موافق، مخالف سب فقہ حنفیہ کو تسلیم کر رہے ہیں؛ یہاں تک کہ اقصائے بلاد مغرب تک فقہ حنفیہ شائع ہوگئی۔

اہل انصاف یہاں غور فرماویں کہ فقہ حنفیہ کی نسبت جو یحییٰ بن معینؒ نے ''**علیہ ادرکت الناس**'' کہا اور یحییٰ بن آدم نے کہا ''**علیہ استقر الامر**'' جو سابقاً نقل کیا گیا۔ اِن اقوال کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ اُس زمانہ میں فقہ حنفیہ پر اجماع ہوگیا تھا، پھر جو بات ایسے دو گواہ عادل کی گواہی سے ثابت ہو، کیا وہ قابل اعتماد نہ ہوگی؟

جب ہمارے زمانہ میں معمولی دو گواہوں کی گواہی سے قصاص ثابت ہوجاتا ہے تو اُن اکابر اور شیوخ محدثین کی گواہی سے اتنی بات بھی ثابت نہ ہوگی کہ اُس زمانے میں فقہ حنفیہ پر اجماع ہوگیا تھا؟

ہم یہ نہیں کہتے کہ فقہ حنفیہ پر اجماع ہونے کے بعد فقہ شافعیہ وغیرہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ ؛ وہ دوسرا مسئلہ ہے، بلکہ ہمارا مطلب صرف یہاں اسی قدر ہے کہ ایک ایسے زمانے میں کہ محدثین کے شیوخ بکثرت موجود تھے اور احادیث کی تحقیق و تنقید کا بازار گرم تھا۔ کوئی بے اصل بات رواج نہیں پاسکتی تھی، ایسے شبابِ علمِ حدیث کے زمانہ میں فقہ حنفیہ پر محدثین وغیرہ علماء کا اجماع ہونا اس بات پر دلیل بین ہے کہ وہ مخالف حدیث نہیں۔

''تہذیب التہذیب''میں حماد بن دلیل''ابوزید مداینی''کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ اصحاب ابوحنیفہؒ میں تھے۔

اگرچہ اُسی میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ''وہ صاحب رائے ہیں،صاحب حدیث نہیں''مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ابن معین اور ابن حبان وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے،اور ابوداؤدمیں اُن کی روایت موجود ہے۔

م ک ۔خلف ابن ایوبؒ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا،انہوں نے کہا:ابوحنیفہؒاورابو یوسف کا اُس میں یہ قول ہے۔اُس نے کہا:پھرآپ کیا فرماتے ہیں؟کہا:میں ایسے دو شخصوں کا قول کہہ رہا ہوں جولوہے کے پہاڑ ہیں اورتو میرا قول پوچھتا ہے؟

امام صاحب کی کس قدرعظمت اُن کے دل میں تھی کہ اُن کے قول کے مقابل اپنا قول بیان کرنا بھی ناگوارتھااوراُسی پرفتویٰ دیا۔اُن کی اس تقریر مبالغہ آمیز سے صاف ظاہر ہے کہ وہ امام صاحب کے مقلدضرور تھے۔

''تہذیب التہذیب''میں شعیب بن اسحٰق کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ امام صاحب کے مقلد تھے۔شعیب وہ شخص ہیں کہ اسحٰق ابن راہو یہ اورلیث ابن سعد جیسے اُن کے شاگرد ہیں۔اکابر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے۔اوزاعی اُن کواپنے نزدیک جگہ دیا کرتے تھے، بخاری مسلم وغیرہ میں اُن کی روایتیں موجود ہیں۔ **كما فى تهذيب التهذيب** .

اب انصاف کیجئے کہ حنفی مذہب بے اصل ہوتا،جیسا کہ اس زمانہ کے بعضے مولوی کہتے ہیں،تو کیا ایسے جلیل القدرمحدث یہ مذہب اختیار کرتے؟

یہ روایت اوپرلکھی گئی کہ مکی ابن ابراہیم حدیث اورفقہ میں امام صاحب کے شاگرد تھےاور حنفی مذہب میں نہایت متعصب تھے۔ایسے جلیل القدرمحدث جن کی شاگردی پرامام بخاریؒ کو ناز ہے،جب حنفیت میں متعصب ہوں تو ہم لوگ کیوں موردطعن بنائے جاتے ہیں؟

یہ روایت بھی اوپر لکھی گئی کہ ثوبہ بن سعد، امام صاحب کے قول کے مطابق فیصلے کیا کرتے اور کہتے کہ وہ میرے اور میرے رب کے درمیان ہیں۔

ثوبہ، وہ شخص ہیں کہ امام مالکؒ آرزو کرتے تھے کہ اُن کے جیسا کوئی ایک شخص اپنے یہاں ہوتا۔

یہ روایت بھی اوپر لکھی گئی کہ سفیان ثوریؒ اکثر امام صاحب کے اقوال اُن کے شاگردوں سے دریافت کرتے اور اُسی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

''تاریخ ابن خلکان'' میں لکھا ہے کہ لیث بن سعدؒ حنفی المذہب تھے۔اور قسطلانی نے بھی شرح بخاری میں یہی بات لکھی ہے۔

لیث بن سعد وہ شخص ہیں کہ شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ نے اُن کے مناقب میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے،جس کا نام ''الرحمة الغيثية بالترجمة الليثية'' ہے۔اسی میں لکھا ہے کہ کسی نے لیثؒ سے پوچھا کہ آپ سے بہت ساری حدیثیں ہم سنتے ہیں؛ جو آپ کی کتابوں میں نہیں ہیں؟ فرمایا: اگر وہ سب حدیثیں میں لکھتا جو میرے سینہ میں ہیں تو یہ مرکب اُس کی گنجائش نہ کرسکتا۔اسی میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ لیث ، امام مالکؒ سے بھی افقہ تھے۔

سعید بن ابی ایوب کہتے ہیں کہ اگر امام مالک اور لیث کسی مقام میں جمع ہوتے تو امام مالک اُن کے روبرو گونگے ہوتے ،یعنی بات نہ کرسکتے۔

کیوں نہ ہو وہ امام صاحب کے فیض یافتہ اور حنفی المذہب تھے۔

اُسی میں لکھا ہے کہ خلیلی کہتے ہیں کہ وہ بالاتفاق اپنے وقت کے امام تھے۔

ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ فقہ اور علم اور حفظ اور فضل وکرم میں اپنے زمانے کے سادات میں تھے۔

نوویؒ نے تہذیب میں لکھا ہے کہ اُن کی جلالت اور امانت اور فقہ اور حدیث میں اُن

کے علو مرتبت پر اجماع ہو گیا۔

اگر بالفرض سوائے ان کے کوئی محدث حنفی المذہب نہ ہوتا تو بھی ایسے جلیل القدر، امام المحدثین کا حنفی المذہب ہونا، حنفیہ کے افتخار اور اطمینان کے لئے کافی تھا۔

م ۔ کادح بن رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ کسی نے امام مالکؒ سے پوچھا کہ کسی کے پاس دو کپڑے ہوں ایک نجس اور ایک پاک اور معلوم نہ ہو کہ پاک کونسا ہے، تو نماز کس طرح سے پڑھے؟ فرمایا: تحری کرے۔

کادح کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ابوحنیفہؒ تو کہتے تھے کہ ہر ایک کپڑے میں ایک بار نماز پڑھے۔ انہوں نے سائل کو بلوا کر ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا۔

م ص ۔ محمد بن عمر الواقدیؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ اکثر ابوحنیفہؒ کے اقوال کی تلاش کرتے اور انہی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے، اگرچہ اس بات کو ظاہر کرتے نہ تھے۔ انتہی

ہم یہ نہیں کہتے کہ امام مالکؒ نے کسی مسئلہ میں امام صاحب کی تقلید کی؛ کیونکہ وہ خود مجتہد تھے۔ اسی وجہ سے امام صاحب کی طرف کسی قول کا منسوب کرنا اُن کو جائز نہ تھا، بخلاف مقلد کے کہ اُس کو منسوب کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے امام صاحب کے اجتہاد کی قوت تو ضرور ثابت ہے کہ امام مالکؒ جیسے شخص اُن کے اقوال کی تلاش کرتے اور انہیں کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

م ک ص خ ف ۔ مسعرؒ کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان میں ابو حنیفہؒ کو قرار دے تو مجھے امید ہے کہ اُس کو کوئی خوف نہیں اور یہ نہ سمجھا جائیگا کہ اُس نے احتیاط میں کمی کی۔ اس مقام میں اگر مسعرؒ کا بھی خیال کرلیا جائے کہ وہ کیسے شخص تھے تو مناسب ہوگا۔ پیشتر اُن کے بعض حالات معلوم ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ شعبہ اور اُن کے معاصر اُن کو مصحف ناطق کہا کرتے تھے۔

دیکھئے! جب مصحف ناطق فرما رہے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کی تقلید میں نہایت احتیاط ہے، تو طالب حق کے لئے اور کیا چاہیئے؟ خدا کے اور اپنے درمیان اُن کو قرار دینے کا مطلب اِس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ جس راہ سے وہ لیجائیں بے چوں و چرا اُن کے پیچھے پیچھے بارگاہ کبریائی میں جانا باعث نجات ہے۔ اسی کا نام تقلید شخصی ہے۔

ک۔ فضل بن موسیٰ سینائیؒ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ ابوحنیفہ کی اتباع کریں۔

ایسے جلیل القدر محدث (جن کی جلالت شان پر وکیع، ابن مبارک اور اسحٰق بن راہویہ رحمہم اللہ جیسے اکابر محدثین گواہی دے رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا) جب امام صاحب کی تقلید کرنے کی ترغیب دیتے ہوں گے تو کس سرگرمی سے مذہب حنفی ترقی پذیر اور شائع ہوتا جاتا ہوگا؟

م ص۔ ابونمیلہ یحییٰ بن واضح کہتے ہیں کہ ایک بار ہم اور محمد بن طلحہ ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کر رہے تھے، انہوں نے کہا: اے ابونمیلہ! اگر تمہیں کسی ثقہ کے ذریعہ سے ابوحنیفہؒ کا کوئی قول پہونچ جائے تو اس کو قبول کرلو، اُن کا جو قول ہوتا ہے پختہ ہوتا ہے۔

اس کا مطلب ظاہر ہے کہ انہوں نے فقہ کی تقلید کی ترغیب دی، اس لئے کہ امام صاحب کے اقوال کو قبول کرنا بلا دلیل مان لینا ہے جس کو اصطلاح میں ''تقلید'' کہتے ہیں۔

خ۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک روز معترضین کے جواب میں فرمایا: تم نہیں جانتے کہ ابوحنیفہؒ سے زیادہ کوئی مستحق اقتداء نہیں! وہ متقی، سراپا مغز، پارسا اور فقیہ تھے۔ انتہی ملخصاً

جب امیر المؤمنین فی الحدیث نے تمام محدثین میں سے امام صاحب کو منتخب کر کے اس بات کے مستحق قرار دیا کہ انہی کی اقتداء کی جائے، تو اب کسی عامی کو تو کیا، محدث کو بھی حق نہیں کہ اُن کی تقلید سے روکے!۔

بہت سے اولیاء اللہ امام صاحب کے مقلد ہیں

م ۔ ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ امام صاحب ایک بار مسجد الحرام میں بیٹھے تھے، لوگ آتے اور مسائل پوچھتے اور آپ جواب دیتے جاتے تھے، اتنے میں امام جعفر صادقؓ وہاں تشریف لائے اور یہ حالت کھڑے دیکھ رہے تھے کہ امام صاحب کی نظر آپ پر پڑی اور فراست سے دریافت کر کے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر پہلے سے مجھے معلوم ہوتا کہ کھڑے ہوئے ہیں، خدا تعالیٰ مجھے اس حالت میں نہ دیکھتا کہ میں بیٹھا رہوں اور آپ کھڑے ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے ابو حنیفہ! بیٹھ جاؤ اور لوگوں کو جواب دو، میں نے اپنے آباء واجداد کو بھی اسی حالت پر پایا ہے۔

دیکھئے! امام صاحب جو جواب دیتے جاتے تھے وہ سب مسائل فقہیہ تھے، جن کو تقلیداً سب مان رہے تھے اور امام جعفر صادقؓ نے بھی اُس کی تحسین کی۔

درمختار میں لکھا ہے کہ بہت سے اولیاء کرام نے امام صاحب کی تقلید کی، چنانچہ اُن میں سے چند حضرات یہ ہیں: ابراہیم ادہم، شقیق بلخی، معروف کرخی، بایزید بسطامی، فضیل بن عیاض، داؤد طائی، احمد بن خضرویہ، ابو بکر وراق، وغیرہم۔

شامیؒ نے **وغیرھم** کی شرح میں لکھا ہے: جیسے، حاتم اصم اور محمد شاذلی۔ **قدست اسرارھم** ۔ ''حدائق الحنفیہ'' میں مولوی فقیر محمد صاحب جہلمی نے اور بہت سے اولیائے کرام کے نام لکھے ہیں جو حنفی المذہب اور امام صاحب کے مقلد ہیں، منجملہ ان کے چند حضرات یہ ہیں: داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ محمد پارساؒ، مجدد الف ثانیؒ، ملا قطب الدین سہالویؒ، شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی۔ **قدست اسرارھم** ۔

حدائق الحنفیہ میں اور بہت سے اسماء گرامی احناف کے لکھے ہیں، فی الحقیقت یہ کتاب

قابل دید ہے اور یہ حدائق قابل تفرج ہیں۔ بہت بڑا سرمایۂ معلومات اس میں مخزون ہے۔
یہ بات قابل تصدیق ہے کہ جب کسی قوم کے سربرآوردہ اور معتمد علیہ کوئی کام کرتے ہیں تو اُن کے دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی وہ کام کرنے لگتے ہیں اور چندروز میں وہ کام اُس قوم کی ضروریات میں داخل ہو جاتا ہے۔اب دیکھئے کہ جب نامی گرامی، مرجع خلائق محدثین واولیاء کرام نے امام صاحب کی تقلید کی تو اُن کے شاگرد اور معتقد کس کثرت سے امام صاحب کے مقلد ہو گئے ہوں گے؟

مابعد کی صدیوں میں جو حنفیہ کی کثرت ہوتی گئی جس پر حالت موجودہ شاہد عدل ہے، اسی ابتدائی کثرت کا اثر ہے۔غرضکہ علماء کا کثرت سے امام صاحب کے مقلد ہونا اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ متدین علماء نے ایسے زمانہ میں آپ کو مجتہد مطلق مان لیا تھا جو شباب علم کا زمانہ تھا۔اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ جب خیرالقرون میں امام صاحب کی تقلید نہایت سرگرمی سے ہوئی اور اُس زمانہ کے اہل احتیاط محدثوں نے اُس کو جائز رکھا اور خود بھی کرتے رہے تو اس بے علمی کے زمانہ میں۔جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے۔کس قدر اُس کی ضرورت ہے۔آخری زمانہ کی نسبت احادیث میں مصرح ہے کہ اُس میں دین عجائز اختیار کیا جائے اور ظاہر ہے کہ دین عجائز صرف تقلید ہی ہوا کرتا ہے، اُن کی جلبت میں یہ بات ہوتی ہے کہ نئی بات کے سخت دشمن ہوتے ہیں۔

بحثِ تقلید

تقلید انسان کی فطرت میں داخل ہے

چونکہ تقلید کا ذکر آ گیا ہے، اس لئے مختصر سی بحث اُس کی بھی بیان کرنا مناسب ہے۔ اگر تفصیلی مبسوط بحث دیکھنا منظور ہو تو اور رسالوں میں ملاحظہ فرماویں جو کثرت سے

چھپ چکے ہیں۔

تقلید کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو معتبر سمجھ کر اُس کے قول وفعل کی پیروی بغیر طلب دلیل کی جائے۔

تقلید انسان کی فطرتی صفت ہے اور تمام کمالات کی تحصیل کا مبداء بھی یہی صفت ہے۔ جس انسان میں یہ صفت کمی کے ساتھ ہوگی اُس کے کمالات میں نقص ضرور ہوگا۔ دیکھئے! جب لڑکا کسی قدر سمجھنا شروع کرتا ہے تو ایک ایک چیز کا نام پوچھتا ہے اور اُس کے ماں باپ یا اور مربی جو کچھ بتلا دیتے ہیں اُس کو تقلیداً مان لیتا ہے۔ اگر اس میں تقلید کا مادہ نہ ہوتا تو حیوان ناطق ہی بننے سے محروم رہ جاتا۔ اور سوائے غائیں غائیں کرنے کے کوئی بات نہ کرسکتا۔ اس طرح جب استاذ کے پاس جاتا ہے تو ہر ایک مسئلہ میں تقلید کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ تمام علوم سے محروم رہ جائے۔ پھر دین میں بھی تقلید کی ضرورت ہے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماویں اُس کو قبول کرلو۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ چوں و چرا کی اجازت نہیں، صرف آپ کے ارشاد کو بلا دلیل مان لیا کرو۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صبح کی نماز دو رکعت ہے، تو کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ دو رکعت مقرر ہونے کی کیا وجہ اور قرآن میں کہیں اُس کا ذکر بھی ہے یا نہیں۔ یہ بحث دوسری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو تقلید کہتے ہیں یا نہیں، مگر صورۃً تقلید ہونے میں کلام نہیں۔

اسی طرح صحابی نے جب کہہ دیا کہ ''**انما الاعمال بالنیات**'' مثلاً حدیث ہے، تو تابعی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ اُس کے حدیث ہونے کی کیا دلیل؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ جس کی تقلید کی جائے وہ شخص معتمد علیہ اور راست باز ہو، اسی وجہ سے محدثین کو رجال کی بحث کرنے کی ضرورت ہوئی، جس سے مقصود یہ ہے کہ جو شخص عدل صادق معتمد علیہ ہو اُسی کی تقلید کی جائے،

یہ بات قریب میں معلوم ہوگی کہ رجال کی جرح وتعدیل کا مدار تقلید ہی پر ہے۔

فقہاء کی تقلید کی ضرورت قرآن وحدیث سے ثابت ہے

فقہاء کی تقلید کی ضرورت قرآن شریف سے بھی معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:
''یآ ایھاالذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم'' ۔
یعنی اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرواور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرواور اُن اولی الامر کی بھی جوتم میں سے ہوں۔
اگرچہ اولی الامر کے معنیٰ امراء کے بھی ہوسکتے ہیں، مگر قرائن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اولی الامر سے مراد علماء، فقہاء ہیں۔ اس لئے کہ مقصود اس آیۂ شریفہ میں اطاعت خدا و رسول اور اطاعت اولی الامر ہے۔ اس مطلب کو ادا کرنا صرف حرف عطف سے ہوسکتا تھا۔ یعنی ''اطیعوا اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر'' سے یہ مقصود معلوم ہو جاتا تھا، لفظ اطیعوا کو مکرر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر چونکہ کلام بلیغ میں خصوصاً کلام الٰہی میں کوئی لفظ بے کار نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ مقصود اس زیادتی سے کچھ دوسرا ہی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو کوئی ضمنی نہ سمجھ لے اور یہ خیال نہ کرلے کہ ''قرآن شریف میں جتنے احکام ہیں انہی میں حضرت کی اطاعت ضروری ہے'' اس خیال کے دفع کرنے کے لئے بہ تکرار لفظ ''اطیعوا'' مثل ''اطیعوا اللہ'' کے مستقل طور پر ''اطیعوا الرسول'' ارشاد ہوا، جس سے مقصود یہ ہے کہ جو کچھ حضرت فرماویں خواہ وہ قرآن میں ہو یا نہ ہو سب مان لیں اور اطاعت کریں اور اُس کے بعد اولی الامر کے ساتھ لفظ ''اطیعوا'' کا ذکر نہ ہوا، جس سے یہ بات معلوم کرادی گئی کہ اُن کی اطاعت ضمنی ہے، یعنی جو احکام حضرت نے بیان فرمادیئے ہیں انہی

میں ان کی اطاعت کی جائے کیونکہ جولوگ خلاف شرع حکم کرتے ہیں اُن کے باب میں وارد ہے: **و من لم یحکم بما انزل الله فاولٰئک هم الفاسقون اورهم الظّٰلمون اورهم الکٰفرون ۔**

اب اولوالامر کو یہ معلوم کرنا ضرور ہوا کہ ہم اس آیۂ شریفہ کی رو سے کون سے امور کے امر کرنے کے مجاز ہیں، جن کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔اور یہ بات ظاہر ہے کہ کل آیات واحادیث سے ایسے امور کا نکالنا جوواجب الاتباع ہیں فقیہ کا کام ہے۔غرضکہ اولوالامر کوضرور ہوا کہ خود فقیہ ہوں یا فقہاء سے مدد لیکر امر کریں، بہر حال دونوں صورتوں میں اولی الامر کی اطاعت فقہاء ہی کی اطاعت ہوئی۔پھر اگر اطاعت کرنے والوں کومعلوم ہوجائے کہ حاکم عالم نہیں تو مشتبہ امور میں اُن کوضرور ہوگا کہ علماء سے دریافت کریں کہ وہ امورواجب الاطاعت ہیں یا نہیں اور اگر وہ فتویٰ دیں کہ اُن امور میں اطاعت جائز نہیں تو انہی کی اطاعت واجب ہوگی ۔جس سے معلوم ہوا کہ فقہاء اور امراء کے اوامر متعارض ہوں تو اہل اسلام مامور ہیں کہ فقہاء کا امتثال امر کریں اور امراء کی اطاعت نہ کریں، جیسا کہ اس روایت سے بھی ظاہر ہے: **عن علی رضی الله عنه، قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : لاطاعة فی معصیة الله ، انما الطاعة فی المعروف ۔ متفق علیه ، کذا فی المشکوة فی کتاب الامارة ۔**

یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ معصیت میں کسی کی اطاعت درست نہیں، اطاعت صرف ان ہی امور میں ہے جو دین میں معروف ہیں۔

اب دیکھئے کہ امیر اور فقیہ کے اقوال متعارض ہونے کی صورت میں فقیہ کا قول جب واجب العمل ہو تو امراء اولوالامر ہوئے یا فقہاء؟ اسی وجہ سے جابر ابن عبداللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور عطا اور مجاہد اور ضحاک اور ابوالعالیہ اور حسن بصری وغیرہم رحمھم اللہ نے **اولی الامر** کی تفسیر میں فقہاء اور علماء ہی لکھا ہے، جیسا کہ تفسیر ابن جریر وابن کثیر وغیرہ سے واضح ہے۔

کیوں نہ ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء ہی کو اپنا جانشین قرار دیا ہے، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے: ”**عن الحسن بن علی رضی الله عنهما ، قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : رحمة الله علی خلفائی ! قیل : و من خلفائک یا رسول الله ؟ قال : الذین یحیون سنتی ، و یعلمو نها الناس . رواه ابو النصر السجزی فی الابانة ، و ابن عساکر و فی معناه رواه الطبرانی والرامهرمزی ، و ابن ابی حاتم ۔ کذا فی کنز العمال**“۔

یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ رحمت کرے میرے خلفا پر! کسی نے پوچھا: آپ کے خلفاء کون ہیں؟ یا رسول اللہ: فرمایا: وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کرتے ہیں اور لوگوں کو سنت کی تعلیم کرتے ہیں۔

غرضکہ فقہاء کی اطاعت قرآن شریف سے بھی ثابت ہے اور احادیث سے بھی، اسی وجہ سے عمر ابن عبدالعزیزؒ نے تمام شہروں میں حکم جاری کر دیا کہ جس باب میں فقہاء کا اتفاق ہوا ُسی پر عمل کیا جائے، جیسا کہ اُس روایت سے ثابت ہے جو دارمی میں ہے: ”**عن حمید، قال : قیل لعمر بن عبدالعزیز : لو جمعت الناس علی شئ ، فقال : مایسرنی انهم لم یختلفوا ، قال : ثم کتب الی الافاق والی الا مصار : لیقض کل قوم بما اجتمع علیه فقهاؤهم**“۔

دیکھئے! عمر ابن عبدالعزیز نے جو تمام ممالک اسلامیہ میں عام حکم جاری کر دیا کہ فقہاء کے اقوال پر عمل کیا جائے، اس سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ **اولی الامر** جن کی اطاعت واجب ہے وہ صرف فقہاء ہیں، حکام کو اُس میں کوئی دخل نہیں۔

ابن حزم تقلید کو جائز رکھتے ہیں

ابن حزم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ تقلید کو حرام سمجھتے ہیں، مگر فقہاء کی تقلید کے وہ

بھی قائل ہیں، جیسا کہ اُن کی اس عبارت سے ظاہر ہے جو **الفصل فی الملل** میں لکھا ہے: ''**نعم ان التقليد لا يحل البتة ، و انما التقليد اخذ المرء قول من دون رسول الله صلى الله عليه وسلم ممن لم يأمرنا الله عز و جل باتباعه قط، و لا بأخذ قوله بل حرم علينا ذلک و نهانا عنه**''

یعنی اس میں شک نہیں کہ تقلید ہرگز حلال نہیں، مگر تقلید اسی کا نام ہے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایسے دوسرے شخص کا قول مان لیا جائے جس کی اتباع کا اور اس کے قول پر عمل کرنے کا حکم خدا نے کبھی نہ دیا ہو بلکہ اُن کے ماننے سے منع فرمایا اور اس کو حرام کر دیا ہو۔

حاصل یہ کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کی اتباع کا حکم خدائے تعالیٰ نے دیا ہو تو اُس کی اتباع اور پیروی کو تقلید ہی نہیں کہتے۔

فقہاء کی تقلید مذموم نہیں ہو سکتی

ابن حزم کے اس قول سے کہ ''**ان التقليد لا يحل البتة**'' سے دھوکا ہوتا تھا کہ انہوں نے مطلقاً تقلید کو حرام کر دئے۔ اس لئے انہوں نے فقہاء کی اتباع کو سرے سے تقلید ہی میں داخل نہیں کیا، کیونکہ وہ تصریح کرتے ہیں کہ تقلید ایسے شخص کی اتباع کو کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے اُس کے اتباع کا کبھی حکم نہ دیا ہو۔ اور چونکہ فقہاء کے اتباع کا حکم ''**وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الاَمْرِ مِنْكُمْ**'' سے دیا ہے، اس لئے وہ تقلید ہی نہیں۔ اس سے مقصود ان کا معلوم ہو گیا کہ اگر تقلید ہر طرح مذموم ہو تو فقہاء کی تقلید کو ہم تقلید ہی سے خارج کر دیں گے۔ اسی وجہ سے انہوں نے تقلید مذموم میں ایسی قید لگا دی کہ تقلید اصطلاحی پر وہ صادق ہی نہیں آتی۔ جب ابن حزم جیسی متشدد شخص تقلید فقہاء کو بُری نہیں سمجھتے تو اُن کے پیرووں کو ضرور ہے کہ اس بات میں اغماض کر جائیں۔

اور مقلدوں کو مشرک نہ بنائیں۔

یوں تو فقہاء اور مجتہدین بہت سے گذرے ہیں اور امام بخاری بھی فقیہ اور مجتہد تھے، مگر جو بات اہل مذاہب اربعہ کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ بات شاہ ولی اللہ صاحب کے قول سے بھی معلوم ہوتی ہے جو ''الانصاف'' میں لکھا ہے: **و خصلة رابعة نتلوها وهی ان ينزل له القبول من السمآء فأقبل الی علمه جماعات من العلماء من المفسرين و المحدثين و الاصوليين و حفاظ كتب الفقه و يمضی علی ذلک القبول و الاقبال قرون متطاولة حتی يدخل ذلک فی صميم القلوب** ''۔ یعنی مجتہد کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ اُس کی قبولیت آسمان سے اترے جس کی وجہ سے علماء اور مفسرین اور محدثین واصولین اور حفاظ کتب فقہ اُس کے علم کی طرف متوجہ ہوں اور اس قبول و اقبال پر مدتیں گذر جائیں یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں۔ یہ باتیں داخل ہوجائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سب باتیں مذاہب اربعہ پر صادق آتی ہیں۔ شاہ صاحب ممدوح نے ''عقد الجید فی احکام التقلید'' میں اس امر میں ایک باب ہی مدون کیا جس کا ترجمہ یہ ہے: **باب تاكيد الأخذ بهذا المذاهب الاربعة و التشديد فی تركها و الخروج عنها** اور اُس میں لکھتے ہیں، **اعلم ان فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة ، و فی الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة و نحن نبين ذلک بوجوه ....**

حاصل اُس کا یہ کہ مذاہب اربعہ کی تقلید نہایت ضروری ہے۔ اور اس میں بڑی مصلحت ہے اور اُس سے اعراض کرنے میں بڑا مفسدہ ہے، جس کے متعدد وجوہ ہیں۔ پھر بہت سے وجوہ بیان کئے، جن کا ذکر موجب تطویل ہے۔

الحاصل تمام روئے زمین پر اہل سنت کے چار ہی مذہب مشہور ہیں اور پانچواں مذہب بخاری کہیں سنا نہیں گیا، بلکہ جو لوگ بخاری شریف کو مانتے ہیں سب سے بڑے ہوئے ہیں، وہ بھی امام بخاری کی تقلید کو عار بلکہ بعضے تو شرک ہی سمجھتے ہیں اور حرمت تقلید پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں: **قولہ تعالیٰ :اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہ اُوْلِیَاءَ ۔**

وَ قولہ تعالیٰ : وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَ نَا

و قولہ تعالیٰ : اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَاباً مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

اور اصل یہ اور اس قسم کی کئی روایتیں کفار کی شان میں نازل ہوئی۔اس وجہ سے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ بت پرستی وغیرہ چھوڑ دو! وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے، اس لئے آپ کی نہیں سنتے اور اصل اُس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کو نبوت ہی کی تصدیق نہ تھی، پھر جب تصدیق کرتے تو فوراً بتوں کو توڑ دیتے تھے چونکہ یہ آیتیں مقلدوں پر چسپاں کی جاتی ہیں اس لئے اُن کی حالت پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ آیا ان کو نبوت پر ایمان ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو باوجود ایمان کے اپنے نبی کی بات نہ مان کر اپنے امام کی بات ماننے کی کیا وجہ؟ کیا امام کو وہ نبی سمجھتے ہیں جو خاتم الانبیاء کے بعد پیدا ہوئے اور اُن پر وحی اُترنے کے بھی قائل ہیں؟ جس کی وجہ سے اُن کے مقرر کئے ہوئے احکام کو ناسخ اور پہلے نبی یعنی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو منسوخ سمجھتے ہیں؟ اس کی تحقیق یوں ہوسکتی ہے: کسی جاہل سے جاہل مقلد سے پوچھ لیا جائے تو وہ ہرگز نہ کہے گا کہ میں اپنے امام کو نبی سمجھتا ہوں اور اسی وجہ سے اُن کے قول کو واجب الاتباع جانتا ہوں ۔اس سے یقینی طور پر ثابت ہو جائیگا کہ کفار جو آباء واجداد

کے طریقہ کو نبی کے مقابلہ میں جس وجہ سے پیش کرتے تھے وہ وجہ تو یہاں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ اُس کا منشاء تکذیب نبی تھا اور کوئی مقلد تکذیب نبی نہیں کرسکتا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہ مجتہدوں کو اجتہاد کرنے کی اور اُس پر عمل کرنے کی ہم کو اجازت دی ہے۔ اس لئے ہم اُس پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ احادیث جب مذہب کے خلاف پیش کی جائیں تو یہ ضرور کہا جائیگا کہ احادیث ہمارے سر آنکھوں پر اور وہ سب واجب التعظیم ہیں۔ اسی وجہ سے بخاری شریف کے ختم کو ہم باعث انجاح مرام سمجھتے ہیں اور اُس کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اہل حدیث بھی نہ ہوں گے، مگر چونکہ کل احادیث کے معنی بخاری شریف وغیرہ میں نہیں، اور جس قدر ہیں وہ امام بخاری وغیرہ کے اجتہادی ہیں، جو ہمارے امام کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ اس وجہ سے اُن معنی کو نہیں مانتے جو ہر شخص اپنی رائے سے بیان کرے بلکہ اُس تحقیق کو مانتے ہیں جو تمام آیات و آحادیث کو پیش نظر رکھ کر ایک جلیل القدر امام الوقت بیان کرے۔

کوئی ضرورت نہیں کہ جو کوئی قرآن وحدیث پیش کرے اس کی بات مان لی جائے

اور ہم لوگ اس کے مامور بھی نہیں کہ جو شخص قرآن وحدیث کو پیش کرے اُس کو مان ہی لیں بلکہ سلف صالح نے ہمیں یہ طریقہ دکھلا دیا ہے کہ غیر معتبر شخص قرآن بھی سنائے تو نہ سنا جائے، چنانچہ سنن دارمی میں یہ روایت ہے: **عن اسماء بن عبید، قال: دخل رجلان من اصحاب الاھواء علی ابن سیرین، فقالا: یا ابابکر! انا نحدثک بحدیث قال: لا قالا: فنقرأ علیک آیة من کتاب اللہ، قال: لا لتقومان عنی او لاقومن ؟ قال: فخرجا، فقال بعض القوم: یا ابابکر! و ما علیک ان یقرآ علیک آیة من کتاب اللہ تعالیٰ ؟ قال انی خشیت ان یقرآ علی آیة فیحرفانھا فیقر ذلک فی قلبی۔**

یعنی ابن سیرینؒ کے پاس دو شخص آئے جو اہل ہوا سے تھے اور کہا کہ ہم ایک حدیث آپ کو سناتے ہیں، فرمایا: میں نہیں سنتا، پھر کہا: قرآن کی ایک آیت ہی سن لیجئے، کہا: نہیں اور فرمایا: تم یہاں سے چلے جاؤ یا میں اُٹھ جاتا ہوں: لوگوں نے کہا: حضرت! اگر آپ قرآن کی آیت سن لیتے تو کیا نقصان تھا؟ فرمایا: اگر وہ آیت پڑھ کر اُس کے مضمون میں تحریف کر دیتے اور وہ ہی بات میرے دل میں جم جاتی تو خوف کی بات تھی۔

دیکھئے! اُن لوگوں نے ابن سیرینؒ کو کیسے متعصب اور جاہل اپنی قوم میں جا کر بتایا ہوگا کہ انہوں نے نہ حدیث سنی نہ قرآن بلکہ یہ آیت پڑھ کر اُن کا کفر بھی ثابت کر دیا ہوگا جو حق تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ'' یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو۔ بجائے اس کے کہ سنکر چپ رہتے، انہوں نے سننا بھی گوارا نہ کیا، پھر کس طرح وہ مستحق رحمت ہو سکتے ہیں؟ اور خدا جانے کیسی کیسی موشگافیاں کر کے اُن کو کافر بنانے میں کوششیں کی ہوں گی۔ مگر اہل اسلام ایسے جلیل القدر تابعی کی نسبت یہ گمان ہرگز نہیں کر سکتے کہ انہوں نے قرآن کے سننے سے انکار اس وجہ کیا کہ آیۂ شریفہ ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہ'' اُن کو یاد نہ تھی یا اُس پر عمل کرنا اُن کو منظور نہ تھا بلکہ سبب اُس کا یہ تھا کہ قرآن بہ نیت تلاوت یا وعظ نیک نیتی سے پڑھا جائے تو اُس کا سننا واجب ہے اور اہل ہوا کو ایسے موقعوں میں یہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث کے ذریعہ سے اپنے خیالات فاسدہ اُن کے ذہن نشین کریں۔

اغراض کا مختلف ہونا اس حکایت سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے؛ جو ایک مولوی صاحب نے مجھ سے کلکتہ کا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ مقلدوں کی مسجد میں ایک غیر مقلد صاحب آ کر جماعت میں شریک ہوگئے، جب امام نے آمین کہی تو انہوں نے حسب عادت بآواز بلند

آمیـن کہی ، اب تمام اہل مسجد مقلد حیران رہے کہ نماز کی حالت میں اس کا کیا تدارک کیا جائے ، مگر بے چین طبیعتیں کب چپ رہ سکتی ہیں ، ایک صاحب نے فوراً اُن کے جواب میں بآ واز بلند (شالا) کہد یا جو وہاں گالی سمجھی جاتی ہے ، غیر مقلد صاحب تھے بڑے جری اُن سے اس گالی کی برداشت نہ ہوسکی اور اُس کے جواب میں پھر آمین بہت زور سے کہی مقلد، صاحب یہ لفظ دوبارہ سنتے ہی آگ بگولا بن گئے اور بلند آواز سے (شالا بیٹا شالا) اسی آمین کے لہجہ میں ادا کیا ، پھر انہوں نے کمال غضب سے اُسی آمین کو اور پھینک مارا غرضکہ چند بار یہ سب وشتم طرفین سے ہوتا رہا۔ اُس کے بعد لات مکھی کی نوبت آئی ۔ مقصود یہ کہ مقلد صاحب کو جو (شالا بیٹا شالا) کہنے سے تشفی ہوتی تھی غیر مقلد صاحب کو لفظ آمین سے بھی وہی تشفی ہوتی تھی ۔

اب کہئے کہ انھوں نے اس متبرک لفظ کو گالی کے موقع پر استعمال کیا یا نہیں؟ غیر مقلدوں کو جب منظور ہوتا ہے کہ مقلدوں کو علانیہ گالی دیں تو اُن کی مسجدوں میں جا کر آمین بآ واز بلند کہد یتے ہیں ، جس سے ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے بخلاف اس کے وہی مبارک لفظ ، شافعیہ وغیرہ بھی نہایت بلند آواز سے کہتے ہیں ، مگر کسی کو برا نہیں معلوم ہوتا ، اس وجہ سے کہ اُن کو صرف امتثال امر اور تلاوت مقصود ہوتی ہے ۔

الحاصل جس طرح اس متبرک لفظ کے کہنے سے مقصود دوسرا تھا اسی طرح اہل ہوا کا قرآن وحدیث سنانے سے مقصود دوسرا ہی ہوا کرتا ہے ۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کیا وجہ ہے کہ باوجود ایمان اور تبحر علم کے اُن حضرات کو اس درجہ کی احتیاط تھی کہ غیر مذہب والوں سے قرآن کی آیت بھی نہیں سنتے تھے ، اس خیال سے کہ کہیں اُس کے عقائد فاسدہ کا اثر اپنے دل پر نہ پڑ جائے اور اس زمانہ میں ہر کم علم بلکہ بے علم شخص بھی اہل مذاہب باطلہ کے اقوال کو سننے اور دیکھنے کی کچھ پروا نہیں کرتا ،

بلکہ اس کو دینداری اور حق پسندی سمجھ کر اپنی بے تعصبی کا ثبوت دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جن حضرات کو اپنے ایمان اور اعتقادات کی قدر ہے اور قرآن وحدیث پر پورا ایمان اور جزا وسزا پر کامل یقین ہے اُن کو احتیاط کرنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ خود فطرت انسانی کا مقتضی ہے کہ جس چیز کو آدمی بے بہا اور عزیز الوجود سمجھتا ہے اُس کی حفاظت میں کمال درجہ کی احتیاط کو کام میں لاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے دوست سے بھی بدگمان رہتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

نگہدار و آں شوخ در کیسہ دُر

کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

اب دیکھئے کہ ایک جماد کی حفاظت میں یہ احتیاط ہو تو ایمان جس پر نجات اخروی اور ابدالآباد کی بہبودی کا مدار ہے اُس کی کس قدر احتیاط چاہئے؟ اور حدیث شریف میں بھی اس کی تعلیم کی گئی ہے، چنانچہ ''مقاصد حسنہ'' میں امام سخاوی نے یہ حدیث نقل کی ہے: **قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''احترسوا من الناس بسوء الظن'' رواہ احمد وغیرہ** یعنی لوگوں سے بدگمانی کر کے اپنی حفاظت کرلو۔

جب تک طبیعتیں تقلید کی جکڑ بندی کی عادی تھیں اہل سنت و جماعت کا گروہ ایک کثیر التعداد اشخاص پر شامل تھا اور جب تک ترک تقلید سے آزادی طبیعتوں میں آ گئی ہے ایسے نئے نئے فرقہ بن جاتے ہیں، جن کا وجود خیال میں نہیں آتا تھا اور لا مذہبی کا شیوع اُس وقت جو صدیوں میں نہیں ہوا تھا اب مہینوں بلکہ دنوں میں ہو رہا ہے اور یہ جتنے نئے فرقہ بنتے جاتے ہیں انہی مقلدوں کے ہم مشرب لوگ ہیں، جو اب جانی دشمن بن گئے ہیں۔

غرضکہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اہل سنت و جماعت کے متدین علماء نے جو تمام آیات و آحادیث کو پیش نظر رکھ کر کمال جانفشانی سے دینی احکام کو تنقیح کر کے کتب فقہ میں لکھ دیئے

ہیں اُن کو ہرگز نہ چھوڑیں اور مخالفین گوآیات واحادیث پیش کریں ان کو قابل التفات نہ سمجھیں ، کیونکہ جتنے مذہب والے اپنے کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں سب کا استدلال قرآن وحدیث ہی سے ہے۔اب کہیئے کہ آدمی کس کس کی پیروی کرے۔ پھر جس طرح قرآن سے ہدایت متعلق ہے کبھی ضلالت کا سبب بھی وہی ہوجاتا ہے، **کما قال اللہ تعالیٰ** : ''**یضل به کثیرًا و یهدی به کثیرًا** ۔ '' اس لئے مقتضائے عقل یہی ہے کہ اہل مذاہب باطلہ سے نہ قرآن سنے نہ حدیث ، بلکہ جس طرح کروڑ ہا اہل سنت و جماعت جن میں علماء ، محدثین اور اولیاء اللہ شریک ہیں ، قرناً بعد قرن مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کے مقلد رہے۔ ہم کو بھی چاہئے کہ اُن ہی کی پیروی کریں ، کیونکہ اسلام میں اجماع بھی ایک بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات مشاہد ہے کہ جس کسی کو مقتدا بننا منظور ہوتا ہے تو چند آیات واحادیث میں غور وفکر کرکے اور اقوال سلف اور عقل سے مدد لیکر کسی بات کو مہتم بالشان بنا دیتا ہے اور جہلاء جن کو دین کی عقل نہیں ہوتی اس کے دام میں پھنس جاتے ہیں ، یہاں تک کہ اُن کا ایک فرقہ بن جاتا ہے اور وہ سب اُس کے تابع اور مقلد کہلاتے ہیں اور وہ اُن کا مقتدا ، اور جو عقلمند ہوتے ہیں وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہمیں جاہل سمجھ کر چاہتا ہے کہ اپنے تابع اور مقلد بنالے اور خود ہمارا پیشوا اور حاکم بنے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مجتہد تو ہو ہی نہیں سکتے ، کسی نہ کسی کی تقلید کا قلادہ ہماری گردن میں ضرور ہوگا ، تو ہر کس وناکس کی تقلید کا عار کیوں قبول کریں اور ایسے شخص کی تقلید کیوں نہ کریں جس کے تدین اور اورع اور اعلم اور افقہ ہونے پر امام بخاریؒ کے صدہا اساتذہ نے گواہی دی ہے اور اسی زمانہ کے اکابر محدثین نے اُن کو اپنا مقتدا مان لیا اور لاکھوں علماء نے جن میں اکثر صحاح ستہ کی احادیث سے بخوبی واقف تھے اُن کی تقلید کی ۔ ایسے جلیل القدر امام کی تقلید کو چھوڑ کر کسی آخری زمانہ والے کے ہاتھ میں اپنا قلادہ دینا عقل سے بعید ہے۔ مثل

مشہور ہے ''اذا سرقت فاسرق الدرة'' غرضکہ مقلدین جو اپنے آباءواجداد کے طریقہ پر ہیں یہ بات اُن کو بتواتر معلوم ہوئی ہے کہ امام صاحب نے اکابر محدثین کے مجمع میں تحقیقات کر کے فقہ مدون کی تھی، جو نسلاً بعد نسل اُن تک پہونچی ہے، اب اگر اسی کا نام تقلید آبائی کہہ کر کفار کی تقلید آبائی کے ساتھ وہ برابر کر دی جائے تو عام مسلمانوں پر یہی الزام لگ سکتا ہے، کیونکہ نہ انہوں نے اپنے نبی کو دیکھا نہ ان کی باتیں سنی، نہ معجزے دیکھے بلکہ اپنے آباءواجداد ہی سے سن سنکر ایمان لائے، مگر جو لوگ سمجھدار ہیں وہ یہی کہیں گے کہ ہر زمانہ کے معتمد علیہ مسلمان خصوصاً اپنی آباءواجداد جن پر اعتماد زیادہ ہوتا ہے جب اُن تمام امور کی گواہی دیتے آئے تو بعد والوں کو نبوت کا یقینی علم ہو گیا۔ اب اگر یہ تقلید بھی ہے تو ایسے امر میں ہے جو اسلام میں ضروری سمجھا گیا ہے اور جس کا وجود تواتر سے ثابت ہو گیا ہے، اسی طرح مقلدین کی تقلید آبائی کا حال ہے۔ یہ بات یادر ہے کہ اس زمانہ میں تقلید مذاہب اربعہ سے بہتر کوئی مستحکم قلعہ نہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے۔

عمل بالحدیث کا دھوکا

اگر تقلید آبائی کا فقرہ سنکر کسی کو عار آجائے اور اس قلعہ سے باہر نکل پڑے تو کسی نہ کسی مکّار، غدّار کا ضرور شکار ہو جائیگا، کیونکہ ہر شخص کا کام نہیں کہ مخالفوں کی دلائل کو رد کر کے اپنا حقانی دین و مذاہب ثابت کر سکے۔ اس صورت میں ضرور کسی ایسے شخص کی تقلید کرنی ہوگی کہ نہ اُس کو دین سے کام ہے نہ مذہب سے، غرض بلکہ صرف جاہلوں کا مقتدا بننا اور اُن کو اپنے مقلد بنانا منظور ہوگا۔

اس موقع میں بعض لوگ یہ دھوکا دیتے ہیں کہ ہم اپنی تقلید کرانا نہیں چاہتے بلکہ عمل بالحدیث چاہتے ہیں۔ یہ ایسا فقرہ ہے کہ بھولے بھالے مسلمانوں کے دلوں پر افسوں کا کام کر جاتا ہے، مگر اہل علم سمجھتے ہیں کہ عمل بالحدیث ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لئے اعلیٰ

درجہ کی قوت اجتہادیہ کی ضرورت ہے۔

وہی حدیثیں معتبر ہیں جو مجتہدِ مطلق کے ذریعہ سے پہونچیں

دیکھئے! عمر رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جب مناظرہ کیا کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جہاد درست نہیں، اُس وقت صحیح حدیث پیش کی، جس کو صدیق اکبرؓ بھی جانتے تھے، باوجود اس کے انہوں نے جہاد کی ضرورت سمجھی اور خدا جانے کونسی آیات و احادیث پیش نظر ہوگئی تھیں کہ انہوں نے اُس حدیث پر عمل کرنا درست نہیں سمجھا۔ آخر کُل صحابہ نے اُس حدیث کو ترک کر کے صدیق اکبرؓ کے اجتہاد ہی کو مان لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہی احادیث اور اُن کے معنی دین میں معتبر ہیں جو مجتہدوں کے ذریعہ سے پہونچیں۔ اگر صحیح حدیث کے پیش ہوتے ہی اُس پر عمل واجب ہوتا تو صدیق اکبرؓ کو اجتہاد پر کبھی جرأت نہ ہوتی۔ غرضکہ بخاری شریف کی حدیثیں اُسی وقت واجب العمل ہوں گی کہ مستند مجتہد کے اجتہاد میں بھی واجب العمل قرار پائیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے ''عقد الجید'' میں لکھا ہے کہ کسی خصوصیت مقام اور قرائن خاصہ کی وجہ سے صحت حدیث ثابت ہوتی ہے اور جدلی امور کلیہ سے اُس کا ابطال کرنا چاہتا ہے۔ سو اُس کی مثال ایسی ہوگی کہ کسی پتھر کو مثلاً دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ وہ پتھر ہے، مگر جدلی اُس میں شک ڈالنے کی غرض سے کہتا ہے کہ ہر چیز کی شناخت رنگ اور شکل وغیرہ سے ہوتی ہے اور چونکہ ان امور میں تشابہ ہوتا ہے، اس لئے اُس کے پتھر ہونے کا یقین نہیں ہوسکتا۔

جب قرائن خاصہ سے حدیث کی صحت ثابت ہوجائے تو جدلی کا قول قابل اعتبار نہ ہوگا بلکہ ایسے موقع میں سکون اور اطمینان قلب دیکھا جاتا ہے، جو مشاہدہ اور قرائن سے حاصل ہو۔ انتہی۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی مسئلہ میں صحت کسی حدیث کی ثابت ہوجائے اور دوسرے احادیث یا قرائن سے مجتہد کو سکون اور اطمینان حاصل نہ ہو تو اُن کو ضرور ہوگا کہ اجتہاد کر

کے ایسا حکم مستنبط کریں جس سے ان کو اطمینان حاصل ہو۔ اسی وجہ سے اکثر اُن کو صحیح حدیثیں چھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ صحابۂ کبار کے طریقۂ عمل سے ثابت ہوا۔

اس زمانہ میں کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا

غرضکہ جن کو درجۂ اجتہاد حاصل نہیں اُن کو سکون اور اطمینان قلبی حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تحقیق کرلیں کہ معتمد علیہ مجتہد نے بھی حدیث مجوث عنہ کو واجب العمل قرار دیا یا نہیں۔ اگر ہر طالب علم کے کہنے سے عمل بالحدیث کرنے لگیں تو اُن طلبہ کے مقلد بازیچۂ اطفال بن جائیں گے، کیونکہ اس زمانہ میں مجتہد بننا ہرگز قرین قیاس نہیں۔ اس وجہ سے مجتہد کو ضرور ہے کہ اجتہاد کر کے ہر مسئلہ میں اطمینانی کیفیت حاصل کرے کہ یہی شارع کی مراد ہے اور کسی مسئلۂ دینیہ میں اطمینانی کیفیت اُس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتی کہ تمام آیات اور تمام احادیث اور تمام اقوال صحابہ جو اُس مسئلہ سے متعلق ہیں، پیش نظر نہ ہوں، جیسا کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے ''انصاف'' میں لکھا ہے: ''**و ثانیها ان یجمع الاحادیث و الآثار فیحصل احکامها و ینبه لأخذ الفقه منها و یجمع مختلفها**''۔

اور صحیح صحیح احادیث و آثار کا مفقود ہوجانا یقیناً ثابت ہے تو یہ چند موجودہ حدیثیں اُن لاکھوں کے قائم مقام کیونکر ہوسکیں؟ پھر احادیث میں قابل اعتماد وہ حدیثیں ہوتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری قول یا فعل مذکور ہو، جیسا کہ بخاری شریف میں ہے:

قال الزهری و انما یؤخذ من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم الأخر فالأخر۔

جب لاکھوں حدیثیں تلف ہوگئیں تو اس قسم کی بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ضرور تلف ہوئی ہوں گی۔

ہاں اگر اصحاب صحاح ستہ یہ تصریح کردیتے کہ کل صحیح حدیثیں ہمیں پہونچ گئی ہیں، مگر کسی مصلحت سے ہم نے بیکار حدیثوں کو ترک کردیا اور کام کام کی حدیثیں صحاح میں

لکھدیں تو اُن کے اعتماد پر یہ کہنا ممکن تھا کہ تلف شدہ حدیثوں کو دین کے معاملہ میں کوئی دخل نہ تھا، اس لئے اُن کا تلف ہونا ہی اچھا ہوا، جس سے حفاظت کی مصیبت سر سے ٹل گئی، مگر یہ بھی ثابت نہ ہوا۔ اس لئے کہ کسی محدث نے یہ دعویٰ کیا ہی نہیں کہ مجھے کل صحیح حدیثیں پہونچی ہیں اور میں نے اُن حدیثوں میں سے وہی حدیثیں انتخاب کر کے اپنی کتاب میں لکھی ہیں جن میں حضرت کے آخری قول اور فعل ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو صحاح ستہ میں ہر مسئلہ سے متعلق ایک ہی حدیث ہوتی، حالانکہ بخاری وغیرہ کتب صحاح میں اکثر متعارض حدیثیں موجود ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف ناسخ اور معمول بھا حدیثوں کے لکھنے کا انہوں نے التزام نہیں کیا۔

صحاح میں کل حدیثیں واجب العمل نہیں

دیکھئے بخاری شریف میں یہ حدیث موجود ہے: ''**قال ابو الدرداء : کیف کان عبد الله یقرأ (اللیل اذا یغشی) قال (و الذکر والانثی) فقال ابو الدرداء: مازال هولاء حتی کادوا یشککونی و قد سمعتها من رسول الله صلی الله علیه وسلم**''

اگر بخاری شریف میں کل روایتیں واجب العمل ہوتیں تو سورۂ واللیل میں کوئی نہیں تو اہلحدیث ضرور ''**والذکر والانثی**'' پڑھتے حالانکہ غالباً وہ بھی ایسا نہ پڑھتے ہوں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ بخاری شریف میں بھی واجب العمل اور غیر واجب العمل ہر قسم کی روایتیں موجود ہیں۔ اب بتایئے کہ کیا ممکن ہے کہ آخری زمانہ والے اجتہاد کے مدعی تمام صحیح اور ناسخ حدیثیں حاصل کر لیں؛ جس سے اطمینانی کیفیت دل میں پیدا ہو؟ اس زمانہ میں اطمینانی کیفیت پیدا ہونے کی تدبیر سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ لاکھوں

حدیثیں ''کان لم یکن ''فرض کر لی جائیں اور یہ خیال کرلیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ فرمایا ہی نہیں ،مگر یہ تصور خلاف واقع ہوگا اور جو اجتہاد اُس پر متفرع ہوگا وہ ''بناء الفاسد علی الفاسد'' ہوگی۔

سوائے فقہ کے کسی کتاب میں یہ بات نہیں کہ وہ خلاصۂ کل احادیث ہو

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ چند صحاح ستہ کی حدیثیں اُس وقت غنیمت اور کافی سمجھی جاتی کہ کل احادیث کا ماحصل اور خلاصہ ہمارے پاس نہ ہوتا۔مگر جب اکابر دین کی شہادتوں سے ثابت ہوگیا کہ فقہ حنفیہ تقریباً کل حدیثوں کا ملخص ہے،تو مقتضائے عقل یہی ہے کہ اسی کو قائم مقام کل حدیثوں کے تصور کرلیں۔

چونکہ گل رفت وگلستان شد خراب بوی گل راازکہ جویم ازگلاب

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ خود محدثین نے کہا ہے کہ ابوحنیفہؒ نے احادیث کو محفوظ کردیا۔

غرضکہ جب امام صاحب نے تمام آیات واحادیث وآثار کو جمع کر کے اُن سے مسائل جزئیہ کے استخراج کا بار گراں اپنے ذمہ لیا اور اُس کام میں جس قدر ضرورتیں پیش آئیں سب کو نہایت اہتمام اور احتیاط سے پوری کیا،تو اُن کی محنت شاقہ کو''کأن لم یکن '' کر کے طے شدہ امور کو بے بضاعتی کی حالت میں از سر نو شروع کرنا کس قدر بے ضرورت اور فضول ہے۔اگر اسی فقہ پر ظن غالب کرلیا جائے کہ تمام احادیث وآثار کا خلاصہ ہے تو اس کو تائید دینے والے بہت سے اکابر دین کی شہادتیں موجود ہیں۔بخلاف اس کے اب جو اجتہاد کیا جائیگا اُس پر ہرگز حسن ظن نہیں ہوسکتا کہ وہ کل احادیث کا خلاصہ ہے اور جب تک کسی چیز پر ظن غالب نہ ہو وہ شریعت میں قابل اعتبار نہیں۔اسی وجہ سے اُمت مرحومہ میں

مذاہب حقہ وہی چار تسلیم کئے گئے ہیں جن کی تدوین صحاح ستہ کی تدوین سے پہلے ہو چکی ہے۔ جس زمانہ میں تقریباً کل صحیح حدیثیں موجود تھیں اور اُس کے بعد مفقود ہو گئیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ''انصاف'' میں لکھے ہیں کہ اہل حق کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ واجب اصلی یہ ہے کہ اُمت میں ایک شخص ایسا ہو کہ احکام فرعیہ اور تفصیلیہ سے معلوم کرے چونکہ مقدمۂ واجب، واجب ہے، تو اگر کسی واجب کے حاصل کرنے کے کئی طریقہ ہوں تو کسی ایک طریقہ کا حاصل کرنا واجب ہوگا۔ اور جب ایک ہی طریقہ اس کا معین ہو جائے تو صرف اسی طریقہ کو حاصل کرنا واجب ہے۔ مثلاً کوئی شخص حالت مخمصہ میں مبتلا ہو، جس سے خوف ہلاکت ہو تو اُس مخمصہ کو دفع کرنے کے لئے غذا خریدے یا جنگل سے میوے وغیرہ چن کر کھائے یا شکار کرے، غرضکہ ان مختلف طریقوں سے کوئی ایک طریقہ دفع ہلاکت کے لئے اختیار کرنا ضرور ہوگا۔ اور اگر سب طریقے مسدود ہوں اور ایک ہی طریقہ کھلا ہو، مثلاً خریدی غذا کا تو اُس پر واجب ہوگا کہ کچھ خرید کر کے کھائے انتہی۔

دیکھئے! جب کل احادیث خصوصاً ناسخ حدیثوں کے حاصل کرنے کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اس لئے کہ لاکھوں حدیثیں مفقود ہو گئیں تو واجب بھی ہے کہ فقہ کی تقلید کی جائے، جس کے خلاصہ احادیث ہونے کا ظن غالب ہے؟ کیونکہ بخاری وغیرہ پر ظن غالب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کل احادیث کا مجموعہ یا خلاصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ لاکھوں علماء باوجودیکہ صحاح ستہ کو خوب جانتے، مگر مذہب ہی کی تقلید کرتے رہے۔

ترکِ تقلید کی ابتداء اور تاریخی حالات

یہاں یہ بات بھی معلوم کرنے کے لائق ہے کہ ابتداء کن لوگوں نے ترک تقلید کر کے خود سری اور تحقیق کا دعویٰ کیا۔

کتب احادیث وتواریخ سے ظاہر ہے وہ لوگ وہ تھے جن کو صحابہ نے خوارج کا لقب دیا تھا۔ ہر چند اس لفظ کے اور بھی معنی ہیں، مگر اس لحاظ سے بھی یہ لقب اُن پر صادق آجاتا ہے کہ وہ تقلید سے خارج ہو گئے تھے۔ بمناسبت مقام تھوڑا سا حال ان کا یہاں لکھا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں متعدد جنگ ہوئے اور یہ تجویز قرار پائی کہ طرفین سے حَکَم مقرر ہوں اور ان کی رائے پر فیصلہ قرار پایا۔ یہ بات اُن لوگوں کو ناگوار ہوئی جن کو کمال تقویٰ اور علم کا دعویٰ تھا، وہ لوگ علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر سے یہ کہہ کر علحدہ ہو گئے کہ حَکَم کرنا خدائے تعالیٰ کا کام ہے۔ جب علی رضی اللہ عنہ دوسرے کے حکم بننے پر راضی ہوئے تو وہ کافر حلال الدّم ہو گئے، اب اُن کی اتباع اور تقلید جائز نہیں۔ ابوالفرج ابن جوزیؒ نے ''تلبیس ابلیس'' میں لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے کو علم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے زیادہ سمجھتے تھے، ہر چند ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اُن سے کہا کہ علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تمام مہاجرین وانصار ہیں، جن میں قرآن نازل ہوا، وہ تم سے زیادہ قرآن کے معنی جانتے ہیں، اُن کے جیسا ایک شخص بھی نہیں، مگر انہوں نے نہ مانا اور کئی سوال کئے، جن میں ایک یہ تھا کہ خدائے تعالیٰ تو فرماتا ہے: ''**اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰه**'' اور علیؓ نے آدمیوں کو حَکَم مقرر کیا۔ آدمیوں کو حَکَم بننے سے کیا تعلق؟ تلبیس ابلیس کی یہ عبارت ہے: **قالو اما احداهن فانه حَگَّم الرجال فی امر الله ، و قد قال الله تعالیٰ " ان الحکم الا لله " فما شأن الرجال و الحکم بعد قول الله؟**'' اور اُس میں لکھا ہے کہ خوارج میں سے حرقوص وغیرہ نے علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ ''**لا حکم الا لله**'' آپ نے بھی فرمایا: ''**لا حکم الا لله**'' یہ سنکر اس نے کہا: جب یہی بات ہے تو، توبہ کرو اور اپنے فیصلہ سے رجوع کرو اور اگر ایسا نہ کرو گے تو ہم تم سے جنگ کریں گے۔ لکھا ہے کہ جب جنگ شروع ہوئی تو خوارج کی فوج میں ہر ایک دوسرے

سے کہتا تھا کہ ''تھیئوا للقاء الرب ۔ الرواح الرواح الی الجنۃ ''یعنی اپنے رب سے ملنے کے لئے آمادہ ہوجاؤ اور چلو جنت کی طرف، جلدی چلو!''۔ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ وہ کیسے قوی الایمان لوگ تھے کہ راہ خدا میں جان دینا اُن پر ذرا بھی گراں نہ تھا، بلکہ اُن کے یہ چند گراں بہا معنی خیز الفاظ اُن کے دلی ولولوں کو کس وضاحت سے بیان کر رہے ہیں کہ اُن کی عمر کا وہ ایک ہی دن تھا جس میں عمر بھر کی سعی اور جانفشانیوں کا نتیجہ پیش نظر ہوگیا تھا۔ اُن کا ایمان اور صدق ہر گز گوارا نہیں کرتا تھا کہ وہ دن ٹل جائے، موت کی تاخیر کو وہ ایک صدمہ جانکاہ سمجھتے تھے، حور وقصور اور جنت کے تمام سامان پیش نظر ہوگئے تھے کہ اب کوئی دم میں وہاں پہنچ کر مصائب دنیوی سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ملاقات جس کی تمنا عمر بھر رہی اب ہونے کو ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بزرگان دین کی توہین اور خودسری و ترک تقلید نے سب آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور بجائے جنت کے دوزخ کا مستحق بنا دیا۔ اگر چوں و چرا نہ کر کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تقلید کر لیتے تو وہ آرزوئیں پوری ہوتیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کے مستحق ہوجاتے۔

لکھا ہے کہ جب نہروان پر کئی ہزار خوارج مارے گئے تو عبدالرحمٰن بن ملجم وغیرہ نے اپنے مقتول رفقاء کا ذکر کر کے کہا کہ وہ ایسے لوگ تھے کہ جن کو خدا کے معاملہ میں کسی کی ملامت کا خوف نہ تھا، وہ تو مقصود کو پہنچ گئے، اب ہم کو چاہئے کہ اپنی جانیں دے کر اپنے لئے بھی جنت خرید لیں اور ان گمراہ ائمہ یعنی علی کرم اللہ وجہہ اور معاویہؓ کو قتل کر کے بندگان خدا کو راحت پہونچائیں۔ چنانچہ مکہ معظّمہ میں یہ عہد و میثاق مؤکد ہوا کہ ابن ملجم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اور بزرگ معاویہ کو اور عمرو بن بکر، عمرو بن عاصؓ کو ایک ہی روز قتل کر ڈالیں۔ چنانچہ ابن ملجم شقی کوفہ کو گیا اور اپنا معاہدہ پورا کیا۔

اُس کے استقلال کا حال لکھا ہے کہ جب قتل کے لئے قید خانہ سے نکالا گیا تو عبداللہ

ابن جعفرؒ نے اُس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹے، مگر اُس نے اُف نہ کیا۔ پھر گرم گرم سیخیں آنکھوں میں پھیری گئیں، جب بھی استقلال کو نہ چھوڑا؛ بلکہ کمال استقلال سے سورۂ اقرأ کی قرأت شروع کی اور یہ حالت تھی کہ اُدھر آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے اور آنکھیں نکل پڑ رہی ہیں اور ادھر زبان پر سورہ اقرأ برابر جاری ہے، یہاں تک کہ اُس سورہ کو ختم کیا۔ اُس کے بعد زبان کاٹنے کے لئے پچھاڑا گیا، اُس وقت جزع وفزع کرنے لگا، جب اُس کا سبب پوچھا گیا تو کہا: مجھے گوارا نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا وقت گذرے کہ جس میں خدائے تعالیٰ کا ذکر نہ کرسکوں اور فی الحقیقت کثرت عبادت اُس کے چہرہ سے نمایاں بھی تھی، کثرت سجود سے اُس کی پیشانی پر گھٹا ہوگیا تھا۔ خوارج کا اعتقاد اُس کی نسبت یہ تھا کہ آیۂ شریفہ ''ومن الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله'' اُسی کی شان میں نازل ہوئی تھی۔

ہم خیال اہل مذہب تو اُس کی تعریفیں کرتے ہی ہوں گے، اُس کی بلکہ اُس کے تمام مذہب والوں کی حالت یہ تھی کہ جو شخص سنے گا اُن کے تقویٰ اور استقلال اور قوت ایمانی کا قائل ہو جائیگا۔ کیوں نہ ہو حدیث میں اُن کی کثرت عبادت کا ذکر وارد ہے، جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے: **عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه أنه قال : سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول : یخرج فیکم قوم تحقرون صلواتکم مع صلوتهم ، و صیامکم مع صیامهم ، و اعمالکم مع اعمالهم ۔ ویقرء ون القرآن و لا یجاوز حناجرهم ، یمرقون من الدّین کما یمرق السهم من الرمیة ۔ اخرجاه فی الصحیحین ۔**

و عن عبد الله بن ابی اوفی ، قال : سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول : الخوارج کلاب النار ۔ کذا فی تلبیس ابلیس لابن الجوزیؒ ۔

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں ایک قوم ایسی نکلے گی کہ اُن کی نماز اور روزہ اور کل اعمال کے مقابلہ میں تم اپنی نماز روزہ اور کل اعمال کو حقیر سمجھیں گے ۔ وہ قرآن پڑھیں گے مگر اُن کے حلقوں کے نیچے نہ اُترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے ۔ اور فرمایا کہ خوارج دوزخ کے کتے ہیں ۔۔

اور اس فرقہ کے احوال کس قدر مبسوط ہم نے ''انوار احمدی'' میں لکھا ہے ۔ غرضکہ احادیث اور اُن کے احوال سے ثابت ہے کہ کتنا ہی تقویٰ اور عبادت کی جائے خودسری ہو تو وہ سب وبال جان ہے اور مفید ہے تو ایمان کے ساتھ بزرگان دین کی تقلید اور تکریم ۔

اُن لوگوں کی احتیاط کا حال لکھا ہے کہ اُن میں اکثر قائل تھے کہ نانا اگر نواسی کے ساتھ نکاح کرے تو جائز ہے ۔ اس لئے کہ قرآن شریف میں صرف بنات کا ذکر ہے ۔ بنات البنات کا اُن پر قیاس کرنا جائز نہیں اور زانی کے رجم کو بھی وہ جائز نہیں سمجھتے تھے، اس لئے کہ قرآن شریف میں اس کا ذکر نہیں اور اُن کا عقیدہ تھا کہ مرتکب کبیرہ کافر ہے اور ابدالآباد کفار کے ساتھ دوزخ میں رہے گا ۔ اس لئے کہ شیطان باوجودیکہ خدائے تعالیٰ کی توحید کا قائل اور عارف تھا، مگر صرف ایک کبیرہ جو اُس سے صادر ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اُس نے سجدہ نہ کیا، اس لئے کافر اور ابدالآباد کے لئے دوزخی ٹھیرا ۔ اُن کے مذہب میں یہ بات بھی داخل ہے کہ عثمان اور علی رضی اللہ عنہما سے تبریٰ اور ان کی تکفیر ضروری ہے، بغیر اس کے مناکحت صحیح نہیں ۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ اُن کی طبیعتوں میں کس درجہ کی احتیاط اور حرارت اسلامی تھی کہ ذرا بھی قرآن کی مخالفت کا احتمال ہو تو تکفیر ہی کر ڈالتے تھے اور کیسے ہی اعلیٰ درجہ کے صحابی کیوں نہ ہو اُن کو کافر کہہ دینا کوئی بڑی بات نہ تھی ۔ اجتہاد کو بالکل مانتے نہ تھے ۔ حالانکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کرم اللہ وجہہ کو اجتہاد کی اجازت دی تھی، مگر اُن کے بھی اجتہاد کو نہ مانا اور نہ ان کی تقلید کی ۔

اب دیکھئے کہ یہ لوگ سلف صالح کی تقلید کو شرک بتاتے ہیں اور مجتہدوں کی توہین کرتے ہیں اور عقلی دلائل قائم کر کے جو کام خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیماً کیا اور صحابہ کرتے رہے اُس کو برا سمجھتے ہیں اور بات بات میں مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں اور بزرگان دین کی شان میں بدگوئیاں کرتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ دین میں تشدد کرتے ہیں وہ کس جماعت میں محسوب ہوں گے؟

ظَنِّ غالب شریعت میں معتبر ہے

اسلام میں پہلا فرقہ جو مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہوا وہ فرقہ خوراج ہے اور سبب اُن کے خارج ہونے کا یہی ہوا کہ خود ظاہر قرآن سے مسئلے نکالنے لگے۔ چنانچہ، **قولہ تعالیٰ ''اِن الحکم الا للہ''** پر استدلال کر کے مستند مجتہد وقت یعنی علی کرم اللہ وجہہ کی تقلید چھوڑ دی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوزخ کے کتے ہوئے۔

اب مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ طریقہ اختیار نہ کریں جس نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا اور تفرقہ اندازوں کو دوزخی بنایا، بلکہ وہ طریقہ اختیار کریں جو صحابہ سے آج تک اہل سنت و جماعت میں جاری ہے۔ یہ تقریر ضمناً آ گئی کلام اس میں ہے کہ متعدد تصریحات اور قرائن سے اس بات کا ظن غالب پیدا کر دیا ہے کہ فقہ، احادیث وقرآن کا خلاصہ ہے اور ظن غالب شرعاً عقلاً، عرفاً قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔

اسی وجہ سے جب تک دو معتبر شخص کسی بات پر گواہی نہ دیں کسی دعویٰ کا ثبوت نہیں ہوسکتا اور جب دو گواہ پیش ہو جائیں تو پھر یہ انتظار نہ ہوگا کہ مدعی اتنے گواہ پیش کرے کہ اُن کی تعداد حد تواتر کو پہنچ جائے، جو مفید علم قطعی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح یقین پر آثار مرتب ہوتے ہیں؛ ظن غالب پر بھی ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر سمت قبلہ میں شک واقع ہوتو جب تک قرائن سے کسی جہت پر ظن غالب نہ ہو، نماز صحیح نہیں ہوتی، گو قبلہ ہی کی طرف کیوں نہ پڑھی جائے اور اگر تحصیل ظن غالب کے بعد خلاف جہت پڑھی جائے تو نماز صحیح ہوجائیگی۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ ظن پر وہی آثار مرتب ہوتے ہیں جو یقین پر ہوتے ہیں۔

محدثین خبر واحد کو بھی واجب العمل کہتے ہیں، جیسا کہ ''نکت'' میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

''واما اشتراط العدد فی الحدیث الصحیح ، فقد قال به قدیما ابراهیم بن اسماعیل بن علیة وغیره وعقد الشافعیؒ فی '' الرسالة '' باباً محكماً لوجوب العمل اخبر الواحد''۔ و خبر الواحد عندهم '' هو مالم یبلغ درجة المشهور ، سواء رواه شخص واحد أو اكثر ''۔

مگر اس کے ساتھ ہی کئی شرطیں بھی لگائی گئیں، جن سے ظن غالب پیدا ہو، چنانچہ ''الفیہ عراقی'' میں صحیح حدیث کی شرطیں لکھی ہیں:

فالاول المتصل الاسناد بنقل عدل ضابط الفؤاد

عن مثله من غیر ما شذوذ وعلة قادحة فتوذی

و بالصحیح والضعیف قصدوا فی ظاهر لا القطع والمعتمد

یعنی صحیح وہ روایت ہے جس میں ہر راوی ملازم تقویٰ اور اعلیٰ درجہ کا متقی اور صادق ہو، اور ہوشیار ہو، بیوقوف نہ ہو اور خوب یاد رکھے اور اگر کتاب میں لکھ لیا ہو تو کتاب کی خوب حفاظت کرے اور کسی ثقہ کے مخالف روایت نہ کیا ہو۔ اور کوئی علت قادحہ اس میں نہ ہو۔

محدثین تو فقہ کا انکار نہیں کر سکتے

الحاصل جب اتنے قرائن ہوں تو وہ حدیث صحیح اور واجب العمل ہوگی، گو قطعی علم اُس

سے حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ ''فتح المغیث شرح الفیة الحدیث'' میں امام سخاویؒ نے لکھا ہے: '' **القطع انما یستفاد من التواتر أو القرائن المحتف بها الخبر و لو کان احاداً** '' یعنی علم قطعی بغیر خبر تواتر کے یا اُس خبر کے جس میں کئی قرینے ہوں حاصل نہیں ہوسکتا۔

غرضکہ ایک شخص کی خبر ہرگز قابل اعتبار نہیں، مگر جب قرائن سے اُس کی صحت کا ظن غالب ہوجائے تو وہ واجب العمل ہوجاتی ہے، لیکن باوجود اس کے غلطی کا احتمال لگا رہتا ہے، جیسا کہ ''فتح المغیث'' میں لکھا ہے:'' **و بالصحیح و الضعیف قصدوا الصحة والضعف فی ظاهر الحکم بمعنی انه اتصل سنده مع سائر الاوصاف المذکورة او فقد شرط من شروط القبول لجواز الخطأ والنسیان علی الثقة و الضبط والاتقان و کذا الصدق علی غیره ، کما ذهب الیه جمهور العلماء من المحدثین والفقهاء والاصولیین و منهم الشافعیؒ مع التقید بالعمل به متی ظنناه صدقاً الخ** ''

یعنی اگر کسی حدیث کی اسناد متصل ہو اور تمام اوصافِ صحت اُس میں پائے بھی جائیں جب بھی احتمال خطا و نسیان لگا ہوا ہے۔ اس لئے کہ ثقہ سے خطا و نسیان ممکن ہے۔

اس کے سواء اور کئی محدثین کے اقوال ابھی نقل کئے گئے، جس سے ثابت ہے کہ اسناد کیسی ہی صحیح ہو مگر اس سے یہ علم قطعی نہیں ہوتا کہ متن حدیث صحیح ہے، البتہ قرائن سے ظن غالب ہو جاتا ہے کہ متن بھی صحیح ہوگا۔ اور اسی ظن غالب سے اُس حدیث پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ جن محدثین کے نام صحیح حدیثوں کے اسناد میں داخل ہیں، جن کی صداقت بیان کو یہ قوت حاصل ہے کہ حدیث کو سامع کے اعتقاد میں صحیح اور واجب العمل بنادیتی ہیں،

انہیں میں کے اکثر حضرات فقہ حنفیہ کو مطابقِ حدیث اور قابلِ وثوق بیان کر رہے ہیں، پھر اس جم غفیر کے اخبار کے وثوق پر یہ کیوں نہ کہا جائے کہ جو مسائل فقہیہ بخاری وغیرہ کے مخالف ہیں دراصل اُن احادیث صحیحہ کے موافق ہیں جو امام بخاری وغیرہ متاخرینؒ کو نہیں پہونچیں۔ پہونچیں بھی تو ضعیف بن کر۔ اُن حضرات کے زمانہ میں وہ سب صحیح اور واجب العمل تھیں۔ غرضکہ بخاری و مسلم کی حدیثوں کو صحیح بنانے والے حضرات جب فقہ حنفیہ کو مطابق احادیث کہہ رہے ہیں تو بخاری و مسلم کو صحیح ماننے والوں کو اس بات کا ظن غالب ہونا ضرور ہے کہ فقہ حنفیہ واجب العمل ہے۔ اور بخاری وغیرہ میں وہ حدیثیں موجود تھیں جن کے مطابق فقہ حنفیہ ہے۔ اور اگر یہ ظن پیدا نہ ہو تو اُس سے یہ لازم آئیگا کہ بخاری وغیرہ کی صحت پر بھی حسن ظن نہیں ہے۔

بخاری کی مخالفت سے لازم نہیں کہ کُل احادیث کی مخالفت ہو

اس میں شک نہیں کہ صحیح حدیثیں واجب العمل ہیں اور موضوع حدیث پر عمل درست نہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو حدیث صحیح ہو واجب العمل ہے۔ چنانچہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے طریقۂ عمل سے معلوم ہوا کہ عمل بالاجتہاد کو عمل بالحدیث پر ترجیح دی۔ اور اگر صحیح حدیث واجب العمل ہوتی تو امام بخاریؒ لاکھ صحیح حدیثیں ضرور جمع کر دیتے جو اُن کو یاد؛ تھیں تا کہ ہر ایک پر لوگ عمل کریں۔

اگر کہا جائے کہ امام بخاری نے واجب العمل انہی حدیثوں کو سمجھا جو بخاری شریف میں ہیں تو ہم کہیں گے یہ سمجھنا اُن کا اجتہاد تھا، دوسرے مجتہدوں پر حجت نہیں ہوسکتا۔ جس طرح انہوں نے ان احادیث کو واجب العمل سمجھا، دوسرے مجتہدوں نے دوسری صحیح حدیثوں کو سمجھا۔ پھر بخاری میں بھی تو کُل حدیثیں واجب العمل نہیں ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ

سورہ واللیل کی روایت پر عمل نہیں ۔غرضکہ صحیح بخاری کی مخالفت سے مقلدوں پر یہ الزام نہیں آ سکتا کہ اُن کا مذہب مخالف حدیث ہے۔

پھر بخاری شریف ایسے زمانہ میں لکھی گئی کہ لاکھوں صحیح حدیثیں مفقود ہوگئیں، جو ائمۂ اربعہ کے زمانہ میں موجود تھیں ۔جن کے موافق فقہ خصوصاً فقہ حنفیہ کا ہونا امام بخاریؒ کے صدہا اساتذہ کی گواہیوں سے ثابت ہے۔اب مذاہب اربعہ پر یہ الزام جو لگایا جاتا ہے کہ وہ بخاری کے مخالف ہیں، اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ امام بخاری کو وہ صحیح حدیثیں ملی ہی نہیں جو ائمہ کو خصوصاً امام صاحب کو ملی تھیں اور اگر ملی بھی تھیں تو اُن کو قوت اجتہادیہ اور تفقہ نے اُن مسائل کے نکالنے پر یاری نہیں دی جو امام صاحب نے نکالا تھا۔اور یہ کوئی نئی بات نہیں ۔اعمش اور اوزاعی جیسے حضرات امام صاحب کے مقابلہ میں ’’ **نحن العطارون و انتم الاطباء** ‘‘ فرما چکے ہیں۔

بخاری کی کُل حدیثیں امام صاحب کے پیشِ نظر تھیں

اب یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ بخاری شریف میں جو حدیثیں مذکور ہیں، ائمہ اربعہ کے زمانہ میں تھیں یا نہ تھیں؟ یہ ممکن نہیں کہ اُس زمانہ میں نہ ہوں ، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ وہ سب موضوع ہیں اور جب موجود تھیں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ ائمہ اربعہ کو اُن کا پہونچنا ممکن ہے یا نہیں؟ تو ہرگز ثابت نہیں ہوگا کہ ان احادیث کا ائمہ کو پہونچنا ممکن ہی نہ تھا!اس سے ثابت ہوگیا کہ ممکن ہے کہ ائمہ کو وہ حدیثیں پہونچی بھی ہوں گی ۔اس کے بعد جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکابر محدثین کی گواہیوں سے امام صاحب کا **اعلم الناس** ہونا ثابت ہےتوبآسانی اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ حدیثیں اُن کو ضرور پہونچی ہوں گی ۔اس لئے امام بخاریؒ نے لاکھوں حدیثوں سے منتخب کر کے چند احادیثِ احکام جو اپنی کتاب میں لکھی ہیں، اس انتخاب کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اُن کی قوت اور صحت اسناد ہے۔اور یہ بات اہل علم پر پوشیدہ

نہیں کہ قوت اور صحتِ اسناد ہر زمانہ میں مرغوب رہا کی اور ایسی حدیثوں کو حاصل کرنے کی غرض سے دور دراز کا سفر اختیار کیا جاتا تھا اور یہ بات مشہور ہوتی تھی کہ فلاں فلاں کے پاس فلاں فلاں منتخب حدیثیں ہیں۔

اب غور کیا جائے کہ جب ایسی منتخب حدیثیں امام صاحب کے زمانہ میں موجود اور مشہور ہوں تو کیا اُن کا شوق اور تدین مقتضی ہوسکتا تھا کہ وہ حدیثیں حاصل نہ کی جائیں؟ ہرگز نہیں! یہی وجہ تھی کہ چار ہزار محدثوں کو اسناد بنانے کی ضرورت امام صاحب نے محسوس کی۔ پھر امام صاحب کے حلقہ میں جو ہر ملک و دیار سے محدثین جوق جوق آتے اور اجتہاد کے وقت اپنا سرمایۂ حدیث پیش کرتے تھے، کیا ایسی منتخب حدیثوں کو انہوں نے نظر انداز کر دیا ہوگا؟ اور ابن مبارک جیسے امیر المؤمنین فی الحدیث جو عمر بھر امام صاحب کی خدمت میں رہے، کیا بغیر ان اعلیٰ درجہ کی منتخب حدیثیں جاننے کے امیر المؤمنین فی الحدیث مُسلَّم ہو گئے ہوں گے؟ ہرگز نہیں! غرضکہ متعدد اور مختلف قرائن و وجوہ سے ثابت ہے کہ بخاری شریف میں جتنی حدیثیں ہیں خصوصاً وہ حدیثیں جن سے احکام فقہیہ متعلق ہیں، امام صاحب کو پہونچیں اور اجتہاد کے وقت وہ ضرور پیش ہوئی تھیں؛ کیونکہ متعدد شیوخ کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ جن احادیث سے مسائل فقہیہ کا تعلق ہے اُن کو امام صاحب خوب جانتے تھے۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ بخاری شریف کی حدیثیں اجتہاد کے وقت اگر پیش نظر تھیں تو بعض مسائل فقہیہ خلاف اُن احادیث کے کیوں ہوئے جس کی وجہ سے عامل بالحدیث حنفیہ پر اعتراض کرتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ ہر ایک اجتہادی مسئلہ سے جتنی حدیثیں متعلق ہوتی ہیں اجتہاد کے وقت سب پیش نظر رکھی جاتی تھیں، اور جتنا سرمایہ لغت اور محاورات عرب وغیرہ امور کی ضرورت ہوتی ہے، سب فراہم ومہیا ہوتا تھا، اس وقت ان تمام امور میں تدبر کر کے ایک ایسی بات نکالی جاتی تھی جس میں وہ تمام امور ملحوظ ہوں، یہ کام آسان نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ایک ایک مسئلہ کی تحقیق میں ایک ایک مہینہ گذر جاتا تھا۔ غرضکہ جب اجتہاد میں تمام آیات و

احادیث ہر مسئلہ سے متعلق پیش ہوتی تھیں اور اُن کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جاتی تھی تو یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ہر ایک حدیث کا پورا مضمون، ہر مسئلہ میں لکھ دیا جائے بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے آیات واحادیث کے لحاظ سے بعضے حدیثیں پوری ترک کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی پیش کی ہوئی حدیث پر عمل نہ کیا، اسی طرح بعضے حدیثیں بخاری کی مسائل فقہیہ میں متروک العمل ہوئیں، اور یہ اجتہاد کا لازمہ ہے۔

مجتہدوں کو بعض احادیث کو ترک کرنے کی ضرورت تھی

''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حدیث صحیح پہونچنے پر بھی مجتہد کو ظن غالب نہیں پیدا ہوتا، اس لئے وہ اپنے اجتہاد کو ترک نہیں کرسکتا، بلکہ حدیث پر طعن کرتا ہے، جیسا کہ صحاح ستہ میں یہ روایت ہے کہ فاطمہ بنت قیسؓ نے عمرؓ کے روبرو یہ گواہی دی کہ جب میرے شوہر نے مجھے تین طلاق دیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے نہ نفقہ مقرر فرمایا نہ سکنیٰ۔ عمرؓ نے فرمایا کہ میں ایک عورت کے کہنے سے کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتا بلکہ میں یہ حکم دیتا ہوں کہ ایسے مطلقہ کے لئے نفقہ بھی دلایا جائے اور سکنیٰ بھی۔ اور عائشہؓ نے بھی فرمایا کہ ''اے فاطمہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتی ہو؟''۔

اب دیکھئے کہ حسب قاعدہ مسلمہ ''صحابہ کل عدول ہیں'' یہ خیال ہرگز نہیں ہوسکتا کہ فاطمہؓ نے جھوٹ کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء کیا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف قرآن حکم کیا ہو، اس لئے یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ یا تو یہ حکم قبل نزول آیہ شریفہ ہوگا یا اس موقع کی کوئی خصوصیت تھی جس کو حضرت ہی جانتے تھے۔ بہرحال مجتہد کو ایسے مواقع میں اجتہاد سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی وجہ

سے عمرؓ نے اُس صحیح حدیث کو ترک کر کے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر صحیح حدیث قابل عمل نہیں ہوسکتی بلکہ اجتہاد کی ضرورت باقی ہے۔

یہی بات اس روایت سے بھی ظاہر ہے: ''**عن ابن عباسؓ ، قال : قال عمرؓ : ابی اقرؤنا ، و انا لندع من لحن ابی ۔ ابی یقول اخذته من فی رسول الله صلی الله علیه وسلم فلا اترکه لشئی قال الله تعالی ما ننسخ من آیة او ننسها نأت بخیر منها او مثلها'' ۔ رواه البخاری ۔**

یعنی عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہر چند ابیؓ ہم سب سے زیادہ قرأت جانتے ہیں ۔ مگر جس بات میں انہوں نے خطا کی ہے اُس کو ہم ضرور ترک کردیں گے ۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت کو میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سن چکا ہوں ، اس لئے میں اس کو کسی وجہ سے یعنی کیسی ہی دلیل اس کے مقابلہ میں پیش ہو ، نہ چھوڑں گا ۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''**ما ننسخ من آیة'' الآیة** ۔ یعنی ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اُس کے مثل دوسری آیت نازل کرتے ہیں انتہی ۔

اب دیکھئے کہ باوجودیکہ ابیؓ جس آیت کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن چکے تھے اُس کا اُن کو جزم تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس کے ترک کو حرام سمجھتے تھے اور عمرؓ جیسے جلیل القدر اور پرزور حکومت والے خلیفۂ وقت کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کی ، مگر عمرؓ نے بھی اپنے جزمی اجتہاد کے مقابلہ میں اُن کے جزم کی کچھ پروا نہ کی ، اور اپنے اجتہاد ہی کو ترجیح دی ۔ اس سے ایک بات اور معلوم ہوئی کہ صحابہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سن لیتے یا کسی فعل کو آپ دیکھ لیتے دوسری روایت یا قرائن کی وجہ سے اپنی مروی حدیث کو ترک نہیں کرتے تھے اور بمصداق ''**لیس الخبر کالمعاینة**'' مقتضائے

طبیعت بھی یہی ہے، مگر مجتہدوں کا فرض منصبی ہے کہ دوسرے احادیث وآیات وقرائن وغیرہ پرغور وفکر کر کے ایک ایسی بات منقح کریں جس کے مطابق واقع اور حق ہونے کا ظن غالب ہو جائے اور اس اجتہاد میں کوئی صحیح حدیث قصداً بھی ترک کردیں تو اُس کے مجاز ہیں، جیسا کہ عمرؓ کے بیان سے واضح ہے۔

ابوداؤد میں یہ روایت ہے: ''**عن الزهری ، ان عثمان بن عفانؓ اتم الصلوة بمنی من اجل الاعراب لانهم كثروا عامئذٍ ، فصلی بالناس اربعاً ليعلمهم ان الصلوة اربع۔**''

یعنی عثمانؓ نے منی میں نمازوں میں قصر نہیں کیا اور پوری چار رکعتیں پڑھیں، اس وجہ سے کہ اُس سال بدو بہت سارے حج کے لئے آ گئے تھے، اس چار رکعت پڑھنے سے اُن کی تعلیم مقصود تھی کہ ظہر عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں۔

دیکھئے! تمام حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں قصر فرمایا تھا، مگر عثمانؓ نے اپنے اجتہاد اور رائے سے اُن حدیثوں پر عمل نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد سے کسی حدیث کو ضرورۃً ترک بھی کرسکتا ہے۔ یہ روایت اوپر لکھی گئی ہے کہ جن لوگوں نے ''**صبأنا صبأنا**'' کہا تھا، خالدؓ نے جو امیر لشکر تھے اُن کے قتل کا حکم دیا اور ابن عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے اُن کے حکم کو نہیں مانا؛ حالانکہ متعدد حدیثوں سے ثابت ہے کہ اطاعت، امیر کی واجب ہے۔

اس سے بھی ثابت ہے کہ اگر مجتہد کسی لحاظ سے حدیث پر عمل نہ کرے تو وہ اُس کا مجاز ہے۔

اوپر بھی مذکور ہوا کہ باوجود حق تعالیٰ فرماتا ہے: ''**فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم**'' یعنی مشرکین جہاں ملیں اُن کو قتل کرڈالو۔ مگر نیل الاوطار میں علامہ شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ اصحاب صوامع اور رہبان کا قتل قیاس سے ممنوع ہے حالانکہ یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے مشرک ہیں۔

محدثین بھی احادیث کوترک کر دیا کرتے ہیں

یہ روایت بھی اوپر مذکور ہوئی کہ ابن عمرؓ نے ابن عباسؓ کے مقابلہ میں یہ حدیث پیش کی: ''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ان الميت يعذب ببعض بكاء اهله عليه''
اور یہی روایت عمرؓ سے مروی ہے، مگر عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے اجتہاد سے اُس کو قبول نہیں کیا اور ابن عمرؓ بھی ساکت ہو گئے۔
اب دیکھئے کہ صدیق اکبر، عمر فاروق، عثمان ذی النورین، عائشہ صدیقہ، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے طریقۂ عمل سے ثابت ہے کہ اگر مجتہد کوئی صحیح حدیث، قیاس صحیح شرعی کے معارض ہو تو وہ اُس کو متروک العمل کرنے کا مجاز ہے اور اُس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔
پھر یہ الزام فقط فقہاء ہی پر نہیں ہے بلکہ محدثین نے بھی اس باب میں ان سے زیادہ حصہ لیا ہے تو اپنے اجتہاد سے نفس حدیث ہی کو متروک بنا دیتے ہیں۔
کتبِ احادیثِ موضوعہ میں دیکھ لیجئے کہ ایسی حدیثیں جن کو محدثین نے اپنی کتابوں میں درج کیا اور اُن کا اعتبار بڑھانے کے لئے اسنادیں بھی ان کے ساتھ ذکر کیں اور مدتوں وہ حدیثیں کلام نبوی سمجھیں گئیں اور علماء استدلال اُن سے کرتے رہے، پھر بعض محدثین نے جو فن حدیث میں مجتہد مانے جاتے تھے، اُن حدیثوں کو موضوع قرار دیا۔ یعنی حدیثوں سے ہی ان کو خارج کر کے بالکلیہ متروک ہی کر دیا۔ اگر اس کی تصدیق منظور ہو تو موضوعات ابن جوزیؒ کو دیکھ لیجئے، انہوں نے اجتہاد سے موضوع حدیث پہچاننے کا یہ قاعدہ بھی بیان کیا؛ جس کو امام سیوطیؒ نے ''تدریب الراوی'' میں نقل کیا ہے کہ ''اکثر ایسی حدیثوں کے سننے سے جسم پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل میں اُس سے نفرت پیدا ہوتی ہے''۔
ابن جوزیؒ نے جو علامت بتلائی ہے کہ موضوع حدیث سننے سے اکثر نفرت پیدا ہوتی ہے، وہ قوت اجتہادی کی طرف اشارہ ہے؛ جو خدا و رسول کا کلام ایک مدتِ دراز تک

دیکھنے اور تحقیق کرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔جس سے آدمی اُن باتوں کو فوراً پہچان جاتا ہے جو خلاف مرضیٔ خدا ورسول ہوں ۔اُس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کس و ناکس اس علامت سے موضوع حدیث پہنچان سکتا ہے۔

دیکھ لیجئے سید احمد خان صاحب اپنی تصانیف میں حوروں سے کیسی نفرت ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک لکھ دیا کہ اگر حوروں کے ساتھ وہ معاملہ ہوتو ہمارے شراب خانے جنت سے ہزار درجہ اچھے ہیں۔

یہ فلسفہ کی مزاولت اور حکیموں سے جوش اعتقادی کا نتیجہ ہے کہ اپنے دین کی کھلی کھلی باتیں قابل نفرت سمجھی جاتی ہیں، اگر اس قسم کی نفرت معتبر ہوتو حدیث تو کیا۔**نعوذ باللہ** ۔ قرآن کو موضوع کہنا پڑے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ہزار ہا احادیث کو ساقط کر دیا

غرضکہ اس قسم کے اجتہادوں سے نفس حدیث ہی متروک ہو جاتی ہے، پھر اگر فقہاء نے دوسرے احادیث وآیات کے لحاظ سے کسی حدیث کو متروک العمل قرار دیا تو کیا برا ہوا؟

فقہاء تو کسی سخت ضرورت کے وقت جب دوسرے احادیث وآیات متعارض ہوں تو کسی حدیث کو متروک کرتے ہیں۔مگر امام بخاریؒ نے تو ایسا طریقہ ایجاد کیا کہ بے سبب صدہا بلکہ ہزارہا حدیثیں متروک العمل اور ساقط الاعتبار ہوگئیں، یعنی صحت حدیث کے لئے اتنی شرطیں لگائیں کہ ہر صحیح حدیث جانبر نہیں ہوسکتی۔گو امام مسلمؒ نے دیباچہ مسلم میں بعض شروط کی نسبت اُن پر سخت اعتراض کیا، مگر امام بخاری کے مقابلہ میں ان کا اجتہاد چل نہ سکا اور ہزارہا صحیح حدیثیں متروک العمل ہوگئیں۔

اب اہل انصاف خود سمجھ سکتے ہیں کہ بخاری شریف کی چند حدیثیں امام صاحب کے اجتہاد سے بلحاظ اشد ضرورت متروک العمل ہوں تو کیا مضائقہ؟ پھر امام بخاریؒ نے اپنے اجتہاد

سے جو شرطیں لگا کر بہت سی حدیثوں کو متروک العمل کر دیا، اُس پر اُن کے اساتذہ کا اتفاق ثابت نہیں ہوسکتا، بخلاف امام صاحب کے اجتہاد کے کہ اُس کی توثیق امام بخاریؒ کے اساتذہ اور اُس زمانہ کے اکابر محدثین کی گواہیوں سے ثابت ہے اوران گواہیوں سے حنفیہ کو اطمینان کامل حاصل ہوگیا کہ ہمارے امام نے اجتہاد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور جن آیات واحادیث سے جس قدر احکام لینے کی ضرورت تھی سب فقہ میں داخل کر دیئے اور جن احادیث کو متروک العمل سمجھا وہ ان کے اجتہاد کا مقتضیٰ تھا، جس کے وہ مامور تھے۔

بحث حدیثِ مرسل، محدثین کو تقلیلِ احادیث کی ضرورت

یہ بات اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ جب کسی مسئلہ میں احادیث بکثرت وارد ہوں اور توثیق ممکن نہ ہو تو بعض احادیث کو متروک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فقہاء نے اس باب میں وہ طریقہ اختیار کیا جو صدیق اکبر وغیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اُن کو دکھلایا تھا کہ مضمون پر غور کر کے اجتہاد اور قیاس سے کام لیا جائے۔ یعنی اگر کوئی حدیث دوسری احادیث اور قیاس صحیح اور آیات کے خلاف ہو تو وہ حدیث ترک کر دی جائے۔ اور امام بخاری وغیرہ محدثین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس حدیث کی اسناد میں وہ شرطیں پائی جائیں جو خود نے مقرر کئے ہیں تو وہ واجب العمل ہے اور جس میں وہ نہ پائی جائیں تو وہ متروک العمل ہے۔

چنانچہ بخاریؒ وغیرہ نے حدیث مرسل کو ساقط الاعتبار کر دیا اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مرسل بھی صحیح حدیث ہے۔ اور اُس میں کل صحابہ اور تابعین کا اجماع ہے۔ چنانچہ دوسری صدی کے آخر تک سب علماء اُس کو قابل قبول سمجھتے آئے۔ اور کسی امام فن سے اس بات کا انکار مروی نہیں ـــ کذا فی تدریب الراوی

للسیوطی ؒ ۔اور ''کشف بزدوی'' میں لکھا ہے کہ مراسیل کے قابل قبول ہونے پر کُل صحابہ کا اتفاق ہے اور وہ اس قدر کثرت سے ہیں کہ جو جمع کئے گئے ہیں وہ قریب پچاس جز کے ہیں۔ اگر یہ قاعدہ ٹھیرا دیا جائے کہ مرسل قابل قبول نہیں تو اتنی حدیثیں بیکار ہوئی جاتی ہیں حالانکہ محدثین نے مشقتیں اٹھا کر اُن کو محفوظ رکھا۔

امام بخاریؒ وغیرہ کو چونکہ احادیث کی تقلیل منظور تھی اس لئے مراسیل پر یہ الزام لگا کر ساقط الاعتبار کر دیا کہ راوی نے جب سلسلہ اسناد میں کسی کا نام چھوڑ دیا تو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ شخص متروک عدل وضابط تھا یا اس اسناد کی وجہ سے حدیث ساقط الاعتبار ہوگی۔ فقہاء کہتے ہیں کہ جس راوی نے ارسال کیا اُس کا حال دیکھنا چاہئے کہ اگر وہ ثقہ اور عدل ہے اور اہل قرون ثلٰثہ میں سے ہے تو اُس کی حدیثِ مرسل قابل اعتبار رہے، کیونکہ صحابہ کی مراسیل کو محدثین مانتے ہیں اور اُن کا منشاء صرف حسن ظن ہے۔ تو قرون ثلٰثہ کے ثقات جو مبشر بالخیر ہیں اس حسن ظن سے کیوں محروم رکھے جائیں؟ حالانکہ صحیح حدیث ہے: **عن ابن عمرؓ، ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خطب بالجابیۃ، فقال: قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامی فیکم، فقال: استوصوا باصحابی خیراً، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم، ثم یفشو الکذب۔ رواہ الامام احمد فی مسندہ۔**

البتہ اس حدیث شریف کی رو سے قرون ثلٰثہ کے بعد والے مراسیل نہ مانی جائیں تو اس کے لئے ایک وجہ نکل سکتی ہے کہ شیوع کذب کا زمانہ ہے۔

پھر محدثین اس کو بھی مانتے ہیں کہ اگر کوئی ثقہ کسی ایک راوی کا نام نہ بیان کر کے مبہم طور پر کہدے کہ مجھے ایک ثقہ یا عدل یا ایسے شخص سے روایت پہونچی ہے جسے میں جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ ایسی روایت بھی مقبول ہے۔ حالانکہ جس طرح مرسل میں نام چھوڑا جاتا ہے اس

میں بھی چھوڑ دیا گیا۔ اور جس طرح مرسل میں متروک الاسم کی تحقیق نہیں ہوسکتی اس روایت میں مجہول الاسم کی تحقیق نہیں ہوسکتی اور جس طرح یہاں راوی کا ثقہ ہونا ضرور ہے جس کے اعتبار پر متروک الاسم ثقہ مان لیا جائے اسی طرح مرسل میں بھی ارسال کرنے والے کی شرائط میں داخل ہے کہ وہ ثقہ متدین بلکہ قرون ثلٰثہ میں ہو، اور ایسا شخص ہو کہ جس پر تدلیس کا گمان نہ ہو۔ مثلاً حسن بصریؒ ''**قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**'' کہیں تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ انہوں نے کسی صحابی کا نام کسی مصلحت سے ترک کردیا، چنانچہ تدریب الراوی میں امام سیوطیؒ نے یونس بن عبیدؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ سے میں نے پوچھا کہ حضرت آپ ''**قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**'' کہہ دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے حضرت کا زمانہ نہیں پایا، فرمایا: تم نے ایک ایسی راز کی بات پوچھی کہ اگر تمہارے ساتھ خصوصیت نہ ہوتی تو اس کی وجہ کبھی نہ بتلاتا! بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ ہم کس زمانہ میں ہیں، یعنی حجاج کی حکومت ہے، اس وقت میں علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لے سکتا۔ اس لئے جو روایتیں علی رضی اللہ عنہ سے مجھے پہونچی ہیں اُن میں صرف ''**قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم**'' کہہ دیا کرتا ہوں۔

غرضکہ جب ایسے مستند شخص ارسال کریں تو اُن کے اعتبار پر متروک الاسم کو موثق مان لینا کوئی نئی بات نہیں بلکہ بعض وجوہ سے تو مستند پر بھی مرسل کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جو شخص ایسی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے جو حضرت نے نہیں فرمایا تو وہ دوزخی ہے۔ پھر جب ارسال کرنے والے متدین اور عدل ہوں تو جب تک یقینی طور پر اُن کو ثابت نہ ہو کہ وہ حدیث حضرت ہی کا ارشاد ہے۔ کبھی اُس کی روایت کرنے پر جرأت نہیں کرسکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس راوی کا نام انہوں نے ذکر نہیں کیا وہ اُن کے نزدیک کمال درجہ کا ثقہ اور ضابط ثابت ہوا ہے۔ گویا وہ کہ اُس کا نام ذکر نہ کرکے اُس کی توثیق کا ذمہ

لے رہے ہیں۔ اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری تحقیق میں وہ شخص ایسا مُسلَّم ہو چکا ہے کہ مزید تحقیق کی ضرورت نہیں۔ بخلاف اُس کے جب نام کو ذکر کر دیا تو وہ اُس ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ ''کشف بزدوی'' میں حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو حدیث چار صحابیوں سے سنی ہوئی مجھے یاد ہے اُس کو مرسل کر دیا کرتا ہوں اور اُس میں لکھا ہے: '' و عن الحسنؒ انه قال متى قلت لكم ''حدثني فلان'' فهو حديثه لا غير ، و متى قلت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فقد سمعته من سبعين او اكثر ''
یعنی حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ جب میں حدثنی فلان کہتا ہوں تو وہ حدیث اسی شخص سے سنی ہوئی ہوتی ہے، اور جب قال رسول الله صلى الله عليه وسلم کہتا ہوں تو وہ کبھی ستر اور اُس سے زیادہ شخصوں سے سنی ہوئی ہوتی ہے۔
غرضکہ متدین راویوں کو جب تک پورے طور سے اطمینان نہیں ہوتا وہ ارسال نہیں کرتے، اسی وجہ سے مرسل انہیں محدثوں کو مقبول ہے جو ثقہ متدین ہوں اور قرون ثلٰثہ میں ہوں۔ بہرحال متروک الاسم اور مجہول الاسم میں فرق کرنا ترجیح بلا مرجح ہے۔

حدیث معنعن میں بحث

اگر کوئی راوی کہے ''روی فلان عن فلان'' تو محدثین جانتے ہیں کہ اس میں احتمال ہوتا ہے کہ کوئی راوی ترک ہو گیا ہو، کیونکہ کوئی لفظ اس میں ایسا نہیں جس سے سماع ثابت ہو، پھر اگر بحسب احتمال کسی راوی کا نام فی الواقع ترک ہو گیا ہو تو اُس میں وہی جہالت ماننی پڑے گی جو ارسال میں ہے۔ باوجود اس کے محدثین اس قسم کی روایت کو مانتے ہیں، پھر فقہاء نے اگر مرسل کو متدین راوی کے اعتماد پر مان لیا تو کونسی نئی بات ہو گئی؟
حدیث معنعن میں محدثین کہتے ہیں کہ اگر دونوں شخص ایک زمانہ میں ہوں تو حسن ظن سے یہ کہا جائیگا کہ دونوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ اس وجہ سے اُس کو متصل اور صحیح کہتے ہیں،

مگرامام بخاریؒ کا اجتہاد ہے کہ یہ حسن ظن اُس وقت ہوگا کہ دونوں کی ملاقات کسی طریقہ سے ثابت ہو جائے اوراگرایک ملاقات بھی ثابت نہ ہووہ، حدیث متصل نہ سمجھی جائیگی۔

امام مسلمؒ نے دیباچہ صحیح مسلم میں امام بخاریؒ کی اس شرط پر سخت اعتراض کیا ہے، مگر چونکہ محدثین کوبھی حتی الامکان صحیح حدیثوں کی تقلید منظور ہے، اس لئے اس شرط کی نسبت فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس شرط سے اتصال بخوبی ظاہر ہے۔ کیونکہ معاصرت کی وجہ سے جب حسن ظن پر اتصال کا حکم کیا جاتا ہےتو حالات کےنسبت ثابت ہونے پر بطریق اولٰی اس کا اتصال ثابت ہوگا۔

یوں تو جتنی شروط زیادہ لگائی جائیں اتصال اورصحت کےقرائن زیادہ ہوں گے۔مثلاً یہ شروط لگادی جائیں کہ ہرروایت میں ''حدثنا و اخبرنا ''ضرورت ہےتو حدیث معنعن میں جوعدم ملاقات کا احتمال ہے وہ باقی ہی نہ رہتا۔اورجس طرح ''مدخل''میں لکھا ہے کہ بخاری میں ایسی روایتیں ہیں کہ صحابی سے دوتابعی روایت کیئے ہیں پھرتابعی سے دوتبع تابعی، اسی طرح امام بخاری تک ہراستاذ سےدودوشاگردوں نے روایت کی ہے۔

یہ اہتمام اورالتزام اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ شہادت علی الشہادت کی شرط صادق آجائے۔انتہی۔

اگرفی الواقع بخاری میں اس شرط کی پابندی ہوتی توصحیح حدیثوں کی تقلیل بخوبی ہوجاتی ہے، اورصحت میں قوت بھی ہوتی مگر''تدریب الراوی''میں لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے یہ التزام ہرگزنہیں کیا۔انتہی۔

صاحب ''مدخل'' وغیرہ کواس بیان پر جراءت اس وجہ سے ہوئی کہ امام بخاریؒ نے صحیح حدیثوں کوکم کرنے کی غرض سے احتیاط کا مسلک اختیارکیا ہے۔اور چونکہ روایت کرنی بھی ایک قسم کی گواہی ہے کہ گویا راوی استاذ کے بیان پرگواہی دیتا ہے کہ میں نے خوداُس کی

زبانی سنا ہے۔ اس لئے اُس بیان پر اور ایک گواہی کی ضرورت ہے، جیسے شہادت علی الشہادت میں ہوا کرتا ہے۔غرض احتیاط کا مسلک یہی تھا کہ جو صاحب ''مدخل'' نے حسن ظن سے امام بخاریؒ کی طرف منسوب کیا اور اُس سے بڑھا ہوا حسن ظن میانجیؒ کا ہے جو ''**کتاب ما لا یسع المحدث جهله**'' میں ظاہر کیا ہے،جس سے تدریب الراوی میں نقل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ شیخین نے صحیح حدیث کی یہ شرط قرار دی ہے، اور صحیحین میں اُس کا التزام بھی کیا ہے کہ وہی حدیث ذکر کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو صحابی یا زیادہ اُس کو روایت کئے ہوں اور ہر صحابی سے چار تابعی روایت کریں اور ہر تابعی سے چار شخصوں سے زیادہ راوی ہوں۔انتہی۔

فی الحقیقت اگر یہ شرط لگائی جاتی تو اعلیٰ درجہ کی صحت ہو جاتی اور صحیح حدیثوں کی پوری تقلیل ہو جاتی، مگر اُس کے ساتھ ہی بخاری شریف کا حجم بھی بہت کم ہو جاتا اور شاید دس پانچ حدیثیں اُس میں رہ جاتیں یا اتنی بھی نہ رہتیں۔اس لئے کہ تدریب الراوی میں شیخ الاسلامؒ کا قول نقل کیا ہے کہ تمام بخاری میں اس شرط کی ایک حدیث بھی نہ پائی جائیگی۔انتہی۔

ہر چند امام بخاریؒ نے صحت حدیث کی شرطیں بڑھا دی ہیں، جن سے تقلیل صحاح منظور ہے۔مگر ان کا یہ مقصود نہیں کہ کوئی صحیح حدیث باقی ہی نہ رہے۔جیسا کہ در باطن معتزلہ کا مقصود ہے۔اسی وجہ سے انہوں نے اس قسم کی شرطیں لگائیں، چنانچہ ابو علی جبائی معتزلی کا قول ہے کہ اگر کوئی خبر ایک عدل بیان کرے تو وہ قبول نہ کی جائے؛ جب تک دوسرے عدل کی خبر اُس کے ساتھ ضم نہ کی جائے اور استاذ ابو نصر تمیمی نے ابو علی سے روایت کی ہے کہ جب تک چار شخص کسی حدیث کو روایت نہ کریں قبول نہ ہوگی۔ **کذا فی تدریب الراوی۔**

امام بخاریؒ کو اس تقلیلِ صحاح سے مقصود یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں کئی حدیثیں موجود ہوں تو جو صحت میں بڑی ہوئی ہو اس پر عمل کیا جائے۔

خبرِ واحد پر عمل کی ضرورت

''تدریب الراوی'' میں ابن العربی کا قول شرح مؤطا سے نقل کیا ہے کہ شیخین کا مذہب یہ ہے کہ جب تک کسی حدیث کو دو (۲) راوی روایت نہ کریں، وہ ثابت نہیں، اور یہ مذہب باطل ہے۔ بلکہ ''روایۃ الواحد عن الاحد'' صحیح ہے۔اور ذکر کیا کہ انہوں نے شرح بخاری میں اعتراض کیا ہے، لکھا ہے کہ حدیث اعمال صرف عمر رضی اللہ عنہ سے وارد ہے؛ حالانکہ امام بخاری نے شرط لگائی ہے کہ ادنیٰ درجہ دو راویوں سے روایت ہونی چاہئے۔ پھر خلاف شرط یہ روایت انہوں نے بخاری شریف میں کیوں داخل کی؟ اس پر ابن حیان نے اپنی صحیح کے اوائل میں لکھا کہ ابن العربی وغیرہ نے جو ادعا کیا ہے کہ شیخین نے جو شرط لگائی ہے وہ شرط خود مستحیل الوجود ہے۔ کسی نے ابن العربی سے کہد یا کہ شیخین نے وہ شرط لگائی ہے، اگر تصریح کہیں ہوتی تو پیش کی جاتی۔ اور اگر استقراء ہے تو باطل ہے۔ اُن کو حدیث اعمال ہی سمجھنے کے لئے کافی تھی جو بخاری کی پہلی حدیث ہے، جس کو صرف عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، پھر اُن سے علقمہ نے اور اُن سے صرف محمد ابن ابراہیم نے اور اُن سے فقط یحییٰ بن سعید نے روایت کی ہے اور یحییٰ بن سعید کے بعد اُس کے رواۃ بہت ہو گئے۔ انتہی

الحاصل گو امام بخاریؒ نے صحت حدیث کی شرطیں بڑھائیں، مگر عام طور پر جو مشہور ہے کہ ہر روایت کا دو راویوں سے مروی ہونا بھی انہوں نے شرط کیا ہے، وہ غلط بلکہ مستحیل الوجود ہے، جیسا کہ ابن حیانؒ کے قول سے معلوم ہوا۔ امام بخاریؒ نے شروط کے بارے میں ایسا تشدد نہیں کیا جیسا کہ معتزلہ نے کیا ہے کہ جب تک چار شخصوں سے روایت نہ پہونچے قابل قبول نہیں۔

دیکھئے! جب دو راویوں سے ہر روایت کا ہر طبقہ میں مروی ہونا مستحیل ہے تو چار راویوں

سے ہر ایک روایت کا مروی ہونا کیونکر ممکن ہوگا ؟ پھر جب ایسی روایتیں ملتی ہی نہیں تو احادیث کو ساقط الاعتبار کر دینے کا موقع معتزلہ کو مل گیا۔ اور آزادانہ، قرآن میں رائے لگانے لگے اور جیسا جی چاہا تاویلیں کر کے اپنا مطلب نکالا۔ دین کو دَرْہم و برہم کرنے والے جتنے خودغرض نکلتے جاتے ہیں سب کا یہی طریقہ ہے، چنانچہ وہ صاف کہتے ہیں کہ بخاری بھی قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ وہ بھی اخبار آحاد سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی حدیثیں متواتر نہیں جو قابل اعتبار ہوں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ہے اور حق تعالیٰ کا خطاب ''**وما اٰتاکم الرسول فخذوہ**'' فقط صحابہ ہی کو نہ تھا، بلکہ تمام اُمت جس طرح ''**اقیموا الصلوٰۃ**'' کی مخاطب ہے اسی طرح اس خطاب کی بھی مخاطب ہے۔ پھر جب صحیح حدیثوں کے پہونچنے کا راستہ ہی بند ہو جائے تو حضرت کے عطا کئے ہوئے فوائد دارین کے لینے کی کیا صورت؟ اور مجتہدین وغیرہم کو اس آیت شریفہ پر عمل کرنے کا کیا طریقہ؟ اس سے ظاہر ہے کہ خدا و رسول کو ہرگز منظور نہیں کہ ایسی شروط لگائی جائیں جن سے امت کو صحیح حدیثوں کے پہونچنے کا راستہ ہی مسدود ہو جائے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جس کو اپنے نبی کی قدر اور اُن کے ساتھ محبت ہوگی اُس کو یہ خواہش ضرور ہوگی کہ اُن کے احوال، افعال، اقوال، عادات وغیرہ کو صحیح طور پر معلوم کرے، کیونکہ آدمی کی فطرتی بات ہے کہ اپنے مقتدا اور محسن کے حالات کو تلاش کرتا ہے۔

دیکھئے! جاں نثار رعایا کو اپنے محسن بادشاہ کے حالات اور اصلی احکام وغیرہ معلوم کرنے کا کس قدر شوق ہوتا ہے کہ بصرف زر خطیر، ان امور پر مطلع ہوتے ہیں۔ اور یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جو چیز بمقتضائے فطرت ہوتی ہے۔ اُس کی تکمیل کے اسباب بھی فطرتی ہوتے ہیں، اس لئے فطرتی طریقہ سے صحیح حدیثوں کا پہونچنا بھی ضرور تھا، سو بفضلہٖ تعالیٰ وہ موجود

ہیں، جس کا انکار نہیں ہوسکتا۔

دیکھ لیجئے! ہر شخص کی فطرت میں داخل ہے کہ جب اپنے معتمد علیہ بزرگ سے کوئی خبر سنتا ہے تو اُس کا یقین آ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ اور تابعین اور لاکھوں علماء نے اپنے بہت سے ذاتی کام چھوڑ کر تبلیغ اخبار میں کوششیں کیں؛ تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہمارے اسلاف نے ہم کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال کے علم سے محروم رکھا۔ اگر اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ آئندہ ایسی شرطیں لگنے والی ہیں جن سے ہماری سب محنت اکارتھ ہوجائیگی تو ضرور اُس سے وہ پہلوتہی کرتے۔ یا یہ کرتے کہ دو دو چار چار محدث مل مل کر حدیثیں پہونچاتے پھرتے، تاکہ حجت تمام ہو۔ انہوں نے صرف مقتضائے فطرت ہی کو پورا نہیں کیا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بھی پوری تعمیل کی، جو حضرت نے فرمایا ہے کہ ''**فلیبلغ الشاھد الغائب**'' یعنی ہر ایک حاضر شخص جو کچھ سنے اور دیکھے تو غائب شخص کو پہونچادے۔ تاکہ وہ سمجھے اور یاد رکھے اور عمل کرے اور دوسروں کو پہنچادے۔

اب دیکھئے کہ اگر ایک راوی کی بات قابل اعتبار نہ ہوتی تو حضرت کبھی نہ فرماتے کہ جو شخص سنے دوسرے کو پہنچادے بلکہ اُس وقت یہ فرماتے کہ جب دوسرے کو پہونچانا چاہے تو دو دو، چار چار شخص اکٹھے ہوکر بیان کیا کریں۔

کیا کوئی عقل والا شخص ''**فلیبلغ الشاھد الغائب**'' کے یہ معنی سمجھے گا، یا یہ خیال کرے گا کہ اُس ارشاد سے مراد یہ ہوسکتی ہے؟ بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے کہ قبا میں لوگ صبح کی نماز بیت المقدس کی طرف پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص نے اُن کو خبر دی کہ کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہونے کا حکم نازل ہوگیا ہے، یہ سنتے ہی عین نماز میں سب کعبہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔

دیکھئے! ایک شخص کی خبر پر کس قدر وثوق ہوا کہ عین نماز میں اُس کو واجب العمل سمجھا۔
اب ہم قرآن شریف سے بھی دو نظیریں پیش کرتے ہیں کہ ایک ہی شخص کی بات کی تصدیق کرنی، اُن سے ثابت ہے۔
دیکھئے! موسیٰ علیہ السلام کو ایک ہی شخص نے خبر دی تھی کہ آپ کے قتل کے باب میں مشورے ہو رہے ہیں، میں خیر خواہانہ کہتا ہوں کہ آپ یہاں سے چلے جائیں! موسیٰ علیہ السلام نے اُس کی تصدیق کی، یہاں تک کہ اُس کے آثار آپ پر نمایاں ہوئے، یعنی خوف پیدا ہوا، اور وہاں سے چلے بھی گئے۔ ''**کما قال اللہ تعالیٰ : و جاء رجل من اقصی المدینة یسعیٰ قال یاموسیٰ ان الَملاَ یأتمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من الناصحین ۔ فخرج منها خائفاً یترقب ، قال ربّ نجنی من القوم الظالمین**''۔
اگرچہ اس آیۂ شریفہ میں اُمت سابقہ کا واقعہ مذکور ہے، چونکہ اُس پر کوئی انکار اور اعتراض نہیں فرمایا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ فعل خلاف مرضی الٰہی نہ تھا، ورنہ صاف ارشاد ہوتا کہ اُن کو سزاوار نہ تھا کہ ایک آدمی کی خبر کی تصدیق کر کے اس قدر پریشان ہوتے۔
اسی طرح جب شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تن تنہا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں اور اپنے والد بزرگوار کا پیام پہونچایا تو آپ نے اُن کی تصدیق کی، اور فوراً اُن کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے'' **کما قال اللہ تعالیٰ : و جاء ت احداهما تمشی علی استحیاء قالت ان ابی یدعوک لیجزیک اجر ما سقیت لنا فلما جاء ہ ...** '' **الآیة** ۔
غرضکہ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ قرائن ہو تو ایک شخص کی بھی تصدیق کی جائے۔ البتہ فاسق کی خبر قابل تصدیق نہیں بلکہ اُس کی تحقیق کی ضرورت ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ''**ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا**'' **الایة** ۔ اس لئے کہ اُس کا فسق خود اس

بات پر قرینہ ہے کہ وہ صدق کو ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اُس کو خوف خدا ہے نہ تدین، نہ مسلمانوں سے شرم وحیا۔ بخلاف اُس کے جس مسلمان شخص میں ثقاہت، عدالت، تقویٰ، تدین، خوف خدا اور صدق وغیرہ صفات حمیدہ پائے جائیں اور عمر بھر اُن اوصاف کے ساتھ متصف اور مشہور رہے، تو کیا کسی عاقل مسلمان کے نزدیک ایسے شخص کی خبر اور ایک فاسق کی خبر جس کو جھوٹ سچ کی کچھ پروانہ ہو، برابر ہوسکتی ہے؟ ہر گز نہیں! انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دونوں کو ہر گز برابر نہیں سمجھ سکتا۔

غرضکہ ثقہ راوی کی خبر کے صدق پر کئی قرینے شہادت دیتے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ کا مرتکب نہ ہوگا۔ خصوصاً دینی معاملات میں، خاص کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث میں، جن میں تھوڑی جھوٹ بھی کوئی شامل کردے تو وہ مستحقِ دوزخ ہو جاتا ہے۔

بعد از خدا بزرگ

یہ بات مشاہد ہے کہ جب کوئی ہندو بقال راست بازی کے ساتھ مشہور ہو جاتا ہے تو تمام ہندو مسلمان اُس کے قول کا اعتبار کرتے ہیں اور اُس کی منہ بولی قیمت دینے میں کچھ تامل نہیں کرتے اور جو چیز اُس سے خریدتے ہیں اُس وقت ایک اطمینانی کیفیت اپنے دل میں پاتے ہیں کہ اس میں کوئی دھوکہ فریب نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ راستبازوں کے خبر کی تصدیق کرلینا انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور خود ہر شخص کی طبیعت اُس کے صدق پر گواہی دیتی ہے۔

محدثین کے شروط ضرورت سے زائد ہیں

الحاصل جب صدق کے پورے پورے قرائن راوی میں موجود ہوں تو اُس کی خبر فطرۃً، عقلاً، شرعاً ہر طرح سے صحیح اور قابل قبول ہے، پھر ایسی خبر کی صحت میں توقف کرنا اُن تمام قرائن کو بیکار اور فطرت وعقل کو بے اعتبار کر دینا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ فقہاء جن

شرائط سے حدیث مرسل وغیرہ کو صحیح سمجھتے ہیں وہ صحیح ہیں۔اب رہا یہ کہ مزید احتیاط کے لئے شروط لگائے جاتے ہیں، جن سے احتمالات بعیدہ بھی ساقط ہو جائیں تو یہ امر غور طلب ہے۔اس لئے کہ جب راوی متدین اور عدل مان لیا گیا تو اُس کا اعتبار خود اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ اُس کی معنعن حدیث بھی مان لی جائے اور اُس میں یہ احتمال کہ باوجود معاصرت کے شاید ملاقات نہ ہوئی ہو، ناشی بلا دلیل ہے، ایسے احتمالات کا انسداد شرائط سے نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ ایک ملاقات ثابت ہوجائے تو بھی وہی احتمال لگا ہوا ہے جو ایک ملاقات ثابت ہونے سے پہلے تھا۔اس لئے کہ اب اس کی خبر کی تصدیق محتاج شرط ہوئی،تو معلوم ہوا کہ اُس کا تدین وغیرہ کافی سمجھا گیا، حالانکہ مفروض وہی معنعن اور مرسل ہے، جس کا راوی متصف با وصف وشروط عدالت ہو۔غرضکہ ایسے مستند راویوں کی تصدیق کو امور خارجیہ کے محتاج بنانا اُن کے عدل وتدین مفروضہ کو بے اعتبار اور غیر مفروض بنا دینا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے صحیح حدیث میں صرف یہ شرط لگائی کہ اُس کے راوی کا عدل و ضبط وغیرہ ضروری صفات دیکھ لیجائیں اور جب عقلاً وشرعاً اُس کی بات قابل تسلیم ہوتو امور خارجیہ کے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شروط بھی پائے جائیں تو **نور علی نور** ہے۔چونکہ فقہاء کو عقل واجتہاد سے بہت کام لینے تھے جو معانی نصوص اور قرائن وغیرہ سے متعلق ہیں، اس لئے انہوں نے صحت حدیث کے لئے جو امور ضروری تھے ان ہی پر اکتفا کر کے ہمہ تن اجتہاد کی طرف متوجہ ہوئے ۔اور محدثین کو اجتہاد سے کوئی تعلق نہ تھا، جیسا کہ اعمشؒ وغیرہ کے حالات سے معلوم ہوا، اس لئے وہ صرف اسنادوں کی طرف متوجہ رہے۔اور یہ عادتی بات ہے کہ آدمی کو جس چیز کی طرف توجہ تام ہوتی ہے اُس سے متعلق اُس کو ایسی باتیں سوجتی ہیں جو دوسروں کو نہیں سوجتیں ۔ پھر وہ نزاکتیں اور ضرورت سے زیادہ امور اُس کے خیال میں ایسے ضروری معلوم ہونے لگتے

ہیں جیسے دوسروں کو اپنے اپنے ضروریات ۔ چونکہ محدثین کا کام تحقیق اسناد ہے اور عمر بھر اُن کو اسی کا مشغلہ رہتا ہے، اس لئے انہوں نے روایتوں میں ضرورت سے زیادہ امور کی پابندی کی ۔ اور ایسی روایتوں کا انتخاب کیا جن کی اسنادوں میں اتفاقی طور پر اعلیٰ درجہ کے رواۃ اور محسنات تھے، اور باقی کو متروک کر دیا۔ گو اُن کے راوی عدل و ضابط ہوں ۔ اگر ممکن ہوتا تو امام بخاریؒ، ابن العربی وغیرہ کے خیالی شرطوں والی حدیثوں کو ضرور جمع کر دیتے ۔ جس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ معتزلہ کو بھی ان روایتوں میں کلام کرنے کی گنجائش نہ ملتی ۔ مگر دراصل وہ کام ہی بے ضرورت اور فضول تھا۔ مقصود حاصل ہونے کے لئے فقہاء نے جس قدر شرطیں لگائی ہیں کافی ہیں ۔ باوجودیکہ امام بخاری نے اس انتخاب میں بہت کچھ پابندیاں کیں، مگر بہت سارے امور میں ان کو بھی اغماض کی ضرورت ہوئی ۔ غرضکہ جس قدر ضرورت سے زیادہ شرطیں کسی حدیث میں پائی جائیں گی گو اُس سے زیادہ حسن آ جائیگا؛ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ نفسِ صحتِ حدیث اُن سے متعلق ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر علم حدیث میں ''موطا'' سے زیادہ صحیح کتاب نہیں، حالانکہ اُس میں مرسل اور منقطع اور بلا اسناد حدیثیں بھی موجود ہیں، جن میں صرف ''بلغنی'' ہوتا ہے، جیسا کہ مقدمہ فتح الباری میں شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''**رویناہ عن الشافعی رضی اللہ عنہ ، انہ قال : ما اعلم فی الارض کتاباً فی العلم اکثر صواباً من کتاب مالک ۔ قال و منھم من رواہ بغیر ھذا اللفظ یعنی بلفظ اصح من الموطا ۔**

و ایضاً فیھا : فقد استشکل بعض الأئمۃ اطلاق اصحیۃ کتاب البخاری علی کتاب مالک مع اشتراکھما فی اشتراط الصحۃ و المبالغۃ فی التحری و التثبت ، و کون البخاری اکثر حدیثاً لا یلزم منہ افضلیۃ

الصحة . والجواب عن ذلک ان ذلک محمول علی اصل اشتراط الصحة ، فمالک لا یری الانقطاع فی الاسناد قادحاً ، فلذلک یخرج المراسیل والمنقطعات والبلاغات فی اصل موضوع کتابه "... الخ۔

اس سے ظاہر ہے کہ نفس صحت، مرسل اور منقطع میں بھی موجود ہے۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ موطا میں، مثلاً آدھی یا تین پاؤ صحت ہے اور بخاری میں کامل۔ کیونکہ صحت متجزی نہیں بلکہ نفس صحت میں دونوں برابر ہیں، البتہ بخاری شریف میں امور زائدہ کا بھی التزام کیا گیا۔ جو، ازقبیل محسنات ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تعارض کے وقت وہ حدیث جس میں شروط محسنہ ہوں راجح ہو اور دوسری صحیح حدیث متروک ہوجائے۔ دیکھ لیجئے! جس حدیث کی پوری اسناد میں "حدثنا" ہو اور سماع پر قطعی دلالت کرتی ہے، باوجود اس کے، تعارض کے وقت صحیح معنعن علی شرط البخاری متروکہ نہ ہوگی۔ بلکہ دوسرے اسباب توفیق وغیرہ دیکھے جائیں گے۔ محدثین کی اسانید کی طرف توجہ اور اُن کے محسنات کی جانب اشتغال اس سے ظاہر ہے کہ امام سخاویؒ نے "الجواهر المکللة فی الاخبار المسلسلة" میں ایک سوایک حدیثیں جمع کی ہیں، جن کی اسنادوں میں عجیب عجیب التزام ہیں، مثلاً بعض اسنادوں میں اول سے آخر تک حرف عین کا التزام ہے، جیسے: عبدالرحمٰن، عزاء ابن جماعہ، عبداللہ وغیرہ اور بعضوں میں نون کا التزام ہے، مثلاً: عبدالرحمٰن وابوالفضل المنسوب الی السقلان و ابونعیم رضوان وغیرہ اور بعضوں میں صرف شامیین اور بعضوں میں صرف عراقیین اور بعض اسنادوں میں اول سے آخر تک ایسے لوگوں کے نام ہیں جن کی عمر ستر (۷۰) سے متجاوز ہوئی اور ہر ایک نے اس کی تصریح کی۔ ہر چند یہ امور ضرورت سے زائد ہیں؛ مگر اُن سے تبحر علمی اور کثرت معلومات اور قوت حافظہ کا اعلیٰ درجہ کا ثبوت ملتا ہے کہ جس طرف انہوں نے توجہ کی ایک قسم کی حدیثوں کا ذخیرہ فراہم کردیا۔

کتاب فقہ اہل بیت پر بحث

ہمارے زمانہ میں بھی فاضل اجل مولانا مولوی محمد حسن الزماں صاحب۔ جوفن حدیث میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ایک کتاب، حدیث میں لکھی اور اُس میں وہ حدیثیں جمع کیں جن کی اسنادوں میں اہل بیت میں سے کوئی ایک مذکور ہوں۔اورسبب تالیف اُس کا یہ لکھا کہ شیعہ کا اعتراض ہے کہ''اہل سنت و جماعت کوعلوم اہل بیت نہیں پہونچے''اس پر مجھے غیرت آئی اور یہ کتاب لکھنی شروع کی۔اس کتاب سے مقصود مولوی صاحب کا صرف یہ بات معلوم کرادینا ہے کہ اُن حضرات کی روایتیں ہماری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔اُس سے شیعہ کو الزام دینا مقصود نہیں کہ انہوں نے ان حدیثوں کے مطابق عمل نہیں کیا اور اعتقاد نہیں رکھا؛ کیونکہ وہ تو اُن کتابوں کواوراُن روایتوں کوصحیح اور قابل اعتبار سمجھتے ہی نہیں، اور نہ مولوی صاحب کا یہ مقصود ہے کہ اہل حدیث اُن روایتوں پرعمل کریں؛ کیونکہ وہ تو سوائے بخاری کے کسی کتاب کو مانتے ہی نہیں۔ پھر فردوس دیلمی اور آغانی وغیرہ کی روایتوں کا جواُس میں مذکور ہیں اُن پرکیا اثر ہوگا اور نہ یہ مقصود ہے کہ مقلدین اُن پرعمل کریں۔اس لئے کہ مقلدین کے عمل کا مداراُن کے امام کے اقوال پر ہے،جس کا وظیفہ تحقیق وتنقید احادیث ہے۔اگر وہ حدیث ہی پرعمل کرتے تو مقلد کیوں کہلاتے ،عامل بالحدیث اور امام بخاریؒ کے مقلد ہوتے۔جن کے امام فی الحدیث ہونے پر محدثین کا اجماع ہوگیا ہے۔پھرجس طرح مذاہب اربعہ مدوّن ہوئے ہیں اہل بیت رضی اللہ عنہم کا مذہب مدّون ہوا ہی نہیں،ورنہ جس طرح حنفی،شافعی،مالکی،حنبلی کروڑ ہا ہیں "اھل بیتی" بھی کہیں ہوتے۔حالانکہ اس لقب کا ایک شخص بھی سنا نہیں گیا۔البتہ شیعہ اپنے آپ کواہل بیت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛مگراُن کے عقائد سے ظاہر ہے کہ اہل بیت کے طریقہ پر وہ نہیں ہیں بلکہ خوداہل بیت کی تصریحات سے اُن کا مخالف ہونا ثابت ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جو روایتیں اہل بیت سے مروی ہیں، کیا اُن حضرات کا مذہب انہی کے مطابق ہوگا؟ سو وہ بھی ضرور نہیں، اس لئے کہ یہ بات مُسلَّم ہے کہ کسی حدیث کو روایت کرنے سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ راوی کا مذہب بھی وہی ہے، دیکھ لیجئے! صحاح ستہ میں، اکثر متعارض حدیثیں موجود ہیں، حالانکہ ممکن نہیں کہ وہ سب مذہب بنیں، اس لئے کہ بلحاظ ''**اذا تعارضا تساقطا**'' کے یا دونوں ساقط الاعتبار ہوں گے، یا کسی ایک کو ترجیح ہوگی۔ اس طرح کسی حدیث کو روایت کرنے سے وہ اہل بیت کا مذہب ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس کی تصدیق بآسانی یوں ہوسکتی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایتیں بالالتزام فقہ اہلبیت میں داخل کی گئی ہیں۔ انہی روایتوں کو تفسیر درمنثور و ابن جریر وغیرہ میں دیکھ لیجئے کہ ایک ایک آیت میں آپ سے کتنی کتنی روایتیں وارد ہیں، جن میں تعارض کا کوئی لحاظ نہیں۔ اس کے بعد رائے قائم کی جائے کہ کیا اُن تمام روایتوں کے مطابق آپ کا مذہب ہوسکتا ہے؟ اُس سے یہ ثابت ہوجائیگا کہ اہل بیت سے جو روایتیں مروی ہیں اُن سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ اُن حضرات کا مذہب بھی وہی تھا۔ غرضکہ مولانا کو اس کتاب سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ اہل بیت کا مذہب یہی تھا۔ بلکہ جس طرح امام سخاویؒ نے ''**الجواهر المکللة**'' میں اُن احادیث کو ذکر کیا جن کی اسنادوں میں کس قسم کا التزام ہے، اسی طرح مولانا ممدوح نے صرف اُن احادیث کا اُس میں التزام کیا جن کے اسنادوں میں حضرات اہل بیت میں سے کسی کا نام ہو۔ خواہ وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ اور وہ کسی کا مذہب ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے آغانی تک کی روایتیں اُس میں لی گئیں۔

اکثر اکابرِ چشتیہ وغیرہ حنفی ہیں

اس کتاب کے دیکھنے سے اکثر علماء مولوی صاحب کے مخالف ہوگئے۔ اور اُس کی وجہ

یہ بتلاتے ہیں کہ مولوی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک فتنہ کی بنیاد ڈالی، جس کا اثر خاص مقلدوں پر پڑنے والا ہے۔ اس لئے کہ نہ شیعہ اُس کی طرف التفات کریں گے، نہ اہل حدیث۔ البتہ مقلدین میں جو حضرات اہل بیت سے خوش اعتقاد ہیں خصوصاً مشائخین و مریدین جن کا انتساب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طرف ہے وہ ضرور یہ خیال کریں گے کہ جس طرح طریقت میں حضرت کی اتباع ضرور ہے شریعت میں بھی بہتر بلکہ ضرور ہے۔
مگر غور کیا جائے تو یہ الزام مولانا ممدوح کی طرف لگانا زیادتی ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ کب دعویٰ کیا کہ طریقت اور شریعت میں ایک ہی کی اتباع ضروری یا بہتر ہے؟ اور ممکن نہیں کہ وہ اُس کے قائل ہوں؛ کیونکہ خود اُن کے پیر حضرت حافظ محمد علی صاحب قدس سرہ اور اُن کے پیر حضرت شاہ سلیمان صاحب اور مولانا فخر صاحب وغیرہم سب حنفی تھے اور خود حضرت محبوب الٰہی مولانا نظام الدین قدس سرہ العزیز بھی حنفی تھے، جیسا کہ ''فوائد الفواد'' کی جلد چہارم، مجلس دہم، ماہ رمضان 710ھ سے ظاہر ہے کہ خود حضرت نے اپنے حنفی المذہب ہونے کا اعتراف کر کے امام اعظم کوفیؒ کے فضائل ومناقب بیان کئے ہیں اور حضرت خواجۂ خواجگاں خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہ العزیز وغیرہ اکثر حضرات بھی حنفی المذہب تھے، پھر حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلۂ چشتیہ کے اکابر شیوخ سے ہیں۔ اُن کا حال بھی اوپر معلوم ہوا کہ کس طرح امام صاحب کے معتقد تھے، اسی طرح تذکروں سے ثابت ہے کہ کوئی طریقہ ایسا نہیں کہ جس کے اکابر اور مقتدا مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے مقلد نہ ہوں۔ اگر اہل طریقت کو اہل بیت کی تقلید ضروری یا بہتر ہوتی تو یہ حضرات سوائے اہل بیت کے کسی کی تقلید نہ کرتے۔

مذاہبِ اربعہ کی حقانیت پر اولیاء اللہ کا کشف

اولیاء اللہ کا کسی مذہب کی تقلید کرنا ایسا نہ تھا جیسے ہم تقلید کرتے ہیں؛ بلکہ اُن کو مشاہدہ

سے یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ مجتہدین رضی اللہ عنہم مقربین بارگاہ الٰہی ہیں اور انبیاء کے مرتبہ کے بعد اُن کا مرتبہ ہے اور اُن کو ہمیشہ امداد الٰہی ہوتی رہتی ہے اور کل مذاہب اربعہ حق ہیں۔ چنانچہ امام المحققین شیخ اکبر محی الدین ابن عربی حاتمی قدس سرہ العزیز نے ''فتوحات مکیہ'' کے ایک سو اکسٹھویں باب میں لکھا ہے: ''فقلت له (ای لابن مدینؒ) یاابا عبد الرحمن ! لا اعرف لهذا المقام اسما امیزه به، فقال لی هذا یسمیٰ مقام القربة فتحقق به ، فتحققت به ، فاذا به مقام عظیم لعلماء الرسوم من اهل الاجتهاد، فیه قدم راسخة لکنهم لا یعرفون انهم فیه ، و رأیت الامداد الالهی یسری الیهم من هذا المقام ، و لهذا ینکر بعضهم علی بعض ... کما انه لکل نبی تقدم هذا الزمان المحمدی شرعة و منهاج والایمان بذلک کله واجب علی کل مومن و ان لم نلتزم من احکامهم الا ما لزمناه، فالمجتهدون من علماء الشریعة ورثه الرسل فی التشریع ،و ادلتهم تقوم لهم مقام الوحی الأنبیاء و اختلاف الاحکام کاختلاف الاحکام الا انهم لیسوا مثل الرسل لعدم الکشف۔

اور ''نیز فتوحات مکیہ'' کے ایک سو پچپنویں باب میں لکھتے ہیں: انقطع منها مسمی النبی والرسول و لذلک قال صلی الله علیه وسلم: فلا رسول بعدی ولا نبی ثم ابقی منها المبشرات، وابقی منها حکم المجتهدین ، و ازال عنهم الاسم ،و ابقی الحکم و امر من لا علم له بالحکم الالهی ان یسأل اهل الذکر ،فیفتونه بما اداه الیه اجتهادهم و ان اختلفوا کما اختلفت الشرائع " لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجاً'' وکذلک لکل مجتهد جعل له شرعة من دلیله و منهاجا وهو عین دلیله فی اثبات الحکم، و یحرم علیه العدول عنه، و قرر الشرع

الالھی ذلک کلہ۔ فحرم الشافعی عین ماأ حلہ الحنفی ، و أجاز ابو حنیفۃ عین ما منعہ احمد بن حنبل ، فأجاز ھذا مالم یجر ھذا ؟ فاتفقوا فی اشیاء و اختلفوا فی اشیاء ، وکل فی ھذہ الامۃ شرع مقرر لنا من عند اللہ مع علمنا ان مرتبتھم دون مرتبۃ الرسل الموحی الیھم من عند اللہ۔

اور باب ثامن وثمانون میں لکھتے ہیں: و حکم الاجتھاد فی الاصول والفروع واحد، والحق فی الفروع حیث قررہ الشرع ، و قد قرر حکم المجتھدین و لا یقرر الا ما ھو حق ،فکلہ حق. اوراسی میں یہ بھی ہے: کان من علم مالک ابن انس و دینہ و ورعہ انہ اذا سئل عن مسئلۃ فی دین اللہ یقول: نزلت ؟فان قیل لہ نعم افتی ،و ان قیل لہ لم تنزل لم یفت ۔

الحاصل اہل کشف کی ان تصریحات سے ثابت ہے کہ مرضی الٰہی یہی ہے کہ شریعت میں ائمۂ اربعہ کی تقلید کی جائے اور چاروں مذاہب برگزیدۂ بارگاہ رب العزت ہیں۔ اورسب حق ہیں، اسی وجہ سے اجتہاد میں من جانب اللہ اُن کو مدد پہونچتی رہتی تھی۔ یہ تو اہل کشف کے مشاہدہ سے ثابت ہوا کہ اہل بیت کی تقلید شریعت میں مطلوب نہیں۔ اب احادیث کو بھی دیکھ لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے بعد اہل بیت کا مذہب اختیار کرو بلکہ یہ ارشاد ہوا کہ ’’قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم‘‘ کذا فی المشکوٰۃ ۔یعنی میرے صحابہ سب مثل ستاروں کے ہیں، تم جس کی پیروی کروگے راہ پاؤگے۔

اورنیز ارشاد ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : انی لا ادری ما بقائی فیکم ،فاقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ رواہ الترمذی۔ کذا فی المشکوٰۃ۔

یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: میں نہیں جانتا کہ کس قدر میرا تم میں رہنا ہوگا، سوتم کو چاہئے کہ میرے بعد ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو اور نیز ارشاد ہے: **قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : من یعش منکم بعدی فیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المھدیین ، تمسکوابھا و عضوا علیھا بالنواجذ ۔ رواہ احمد و ابو داؤد ۔ والترمذی و ابن ماجه. و کذا فی المشکوٰة۔**

یعنی فرمایا حضرت نے: جو تم میں سے میرے بعد زندہ رہیگا اختلافِ کثیر دیکھے گا، سوتم کو چاہئے کہ میری سنت اور خلفاء راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑو اور ہرگز نہ چھوڑو اور نیز ارشاد ہے: **قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اتبعوا السواد الاعظم ؛ فانه من شذ شذ فی النار ۔ رواہ ابن ماجه ۔ کذا فی المشکوٰة** ـــ یعنی فرمایا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے: جماعت کثیرہ کی اتباع کرو اور اُس سے جو علحدہ ہووہ دوزخی ہے انتہی ۔

انہی روایتوں اور ارشادات کی وجہ سے محدثین نے خلفاء راشدین اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو روایتیں مروی ہیں جمع کئے ۔ اور جس طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ نے طریقہ بتلا دیا۔ مجتہدین نے ان میں اجتہاد کئے ۔ اور کروڑ ہا مسلمانوں نے جن میں لاکھوں علماء ہیں اُن کی تقلید کی اور سواد اعظم بن گیا، جس کے اتباع کا حکم نبوی ہے۔

فقہ حنفیہ میں اہل بیت کا مذہب بھی داخل ہے

اب دیکھئے کہ مولانا ممدوح کو نہ اولیاء اللہ کے اُس کشف کا انکار ہے نہ اپنے پیروں کے حنفی المذہب ہونے کا انکار ہے نہ ان احادیث کا انکار ہے، پھر کیونکر کہا جائے کہ ان تمام اقراری امور کے بعد اُن کی یہ رائے ہے کہ سب چھوڑ کر فقہ اہل بیت کی تقلید کی جائے؟ باوجود اس کے اگر کوئی شخص مولانا کے منشا کے خلاف اپنے جہل سے یہ سمجھ لے کر فقہ اکبر

اہل بیت کا مذہب ہے اور وہی واجب الاتباع ہے، تو اُس کی غلط فہمی ہے، اُس سے مولانا کو کوئی تعلق نہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ اگر کسی کو یہی شوق ہو کہ اہل بیت کے مذہب کے موافق عمل کرے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے شان میں جو وارد ہے: ''**انا مدینة العلم و علی بابها**'' ان علوم سے بہرہ یاب ہو تو یہ خواہش بھی حنفی مذہب کی تقلید سے پوری ہوسکتی ہے اس لئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفہ میں تشریف رکھے تھے اور آپ کے علوم جیسے کوفہ میں شائع تھے دوسری جگہ نہ تھے، اور امام صاحب بھی کوفی تھے۔ ایک یا دو واسطہ سے حضرت کے علوم آپ کو پہونچ گئے ہیں؛ کیونکہ جب امام صاحب کے چار ہزار استاذ تھے تو اُن میں صدہا اساتذہ کوفہ کے ہوں گے۔ پھر امام صاحب کا شوق تحصیل علم گواہی دیتا ہے کہ جب تک کل احادیث، کوفہ کے آپ نے حاصل نہ کرلیا ہوگا باہر نہ نکلے ہوں گے۔ باہر کے علماء تحصیل علم کے لئے بار بار کوفہ کو آتے تھے جیسا کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ شام اور مصر اور جزیرہ اور بصرہ کو تو میں دو دو چار چار بار گیا مگر کوفہ اور بغداد کو اتنے بار گیا کہ اُس کا شمار نہیں کرسکتا۔ **کما فی مقدمة فتح الباری ، قال البخاری : دخلت الی الشام و مصر و الجزیرة مرتین، و الی البصرة اربع مرات ، و اقمت بالحجاز ستة اعوام ، و لا احصی کم دخلت الی الکوفة و بغداد مع المحدثین۔**

جب کوفہ ایسا دارالعلم تھا تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ امام صاحب ایسے بیش بہا ذخیرہ کو گھر میں حاصل نہ کرکے باہر گئے ہوں؟ بلکہ عقل اس بات پر گواہی دیتی ہے کہ جس قدر اوروں کو زحمت سفر اُٹھانے کے بعد وہاں کی حدیثیں ملی ہوں گی امام صاحب کو گھر بیٹھے اُن کے اضعاف مضاعفہ حاصل ہوئی ہوں گی۔ اور چونکہ امام صاحب کو اہل بیت اور علی کرم اللہ وجہہ سے کمال درجہ کی محبت تھی یہاں تک کہ اسی محبت کی وجہ سے اہلحدیث آپ کے مخالف

ہو گئے ہیں؛ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اہل حدیث ہم سے بغض اس وجہ سے بھی رکھتے ہیں کہ ہم اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے ہیں اور علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت ثابت کرتے ہیں اور وہ ثابت نہیں کرتے۔

ملل ونحل میں شہرستانیؒ نے اصل سبب آپ کے قید ہونے کا لکھا ہے کہ آپ کو اہل بیت کے ساتھ نہایت محبت اور تعلقات تھے، جب یہ خبر منصور کو پہونچی تو اُس نے آپ کو دائم الحبس کر دیا؛ چنانچہ قید ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔

اب کس کا منہ ہے کہ امام صاحب کے مقابلہ میں اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کر سکے؟ آپ نے تو اس محبت میں اپنی جان تک فدا کر دی اور مقتضائے طبیعت ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اُس کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی روایتیں اُس زمانہ میں موجود تھیں امام صاحب نے تلاش کر کر کے اُن کو حاصل کر لیا تھا۔ غرضکہ یہ حسن ظن بالکل واقع کے مطابق اور موکد بالقرائن اور مؤید بالعقل ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علوم امام صاحب کے اجتہاد میں پیش نظر تھے۔ اور ظاہر ہے کہ سرچشمہ علوم اہل بیت کے امام صاحب کی فقہ میں شامل ہیں۔ پھر مزید برآں دو سال آپ کا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں رہنا جو ''**لولا السنتان لهلك النعمان**'' سے معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو بتلاتا ہے کہ رہے سہے علوم اہلبیت کی تکمیل بھی آپ نے اس مدت میں کر لی۔

غرضکہ حنفیہ کو کمال افتخار کا موقع ہے کہ علاوہ جمیع احادیث وقرآن کے، علوم اہل بیت کے ساتھ بھی اُن کے فقہ کو خصوصیت ہے۔ اور اُن کے فقہ میں فقہ اہل بیت بھی شامل ہے۔

الحاصل محدثین تبحر علمی کی وجہ سے اسنادوں سے متعلق اقسام کے تفنن اور التزام کیا کرتے ہیں، اسی طرح امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ایک ایسا التزام تصحیح کیا جو

دوسرے سے ہونا مشکل تھا۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ آپ کا خداداد وغیر معمولی حافظہ اس درجہ قوی تھا کہ لاکھوں اسنادیں آپ کے پیش نظر تھیں ،جس میں ایک لاکھ صحیح اسنادیں تھیں، جن کی صحت کا خود ان کو اعتراف ہے۔اور قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی چیز کثرت سے ہوتی ہے اور کوئی اہم اور ضروری کام درپیش نہیں ہوتا تو مقتضائے طبیعت ہے کہ اُس میں سے اعلیٰ درجہ کی اشیاء کو آدمی منتخب کرتا ہے۔

دیکھ لیجئے! شاہی جواہر خانہ میں ہر چند اکثر جواہر بیش بہا ہوتے ہیں،مگر پھر بھی اُن میں سے ایسے جواہر منتخب کئے جاتے ہیں جو لاجواب ہوں۔اسطرح امام بخاریؒ نے اُن لاکھ صحیح منتخب حدیثوں سے پھر انتخاب کر کے چند حدیثیں ممتاز کردیں،جن کو لاجواب کہنا چاہئے۔ اور یہ کام اُن سے ایسا وقوع میں آیا جو اُس وقت تک کسی سے ہوا نہ تھا،اس پر جس قدر امام بخاری صاحب کو نشاط وسرور ہوا ہو بجا ہے۔بمقتضائے سرور ونشاط اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بس صحیح حدیثیں پوچھئے تو یہی ہیں اور ان کے سوا جتنی حدیثیں ہیں ان کے مقابلہ میں کوئی قابل اعتبار نہیں اور اُن سب حدیثوں کو ساقط الاعتبار کردیا جن کی صحت ائمہ بلکہ خود اُن کے اساتذہ کے نزدیک بلکہ خود ان کے نزدیک مسلم ہو چکی تھی اور اُس وجدانی حالت کا اُن پر اس قدر اثر ہوا کہ کل احادیث صحیحہ کو ترک کر کے انہی چند حدیثوں پر اجتہاد کا مدار رکھا اور اس کا خیال نہ کیا کہ یہ رائے تمام مجتہدوں اور اُن کے اساتذہ کے خلاف ہے۔

مقلدین عامل بالحدیث ہیں

امام بخاریؒ نے جو منتخب شدہ حدیثوں میں دوبار انتخاب کیا ، مجتہدین سابق کو اس انتخاب کی ضرورت نہ تھی ۔اس لئے کہ انہوں نے اسنادوں کی تحقیق کر کے صرف اُن صحیح حدیثوں کو یاد کرلیا تھا جن سے احکام متعلق ہیں، پھر اُن احادیث کے مضامین میں غور وفکر

کرنا اور اُن سے مسائل دینیہ کا استنباط کرنا کوئی ایسا کام نہیں کہ اُس سے فرصت مل سکے۔ اور راویان صحاح کے اوصاف و حالات پسندیدہ میں موازنہ کرنے کی نوبت آئے، کیونکہ انہوں نے یہ مان لیا تھا کہ اُن معتبر راویوں کے ذریعہ سے جو حدیث پہونچ گئی ہے اُس کا انکار ہو نہیں سکتا، اس لئے اُن تمام صحیح حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کیا اور جس طرح صدیق اکبرؓ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کا طریقہ بتلایا تھا، اُس کو عمل میں لایا اور تمام احادیث صحیحہ اور آیات قرآنیہ سے مدد لیکر استنباط احکام کیا اور اجتہاد کے وقت کسی صحیح حدیث کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ اُس کے خیال کرنے کی اُن کو ضرورت تھی۔

اب بتائیے کہ جو لوگ تمام احادیث صحیحہ کو قابل استدلال سمجھتے ہیں وہ عامل بالحدیث ہوں گے یا وہ لوگ جو لاکھوں حدیثوں کو ترک کر کے چند حدیثوں کو قابل استدلال سمجھتے ہیں؟۔

فقہاء اور محدثین کے طریقوں کا موازنہ

تقریر سابق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امام بخاریؒ نے واجب العمل حدیث پہچاننے کا طریقہ، تقلیل احادیث صحاح قرار دیا ہے، یعنی جن احادیث کی صحت کو قدماء نے تسلیم کرلیا ہے، ادنی ادنی احتمالات سے اُن کو ساقط الاعتبار کر کے وہ حدیث واجب العمل سمجھی جائے جس میں ضعف کے احتمال کم ہوں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ سب صحیح حدیثوں کو ترک کر کے ایک حدیث پر عمل کیا جائے جس سے عمل بالحدیث صادق آئے۔ اور فقہاء کا یہ طریقہ ہے کہ اُن تمام مسلم صحیح حدیثوں کی صحت کو مسلم رکھ کر اُن سے استنباط احکام کیا جائے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف ایک حدیث پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کل صحیح حدیثوں اور آیات سے جو بات بعد غور و فکر و اجتہاد کے ثابت ہو وہ واجب العمل ہے۔ اب ان دونوں طریقوں پر غور کیجئے کہ کونسا طریقہ اچھا اور اقرب الی الصواب ہے؟

تقلیل احادیث کا طریقہ معتزلہ کا نکالا ہوا ہے، چنانچہ انہوں نے منجملہ اور شرطوں کے

ایک شرط یہ بھی لگائی کہ ہر روایت کے راوی ہر شخص سے چار ہوں، اگرچہ ظاہراً اس میں نہایت احتیاط معلوم ہوتی ہے، مگر منشا اُس کا بدنیتی ہے کہ نہ کوئی حدیث ایسی ملے گی نہ حدیث کے اتباع کی ضرورت ہوگی۔

فقہاء کی توسیع نظر

امام بخاریؒ کو چونکہ یہ منظور تھا کہ صحیح حدیث کا وجود بھی رہے اور حتی الوسع احتیاط بھی بڑھ جائے، اس لئے شروط لگانے میں ایسا اندازہ پیش نظر رکھا کہ صرف تقلیل احادیث ہوجائے اور اُن شرطوں سے اغماض کیا، جن سے احادیث صحیحہ کا وجود باقی نہ رہے۔ ہر چند اُن شرطوں سے کسی قدر احتیاط زیادہ ہوئی، مگر نہ اُن کو اصل صحت میں دخل ہے نہ مسکت خصم میں۔ اس لئے بغیر ان شرطوں کے بھی اکابر محدثین نے حدیثوں کو صحیح مان لیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے فقہاء کو ان شرطوں کے لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور معتزلہ کے مقابلہ میں اُن شروط والی حدیثوں سے بھی کام نہیں چل سکتا۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ابوداؤد کی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ سعید ابن جبیرؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنھما سے کہا کہ صحابہ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے اُس سے تعجب ہوتا ہے، تو فرمایا کہ بات یہ ہے کہ حضرت نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت پڑھ کر احرام باندھا اور تلبیہ کہا۔ حاضرین نے اُس کو یاد رکھ کر روایت کی، پھر جب آپ ناقہ پر سوار ہوئے اور تلبیہ کہا، اُس وقت جو لوگ وہاں پہونچ گئے تھے انہوں نے تلبیہ سنکر کہا کہ سوار ہونے کے بعد حضرت نے احرام باندھا، پھر جب بلندی پر پہونچے اور وہاں بھی تلبیہ کہا تو اُس پر جو لوگ مطلع ہوئے انہوں نے کہا، یہیں احرام باندھا گیا''، حالانکہ حضرت نے احرام وہیں باندھا تھا جہاں نماز پڑھی تھی۔ انتہی، ملخصاً۔

اب دیکھئے ! یہ تینوں قسم کی روایتیں صحابہ سے مروی ہیں ۔ اگر ایسی اختلافی روایتوں میں امام بخاریؒ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اُس کو اصل واقعہ سے کچھ سروکار نہ ہوگا ، کیونکہ تینوں واقعات صحابہ سے مروی ہیں، ان میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے تصحیح حدیث کا مدار ہر ایک روایت کی اسناد پر ہوگا۔ پھر یہ ضرور نہیں کہ وہی اسناد مطابق شروط ہوں جس میں اصل واقعہ مذکور ہے، بلکہ ممکن ہے کہ اصل واقعہ کی اسناد گو دراصل صحیح ہوں مگر مطابق شروط نہ ہوں ۔ اس صورت میں خلاف واقعہ اعتقاد اور عمل کی ضرورت ہوگی ۔ کیونکہ دوسری روایتوں کو ساقط الاعتبار کرنے کے بعد نہ قرائن پر غور کرنے کی اجازت ہوگی نہ عقل واجتہاد سے کام لیا جائیگا۔ اور اُس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ نے طریقہ اجتہاد کا بتلایا تھا۔ جس کا حال ابھی معلوم ہوا، وہ متروک ہو جائیگا۔

اب بتایئے ! کونسا طریقہ محمود اور واجب الاتباع ہے ؟ اور مجتہدین صدیق اکبرؓ اور عمرؓ وغیرہ کے اتباع کے مامور ہیں یا نہیں؟ حدیث شریف میں وارد ہے : ''**علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین من بعدی**'' ۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا جو قول ہے کہ صبح میں اسفار اور عصر میں تاخیر افضل ہے، اُس کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ''**وأقم الصلوٰة طرفی النهار و زلفا من اللیل**'' ۔ یعنی قائم کرو نماز کو دونوں طرف دن کے اور حصوں میں رات کے ۔

ظاہر آیت دلالت کرتی ہے کہ نماز دن کے دو طرفوں میں واجب ہے اور چونکہ دو طرف دن کے طلوع و غروب ہیں ، جن میں نماز بلا ضرورت بالا جماع جائز نہیں اور طرف ثانی سے مراد مغرب نہیں ہوسکتی ، اس لئے کہ وہ ''**زلفا من اللیل**'' سے متعلق ہے، جن میں

نمازمغرب اور عشاء اور وتر پڑھی جاتی ہے، کیونکہ لفظ ''زلف ''،جمع ہےاور جمع کے لئے کم ازکم تین افراد چاہئے ،اس لئے ضرور ہوا کہ طرفین سے معنی مجاز لئے جائیں اور قاعدہ ہے کہ کسی چیز کا اطلاق اُس کےقریب والی چیز پر ہوا کرتا ہے،اس لئے طرف کا اطلاق مجازاً ایسے وقت پر ہوگا جوطلوع وغروب کےقریب ہو۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسفار بہ نسبت غلس کے اور مثلین بہ نسبت ایک مثل کے طلوع و غروب کےقریب ہیں،اس لئے ''طرفی النهار'' کا اطلاق انہی دونوں قریب والے وقتوں پر اولیٰ ہوگا ؟ کیونکہ لفظ کا اطلاق اُن مجازی معنی پر اولیٰ ہے جو حقیقت سے قریب ہوں۔

دیکھئے ! اجتہاد میں کہاں کہاں نظر ڈالی جاتی ہے،صرف احادیث کے ظاہری معنیٰ سے مقصود نہیں حاصل ہوسکتا۔کیا کوئی معمولی مولوی کی سمجھ میں یہ بات آئیگی کہ اس آیۂ شریفہ سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ ہر چیز کا سایہ دوسرے پر ہوتو نماز عصر پڑھی جائے۔محدثین نے جو تصریح کی ہے کہ ''ابوحنیفہ مواقع استدلال کوخوب جانتے تھے'' اُس کا مطلب اس سے ظاہر ہے کہ کونسی آیت اور کونسی حدیث سے کون کون مسائل نکلتے ہیں اُس کو جانتے تھے اور جومواقع استدلال اُن کے حاشیہ خیال میں نہیں وہ امام صاحب کے پیش نظر تھے۔

یہ روایت اوپر لکھی جا چکی ہے کہ اعمشؒ سے چند مسائل، کسی مجلس میں پوچھے گئے، آپ نے امام صاحب سے اُن کا جواب دینے کو کہا، آپ نے جواب دیا، اعمشؒ نے اُس کی دلیل طلب کی ، امام صاحب نے وہی احادیث پیش کر دی جو اعمشؒ سے انہیں پہونچی تھیں۔اب وہ حیران ہیں کہ یہ مسائل اُن احادیث سے کیونکر نکل سکتے ہیں ۔آخر امام صاحب نے موقع استدلال اور طریقۂ استخراج بیان کیا،جس کوسنکر وہ کمال مسرت سے کہہ اُٹھے: ''انتم الاطباء و نحن العطارون''۔

اب غور کیجئے ! کیا یہ مضامین عالیہ اسنادوں میں تشدد کرنے اور سخت سخت شرطیں لگانے سے حاصل ہو سکتے ہیں؟ یا شارع کومراد پر مطلع ہونے کا اُس سے کوئی قرینہ مل سکتا ہے؟ ہرگز نہیں !

''عقدالجید'' میں ابن حزمؒ کا قول نقل کیا ہے: **فلم یبح اللہ تعالیٰ الرد عند التنازع الی احد دون القرآن و السنة ، و حرم بذلک الرد عند التنازع الی قول قائل لانه غیر القرآن و السنة** ۔یعنی تنازع کے وقت سوائے قرآن و حدیث کے کسی کے قول کی طرف رجوع کرنا درست نہیں ۔انتہی ۔

یہاں شاید یہ خیال کیا گیا ہے کہ مقلدین امام کے ذاتی قول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مگر یہ خیال درست نہیں ، اس لئے کہ ہم مقلدین کا جزمی اعتقاد ہے کہ امام صاحب نے اجتہاد کر کے کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دیا ہے،جس پر صدہا اکابر محدثین نے گواہی دی ہے،جن کو ہم جھوٹے نہیں سمجھ سکتے وہ مجتہدین کے قول کو خدا اور رسول کے قول کا ما حصل سمجھے ہیں ،اور اُسی جزم پر ان کا عمل صحیح بھی ہوتا ہے،جیسا کہ مشتبہ ہو تو جس جہت پر قبلہ ہونے کا جزم ہو اسی طرف نماز صحیح ہوتی ہے، گو خلاف واقع ہو۔

غرضکہ حقیقت تقلید پر غور نہ کرنے سے اس قسم کے اعتراض پیدا ہوتے ہیں ،جن سے عوام کو دھوکا ہوتا ہے اور علماء کو جنبش بھی نہیں ہوتی ۔

''عقدالجید'' میں لکھا ہے کہ ابن حزمؒ نے اس آیۂ شریفہ سے یہ استدلال کیا ہے: **قوله تعالیٰ '' فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ''** یعنی اگر کسی بات میں تمہیں جھگڑا ہو تو اُس کو خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر تم کو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان ہو۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں ، اس لئے کہ آیۂ شریفہ میں ذاتی جھگڑوں کا ذکر ہے۔اس تنازع کا بیان نہیں جو مسائل فقہیہ میں ہوتا ہے، کیونکہ مجتہد جو فتویٰ دیتا ہے اُس پر قرآن

وحدیث سے استدلال کرتا ہے۔ اگر اس کا فیصلہ بھی قرآن وحدیث ہی پر رکھا جائے تو دور لازم آئیگا۔

کسی ایک مسئلہ میں جب آیات واحادیث باہم متعارض ہوں تو ممکن نہیں کہ اُن کا فیصلہ دوسری آیات واحادیث سے ہوسکے، کیونکہ وہ آیات واحادیث بھی اسی تنازع میں شریک ہوں گے۔ دراصل یہاں تنازع کرنے والی احادیث وادلہ میں جو مجتہدین کی طرف سے پیش ہوتے ہیں ان کے فیصلہ کا طریقہ ابوداوٗدؒ نے صحیح میں یہ لکھا ہے : **اذا تنازع الخبران عن رسول الله صلى الله عليه وسلم نظر الى ما عمل به اصحابه من بعده** ۔یعنی اگر وہ دوحدیثوں میں تنازع ہوتو عمل صحابہ کی طرف دیکھا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے اُس بات میں کیا عمل کیا۔

اب دیکھئے کہ بموجب اس روایت کے احادیث کا فیصلہ صحابہ کے عمل پر رکھا گیا۔ حالانکہ وہ غیر قرآن وحدیث ہے؛ کیونکہ سنت سے مراد ابن حزمؒ کے قول میں سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، بدلیل ’’**قوله تعالىٰ : فردوه الى الله و الرسول**‘‘

اب اگر ابن حزمؒ کا قول مان لیا جائے تو اُن مسائل فقہیہ کا فیصلہ جن میں متعارض احادیث ہوں ممکن نہ ہوگا ؛ کیونکہ وہ تو صاف کہتے ہیں کہ غیر خدا ورسول کی طرف رجوع کرنا حرام۔

اور یہ بھی کہنا پڑیگا کہ ابوداوٗدؒ نے ایک ایسے کام کو جو حرام ہے اپنی صحیح کتاب میں داخل کیا۔ اور کسی محدث نے اُس کا انکار تک نہیں کیا بلکہ سب راضی ،اور رضا بالحرام کے مرتکب رہے؛ جو کفر ہے ۔ **نعوذ بالله من ذلک** ۔

’’عقد الجید‘‘ میں حرمت تقلید پر ابن حزمؒ کا یہ استدلال بھی نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:’’**اتبعوا ما انزل اليكم من ربكم و لا تتبعوا من دونه اولياء**‘‘ یعنی چلو

اسی پر جو اُترے تم کو تمہارے رب سے اور نہ چلو اُس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے۔ مطلب اُن کا یہ کہ مقلد، قرآن کو نہیں مانتے اور اُس کے مقابلہ میں امام کے ذاتی قول کو مانتے ہیں۔

خدا کی پناہ! اتہام کی بھلا کوئی حد بھی ہے! کوئی ایک مسئلہ تو پیش کیا جائے کہ کسی معتمد علیہ مجتہد نے صریح آیت قرآنی کے خلاف میں رائے قائم کی ہے۔ اور مقلد اسی کو مانتے ہیں اور قرآن کو رد کر دیتے ہیں۔

ایک استدلال یہ بھی نقل کیا ہے ''**قال اللہ تعالیٰ : و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباء نا** ''یعنی جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی اتباع کرو تو کہتے ہیں: ہم اُس کی اتباع نہ کریں گے، بلکہ اپنے آباء و اجداد کو جس طریقہ پر دیکھا ہے اس کی اتباع کریں گے۔

مطلب اُن کا یہ کہ مقلد اپنے باپ دادا کے قول و فعل کے مقابلہ میں قرآن کو بھی نہیں مانتے۔ انصاف سے دیکھا جائے کہ چاروں مذہبوں میں کوئی بھی مذہب ایسا ہے کہ اُس میں آیات قرآنیہ کا انکار ہے۔ اگر کوئی مذہب ایسا ہو تو کیا وہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

فقہ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث تو کیا صحابہ کے اقوال تک ترک نہیں کئے جاتے۔ ایسی فقہ کے متبعوں کو کافر قرار دینا اور وہ آیات جو خاص کافروں کے باب میں وارد ہیں اُن پر زبردستی چسپاں کرنا صرف غصہ کا مقتضی ہے، جو تعصب مذہبی سے پیدا ہوتا ہے اور ہوش وحواس و تدین کو درہم و برہم کر دیتا ہے۔ اسی غصہ کی وجہ عین مسجدوں میں مار پیٹ ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں، جس کی قرآن و حدیث سے قطعی ممانعت و حرمت ثابت ہے۔ اُسی غصہ اور تعصب کا اثر ہے کہ آمین بالجہر میں مبالغہ کیا جاتا ہے تا کہ اچھی طرح

مخالفت قائم ہو اور دل کھول کر طرفین سے دشمنی کے جوہر دکھلائے جائیں۔ کیا کسی حدیث سے ثابت ہوسکتا ہے کہ آہستہ آمین کہنے والوں کے ساتھ دشمنی قائم کرنے کی غرض سے آمین پکار کر کہا جائے؟ اور مار پیٹ کر کے مقدمہ بازی میں بے دریغ روپیہ صرف کریں اور ججوں کے روبرو خواہ کرستان ہوں یا پارسی وغیرہ اسلام کو ذلیل کریں؟ نہ کسی کتاب سے یہ بات ثابت ہوسکتی نہ حمیت اسلامی اس کو گوارا کرسکتی ہے۔ مگر ایک نفسانیت ہے جو، ہر قسم کی تباہی پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح ائمہ دین کے مقلدوں کو کافر بنانے کا سبب بھی وہی غصہ اور جہالت ہے۔

اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت شریفہ میں حق تعالیٰ نے غیر مقلدوں کی مدح کی ہے **''قولہ تعالیٰ : فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھدٰھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب''** یعنی تم خوشی سناؤ میرے بندوں کو جو سنتے ہیں بات اور پھر چلتے ہیں اُس میں سے اچھی بات پر، وہی ہیں جن کو راہ دی اللہ نے اور وہی ہیں عقل والے۔

معلوم نہیں غیر مقلد، اس میں کیوں شریک ہوگئے؟ حالانکہ اُس سے تو مقلدوں کی تعریف ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ بموجب ارشاد الٰہی باتیں تو سب کی سنتے ہیں؛ مگر مانتے ہیں اسی کی جس کی بات کو اچھی سمجھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے مطابق اگر ہے تو اپنے ہی امام کی بات ہے اور اُسی کی پیروی کرتے ہیں۔

غیر مقلدوں کے استدلال کا جواب

یہاں شاید یہ شبہ کیا جائیگا ''حق تعالیٰ صرف اچھی بات کی اتباع کو فرماتا ہے اور مقلد جس کو اپنی دانست میں اچھی سمجھتے ہیں اُس کی اتباع کرتے ہیں''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو باتیں بالاتفاق اچھی ہیں، مثلاً: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اُن کو ہر امام کے مقلد مانتے ہیں، اب رہی وہ باتیں جن کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں یا مختلف

حدیثیں اُن میں وارد ہیں۔سو اُن میں اچھی بات جو موافق مرضی خدا ورسول ہو بغیر اجتہاد کے معلوم نہیں ہوسکتی۔اُس کو وہی جانے گا جو اعلیٰ درجہ کا مجتہد ہو۔اور چونکہ ہر مقلد اپنے امام کو قرآن وحدیث دانی میں اعلیٰ درجہ کا ماہر سمجھتا ہے،اس لئے اُس کے علم کے مطابق اچھی بات کا وہی متبع ہوگا اور غیر مقلد کو چونکہ اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں،اس لیے اس کو اچھی بات کا ممتاز کرنا دشوار ہے۔اس صورت میں کیونکر کہا جائے کہ''فیتبعون احسنه'' غیر مقلدوں پر پوری طور سے صادق آتا ہے؟

تقلیدِ شخصی

''عقد الجید''میں ابن حزمؒ کا استدلال بھی نقل کیا ہے کہ کُل صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اجماع ہے کہ کسی ایک معین شخص کی تقلید حرام ہے،اس لئے اگر کسی نے ابوحنیفہ یا شافعی وغیرہ کی تقلید کل اقوال میں کی تو اُس نے ''غیر سبیل المومنین'' اختیار کیا۔نعوذ باللہ من ذلک ۔مطلب یہ کہ غیر سبیل المومنین کی اتباع کرنے والا بحسب آیۂ شریفہ قطعاً دوزخی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا صحابہ یا تابعین نے یہ تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص اچھی باتیں قرآن وحدیث کے مطابق بھی کہتا ہو تو اُس کی اگر دس،بیس باتیں مانی بھی جائیں تو دو چار باتوں میں خواہ مخواہ مخالفت کی جائے اور یہ کہا جائے کہ اس کی وہ اچھی باتیں بھی ہوں تو ہم نہ مانیں گے کیونکہ کسی کی سب باتیں ماننا درست نہیں گو وہ اچھی ہی کیوں نہ ہوں۔

ہمیں تو اس قسم کی تصریح یاد نہیں،اگر کوئی صاحب اس تصریح سے کسی کا قول پیش فرماویں تو اُس کے ماننے میں ہمیں کلام نہیں۔

اب ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ حرمت تقلید شخصی پر صراحۃً اجماع ثابت ہوسکے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی صحابی یا تابعی کی تقلید شخصی ثابت نہیں،مگر کسی فعل کے نہ کرنے سے

اگر اُس فعل کی حرمت پر اجماع ثابت ہوا کرے تو بڑی دشواریوں کا سامنا ہوگا۔

دیکھئے! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت تک قرآن جمع نہیں کیا گیا، پھر کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کام نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، نہ اُس وقت تک صحابہ نے کیا، اس لئے اُس کی حرمت پر اجماع ہوگیا تھا اور صدیق اکبرؓ نے **نعوذ باللہ** اس باب میں **غیر سبیل المومنین** اختیار کیا۔

اسی طرح تقریباً ایک صدی تک حدیث کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، باوجود اس کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتابوں کے نہ لکھنے پر اجماع ہوگیا تھا اور محدثین کتابیں لکھ کر معاذ اللہ مرتکب حرام ہوئے۔ اس کے سوا اور بہت سارے امور ایسے ہیں کہ وقتاً فوقتاً بحسب ضرورت متدین اہل علم اُن کو ایجاد کرتے گئے اور بجائے اس کے کہ وہ مخالفت اجماع اور مرتکب حرام سمجھے جائیں، احادیث سے مستحق ثواب ہونا اُن کا ثابت ہے، جیسا کہ **''من سن سنة حسنة''** والی حدیث صحیح سے ظاہر ہے۔ اور ایسے امور کا بارگاہ کبریائی میں مورد تحسین ہونا اس روایت سے ثابت ہے: **''ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن''**

صحابہ کو تقلیدِ شخصی کی ضرورت نہ تھی

بات یہ ہے کہ صحابہ کل عدول تھے، جس کسی کو کوئی بات معلوم نہ ہوتی وہ کسی صحابی سے پوچھ لیتا اور اُس پر عمل کرنے میں کسی قسم کا اندیشہ نہ ہوتا؛ کیونکہ اُس وقت مذاہب باطلہ کا وجود بھی نہ تھا اور اواخر میں اگر ابتدا ہوئی بھی تو صحابہ اُن کے سخت دشمن تھے۔ غرضکہ اُس وقت ہر ایک مفتی معتمد علیہ تھا۔ اسی طرح اوائل زمانہ تابعین میں بھی اکثر سربرآوردہ علماء، متدین اور معتمد علیہ تھے۔ لوگوں کو اُن کے اقوال پر عمل کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا،

جب کوئی ضرورت پیش آتی تو کسی معتمد علیہ سے پوچھ کر عمل کر لیتے۔ اُس کے بعد جب مذاہب باطلہ کے لوگ علم پڑھ کر بظاہر محدث کہلاتے؛ مگر در باطن اُن مذاہب باطلہ کے رواج دینے میں بیحد سعی کرتے تھے، جس سے اُن کی مردم شماری میں علانیہ زیادتی اور اہل سنت میں کمی واقع ہونے لگی، اُس وقت اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ تمام آیات و احادیث پر غور کر کے اہل سنت و جماعت کا مذہب مدون اور ممتاز کر دیا جائے، تاکہ لوگ اہل مذاہب باطلہ کے مکر وتزویر سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ امام صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور ایک ہزار محدثوں کے اتفاق سے فقہ مدون کیا، جس کی توثیق اکابر محدثین نے کی اور خود بھی اُس پر عمل کرتے اور لوگوں کو اُس کی تقلید پر ترغیب دیتے گئے، جس سے تھوڑے عرصہ میں وہ مذہب عالمگیر ہو گیا اور لوگوں کو یہ اطمینان حاصل ہوا کہ اہل سنت و جماعت کا بھی یہی مذہب ہے، جس میں اہل باطل کی رائے کو دخل نہیں۔ اب اس اطمینان کے بعد اگر اُن لوگوں سے کہا جاتا کہ بھائیوں اس مذہب کے دس بیس باتوں پر اگر عمل کرتے ہو تو دو چار باتوں میں مخالفت بھی کیا کرو! تو وہ ضرور پوچھتے کہ حضرت مخالفت کسی خاص وجہ سے کی جائے یا خواہ مخواہ بلا وجہ بھی مخالفت کی ضرورت ہے؟ اور اگر یہ قاعدہ بتایا جاتا کہ صریح حدیث کے مخالف جو بات ہو اُس میں مخالفت کی جائے تو وہ اُس کے جواب میں صدیق اکبر، عمر فاروق، عثمان ذی النورین، عائشہ صدیقہ، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا طریقہ عمل بلکہ کل صحابہ کا اجماع پیش کر سکتے تھے کہ مجتہد کو ضرور نہیں کہ ہر ایک حدیث پر عمل کرے بلکہ یہ بتلا سکتے تھے کہ خود محدثین نے ہزار ہا حدیثوں کو متروک العمل کر دیا۔ اور یہ تو ضرور کہیں گے کہ ہم نے ایسے مذہب کی تقلید کی کہ اُس کی تدوین میں ہزار ہا محدث شریک تھے اور تمام روئے زمین پر جو حدیثیں اُس وقت موجود تھیں، تدوین کے وقت سب پیش نظر تھیں۔ اور ایسے شخص کی تقلید کی ہے کہ بحسب گواہی اکابر محدثین وہ تمام محدثوں سے اعلم و افقہ اور اورع ہیں۔ ایسے شخص کی مخالفت کیونکر جائز ہو؟ اور اگر چند مسائل میں

مخالفت کی تو وہ ابو حنیفہ کی مخالفت ہوگی یا آیات و احادیث کی ؛ جن کی بناء پر انہوں نے فتویٰ دیا تھا؟ غرضکہ فقہ کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد مقلد اپنے امام کی مخالفت ہرگز نہیں کرسکتا، ورنہ لازم آئیگا کہ اُس کا حسن ظن جو امام کے اعلم اور افقہ ہونے پر تھا، جاتا رہا، حالانکہ صحت عمل کا مدار اُسی حسن ظن پر ہے۔

ضرورتِ تقلید

اب ضرورت تقلید پر بھی غور کیجئے! یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے کہ آدمی اپنے ہم خیال وہم مشربوں کو دوست رکھتا ہے اور جو ہم خیال نہ ہو اُس سے اجنبیت بلکہ کبھی وحشت اور نفرت ہوتی ہے، جس سے مخالفت اور عداوت تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ تھوڑے روز کی بات ہے کہ قصبۂ بیڑ میں ایک صاحب نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ جمعہ کے دونوں خطبوں کے بیچ میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا منع ہے۔ تھوڑے لوگ اُن کے موافق ہوئے اور تھوڑے مخالف۔ اور ان دونوں فرقوں میں باہمی مخالفت کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور ایک دوسرے کی اقتداء کو جائز نہیں رکھتے تھے، حالانکہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ اس قدر اُس میں تشدد کیا جائے۔ جامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

گر ز عشقت خبری است بگوای واعظ ورنہ خاموش کہ ایں شور وفغاں چیزی نیست

دیکھئے! حالانکہ جامیؒ ظاہری علم میں بھی علامہ تھے، مگر چونکہ طبیعت میں عشق تھا، واعظ سے کہدیا کہ چپ رہ شور وفغاں کیوں کررہا ہے۔ وجہ یہی تھی کہ اُس کو اپنا ہم مشرب نہیں پایا۔

بخاری شریف میں یہ روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا تھا، کسی قدر اُس کے خلاف پڑھ رہا تھا، میں نے اُس کو پکڑ کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا اور اس واقعہ کی خبر دی، حضرت نے اُس کی اور میری قرأت سنکر فرمایا: تم دونوں محسن ہو، یعنی

اچھا پڑھتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ اختلاف مت کیا کرو؛ تم سے پہلے جو اُمتیں تھیں وہ اختلاف کرنے ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔!

دیکھئے! قرأت کے اختلاف کی وجہ سے اُن کو تحمل نہ ہوسکا اور اُس شخص کو پکڑ کر حضرت کے پاس لے گئے۔

اور بخاری و مسلم میں ہے کہ عمرؓ نے ہشام بن حکیم کو دیکھا کہ اپنی قرأت کے خلاف پڑھ رہے ہیں، فوراً اُن کے گلے میں چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔

غرضکہ اختلافات سے خلاف ضرور پیدا ہوتا ہے، خواہ منشا اُس کا نفسانیت ہو یا للہیّت۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اصلاح فرمادی کہ ایسے خفیف امور میں اگر اختلاف نہ ہو تو مخالفت کی نوبت نہ آنے پائے۔ اسی طرح ہر ایک موقع میں مخالفت باہمی کی خرابیاں اور وعید اور اتحاد و موافقت کے منافع اور فضیلتیں بیان فرمایا کئے اور آیات بھی اس باب میں نازل ہوئیں۔ چونکہ صحابہ نے خدا اور رسول کے ارشادات کے مقابلہ میں اپنے اقتضائے طبعی کو کان لم یکن اور نفسانیت کو بالکلیہ ترک کردیا تھا، اس لئے جزئی مسائل میں اختلاف ہونے سے مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص جس سے چاہتا مسئلہ پوچھ لیتا اور اُس کے مطابق عمل کرتا اور مختلف فتووں سے جو اختلاف پیدا ہوتا تھا اُس سے مخالفت کی نوبت نہیں آتی تھی اور وہی اثر اوائل زمانۂ تابعین میں بھی تھا۔ پھر جوں جوں زمانہ دور ہوتا گیا، مقتضیات طبع سر اُٹھانے لگے اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوئی جو فی زمانا مشاہد ہے کہ دیکھنے کو تو علم کی تحصیل ہے؛ مگر عمل کی حالت ناگفتہ بہ اور چھوٹے چھوٹے مسائل میں ایسا اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ مخالفت اور دشمنی کی نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اس کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوگئی تھی۔

غرضکہ علماء نے جب دیکھا کہ مذاہب باطلہ کا شیوع اوراختلاف ومخالفت باہمی روز افزوں ہے، اس لئے فقہ کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے ،جس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اختلاف باہمی جاتا رہا،اورتمام مقلد ہم مشرب ہوگئے۔جس سے اتحاد باہمی جو مقصود خدا ورسول ہے قائم ہوا۔

دیکھ لیجئے ! کروڑہا مسلمان ہیں کہ فقہ کے متفق علیہ مسائل پر برابر عمل کرتے ہیں اور اختلاف کی نوبت ہی نہیں آتی اور جن مسائل میں امام کا قول مصرح نہیں علماء کے فتووں پر کیسی کیسی مخالفتیں ہوتی ہیں؟ غرضکہ یہ ہم مشربی اتفاق پیدا کرنے کا ایک قوی ذریعہ ہے۔

پھر مذہب حنفیہ کے بعد دوسرے مذاہب حقہ کی جب بنیاد قائم ہوئی تو اُس کے ساتھ ساتھ مخالفت کی بھی بنیاد پڑی ، چنانچہ تاریخ دانوں پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ اہل مذاہب اربعہ میں کیسی کیسی مخالفتیں اور ہنگامے برپا ہوئے ،مگر خدا کا فضل یہ ہوا کہ صرف چار ہی مذہبوں میں اختلاف منحصر ہوگیا اور علماء نے فیصلہ کردیا کہ اب پانچواں مذہب ضرورت سے زائد ہے۔اس فیصلہ کا پرزور اثر یہ ہوا کہ یہی چار مذاہب بالاجماع حق سمجھے گئے اور ہر ایک آزادانہ بلاتعرض اپنے مذہب پر عمل کرنے کا مجاز قرار دیا گیا،جس سے باہمی مخالفت بہت کم بلکہ منہدم ہوگئی۔اور ہر مذہب کا مقلد یہ سمجھنے لگا کہ دوسرے مذہب والے کا عمل گو اپنے عمل کے مخالف ہومگراس کا فرض منصبی وہی ہے۔ ہر چند مسائل جزئیہ میں اہل مذاہب اربعہ ہم مشرب نہیں ہیں ؛مگر وہاں ایک نئی قسم کی ہم مشربی قائم ہوگئی کہ نفس تقلید میں سب ہم مشرب ہیں اور جو مقلد نہ ہو اُس کو اجنبی اور مخالف سمجھتے ہیں ۔ اسی وجہ سے شافعی المذہب برابر آمین بالجہر کہتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کرتا۔اور غیر مقلدوں کا آمین بالجہر ایک ہنگامہ برپا کردیتا ہے۔

ہم نے جولکھا کہ ’’مذاہب حقہ یہی چار مذہب ہیں‘‘۔سو یہ صرف ہماری رائے نہیں بلکہ

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے ''عقد الجید'' میں اسی پر فیصلہ کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ''**ولما اندرست المذاهب الحقة الا هذه الاربعة كان اتباعها اتباعاً للسواد الاعظم والخروج عنها خروجاً عن السواد الاعظم۔**

یعنی تمام مذاہب حقہ مٹ گئے، اب اُن میں سے یہی چار مذہب باقی ہیں، جن کی اتباع سواداعظم کی اتباع ہے۔ اوراُن سے خارج ہونا سواداعظم سے خارج ہونا ہے۔

مولانا نے مذاہب اربعہ کو جوسواداعظم لکھا ہے وہ اشارہ اس حدیث شریف کی طرف ہے؛ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **اتبعوا السواد الاعظم ، فانه من شذ شذ فی النار۔ رواه ابن ماجه ، كذا فی المشكوٰة** ''یعنی سواداعظم یعنی بڑی جماعت کی اتباع کرو، اس لئے کہ جواس سے علحدہ ہوا، وہ اس سے علحدہ ہوکر دوزخ میں گیا۔

صحابہ نے بھی تقلید کی

ہم نے اختلاف کو باعث خلاف جولکھا اور مشاہدے سے ثابت کیا، سووہ احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ ابوداوداورترمذی میں یہ روایت ہے کہ عثمانؓ نے منیٰ میں چار رکعتیں پڑھیں۔ یعنی نمازوں میں قصر نہیں کیا۔ ابن مسعودؓ نے یہ دیکھ کر کہا کہ ہم نے اس مقام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو رکعت پڑھی یعنی قصر کیا، پھر ابوبکرؓ کے ساتھ بھی دو رکعت پڑھی پھر عثمانؓ کے اوائل زمانۂ خلافت میں اُن کے ساتھ بھی دو ہی رکعت پڑھی، مگر جب عثمانؓ نے چار رکعتیں پڑھیں تو انہوں نے بھی قصر کو ترک کردیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے قصر نہ کرنے کا عیب عثمانؓ پر لگایا تھا اوراب آپ خود قصر نہیں کرتے، اس کی کیا وجہ؟ فرمایا: **الخلاف شر۔**

دیکھئے! ابن مسعودؓ نے اختلاف کو باعث خلاف سمجھا اور رفع مخالفت کی غرض سے حدیث صحیح پرعمل نہیں کیا اور تقلید کو اُس پر ترجیح دی۔

اہل بصیرت غور فرماویں! کہ ایک جلیل القدر صحابی کے قول وفعل سے ثابت ہے کہ تقلید باعث دفع شر وفساد ہے۔ کیوں نہ ہو، دینی مصالح کو جاننا اُنہی کا کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ ان کی ذاتی لیاقت ومصلحت اندیشی کی خبر دی ہے، جیسا کہ اس حدیث شریف سے ظاہر ہے: ''**عن علی رضی اللہ عنه، قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم : لو کنت مستخلفاً احدًا عن غیر مشورۃ لاستخلفت ابن ام عبد۔ رواہ ابن ماجه**'' یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: اگر میں کسی کو بغیر مشورت کے اپنا خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد یعنی عبد اللہ ابن مسعودؓ کو بناتا''۔ انتہی۔

مجتہد صحابہ نے بخوفِ فتنہ تقلید کی

دیکھئے! دینی مصالح میں اُن کی عقل خداداد کس قدر رسا ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لئے اعلیٰ درجہ کے اہل اُن کو تصور فرمایا۔ یہ روایت اوپر مذکور ہوئی کہ عمر اور علی رضی اللہ عنہما کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ مرد عورت کو طلاق کا اختیار دے۔ مگر باوجودیکہ علی کرم اللہ وجہہ کا اجتہاد عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے مخالف تھا۔ علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے اجتہاد پر فتویٰ نہیں دیا اور عمر رضی اللہ عنہ کی تقلید کرتے رہے۔ اسی وجہ کہ اختلاف باعث شر وفساد ہے۔

دیکھئے کہ ایسے دو جلیل القدر صحابیوں نے صرف فساد کے خیال سے تقلید کو تحقیق پر ترجیح دی ہے۔ اب اصلاح پسند حضرات کو تقلید مذاہب کر کے مخالفت باہمی جو مانع ترقی ہو رہی ہے بلکہ تنزل اور ادبار کو روز افزوں ترقی دے رہی ہے، اس کو اٹھانے اور قوم کی اصلاح کرنے میں کیا تامل ہے۔ صحیح حدیث ہے کہ ''**اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم**'' یعنی صحابہ مثل ستاروں کے ہیں؛ اُن میں سے جس کی اقتدا کی

جائے باعث ہدایت ہے۔

جب ایسا قوی دستاویز ہمارے ہاتھ آ گیا ہے تو اگر بالفرض تقلید کے باب میں پرسش بھی ہو جائے تو یہ جواب ہوسکتا ہے کہ جس طرح صحابہ نے دفع مخالفت کی غرض سے تقلید کی تھی ہم نے بھی کی۔ بلکہ ہم اس کی بدولت مستحق اجر جزیل ہیں کیونکہ یہ صحیح حدیث ہمیں پہونچی تھی: **عن ابی الدرداء، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: الا اخبركم بافضل من درجة الصيام والصلوٰة والصدقة؟ قلنا: بلى! قال: اصلاح ذات البين، و فساد ذات البين، هى الحالقة. رواه ابو داؤد، والترمذى و قال هذا حديث صحيح**"۔ یعنی فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اصلاح ذات البین یعنی قوم کی بگڑی حالت کو درست کرنا، درجہ میں روزہ، صدقہ اور نماز سے افضل ہے اور فساد ذات البین حالقہ ہے، جس کی تفسیر خود حضرت ہی نے دوسری حدیث میں فرمائی جس کا مطلب یہ کہ وہ دین کو تباہ کر دیتا ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "عقد الجید" میں لکھا ہے: "**اعلم ان فى الاخذ بهٰذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة و فى الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة**"

دیکھیے! شاہ صاحب بھی تقلید کو مذاہب اربعہ میں منحصر فرما رہے ہیں اور ترک تقلید میں فساد عظیم بتلا رہے ہیں۔ شاہ صاحب جو تقلید میں مصلحت عظیم کہہ رہے ہیں سر دست ایک مصلحت یہ ہے کہ سب ہم مشرب ہو جاتے ہیں اور مخالفت وفساد مبدل باتحاد ہو جاتا ہے، جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی اصلاح اور رضا مندی خدا اور رسول حاصل ہوسکتی ہے۔ البتہ اس میں مولویوں کا اتنا نقصان تو ضرور ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے جماعتوں کے جو مقتدا اور سرپرست بنے رہتے تھے وہ بات جاتی رہے گی اور جماعت متفرق ہو جائیگی۔ مگر یہ

ذاتی غرض ہے، اگر اس پر دینی غرض اور ثواب اخروی اور خدا ورسول کی خوشنودی کو مقدم رکھیں تو علاوہ ان تمام فضائل کے دنیا میں بھی نیک نام ہو جائیں اور عجب نہیں کہ اس اتفاق باہمی سے اُن کی اور قدر بڑھ جائے اور چھوٹے جماعتوں کے جو مقتدا تھے ایک بڑی جماعت کے مقتدا بن جائیں۔

خدائے تعالیٰ ان حضرات کو توفیق عطا فرمائے کہ مسلمانوں کی حالت زار پر رحم کر کے اصلاح ذات البین کی طرف متوجہ ہوں۔

اپنے امام کی مخالفت جائز نہیں

''الانصاف'' میں لکھا ہے کہ امام غزالیؒ اور بعض علماء کا قول ہے کہ مقلد اگر چہ عالم متبحر ہو، مگر اُس کو جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں اپنے امام کا قول چھوڑ کر دوسرے امام کی تقلید کرے، اس لئے کہ ہر آدمی پر واجب ہے کہ ہر مسئلہ میں دلیل کے مطابق عمل کرے اور جب اُس میں صلاحیت نہ ہو کہ ہر مسئلہ دلیل سے نکال سکے تو اپنے امام کی نسبت جو اُس کا اعتقاد ہے کہ ہر مسئلہ کو انہوں نے دلیل سے نکالا ہے اور وہ قوت اجتہادی میں دوسرے اماموں سے افضل ہیں۔ وہی اعتقاد افضلیت دلیل کے قائم مقام ہو جائیگا اور جس طرح دلیل کی مخالفت درست نہیں؛ قائم مقام دلیل کی مخالفت بھی درست نہیں۔ مگر یہ دلیل مخدوش ہے، اس لئے کہ اپنے امام کو دوسرے اماموں سے افضل سمجھنا ضرور نہیں؛ کیونکہ صحابہ اور تابعین ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتے تھے، باوجود اس کے بہت سے مسائل پر دوسرے صحابہ کی بھی تقلید کیا کرتے تھے، اس سے ثابت ہے کہ جس کی تقلید کی جائے اُس کو افضل سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ انتہی۔

یہاں یہ بات بتانے کی ضرورت تھی کہ صدیق اکبرؓ کو کسی خاص مسئلہ کے عالم سمجھنے کے

بعد بھی صحابہ کسی دوسرے سے وہ مسئلہ پوچھتے تھے، مگر یہ بات نہیں بتلائی گئی۔ صحابہ کا دستور تھا کہ جس کی نسبت یہ خیال ہوتا کہ کسی مسئلہ میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کو روایت ہے تو وہ مسئلہ انہی سے پوچھتے؛ چنانچہ صدیق اکبر اور عمر رضی اللہ عنہما کی یہی عادت تھی، جیسا کہ کتب احادیث سے ثابت ہے کہ جس سے جو مسئلہ پوچھا جاتا تھا وہ اُس مسئلہ کے علم میں افضل سمجھا جاتا تھا اور صدیق اکبرؓ بھی اُس سے پوچھنے کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔

اب یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ آدمی لاکھوں علماء میں سے ایک شخص کو جو اپنا مقلد بنا لیتا ہے، اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی، ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی؛ جو جائز نہیں۔ پھر وہ مرجح بھی ایسا ہوگا جو مناسب ہو، مثلاً امام صاحب کی تقلید، مسائل فقہ میں اس وجہ سے کسی نے نہیں کی کہ وہ بڑے عابد یا تاجر تھے؛ بلکہ اُس زمانہ کے محدثین نے جب دیکھ لیا کہ حدیث، تفقہ، فہم نصوص اور تدین وغیرہ ضروریات اجتہاد میں کوئی اُن کا نظیر نہیں، اس لئے خود بخود ان کے دلوں میں ایک انقیادی کیفیت پیدا ہوگئی، جو ایک متبحر متدین عالم کا حال دیکھنے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے؛ کیونکہ کسی ضعیف روایت سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ امام صاحب نے کسی کو مجبور کیا تھا یا جس طرح ان دنوں بذریعہ اشتہارات اپنے فضائل معلوم کرائے جاتے ہیں امام صاحب نے بھی کیا تھا بلکہ برخلاف اس کے وہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ آیات واحادیث وغیرہ میں غور کرکے اپنے اجتہاد سے ہر مسئلہ میں ہم نے ایک رائے قائم کی ہے، جس کا جی چاہئے مانے اور اگر اُس سے بہتر کوئی بات ثابت کردی جائے تو ہم اُس کو مان لیں گے۔

باوجود اس کے جب علماء نے اُن کو اپنا مقتداء بنالیا تو معلوم ہوا کہ ان کا سب سے افضل ہونا ان حضرات کے نزدیک مُسلَّم ہوگیا تھا، پھر اُس زمانہ کے اکابر محدثین کی متواتر شہادتوں نے بعد والوں کے دلوں میں وہی انقیادی کیفیت پیدا کردی، جس سے یہ ثابت

ہوگیا کہ ہر مقلد کے نزدیک امام صاحب کی افضلیت مسلم ہے، جس کی نسبت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قائم مقام دلیل ہے۔ اگر یہ فضیلت مُسلَّم ہو تو پھر دوسروں کے مقلد کہلانا ترجیح بلامرجح ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو مقلد اپنے امام کے قول کو چھوڑ کر دوسرے امام کے قول کو ترجیح دینا چاہے وہ دو حال سے خالی نہ ہوگا: مقلد سمجھا جائیگا یا مجتہد۔ اگر مقلد ہے تو دلیل قائم کرنے اور دلائل میں ترجیح دینے سے اُس کو کیا تعلق؟ مقلد کا فرض یہی ہے کہ اگر ممکن ہو تو اپنے امام کی دلیلوں کو تقویت دے، ورنہ امام کے قول کو واجب العمل سمجھے اور اگر مجتہد ہے تو شرائط اجتہاد مفقود ہیں، چند حدیثوں کو یاد کر لینے سے آدمی مجتہد نہیں ہوسکتا! اُس کے لیے بقول امام احمدؒ کم سے کم پانچ لاکھ حدیثیں یاد ہونے کی ضرورت ہے۔ پھر لاکھوں صحیح حدیثیں جو مفقود ہوگئی ہیں ان کو فراہم کرنے کی کیا صورت؟

غرض مقلد آخر مقلد ہی ہے، یعنی امام کی تقلید کے بغیر اس کو چارہ نہیں۔ اگر اپنی حد سے وہ قدم باہر رکھے تو بے موقع اور ظلم سمجھا جائیگا۔

اب رہی یہ بات کہ باوجود صدیق اکبر اور عمر رضی اللہ عنہما کی افضلیت کے، لوگ دوسرے صحابہ کی بھی تقلید کیا کرتے تھے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ خود یہ حضرات فرمایا کرتے تھے کہ تجارت وغیرہ مشاغل میں بہت سی حدیثیں ہم سے فوت ہوگئیں، اسی وجہ سے جب ضرورت ہوتی تو صحابہ سے دریافت کرتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں کیا فرمایا ہے، پھر جو حدیث وہ بیان کرتے اس پر خود بھی عمل کرتے اور لوگوں کو اُس پر عمل کرنے کے لئے فرماتے اور عندالضرورت بہت سے مقدمات میں صحابہ کی رائے بھی دریافت کرتے تھے۔

بہرحال جس طرح مجتہدین نے احادیث کو فراہم کرنے اور اجتہاد کر کے ہر مسئلہ میں

ایک رائے قائم کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا ان حضرات نے اپنے ذمہ نہیں لیا اور کیونکر لے سکتے ؟ اس وقت کی ضرورتیں ہی دوسری تھیں ، اگر وہ حضرات اس کام میں مشغول ہوجاتے تو دین کی اس قدر اشاعت کیونکر ہوسکتی ؟ غرضکہ شیخین کی فضلیت دوسری قسم کی ہے، امام کی فضلیت کو اُس سے کوئی تعلق نہیں ! امام کی افضلیت باعث تقلید ہے اور شیخین کی افضلیت باعث تقلید نہیں۔

اب تھوڑا سا حال محدثین کی تقلید کا بھی سن لیجئے !

محدثین نے بھی تقلید کی

یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہوسکتی ہے کہ امام بخاریؒ نے صحت جامع کا جو دعویٰ کیا ہے اُس میں وہ اُن محدثین کے مقلد ہیں جن کے نام اُس کی اسنادوں میں مذکور ہیں ؛ کیونکہ نہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے وہ حدیثیں سنیں نہ اُن کے اساتذہ نے بلکہ ہر تابعی نے صحابی سے سنکر بلا دلیل مان لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے۔ اسی طرح ہر محدث اپنے اپنے استاذ کے مقلد رہے اور یہ تقلید دینی مسائل میں ہوا کی کیونکہ کسی خاص عبارت کو یہ کہدینا کہ وہ حضرت کا ارشاد ہے اور اُس کے حدیث ہونے کا اعتقاد رکھنا ایک دینی مسئلہ ہے، جس کی تحقیق بغیر اس کے ممکن نہیں کہ کسی معتمد علیہ کے قول کو بلا دلیل مان لیا جائے اور یہ تقلید بعینہ ایسی ہے جیسے مقلدین دینی مسائل کو تقلیداً بلا دلیل مان لیا کرتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ جس طرح امام بخاریؒ وغیرہ محدثین اُن حضرات کی تقلید سے بخاری شریف کو حدیث کی صحیح کتاب کہتے ہیں، اسی طرح حنفیہ بھی ان ہی حضرات کی تقلید کر کے فقہ کو مطابق حدیث اور واجب العمل کہتے ہیں۔ پھر بیچارے حنفیہ تقلید کے باب میں کیوں مورد طعن بنائے جاتے ہیں ؟ اگر تقلید حرام ہوجائے تو معاذ اللہ بخاری شریف کو صحیح کہنا

بھی حرام ہو جائیگا؛ کیونکہ اس کو صحیح کہنا بھی تقلید ہی پر مبنی ہے۔

ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ کسی صنعت اور حرفت اور فن میں بغیر تقلید کے کام چل نہیں ہوسکتا۔ محقق، ہر صنعت وفن میں بہت کم ہوتے ہیں۔ محدثین کو دیکھ لیجئے کہ کیسے ہی محقق کیوں نہ ہو بغیر تقلید کے اُن کو گزیر نہیں۔ اس لئے کہ فن رجال سے ظاہر ہے کہ ایسے محدث بہت ہی کم ہیں کہ جن کی توثیق کل محدثوں نے کی ہو، بلکہ تقریباً کل محدث ایسے ہیں جن پر بعضوں نے جرح کی ہے اور بعضوں نے توثیق اور ظاہر ہے کہ قابل اعتماد وہی جرح وتعدیل ہوگی جو معاصرین نے بعد تحقیق اپنے چشم دید واقعات بیان کر کے اپنی رائے ظاہر کی ہے اور وہی حضرات اُس جرح وتعدیل خاص میں مجتہد اور محقق سمجھے جائیں گے، کیونکہ ''**لیس الخبر کالمعاینة**'' پھر اُن کے بعد کے طبقے والے خواہ جرح کریں یا تعدیل، صرف تقلید سے ہوگی۔ کیسا ہی محقق شخص ہو، اس باب میں وہ مقلد ہوگا، ممکن نہیں کہ تحقیق کا دعویٰ کر سکے۔ اس دعویٰ پر بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے جو ''مقدمہ فتح الباری'' میں مذکور ہے کہ عکرمہؒ جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام تھے، ان کو بہت سے اکابر دین نے کاذب اور خارجی وغیرہ کہا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ اور سعید ابن مسیّب اور عبداللہ ابن عباسؓ کے فرزند علی اور ابن سیرین اور یحیٰ اور ابن سعید انصاری اور امام مالک اور امام شافعی اور قاسم بن معین رضی اللہ عنہم سے اس قسم کے امور قادحہ اُن کی نسبت مروی ہیں۔ اسی وجہ سے امام مسلمؒ نے ان کی روایتیں صحیح میں داخل نہیں کی۔ اور امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور ابوثور اور یحیٰ بن معین اور ابوحاتم **رحمہم اللہ** نے اُن کی توثیق کی ہے اور اسی بناء پر امام بخاریؒ نے اُن کی بہت سی روایتوں کو صحیح میں داخل کیا ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنی ذاتی تحقیق اور چشم دید مشاہدوں

سے اُن کی توثیق کی ہو؛ کیونکہ وہ تابعی اور یہ نویں طبقہ والے، اس سے ظاہر ہے کہ امام احمدؒ وغیرہ اساتذہ کی تقلید سے انہوں نے اُن کی توثیق کی۔ اب غور کیجئے کہ اس تقلید کو کس درجہ کا رسوخ اور وثوق ہے کہ اسی کی بنیاد پر ان کی حدیثیں صحیح اور واجب العمل مانی جاتی ہیں۔

محدثین نے تقلیدِ شخصی کا طریقہ بتلایا

ہمیں اس میں کلام کرنے کا کوئی حق نہیں کہ انہوں نے ایسے شخص کی توثیق کی جس کی نسبت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا کہ وہ کذاب ہے اور خود ابن عباسؓ نے اُن کو خبیث کہا اور ابن مدینی کہتے ہیں کہ وہ خارجی تھے اور دراوردی نے کہا ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے تھے۔ غرضکہ ''مقدمہ فتح الباری'' میں یہ اور اس قسم کے اور اقوال اُن کی نسبت میں منقول ہیں، باوجود اس کے امام بخاریؒ نے اُن کی توثیق کی۔ ہر چند ہم اس توثیق میں کلام نہیں کر سکتے بلکہ امام بخاریؒ کی تقلید کر کے ان کی کل روایتوں کو اعلیٰ درجہ کی صحیح سمجھتے ہیں؛ لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ جس طرح اس باب میں ہم امام بخاریؒ کے مقلد ہیں وہ بھی اپنے اساتذہ کے مقلد ہیں۔ البتہ یہ ماننا پڑیگا کہ وہ جرح وتعدیل کے باب میں مجتہد ہیں، جس کی وجہ سے جتنے اقوال ان کی جرح وتعدیل کے باب میں وارد ہیں سب کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے ان کی توثیق کا حکم لگا دیا اور چونکہ فن رجال میں اُن کو ید طولیٰ تھا اس لئے اُن کے بعد کے محدثین نے ان کو اپنا امام بنالیا اور ان ہی کی تقلید سے عکرمہؒ کی کل روایات کو صحیح قرار دیا اور امام مسلم وغیرہ کے اقوال کا کچھ اعتبار نہ کیا۔ اسی کا نام تقلید شخصی ہے۔ اس تقلید نے محدثین کے دل پر ایسا اثر کر رکھا ہے کہ جس راوی کا نام بخاری میں ہو اگر کسی نے اس پر جرح بھی کی ہو تو وہ قابل التفات نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ابن حجرؒ نے ''مقدمہ فتح الباری'' میں لکھا ہے: ''و قد كان الشيخ ابو الحسن المقدسی

يقول فی الرجل الذی یخرج عنه فی الصحیح هذا جاز القنطرة یعنی بذلک انه لا یلتفت الی ما قیل فیه‘‘

یہ روایت بخاری شریف میں ہے: ’’عن ابی هریرة ، قال : قال رسول صلی الله علیه وسلم : ان الله قال من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب و ما تقرب الی عبدی بشیءٍ احب الی مما افترضت علیه ، و ما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبه ، فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به ، و بصره الذی یبصره به و یده التی یبطش بها ، و رجله التی یمشی بها ۔ و ان سألنی لأعطینه و لئن استعاذنی لاعیذنه ' و ماترددت عن شیٔ انا فاعله ترددی عن نفس المومن ، یکره الموت و انا اکره مساء ته‘‘

فتح الباری میں ابن حجر عسقلانیؒ نے ’’میزان الاعتدال‘‘ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث نہایت غریب ہے ۔ اگر جامع صحیح کی حدیث نہ ہوتی تو محدثین اس کو منکرات خالد بن مخلد سے ضرور کہتے ۔ انتہی

بہر چند اس حدیث شریف کا مضمون محدثین کے مذاق کے بالکل خلاف میں ہے ۔ اگر یہی حدیث کسی دوسری کتاب میں نہ ہوتی تو صاف کہد یتے کہ وہ موضوع ہے اور باوجود صحیح بخاری میں ہونے کے اتنا کہنے پر تو آمادہ تھے کہ منکرات خالد بن مخلد میں شمار کر کے اُس کو منکر قرار دیں ، مگر امام بخاریؒ کی رائے میں جب یہ بات آ گئی کہ حدیث صحیح ہے تو اپنے ذاتی خیالات کو ترک کر کے ان ہی کے تقلید سے سب نے اس حدیث کو صحیح کہد یا ۔ اسی کو تقلید شخصی کہتے ہیں ۔

اب دیکھئے کہ امام بخاریؒ کی کس قدر جلالت شان اس سے ظاہر ہے کہ باوجود یہ کہ جرح کرنے والوں نے اپنے ذاتی تجربوں اور چشم دیدہ واقعوں کے لحاظ سے کسی راوی میں جرح

کی، پھر وہ جارحین بھی معمولی لوگ نہیں بلکہ امام بخاریؒ ہی کے سلسلہ اساتذہ میں ہیں اور ان کی گواہی اس بات میں مثبت ہے اور اہل تعدیل کی گواہی نفی کی، اس وجہ سے کہ جارحین جس بات کا اثبات کررہے ہیں وہ اُس کی نفی کرتے ہیں، حالانکہ نفی کی گواہی شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ ''تدریب الراوی'' میں لکھا ہے کہ ''وقیل ان زاد المعدلون فی العدد المجرحین قدم التعدیل لان کثرتھم تقوی حالھم ، و توجب العمل بخبرھم ۔ و قلة المجرحین تضعف خبرھم ۔ قال الخطیب : وھذا خطأ و بعد ممن توھمه ؛ لان المعدلین و ان کثروا لم یخبروا عن عدم ما اخبر به الجارحون ، و لو اخبروا بذلک لکانت شھادتھم باطلة علی نفی''۔

مگر امام بخاریؒ کے اجتہاد اور رائے کے مقابلہ میں یہ سب امور نظر انداز کردیئے جاتے ہیں اور اُن کی رائے کے مطابق حدیث صحیح مان لی جاتی ہے؛ چنانچہ ''مقدمہ فتح الباری'' میں لکھا ہے: ''ینبغی لکل مصنف ان یعلم ان تخریج صاحب الصحیح لأیِّ راو کان مقتض لعدالته عنده ، و صحة ضبطه و عدم غفلته ' ولا سیما ما انضاف الی ذلک من اطباق جمھور الأئمة علی تسمیة الکتابین بالصحیحین و ھذا معنیٰ لم یحصل لغیر من خرج عنه فی الصحیح فھو بمثابة اطباق الجمھور علی تعدیل من ذکر فیھما ھذا اذا خرج له فی الاصول''

حاصل یہ ہے کہ جس راوی کا نام بخاری شریف کی روایتوں میں ہے اُس کا عدل اور ضابط ہونا جمہور ائمہ کے نزدیک مُسلَّم ہوگیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ بخاری شریف میں اسی (۸۰) راوی ایسے ہیں جس کو قُدَماءَ نے ضعیف اور غیر معتبر کہا ہے، جیسا کہ ''مقدمہ فتح الباری'' میں مذکور ہے۔ مگر محدثین نے امام بخاریؒ کو جب مجتہد اور اپنا

امام مان لیا ہے اس لئے اُن کی تقلید سے انہوں نے بھی اُن سب کو عدل ۔ ضابط اور موثق مان لیا ہے اور اُن قدماء کے قول کا کچھ اعتبار نہ کیا؛ جنہوں نے اُن کو غیر معتبر کہا تھا، باوجود یکہ وہ اکابر محدثین کے بلکہ خود امام بخاریؒ کے اساتذہ میں ہیں۔

ان اکابر محدثین کے طریقۂ عمل سے تقلید کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ جس باب میں تقلید کی جاتی ہے اُس باب میں کتنا ہی سرمایہ علم مقلد کے پاس ہو، وہ اُس سے اجتہاد کا کام نہ لے اور اپنے امام کے مخالف کسی عالم کا قول ہو اُس پر عمل تو کجا التفات بھی نہ کرے اور مقتضیٰ ،حق پسند طبائع کا بھی یہی ہے کہ جب کسی کو علم و فضل اور تقویٰ اور تدین میں اپنے سے فائق پاتے ہیں تو اُس کو اپنا مُقتَدَاء اور امام مان لیتے ہیں اور اُس کی تقلید کو باعث نجات سمجھتے ہیں۔ محدثین نے جو تقلید کا طریقہ بتلایا اُس سے ظاہر ہے کہ مقلد کو یہ ضرور نہیں کہ اپنے امام کے قول کا ماخذ اور دلیل بھی معلوم کرے، پھر جو ''عقد الجید'' میں لکھا ہے کہ ''قال الشافعی رحمه الله : اذا صح الحديث فهو مذهبی ، و اذا رأيتم كلامی يخالف الحديث فاعملوا بالحديث ، و اضربوا بكلامی الحائط ۔ و قال مالک : ما من احد الا و ماخوذ من كلامه و مردود عليه الا رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔ و قال ابو حنيفةؒ : لا ينبغی لمن لم يعرف دليلی ان يفتی بكلامی ۔ و قال احمد : لا تقلدنی و لا تقلدن مالكاً و لا غيره ، و خذ الاحكام من حيث اخذوا من الكتاب و السنة''۔

اس سے ان حضرات کا یہ مقصود نہیں کہ جو صحیح حدیث مل جائے اُس پر عمل کرلیا جائے۔ اگر یہی بات ہوتی تو ہر امام کے زمانہ میں صحیح حدیثیں بکثرت موجود تھیں، یہ کہہ دیتے کے بھائیو! تمہیں اختیار ہے جس حدیث پر چاہو عمل کرلو۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ سب کام چھوڑ کر عمر بھر اجتہاد کرتے رہے اور اُس کے طریقہ ایجاد کئے اور ہر مسئلہ میں تمام آیات و

احادیث واقوال سلف اور لغت وغیرہ پیش نظر رکھ کر اپنے اجتہاد سے ہر مسئلہ میں خاص طور پر حکم دیا کہ اس میں یہ کرنا چاہئے۔جس سے فقہ مدون ہوئی۔

ان اقوال سے اُن حضرات کا مقصود یہ تھا کہ ہر شخص علم میں تبحر حاصل کرے اور موقع اجتہاد پر مطلع ہوکر خود کتاب وسنت سے مسائل منضبط کرے۔پھر یہ بھی صاف کہہ دیا کہ جب تک کسی کو پانچ لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں فتویٰ دینے کا مجاز نہیں، جیسا کہ امام احمدؒ سے منقول ہے۔اب اگر مفتی یہ قول بھی معلوم ہو اور تقلید بھی نہ کی جائے تو عمل کرنے کی کیا صورت؟۔

اصل منشا ان اقوال کا یہ تھا کہ یہ حضرات کمال تدین اور خشیت الٰہی سے نہیں چاہتے تھے کہ مقتداء بنیں اور چونکہ علم کافی اور قوت اجتہادی موجود تھی، یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اُس کو ضائع کر کے مستوجب باز پرس ہوں۔اس لئے اجتہاد کر کے اپنا فرض منصبی ادا کر دیا اور اپنے ابرائے ذمہ کے لئے کہہ بھی دیا کہ تم خود جانچ لو، ہم جو کہتے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں! مگر جب محدثین نے ہر طرح سے جانچ لیا اور تبحر علمی اور اجتہاد کو قابل وثوق پایا تو خود اُن کو اپنا امام تصور کر لیا۔

تاریخ خلفاء میں لکھا ہے کہ جب مسئلہ خلافت میں گفتگو ہوئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عمرؓ اور ابوعبیدہ بن الجراح کا ہاتھ پکڑ کے کہا کہ خلافت قریش میں ہونی چاہئے اور میں اس بات پر راضی ہوں کہ مسلمان ان دونوں صاحبوں سے جس کو چاہیں خلیفہ مقرر کرلیں۔ عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اُس وقت اپنا قتل کیا جانا اس قدر نا گوار نہ تھا جیسے یہ بات نا گوار تھی کہ جس قوم میں ابوبکرؓ موجود ہوں میں اس کا امیر بنوں۔غرضکہ صدیق اکبرؓ نے ہر چند خلافت سے ابرائے ذمہ کیا، مگر کسی نے نہ مانا۔اسی طرح ائمہ رضی اللہ عنہم بھی امامت سے بری الذمہ ہونا چاہئے تھے؛ مگر محدثین نے نہ مانا۔اور اپنا مقتداء ان کو بنا ہی لیا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ’’عقد الجید‘‘ میں لکھا ہے: کسی معین شخص کی تقلید جمیع مسائل

میں جائز نہیں۔مگر محدثین کے عملدرآمد سے ثابت ہے کہ انہوں نے امام بخاریؒ کی تقلید جمیع مسائل میں کی ہے، یہاں تک کہ امام مسلمؒ شرط لقاء میں جو کلام کیا اُس میں بھی محققین امام بخاریؒ ہی کے طرفدار ہیں۔جس سے ظاہر ہے کہ وہ کل مسائل میں امام بخاریؒ کے مقلد ہیں۔اور یہ بات قابل انکار بھی نہیں،اس لئے کہ جب کسی کا تبحر علمی اور تدین مُسلَّم ہوجاتا ہے تو دل خود اُس کی تقلید پر مجبور اور منقاد ہوجاتا ہے اور اگر کوئی بات اُس نے اپنے اجتہاد سے بھی کہی تو اُس میں بھی حسن ظن ہوتا ہے کہ بغیر تحقیق کے اُس نے یہ نہ کہا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے جامع کے ابواب تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ''**و اما الذی روی عن مجاهد و قتادة وغیرهما من اهل العلم انهم فسروا القرآن فلیس الظن بهم انهم قالوا فی القرآن او فسروه بغیر علم او من قبل انفسهم** ''یعنی'' مجاہد اور قتادہ غیرہ اہل علم سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں وارد ہیں ان کی نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ بغیر علم کے یا اپنی طرف سے انہوں نے قرآن کی تفسیر کی ہے''۔

اب بتایئے کہ ان حضرات نے ہر ایک آیت کی تفسیر میں کب کہا کہ بواسطہ صحابہ یہ تفسیر ہمیں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہونچی ہے؟ مگر اُن کی جلالت شان اس اعتقاد پر مجبور کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی رائے سے یہ تفسیر نہیں کی۔اسی طرح امام کی جلالت شان مقلدوں کو اس اعتقاد پر مجبور کرتی ہے کہ امام نے کوئی دینی مسئلہ بغیر کسی اصل محکم کے اپنی رائے سے نہیں کہا۔

یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ مقلد کو اپنے امام پر حسن ظن ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہے تو اُس کی تقلید ہی کیوں کی؟ اگر ہے تو بعض اقوال کو ماننا اور بعضوں کو نہ ماننا ترجیح بلا مرجح ہے۔اور اگر کوئی حدیث مرجح ہے تو جب بھی حسن ظن نہ رہا اور کیا ضرورت تھی کہ ایسے جاہل کی تقلید کی؛ جس کی حدیث دانی پر وثوق اور بھروسہ نہیں۔غرضکہ اُس کا تقلید کرنا اس بات پر دلیل

ہے کہ وہ جانتا ہے کہ ہر ایک جزئی مسئلہ میں اپنے جمیع معلومات سے امام کے معلومات بڑے ہوئے ہیں۔

امام ترمذیؒ نے جامع کے ابواب الطلاق میں یہ روایت بیان کی ''**ولا طلاق لہ فیما لا یملک** ''یعنی جب تک کسی عورت کو نکاح نہ کیا ہو اُس کو طلاق دینے کا حق حاصل نہیں اور اس کے دلیل میں یہ واقعہ بیان کیا کہ ابن مبارک سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ کسی عورت کو میں اگر نکاح کروں تو اُس پر طلاق ہے اور اُس کے بعد اُس نے نکاح کیا۔تو جن فقہاء نے اس نکاح کو جائز رکھا ہے اُن کی تقلید یہ شخص کرسکتا ہے یا نہیں؟ فرمایا:'' **ان کان یریٰ ھذا القول حقا من قبل ان یبتلی بھذہ المسئلة فله ان یاخذ بقولھم فاما من لم یرض بھذا فلما ابتلی احب ان یاخذ بقولھم فلا اری له ذلک** ''یعنی اگر پہلے سے وہ مقلد تھا اور اس قول کو حق سمجھتا تھا اور اُس کے بعد اس قسم کے نکاح کا اتفاق ہوا تو اُس قول کے مطابق وہ عمل کرسکتا ہے، یعنی صحیح ہو جائیگا اور اگر پہلے سے اس قول کا وہ معتقد نہ تھا اور بعد اس قسم کا نکاح کیا تو میری رائے میں اب اس قول کی تقلید اُس کو درست نہیں۔

دیکھئے کہ مقلد کے ظن کا کس قدر اعتبار کیا گیا، باوجودیکہ حدیث صاف طور پر ثابت ہے ،مگر پہلے سے اگر وہ مقلد اُس امام کا ہو جس کے نزدیک یہ نکاح جائز نہیں تو مبتلی ہونے کے بعد اُس کو ترک تقلید کی اجازت نہیں دی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث نے تقلید کو کس قدر زور دیا۔

امام بخاری کے حالات

امام بخاریؒ کو محدثین نے جو اپنا امام بنالیا ہے اُس کا سبب صرف تبحر علمی نہیں بلکہ اُس میں اُن کے تقدس اور تدین کو بھی دخل تام ہے کہ کیونکہ کسی میں علم کے ساتھ تدین نہ ہو تو اہل تدین ہرگز اُس کو اپنا مقتداء نہیں بنا سکتے ۔اب ان کے تقویٰ اور تقدس کا حال سنیئے ۔

''مقدمہ فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ امام بخاریؒ کے والد مالدار شخص تھے، پچیس ہزار درہم انہوں نے کسی کو مضاربت کی غرض سے دیئے تھے، اُن کے انتقال کے بعد اُس نے وہ مال غصب کرنا چاہا، لوگوں نے امام بخاریؒ سے کہا کہ والی سے اس باب میں مدد لیجئے! آپ نے فرمایا کہ اگر میں والی سے کوئی درخواست کروں تو وہ مجھ سے کچھ خواہش کرے گا اور میں دین کو دنیا کی عوض ہرگز بیچنا نہیں چاہتا۔ اُس کے بعد اُس شخص نے اس بات پر صلح کی کہ ہر مہینے دس درہم دیا کروں گا، چنانچہ آپ اُسی پر راضی ہوگئے۔

اور فرماتے تھے کہ میں نے کبھی کوئی چیز اپنی ذات سے نہ بیچی نہ خریدی، ضرورت کے وقت کسی سے کہہ دیا جاتا ہے کسی نے اُس کی وجہ دریافت کی، فرمایا کہ اُس میں زیادتی اور نقصان اور تخلیط کا اندیشہ ہے۔

ایک بار آپ تیراندازی کررہے تھے؛ اتفاقاً پل کی ایک میخ آپ کے تیر سے پھٹ گئی، آپ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور نہایت غمگین اور متفکر ہوکر صاحب پل کو کہلا بھیجا کہ یہ خطا تو ہوگئی، مگر اجازت ہو تو دوسری میخ اُس کے معاوضہ میں لگا دی جاتی ہے یا اُس کی قیمت قبول کیجئے، اُس نے کہا کہ وہ میخ کیا چیز تھی؟ میرا تمام مال آپ پر فدا ہے۔ یہ سنکر آپ اتنا خوش ہوئے کہ چہرہ چمکنے لگا اور اُس کے شکریہ پر پانچ سو حدیثیں مسافروں کو پڑھایا اور تین سو درہم صدقہ دیئے۔

اور فرماتے تھے کہ میں نے دو دعائیں کیں، جن کے آثار فوراً ظاہر ہوگئے، اُس کے بعد میں دعا کرنے کو پسند نہیں کرتا، اس خیال سے کہ کہیں حسنات میں اُس کی وجہ سے کمی نہ ہو۔

اور فرماتے تھے کہ قیامت میں میرا کوئی خصم نہ ہوگا۔ کسی نے کہا: آپ نے جو تاریخ لکھی ہے اُس میں محدثین پر بہت سی جرحیں ہیں۔ فرمایا کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، صرف محدثین کے اقوال نقل کردیئے۔

ایک بار آپ بیمار ہوئے، جب قارورہ طبیب کو دکھلایا گیا تو اُس نے یہ تشخیص کی کہ روٹی بغیر سالن کے کھانے کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوئی ہے۔ آپ نے اُس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ فی الحقیقت چالیس سال سے میں نے کبھی سالن نہیں کھایا۔ طبیب نے سالن کھانے کی ضرورت بتلائی آپ نے قبول نہ کیا، مگر مشائخ علم کے اصرار پر فرمایا کہ خیر روٹی صرف شکر سے کھالیا کروں گا۔

آپ کی عادت تھی کہ جب رمضان شریف کی پہلی تاریخ ہوتی تو آپ کے اصحاب سب آپ کے یہاں جمع ہوجاتے اور آپ امامت کرتے۔ اور ہر رکعت میں بیس بیس آیتیں پڑھ کر قرآن ختم کرتے۔ پھر سحر کے وقت ثلث قرآن پڑھتے اور دن کو ہر روز ایک قرآن پڑھ کر افطار کے وقت ختم کرتے۔

امام بخاری موئے مبارک تبرکاً رکھا کرتے تھے

آپ کے پاس چند موئے مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے، جن کو تبرکاً اپنے ملبوس میں رکھتے تھے۔

یہ چند روایتیں ''مقدمہ فتح الباری'' سے نقل کی گئیں، ان کے سوا اور بھی اُس میں مذکور ہیں۔ ماحصل سب کا یہی ہے کہ امام بخاریؒ تقویٰ اور ورع اور کثرت عبادت اور خوش اعتقادی میں ممتاز اور یگانہ روزگار رہے۔

دیکھئے! موئے مبارک کی کس قدر وقعت امام بخاری صاحب کے دل میں تھی، جس کو ہمارے زمانہ کے بعض صاحب لوگ فضول سمجھتے ہیں۔

اور آپ کے تبحر علمی کی یہ کیفیت تھی کہ بڑے بڑے محدثین آپ کے روبرو حدیث بیان کرنے سے ڈرتے تھے، چنانچہ ''مقدمہ فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ محمد بن سلام کہتے ہیں کہ جب محمد ابن اسماعیل میرے پاس آتے تو مجھے خوف ہوتا کہ کہیں غلطی نہ ہوجائے، آخر اپنی

کتابیں پیش کر کے کہہ دیا کہ جہاں ان میں خطا ہو اس کو کاٹ دیجئے۔
حسین بن حریث کا قول ہے کہ میں نہیں جانتا کہ محمد بن اسمٰعیل کا مثل میں نے دیکھا ہے، گویا وہ حدیث ہی کیلئے پیدا کئے گئے تھے۔
اس کے سوا محدثین نے جو اُن کے علم حدیث کی تعریفیں کی ہیں اس مختصر میں اُن کی گنجائش نہیں۔
اب غور کیجئے! کیا ممکن ہے کہ اس تبحر علمی اور تقویٰ و تقدس کو دیکھ کر حق پسند محدث اُن کو اپنا مقتدا نہ مانتے؟ مقتضائے انصاف یہی تھا جو، اُن حضرات سے وقوع میں آیا کہ اُن کی تحقیق کے روبرو اپنے علم کو **کأن لم یکن** سمجھا اور ایسی مستحکم اُن کی تقلید کی کہ اُس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔ جس حدیث کو انہوں نے صحیح یا سقیم کہہ دیا اُس کو بلا دلیل تسلیم کر لیا۔
دیکھ لیجئے! ''مقدمہ فتح الباری'' سے ثابت ہے کہ بخاری شریف میں اسّی (۸۰) راوی ایسے ہیں کہ ان میں جہمی، قدری شعیی' خارجی اور مرجی وغیرہ ہیں اور امام بخاریؒ کے اقران بلکہ اساتذہ نے اُن کی نسبت ''**کذاب، یروی المناکیر، یسرق الحدیث' یقلب الاخبار، مدلس ضعیف، کثیر الوھم والخطأ، مضطرب الحدیث سیئی الحفظ**'' وغیرہ الفاظ کہے ہیں، جن سے حدیث قابل اعتبار نہیں رہ سکتی۔ مگر اُس تقلید شخصی کی برکت سے ایک ایسی کتاب مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی جس کو ''**اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری**'' کا اعزاز و امتیاز حاصل ہے۔ اور تمام اہلحدث بلکہ کل اہل سنت و جماعت قرناً بعد قرن اسی اعتقاد کو دار و مدار سنیت کا اقرار دیتے آئے اور کوئی مجاز نہیں کہ اس اجماع کو توڑ سکے۔
اب غور کیجئے کہ اس اجماع پر مجبور کرنے والی کون چیز تھی؟ وہی امام بخاریؒ کا صدق، تقدس، تبحر علمی وغیرہ تھا؛ جس سے خیال نہیں ہوسکتا کہ خلاف واقع انہوں نے کسی ضعیف

حدیث کو صحیح کہد یا، بلکہ کثرت قرائن اس بات پر گواہی دے رہے ہیں کہ اُن کو اس باب میں قوت اجتہادی حاصل تھی جس کو انہوں نے خالصاً لوجہ اللہ کام میں لا کر ایسی صحیح کتاب تصنیف کی کہ جس کے برکات اہل ایمان کے نزدیک **اظهر من الشمس** ہیں۔ چنانچہ ''مقدمہ فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ بخاری شریف جس سختی اور آفت کے وقت پڑھی جائے وہ دفع ہو جاتی ہے اور اگر جہاز میں وہ ساتھ رہے بفضلہ تعالیٰ وہ غرق سے محفوظ رہتا ہے۔ کیوں نہ ہو جب یقیناً کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہونا اُس کا مسلم ہو تو اُس یقین پر ضرور آثار مرتب ہوں گے۔

امام صاحب کے مطاعن پر بحث

فی الحقیقت یہ امام بخاریؒ کے صدق و تدین و تبحر علمی اور اجتہاد کا ثمرہ ہے جس سے تمام اہل سنت و جماعت نے نفع اٹھایا اور بحسب مدارج یقین اب بھی اٹھا سکتے ہیں۔ غرضکہ جس طرح امام بخاری کے تقویٰ، تقدس، تبحر علمی اور اجتہاد نے اُن کی اس تقلید پر مجبور کیا تھا، امام ابو حنیفہ کا بھی تبحر علمی، تفقہ، تقویٰ، ورع، صدق اور حسن اجتہاد نے اکابر محدثین کو اُن کی تقلید پر مجبور کیا۔ اُن کے علم اور تفقہ کا حال تو کسی قدر معلوم ہوا کہ اکابر محدثین نے نہایت وضاحت سے گواہی دی کہ وہ ''**اعلم الناس**'' اور ''**افقه الناس**'' تھے۔ اب ذرا انصاف سے دیکھا جائے کہ امام بخاریؒ کے جن صفات نے اُن کے ہمعصر محدثوں کو اُن کی تقلید پر مجبور کر کے قیامت تک کے علما کو مسئلہ **اصح الكتب بعد كتاب الله البخاری** میں اُن کا مقلد بنا دیا اور اسی تقلید نے اُن کے مقلدوں کو اس بات پر یقین دلایا کہ اُس میں جتنے حدیثیں ہیں واجب العمل ہیں۔ وہی صفات امام اعظمؒ میں بھی موجود ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ امام صاحب میں وہ صفات اُن سے بھی بڑے ہوئے تھے تو بے موقع نہ ہوگا، اس لئے کہ امام صاحب قرون ثلثہؓ کے لوگوں میں ہیں اور امام بخاری

صاحب کے اساتذہ اور اکابر محدثین نے خبر دی ہے کہ امام صاحب اپنے زمانہ میں ورع، تقویٰ، عبادت وغیرہ امور میں سب سے بڑے ہوئے تھے اور یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تابعین و تبع تابعین جو مبشر بالخیر ہیں اُن میں کس درجہ تقویٰ، تورع، اور خوف الٰہی وغیرہ امور تھے۔ جب امام صاحب اُس وقت کے لوگوں سے ان صفات میں بڑے ہوئے تھے تو نویں طبقہ والے امام بخاریؒ سے اُن میں بڑھے ہوئے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں! غرضکہ مقلد بنانے والے صفات حمیدہ امام صاحب میں اعلیٰ درجہ اتم پائے گئے، جس سے اُن کے زمانہ کے سر برآوردہ محدثین نے اُن کی تقلید کی اور وہی تقلید ہم تک بتواتر پہونچی تو کیا وجہ کہ امام صاحب کی تقلید تو حرام ہو جائے اور بخاری صاحب کی واجب؟ حالانکہ دونوں تقلیدیں ایک قسم کی ہیں کہ امام بخاری صاحب کے مقلد بخاری شریف کو واجب العمل قرار دیتے ہیں اور امام صاحب کے مقلد فقہ کو جو خلاصۂ احادیث ہے۔ چونکہ امام صاحب پر اقسام کے طعن کئے جاتے تھے جن سے مقصود فقہ کو بے اعتبار ثابت کرنا ہے، اس لئے یہاں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ ان مطاعن کا منشا کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سارے محدث امام کے دشمن ہو گئے تھے، مگر جب تک دشمنی کے اسباب معلوم نہ ہوں دشمنوں کی طعن و تشنیع پر کوئی رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ بغض للہ کے احکام جدا ہیں اور بغض نفسانی کے احکام جدا۔ اس لئے پہلے اسبابِ بغض معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسبابِ مخالفت بہت سے تھے، جن کو مجملاً ہم بیان کرتے ہیں۔

امام صاحب سے بغض کے اسباب

مک۔ ابن ہبیرہ نے (جو حاکم کوفہ تھا) جب خوارج سے صلح کی تو ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ سے (جو کوفہ میں سر برآوردہ محدث اور قاضی تھے) صلح نامہ لکھنے کو کہا اور مسودہ پیش

کرنے کے لئے ایک مہینے کی مہلت دی، مگر جو مسودہ پیش ہوا وہ پسند نہ آیا، کسی نے اس موقع پر امام صاحب کی لیاقت علمی کا ذکر کیا، حاکم نے آپ کو طلب کر کے وہ مسودہ دکھلایا، آپ نے اُس کو پڑھ کر فرمایا کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے متبرک ناموں کے جو کچھ اُس میں لکھا گیا ہے سب غلط ہے۔ ابن ہبیرہ نے کہا کہ کیا آپ صلحنامہ لکھو گے؟ کہا: اگر آپ کی خواہش ہو تو میں لکھ سکتا ہوں، کہا: میں تو یہی چاہتا ہوں، امام صاحب نے کہا: وہ کب ہونا چاہئے؟ کہا! اگر اسی وقت ہو تو بہتر ہے۔ فرمایا: اچھا کسی کاتب کو بلوائے! چنانچہ کاتب آیا اور امام صاحب عبارت کہتے گئے اور اسی وقت صلحنامہ ایسا لکھا گیا کہ سب مان گئے، جس سے امام صاحب کی فضیلت مُسلَّم ہوگئی۔ جب سَر دَرْ بار اُن حضرات کی ذلت اور امام صاحب کی عزت ہوئی تو اُسی وقت سے دشمنی کی بنیاد قائم ہوئی اور وقتاً فوقتاً وہ مستحکم ہوتی گئی۔

اس کے بعد ابن ہبیرہ نے امام صاحب سے درخواست کی کہ خدمت قضا قبول کریں، مگر آپ نے قبول نہیں کیا، پھر چاہا کہ مہر حکومت آپ کے پاس رہے اور جو حکم نافذ ہو وہ آپ کی اطلاع سے ہوا کرے۔ آپ نے اُس کو بھی نہیں قبول کیا۔ جب دیکھا کہ آپ مانتے ہی نہیں، تشدد شروع کیا اور پوری مخالفت ہوگئی، یہاں تک کہ قید کر دیا؛ چنانچہ کئی روز امام صاحب قید میں رہے اور ہر روز آپ کو کوڑے لگوائے جاتے تھے۔

امام موفقؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ ایک روز امام صاحب کسی ضرورت سے ابن ابی لیلیٰ کے یہاں گئے، جو شہر کے قاضی اور مشہور فقیہ تھے۔ انہوں نے گویا اپنی فقاہت امام صاحب کو بتلانے کی غرض سے اہل مقدمات کو طلب کیا، چنانچہ دو شخص پیش ہوئے۔ مدعی نے کہا: اس نے مجھے ابن زانیہ کہا ہے، اس کو سزا دی جائے! قاضی صاحب نے مدعیٰ علیہ سے جواب طلب کیا، امام صاحب نے کہا کہ دعویٰ تو ماں کو زانیہ کہنے کا ہے، اس لئے دعویٰ ماں کی طرف سے پیش ہونا چاہئے۔ البتہ یہ وکیل ہوسکتا ہے، کیا آپ کے نزدیک اس کی وکالت

ثابت ہوگئی ؟ کہا: نہیں۔ امام صاحب نے کہا: اس سے پوچھئے کہ اس کی ماں زندہ ہے یا مر گئی ؟ اگر زندہ ہے تو اس کو سوائے وکالت کے اور کوئی حق نہیں، اور اگر مر گئی ہے تو اُس کا حکم دوسرا ہے۔ قاضی صاحب نے مدعی سے پوچھا، اُس نے جواب دیا کہ وہ مر گئی اور اُس پر بینہ پیش کیا۔ قاضی صاحب نے مدعیٰ علیہ سے جواب دعویٰ لینا چاہا، امام صاحب نے فرمایا: پہلے مدعی سے یہ تو پوچھئے کہ اُس کی ماں کا اور بھی کوئی وارث ہے یا نہیں؟ اگر ہو تو حق مطالبہ سب کو ہوگا اور نہ ہو تو اُس کا حکم دوسرا ہے۔ قاضی صاحب نے دریافت کیا، اُس نے کہا: کوئی دوسرا وارث نہیں اور اُس پر بینہ قائم کیا۔ قاضی صاحب نے چاہا کہ اب مدعیٰ علیہ سے جواب لیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ مدعی سے یہ بھی تو پوچھئے کہ اُس کی ماں حرہ تھی یا امہ؟ قاضی صاحب نے پوچھا، اُس نے کہا: حرہ تھی اور اُس پر بینہ قائم کیا۔ اس کے بعد چاہا کہ اب مدعیٰ علیہ سے جواب لیں۔ امام صاحب نے فرمایا: مدعی سے یہ بھی تو پوچھئے کہ وہ مسلمہ تھی یا ذمیہ؟ قاضی صاحب نے پوچھا، اُس نے کہا: مسلمہ اور فلاں قبیلہ کی لڑکی تھی اور اُس پر بینہ قائم کیا۔ امام صاحب نے فرمایا: اب آپ مدعیٰ علیہ سے جواب لیجئے اور مقدمہ دریافت کیجئے ؟

غور کیجئے ! جب سَرِ اجلاس اہل مقدمات کے روبرو بات بات میں قاضی صاحب بے علم بنائے گئے تو اُس وقت اُن کا کیا حال ہوا ہوگا ؟ کیا ممکن ہے کہ کسی نام آور عالم اور قاضی کو کوئی عالم سر کچہری، عین اجلاس کے وقت علمی مباحث میں ذلیل کرے اور اُس کا کچھ اثر دل پر نہ ہو؟ یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مقتدر حکام جب کسی کے دشمن ہو جاتے ہیں تو شہر کے اکثر زوردار لوگ اُن کی خوشنودی کے خیال سے خود بھی مخالفت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اُس پر آمادہ کیا کرتے ہیں۔ چونکہ خود حاکم اور قاضی شہر جس کو حکومت کے کل اختیارات حاصل تھے، امام صاحب کے دشمن تھے، اس لئے لوگوں نے اُن کی خوشنودی کی غرض سے

آپ کی بدنامی کی ایسی ایسی تدبیریں کیں کہ کوئی دیانت دار نہیں کرسکتا۔ یہاں تک تو کیا کہ دھوکہ دے کر آپ کو کسی زانیہ کے مکان پر لے گئے اور زنا کے الزام میں قاضی صاحب کے یہاں مقدمہ دائر کر دیا، مگر تائید الٰہی تھی کہ وہ عورت خود تائب ہوگئی اور مقدمہ خارج ہوا۔ یہ واقعہ اور اس کے سوا بہت سے واقعات امام موفق اور کردریؒ نے لکھے ہیں۔

اب قیاس کیجئے کہ جن لوگوں نے یہاں نوبت پہونچائی تو اور کیا کچھ الزامات نہ لگائے ہوں گے؟

ہر چند حکام کو خوش کرنے کی غرض سے بہت کچھ نکتہ چینیاں کی گئیں۔ اقسام کے الزام لگائے گئے، مگر جو حق پسند، اہل انصاف علماء تھے وہ حق بات کہنے سے کب باز رہ سکتے تھے۔ صدہا اکابر محدثین نے جن کا کلام جمیع اہل سنت و جماعت کے نزدیک مستند ہے برغم مخالفین امام صاحب کی اقسام کی تعریفیں کیں اور صاف صاف کہدیا کہ ابو حنیفہؒ کا مثل علم و فقہ و ورع وغیرہ فضائل میں دنیا میں نہیں۔ اگر روئے زمین کے علماء کا علم اُن کے علم کے ساتھ وزن کیا جائے تو اُن ہی کا علم زیادہ ہوگا۔ اُن کے علم سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ تابعین اور تبع تابعین میں اُن کا سا بصیرت والا، نکتہ رس دیکھا نہیں گیا۔ اگر اکابر تابعین بھی ان کے زمانہ میں ہوتے تو اُن کے طرف محتاج ہوتے۔ کوئی فتویٰ، انہوں نے بغیر اصل محکم نہیں دیا۔ کسی بات میں اُن کی مخالفت درست نہیں، وہ فقہ میں مُوَفَّق اور مُؤَیَّدْ من اللہ ہیں۔ اُن کے حلقہ میں بیٹھنا اور ان کی کتابیں دیکھنی باعث حصول علم ہے۔ جو شخص تمامی دنیا کے موجودہ علماء سے اُن کو علم میں زیادہ نہ سمجھے اُس کے تدین میں شک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تعریفیں جو، ان حضرات نے کیں، امام صاحب کے حق میں وہ بھی وبال جان ہوئیں، کیونکہ جب یہ تعریفیں شہرۂ آفاق ہوئیں طالبین حق جوق جوق امام صاحب کے حلقہ میں آکر شریک ہونے لگے، جس سے مولویوں کی کساد بازاری ہوئی۔

م ک ۔ یحیٰ ابن آدم کہا کرتے تھے کہ کوفہ فقہ سے بھرا ہوا تھا، اُس میں فقہاء ابن شبرمہ بن ابی لیلیٰ، حسن بن صالح، شریک اور اُن کے امثال بہت سے تھے، مگر ابوحنیفہ کے اقوال سے اُن کی کساد بازاری ہوئی اور ابوحنیفہ کے علم کی شہرت تمام شہروں میں ہوئی اور خلفاء اور حکام نے اُن کی فقہ کو جاری کیا اور امر اُسی پر قرار پایا۔

اب غور کیا جائے کہ اس قدر نیک نامی امام صاحب کی جب ہوئی، جس کی وجہ سے وہ مرجع آفاق ہوئے اور دوسرے مولوی کس مپرس حالت میں ہوگئے تو رشک بھری طبیعتوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟ آخر انسان اقتضائے طبع سے کچھ نہ کچھ متاثر ہو ہی جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جتنے مولوی اُس زمانہ میں تھے سب اصحاب نفوس قدسیہ ہوں، جن کو مطلقاً حسد نہ ہو، البتہ ایسے بھی تھے کہ آیۂ شریفہ ''**ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء**'' کو پیش نظر رکھ کر بلاکم و کاست امام صاحب کے فضائل بیان کرتے، بلکہ حلقہ میں اکثر شریک ہوتے تھے، مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ عموماً ایسے موقع میں حسد ضرور ہوتا ہے، چنانچہ خود بعض اہل انصاف محدثین نے صاف کہہ دیا کہ ہم لوگ ابوحنیفہ پر حسد کرتے ہیں، جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے جو اوپر لکھی گئی کہ جس وقت کوئی مشکل مسئلہ سفیان ثوریؒ کے پاس پیش ہوتا، تو فرماتے کہ اس کا جواب وہی خوب جانتے ہیں جن پر ہم لوگ حسد کرتے ہیں یعنی ابوحنیفہؒ۔

م ک ۔ یحیٰ بن معین کے روبرو اگر ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص ابوحنیفہ میں کلام کرتا ہے، تو وہ یہ اشعار پڑھتے:

حسدوا الفتی اذ لم ینالوا سعیه　　فالقوم اعداء له و خصوم

کضرائر الحسناء قلن لوجهها　　حسدا و بغیاً انه لدمیم

یعنی ''لوگ اُن کے دشمن ہوگئے، اس وجہ سے کہ اُن کی سی سعی اُن سے نہ ہوسکی۔ اُن کی

مثال ایسی ہے جیسے خوبصورت عورت کی سوکنیں اُس کو بدصورت کہتے ہیں''
مطلب یہ کہ جتنے لوگ امام صاحب پر کسی قسم کا الزام لگاتے ہیں وہ سب مفتری اور جھوٹے ہیں۔ اُن کی مثال ایسی ہے کہ دشمنی سے خوبصورت کو بدصورت کہا جاتا ہے۔

ک۔ ابوداؤدؒ کا قول ہے کہ ابوحنیفہؒ میں کلام کرنے والا، یا حاسد ہے یا ایسا شخص ہے کہ علم کی قدر نہیں جانتا۔

م ک۔ سلمہ بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے سفیان اور اوزاعیؒ کے اور ابوحنیفہؒ کے درمیان میں منافرت تھی اور اُن دونوں نے پوری کوشش کی کہ ابوحنیفہؒ کی منقصت اور کسر شان کریں، مگر اُن کی کچھ نہ چلی۔
اور ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ اور شریک اور حسن بن صالح ابوحنیفہؒ پر حسد کرتے تھے، مگر وہ بھی اُن کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکے، تو اب ان لونڈوں سے اُن کا کیا ضرر ہوگا، جو خود اپنی بات آپ نہیں سمجھ سکتے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ ابوحنیفہؒ کا معاملہ ہر روز روبترقی ہے۔
اس سے ظاہر ہے کہ امام صاحب پر حسد کی ایک عام شورش تھی کہ بڑوں سے لیکر چھوٹوں تک اسی دھندے میں لگے ہوئے تھے کہ اُن کے کمالات پر کسی قسم کا دھبہ لگائیں، مگر کسی سے نہ ہوسکا اور وہ کمالات روزافزوں ترقی کرتے رہے یعنی فقہ نیک نامی کے ساتھ شائع ہوتی گئی۔
یہ بات پیشتر لکھی گئی کہ یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ شریک ابوحنیفہؒ کے اقوال کو پسند کرتے اور سنا بھی کرتے، مگر حسد کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے اور اعمشؒ کا قول بھی مذکور ہوا کہ امام صاحب کے مسائل کو نہ سمجھ کر لوگ دشمن اور حاسد ہو گئے۔ اور عبید ابن اسحٰق کا قول بھی مذکور ہوا کہ ابوحنیفہ پر تہمت لگانے والا حاسد یا شریر ہے۔ اور یحییٰ بن آدم کا قول بھی مذکور ہوا کہ امام صاحب کے حاسد بکثرت تھے، باوجود اس کے فقہ جو آفاق میں مشہور ہوئی اُس کا سبب اُن کا خلوص تھا۔

''تبییض الصحیفہ'' وغیرہ میں لکھا ہے کہ ابن داؤد کہتے ہیں کہ جو شخص ابو حنیفہؒ میں کچھ کلام کرے وہ حاسد یا جاہل ہے کہ علماء کی قدر نہیں جانتا۔

جس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ جن محدثین نے امام صاحب میں کلام کیا وہ سب حاسد تھے۔ اس قسم کی تصریحات اور بھی اکابردین سے مروی ہیں۔

اب اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ جب اکابر محدثین نے گواہی دی ہے کہ امام صاحب کے حاسد بکثرت تھے، اور یہ قاعدہ بتلا دیا کہ جس نے اُن میں کلام کیا وہ حاسد یا شریر یا جاہل تھا۔ تو اب اہلحدیث کو کیونکر شایاں ہوگا کہ حاسدوں کی تقلید کر کے جھوٹے الزام انہوں نے شرارت یا جہالت سے امام صاحب کی نسبت لگائے ہیں، بیان کریں۔

م ک ۔ ابوالخطاب جرجانی کہتے ہیں کہ میں ایک بار امام صاحب کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان شخص آ کر ایک مسئلہ پوچھا، آپ نے اُس کا جواب دیا، اس نے کہا کہ تم نے خطا کی۔ پھر دوسرا مسئلہ پوچھا، آپ نے اُس کا بھی یہی جواب دیا، پھر اس نے وہی کہا کہ تم نے خطا کی۔ میں نے اہل حلقہ سے کہا: سبحان اللہ! تم لوگ اپنے استاذ کی کچھ بھی تعظیم نہیں کرتے؟ لونڈے آ کر دو دو باران کا تخطیہ کرتے ہیں اور تم لوگ کچھ نہیں کہتے! امام صاحب نے کہا: اُن کا قصور نہیں، میں نے اُن کو تاکید کی ہے کہ میرے معاملہ میں کسی سے کچھ نہ کہیں۔

اس کے سوا اور بہت سے واقعات لکھے ہیں کہ لوگ مناظرہ کو آتے اور سخت سست کہہ جاتے، جن سے ظاہر ہے کہ طلبہ استادوں کی طرف سے مامور ہوا کرتے تھے، ورنہ جن کے مقابلہ میں اکابر شیوخ سر جھکاتے تھے طلبہ کی حیثیت ہی کیا کہ ایسی گفتگو کر سکیں۔

ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ حسد ایسی بری بلا ہے کہ آدمی کو اندھا کر دیتی ہے، جس سے کمال، نقصان کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ حاسد، اوروں

کو اندھا بنانے کی فکر میں ہوتا ہے کہ کمال کو نقصان کی صورت میں مشاہدہ کرائے۔ بہر حال یہ ایسی بلا ہے کہ اس سے پناہ مانگنے کی ضرورت ہے، جیسا کہ آیۂ شریفہ ''و من شر حاسد اذا حسد'' سے مستفاد ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ نے اُس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جمیع شرور کا مبدأ 'حسد ہے' آسمان و زمین میں جو پہلا گناہ ہوا، حسد ہی تھا۔ وہاں ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کیا تھا، یہاں قابیل نے ہابیل پر''۔

پھر امام صاحب پر اگر حسد کیا گیا تو کوئی نئی بات نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اہل کمال کا محسود ہونا ایک امر لازمی ہے، جیسا کہ کہا گیا:

و ازداد لی حسدا من لست احسده　　ان الفضیلة لا تخلو عن الحسد

امام بخاری پر محدثین کا طعن اور ان کی بدنامی

اس وجہ سے امام صاحب کا محسود ہونا ضروری تھا، چنانچہ امام بخاریؒ پر بھی محدثین نے حسد کیا تھا، جیسا کہ تاج الدین سبکیؒ نے ''طبقات شافعیہ'' میں لکھا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ امام بخاریؒ جب نیشاپور گئے اور اس وجہ سے کہ پیشتر سے آپ کی شہرت بلاد اسلامیہ میں ہو چکی تھی' طالبین حدیث جوق جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور محمد ابن یحییٰ ذہلیؒ کا مجمع ٹوٹا تو انہوں نے اُن کی بدنامی کی یہ تدبیر نکالی کہ تلفظ بالقرآن کا مسئلہ چھیڑ دیا جائے، اس وجہ سے کہ مسئلہ خلق قرآن اُس زمانہ میں مہتمم بالشان تھا، جس پر امام احمد ابن حنبلؒ صدمے اٹھا چکے تھے اور محدثین اُس میں نہایت احتیاط کرتے تھے کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا ایہام بھی نہ ہونے پائے۔ ایک روز جب طلبہ اور علماء سے مجلس مالا مال تھی، ایک شخص کھڑا ہو گیا اور پوچھا: حضرت! اس مسئلہ میں آپ کیا فرماتے ہیں کہ قرآن کا تلفظ

جو کہا جاتا ہے، وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ آپ نے کچھ جواب نہ دیا، اُس نے پھر دوبارہ پوچھا، پھر اعراض کیا، جب تیسری بار پوچھا تو فرمایا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے، اور بندہ کے جتنے افعال ہیں سب مخلوق ہیں اور امتحان بدعت ہے۔ یہ سنتے ہی مجلس میں شور ہوگیا اور سب چلے گئے اور ادھر ذہلیؒ نے اعلان دیدیا کہ جو شخص بخاری کے پاس جائے وہ ہمارے یہاں نہ آئے، کیونکہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے وہ تو کافر ہے اور جو یہ کہے کہ تلفظ بالقرآن مخلوق ہے وہ بدعتی ہے اور بدعتی کی صحبت میں بیٹھنا اور اُس سے بات کرنا درست نہیں، اور کہا کہ علمائے بغداد نے ہمیں لکھا ہے کہ بخاری تلفظ بالقرآن کے باب میں کلام کرتے ہیں، اُن کو بارہا ہم نے اُس سے منع کیا، مگر وہ مانتے نہیں۔ چاہئے کہ کوئی اُن کی صحبت میں نہ جائے۔ ہر چند امام بخاریؒ نے کہا کہ میں بندوں کی حرکات، اصوات، اکتسابات اور کتابت کو مخلوق کہتا ہوں۔ اور قرآن جو پڑھا جاتا ہے، اور لکھا جاتا ہے اور دلوں میں جو محفوظ ہے اُس کو مخلوق نہیں کہتا۔ مگر کسی نے نہ مانا اور ذہلی ہی کی چل گئی۔

اب ذہلیؒ کو دیکھئے کہ وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھے، ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ذہبیؒ نے نویں طبقے کی ابتدا انہی سے کی، جس میں امام بخاریؒ بھی ہیں۔ اور اُن کے نام پر لکھا ہے:
الامام، شیخ الاسلام ''حافظ الذھلی'' اور محمد ابن سہل کا قول نقل کیا ہے کہ ہم ایک روز امام احمدؒ کے یہاں بیٹھے تھے کہ محمد ابن یحییٰ الذہلی آئے، امام احمدؒ اُن کے لئے کھڑے ہوگئے، جس سے لوگوں کو تعجب ہوا۔ پھر امام نے اپنے فرزندوں اور شاگردوں سے کہا کہ اُن کے یہاں جاؤ اور اُن سے حدیثیں لکھ لو۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ ذہلی اپنے زمانہ کے امام ہیں۔ ابوبکر کا قول ہے کہ وہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ انتہی۔

اب دیکھئے کہ امام بخاریؒ مسافرانہ وارد نیشاپور ہوئے تھے، مگر چند روز کی کساد بازاری کے خیال سے، ایسے جلیل القدر بزرگوار پر کس بلا کا اثر کیا۔ امام صاحب تو کوفہ ہی کے مقیم

تھے، اُن کی وجہ سے جب علمائے کوفہ کی ہمیشہ کے لئے کساد بازاری ہوگی تو اُس کا اُن پر کس قدر اثر ہوا ہوگا؟ اور کیسی کیسی تدبیریں امام صاحب کی بدنامی کے لئے سوچی گئی ہوں گی؟ غرض کہ حسد ایک بلائے بے درماں ہے۔

کل العداوۃ قد یرجیٰ سلامتھا الاعداوۃ من عاداک عن حسد

یہ بات واضح رہے کہ امام صاحب کے بعد والے محدثین مثلاً امام شافعیؒ امام احمدؒ امام بخاری وغیرہ رحمہم اللہ کو ہم امام صاحب کے حاسدوں میں شریک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ بظاہر کوئی منشا حسد کا اُس وقت قائم نہ تھا۔ پھر وہ حضرات فقہ حنفیہ کے جو قائل نہ ہوئے، اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی توجہ، ظاہر حدیث کی طرف مبذول تھی اور امام صاحب کے اجتہاد میں غوامض علمیہ ہوا کرتے تھے، جن تک ان حضرات کی رسائی نہ ہوئی یا اُن کو ضروری نہ سمجھا۔

امیر المومنین فی الحدیث یعنی عبداللہ بن مبارکؒ نے خود اپنا حال بیان کیا کہ کئی روز تک امام صاحب کی تقریر کچھ سمجھ میں نہ آئی اور تبرکاً شریک حلقہ رہا کرتے تھے اور اکابر شیوخ سے مروی ہے کہ بڑے بڑے محدثین امام صاحب کی تقریر کے تہہ تک نہیں پہونچ سکتے تھے، جس کی وجہ سے بمصداق ''**الانسان عدو ما جھل**'' دشمن ہو گئے۔

''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ اعمشؒ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا، فرمایا: اس کا جواب نعمان بن ثابت خوب جانتے ہیں، اس پر یحییٰ بن آدم نے پوچھا: آپ اُن لوگوں کے باب میں کیا فرماتے ہیں جو ابو حنیفہؒ کی برائیاں بیان کرتے ہیں؟ فرمایا: بات یہ ہے کہ جو مسائل انہوں نے بیان کئے کچھ تو لوگوں نے اُن کو سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ اس لئے اُن کے دشمن ہو گئے اور حسد کرنے لگے۔

''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ شعبہؒ ابو حنیفہؒ پر نہایت ترحم کیا کرتے اور قسم کھا کر کہتے

تھے کہ اُن کا فہم نہایت درست اور حافظہ نہایت قوی تھا۔ جن مسائل میں لوگوں نے اُن کی تشنیع کی ہے وہ ایسے مسائل تھے کہ اُن کی سمجھ وہاں تک نہ پہونچ سکی اور ابوحنیفہؒ اُن کو خوب جانتے تھے۔ پھر فرمایا: خدا کی قسم! خدائے تعالیٰ کے روبرو وہ اُس کا نتیجہ دیکھیں گے۔

غرض کہ کمی فہم، سبب عداوت ہوئی۔

''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ ابوسلیمان کہتے تھے کہ ابوحنیفہ عجب شخص تھے، اُن کے کلام سے وہی شخص منہ پھیرتا ہے جو اُس کے سمجھنے پر قادر نہیں۔

مطلب یہ کہ ناسمجھی سے لوگوں نے فقہ سے اعراض کیا۔

موفقؒ نے ابن مبارکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص ابوحنیفہؒ کو برائی سے ذکر کرتا ہے اُس کا سبب تنگی علم ہے۔

اس وجہ سے کہ علم میں وسعت ہو تو معلوم ہو کہ کونسا مسئلہ کس آیت و حدیث کے مطابق ہے اور جب کمی علمی سے وہ معلوم نہیں تو جس طرح جاہلوں کی عادت ہوتی ہے؛ دشمنی ظاہر کرتے ہیں اور برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔

''الانتصار'' میں لکھا ہے کہ خارجہ بن مصعب کہتے ہیں کہ جو شخص ابوحنیفہ کی بدگوئی کرتا ہے وہ ناقص العقل ہے۔

مطلب یہ کہ نقصان عقل کی وجہ سے جب مطلب سمجھ میں نہ آیا، دشمن ہو گئے۔ اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں جن سے ظاہر ہے کہ مطلب اور مقصود امام صاحب کا نہ سمجھ کر بھی بعض لوگ دشمن ہو گئے۔ یہ بھی ایک مستقل سبب ہے، اس میں حسد کو چنداں دخل نہیں، بلکہ اس کا منشا اکثر حرارت طبع ہوتا ہے، کیونکہ جب انہوں نے دیکھا کہ بہت سارے مسائل صراحۃً احادیث کے مخالف ہیں اور طبیعت میں یہ صلاحیت تو تھی ہی نہیں کہ غوامض علمیہ اور اجتہاد کے دقائق پر مطلع ہوں، جس سے وجہ مخالفت معلوم ہو سکے، اس لئے دشمن ہو گئے۔

ابن مبارکؒ کی سی عقل ہر کسی کو کہاں نصیب کہ صبر وتحمل سے کام لیکر دیکھتے کہ آخر اس مخالفت کا سبب کیا ہے، اگر دقائق علمیہ ہیں تو اُن کو معلوم کرنے کا کوئی طریقہ بھی ہے یا نہیں۔مغلوب الغیظ ہر زمانہ میں ہوتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی طبیعت میں جب اشتعال ہوتا ہے تو اُن کی عقل ہی ٹھکانے نہیں رہتی اور ایک ایسی حالت پیدا ہوتی ہے جو مشابہ جنون ہوتی ہے، ایسی حالت میں کسی کا فضل وکمال پیش نظر رہتا ہے نہ اپنے ناشائستہ حرکات کا مآل۔غرضکہ کج فہمی اور نافہمی ہی بعض لوگوں کی مخالفت اور دشمنی کا سبب ہوئی۔اس کے سوا اور مختلف اسباب بھی تھے، جن کو خود امام صاحب نے بیان فرمایا ہے۔

امام موفقؒ اور سبط ابن جوزیؒ وغیرہ نے بکیر بن معروف سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ کسی نے میرے ساتھ برائی کی تو میں نے کبھی اُس کا بدلہ نہیں کیا اور نہ کبھی برائی سے کسی کا ذکر کیا، باوجود اس کے مجھ سے بغض رکھتے ہیں۔

تم جانتے ہو کہ اہل مکہ کیوں ہم سے بغض رکھتے ہیں؟ اُس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں جو ناسخ آیتیں نازل ہوئی، ہم اُن سے منسوخ آیتوں کو رد کر دیتے ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں تھیں۔

اور جانتے ہو کہ اہل مدینہ کیوں ہم سے بغض رکھتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک رعاف اور حجامت سے وضوٹوٹا ہے، جس کے وہ قائل نہیں، اور ہم اُن کی نماز کے فساد کا حکم کرتے ہیں۔

جانتے ہو کہ اہل بصرہ کیوں ہم سے بغض رکھتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ہم مسئلہ قدر میں اُن کے مخالف ہیں، جو اُن کے یہاں ایک بڑا مہتم بالشان مسئلہ ہے۔

اور جانتے ہو کہ اہل شام کیوں ہم سے بغض رکھتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ہم کو علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ایک خصوصیت ہے، اگر ہم اُس وقت موجود ہوتے تو علی کرم اللہ وجہ کے لشکر

میں رہ کر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کرتے۔

اور جانتے ہو کہ اہل حدیث کیوں ہم سے بغض رکھتے ہیں؟ اس وجہ سے کہ ہم اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست رکھتے ہیں اور علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت ثابت کرتے ہیں اور وہ نہیں کرتے۔ انتہی۔

الحاصل مختلف اسباب سے امام صاحب کی دشمنی، محدثین کے دلوں میں متمکن ہوئی۔ جس کی وجہ سے اقسام کے الزام آپ پر لگائے جاتے ہیں اور ہر طرف شہرہ تھا کہ وہ صاحب الرائے تھے۔ احادیث کے مخالف اپنے دل سے مسئلے تراشتے ہیں، جس سے اہل تدین کو دلی نفرت آپ سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر اگر کوئی شخص آپ کے حلقہ میں شریک ہوتا تو وہ ضعیف بنایا جاتا، گویا محدثین کے دفتر سے اس کا نام خارج کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ''انتصار'' میں سبط ابن جوزیؒ نے محمد ابن خزیمہ کا قول نقل کیا ہے کہ حسن بن عمارہ، ابوحنیفہ کی مدح کیا کرتے اور اُن کی طرف مائل تھے۔ اس وجہ سے محدثین نے اُن کو ضعیف قرار دیا اور ''میزان الاعتدال'' وغیرہ کتب رجال سے واضح ہے کہ امام صاحب کی طرفداری اور شاگردی کے الزام میں کتنے محدث ساقط الاعتبار کر دیئے گئے۔ پھر یہاں تک نوبت پہونچی کہ کیسے ہی جلیل القدر محدث کیوں نہ ہو، اگر امام صاحب کا نام کسی روایت میں لے لیتے، تو ادنیٰ ادنیٰ طلبہ صاف کہد یتے کہ اُن کی روایت سے ہمیں معاف رکھئے، جس کا حال انشاءاللہ تعالیٰ ابھی معلوم ہوگا۔

غرضکہ محدثین نے امام صاحب کو ایسا بنا رکھا تھا جیسے ہمارے ملک میں جان اللہ شاہ۔ فقیروں میں ایک بہت بڑا گروہ ہے، جس میں تقریباً کل فقرا شامل ہیں، وہ باب اللہ شاہی کہلاتے ہیں۔ اُن کے مشرب میں یہ بات داخل ہے کہ جو فقیر، جان اللہ شاہ کی سرحد میں جائے وہ گروہ فقرا سے خارج ہے۔ اُن کے زمانہ سے آج تک یہ بات چلی آ رہی ہے کہ

اگر کوئی فقیر اُن کے مزار کے سرحد میں جائے (جو جالنہ ضلع اورنگ آباد میں واقع ہے) تو وہ زمرۂ فقرا سے خارج ہے۔ چنانچہ یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک تازہ وارد ہندوستانی فقیر پانی پینے کے لئے اُس نہر پر گیا جو اُن کے گنبد کے نیچے بہتی ہے اور پانی کی طرف ہاتھ دراز کیا تھا کہ ایک فقیر نے پکار کر کہا کہ ارے! یہ کیا کرتا ہے؟ یہ تو جان اللہ شاہ کی نہر ہے! یہ سنتے ہی اُس نے فوراً اپنی انگلی کاٹ ڈالی جو پانی سے تر ہوئی تھی۔

اسی طرح امام صاحب کے حلقہ میں جانا تو در کنار، روایت میں اُن کا نام سننا بھی ناگوار تھا۔ کیسے ہی جلیل القدر محدث اُن کی روایت بیان کریں، قابل اعتبار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور اُس کی کچھ پروانہ تھی کہ اس میں اپنے استاذ کی بے اعتباری ہوئی جاتی ہے، کیونکہ جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ ابوحنیفہ بے علم، غیر متدین اور مخرب دین ہیں اور اپنے استاذ نے ایسے شخص کو استاذ بنایا، اور اُن کی مدح کی تو یقیناً معلوم ہوا کہ اُن تمام صفات پر وہ بھی راضی ہیں جس سے اُن کا تدین باقی نہ رہا۔ پھر ایسے شخص سے دوسری روایتوں کا لینا کیونکر جائز ہوگا۔ انہی اسباب سے ابن مبارکؒ نے ایسے لوگوں کو سفہا کہا اور فرمایا کہ اگر ان سفہا کی باتوں کو مان کر میں ابوحنیفہ کی خدمت میں نہ جاتا تو نعمت عظمیٰ سے محروم رہ جاتا اور حلال و حرام سے واقف نہ ہوتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ طالبین حق کو امام صاحب کے یہاں حاضر ہونے سے روکتے تھے۔ مگر محققین اُن کی سماعی باتوں پر قناعت نہ کرکے بالمشافہ تحقیق کرلیا کرتے۔

بعدِ اطلاع محدثین کا رجوع کرنا امام صاحب کی بدگمانی سے

م ص ک ۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ امام صاحب اور امام باقرؒ سے مدینہ طیبہ میں ملاقات ہوئی، امام باقرؒ نے کمال غضب سے امام صاحب سے کہا: کیا تم ہی ہو کہ ہمارے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی مخالفت قیاس سے کرتے ہو؟ امام صاحب

نے کہا: **معاذ اللہ** ۔ آپ ذرا تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں، آپ کی حرمت بھی ہم پر ایسی ہے جیسے آپ کے جدامجد صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت صحابہ پر تھی۔ امام باقرؒ بیٹھ گئے اور امام صاحب بھی روبرو بیٹھ گئے اور عرض کی کہ میں آپ سے تین مسئلے پوچھتا ہوں، اُن کا جواب ارشاد ہو! ایک یہ کہ مرد ضعیف ہے یا عورت؟ فرمایا: عورت۔ امام صاحب نے کہا: عورت کا حصہ کتنا ہے اور مرد کا کتنا؟ فرمایا: عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ عرض کی: اگر میں قیاس سے مسئلے بناتا تو اُس کے خلاف میں حکم دیتا، عورت کا حصہ دونا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ: نماز افضل ہے یا روزہ؟ فرمایا: نماز۔ کہا: اگر میں قیاس سے حکم دیتا تو یہ حکم دیتا کہ حائضہ نماز کی قضا کرے اور روزہ کی قضا نہ کرے۔

تیسرا مسئلہ یہ کہ پیشاب زیادہ نجس ہے یا منی؟ فرمایا: پیشاب۔ کہا: اگر میں قیاس جاری کرتا تو پیشاب کو موجب غسل قرار دیتا۔ اس کے بعد عرض کی: میں پناہ مانگتا ہوں کہ کوئی حکم خلاف حدیث دوں! یہ سنتے ہی امام باقرؒ اپنے مقام سے اٹھ کر امام صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ انتہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ امام باقرؒ عام شہرت کی وجہ سے امام صاحب سے بدظن تھے، مگر تحقیق کر کے صفائی کر لی اور کمال درجہ کا اخلاص ظاہر فرمایا۔

یہ روایت اوپر مذکور ہوئی کہ مالک بن سلیمان کہتے ہیں کہ حسن بن عمارہ' ابوحنیفہ کی شان میں بدگوئی کیا کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے امیر کوفہ نے جمیع علمائے کوفہ کو طلب کیا، مناظرہ کے بعد سب کا اتفاق ابوحنیفہؒ کے جواب پر ہوا۔ جب امیر نے لکھنے کو کہا تو ابوحنیفہ نے تامل کر کے کہا کہ اس مسئلہ میں ہم سب خطا پر تھے اور صواب وہی ہے جو حسن بن عمارہ کہتے ہیں، چنانچہ وہی لکھا گیا۔ اُس کے بعد حسن بن عمارہ، امام صاحب کی نہایت مدح کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اگر ابوحنیفہ چاہتے تو میرا قول رد کر دیتے اور باوجودیکہ وہ

مجلس، مفاخرت کی تھی، مگر انہوں نے الزام اپنے ذمہ لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اُس سے مجھے یقین ہوا کہ وہ ورع میں سب سے زیادہ ہیں۔

غرضکہ امام صاحب کے تقویٰ کو دیکھ کر انہوں نے مخالفت سے توبہ کی۔ یہ بات بھی اوپر مذکور ہوئی کہ ابتدا میں حسن بن صالح، امام صاحب کے سخت مخالف تھے؛ یہاں تک کہ اُن کی تعریف کرنے والے کی نماز میں اقتدا نہیں کرتے تھے، پھر یہ نوبت پہونچی کہ مسائل فقہ حنفیہ کی نہایت تحسین کیا کرتے۔

''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ اوزاعیؒ نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا، وہ کون بدعتی ہے جو کوفہ میں نکلا ہے، جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے؟ ابن مبارک کہتے ہیں کہ میں اس وقت تو خاموش ہوگیا، مگر اُس کے بعد چند مشکل مسائل پیش کر کے کہا کہ یہ نعمان بن ثابت کے افادات ہیں۔ کہا: وہ کون ہے؟ میں نے کہا: عراق میں ایک شیخ ہیں؛ جن سے میں نے ملاقات کی ہے۔ فرمایا: وہ شیخ، نبیل ہیں اُن کے پاس جاؤ اور اُن سے علم حاصل کرو۔ میں نے کہا: یہ وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کے ملنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ اُس کے بعد اوزاعیؒ اور ابوحنیفہؒ کی ملاقات مکہ معظّمہ میں ہوئی اور اُن مسائل کا ذکر آیا، امام صاحب نے جس قدر لکھا تھا بیان میں اُس سے زیادہ توضیح کی۔ بعد برخاست اوزاعیؒ نے کہا: مجھے اُن کی کثرت علم اور وفور عقل پر رشک آتا ہے اور میں جو اُن سے بدگمان تھا وہ سخت غلطی تھی جو لوگوں کے کہنے سے ذہن نشین ہوگئی تھی۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ جو لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے وہ اُس کے بالکل برخلاف ہیں۔ اب میں خدائے تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں کہ یہ بدگمانی معاف فرمادے۔ انتھی۔

دیکھئے! ایسے جلیل القدر محدث کو مخالفوں نے امام صاحب سے بدظن کر دیا تھا، مگر بالمشافہ اُس کا تصفیہ ہوگیا کہ جتنے الزام لگائے جاتے ہیں سب بے اصل محض ہیں۔ اسی وجہ

سے اُس سے توبہ کرنے کی اُن کو ضرورت ہوئی۔

''الانتصار'' میں ابراہیم بن اشعثؒ کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں فضیل بن عیاض کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ عبداللہ بن مبارک حج کے لئے آئے ہیں، انہوں نے کہا: میں امید کرتا ہوں کہ اُن کی وجہ سے اہل موقف کی بھلائی ہوگی۔ اُس نے کہا کہ وہ تو ابوحنیفہ کے پاس جایا کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسا شخص جو ابوحنیفہ کے پاس جائے ممکن نہیں کہ بارگاہ الٰہی میں اُس کو اس قسم کا تقرب ہو۔ فضیلؒ نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ ابوحنیفہ افضل ہیں، اس وجہ سے اپنے فائدہ کے لئے انہوں نے اُن کو اختیار کیا اور میں نے بھی وہی بات اختیار کی جو عبداللہ نے کی ہے۔ اُس شخص نے کہا کہ آپ نے بھی تو ابوحنیفہ میں کلام کیا ہے! فرمایا: یوں تو سفیان بھی اُن میں کلام کرتے تھے، مگر جب ان کے ساتھ بیٹھے اور اُن کا حال معلوم کیا تو نادم ہو کر اُس سے استغفار کیا کرتے تھے۔ انتہی۔

یہ بات اوپر معلوم ہوئی کہ وکیعؒ ابتدا میں امام صاحب کے سخت مخالف تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا ہے کہ مسئلہ شعار میں انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ابو حنیفہؒ نے حدیث کی مخالفت کی اور امام صاحب کے کسی مقلد نے جب امام صاحب کی طرف سے جواب دیا تو نہایت غضب سے کہا کہ تو اس قابل ہے کہ قید کر دیا جائے اور جب تک توبہ نہ کرے رہا نہ کیا جائے! اُس کے بعد انہی کی یہ حالت ہوئی کہ امام صاحب کے معتقد بلکہ شاگرد اور مقلد ہو گئے۔

یہاں یہ بات، قابل یاد رکھنے کی ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں جو وکیعؒ کی مخالفت کا حال لکھا ہے اُس سے ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ وکیعؒ امام صاحب کے سخت مخالف تھے اور جتنے مخالفانہ اقوال مل سکیں اُن کو امام صاحب کی توہین میں پیش کریگا، حالانکہ اُن کے کل اقوال اس باب میں ساقط الاعتبار ہیں، اس لئے کہ ''تذکرہ الحفاظ'' وغیرہ سے صاف ظاہر

ہے کہ وہ امام صاحب کے شاگرد اور مقلد ہو گئے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اُن تمام اقوال سے رجوع کیا ہے۔ اسی پر اور محدثین کے اقوال کا قیاس کیا جائے کہ بمرور ایام، امام صاحب کی حالتوں پر مطلع ہوتے اور اپنے اقوال سے رجوع کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ شدہ شدہ کل اہل انصاف، امام صاحب کے موافق بلکہ مداح ہو گئے، جن کے بیش بہا اقوال سے کتابیں بھری ہیں، جن میں سے چند، اس کتاب میں بھی لکھے گئے۔ البتہ جن لوگوں نے انصاف سے کام نہیں لیا وہ اپنے مخالفانہ اقوال پر اڑے رہے، مگر ظاہر ہے کہ بے انصاف حاسدوں کی مخالفت نہ شرعاً قابل اعتبار ہے نہ عقلاً۔

''الانتصار'' میں لکھا ہے کہ شریک بن عبداللہ نے حضار مجلس سے خطاب کر کے کہا کہ اے لوگو! ہم سے ابوحنیفہؒ کے باب میں لغزشیں ہوگئی ہیں، جیسا کہ ہوا ہی کرتی ہیں، لیکن اب ہم اللہ تعالیٰ سے اُن کی معافی چاہتے ہیں۔

دیکھئے! شریکؒ کی مخالفتیں، کس وضاحت سے منقول ہیں، مگر اس روایت سے ظاہر ہے کہ انہوں نے آخر میں مخالفت سے توبہ کی۔ جس سے کل مخالفانہ اقوال **کان لم یکن** ہو گئے۔

مولانا مولوی استاذی محمد عبدالحئی نے ''**الکلام المبرور**'' میں میزان شعرانیؒ سے نقل فرمایا ہے کہ ابومطیع بلخیؒ کہا کرتے تھے کہ ایک روز میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس جامع کوفہ میں بیٹھا تھا کہ سفیان ثوری اور مقاتل بن حیان اور حماد بن سلمہ اور جعفر صادق وغیرہ فقہا آئے اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ خبر پہونچی ہے کہ تم دین میں قیاس کیا کرتے ہو، جس سے ہمیں تمہارے ضرر کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس ہے۔ امام صاحب نے کہا میرا حال سنئیے! میں پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں، پھر سنت پر، پھر صحابہ کے فیصلوں پر، اور اُن میں بھی اُن کو مقدم کرتا ہوں جن پر اتفاق ہے۔ اُس کے بعد قیاس کرتا ہوں اور اس بات پر مسائل فقہیہ پیش کرنا شروع کئے، یہاں تک کہ صبح سے

دوپہر تک یہی گفتگو رہی۔ چنانچہ سب قائل ہوگئے اور کوئی صاحب اُن کے زانو پر بوسہ دیتے تھے اور کوئی ہاتھ چومتے۔ پھر جاتے وقت اُن حضرات نے کہا کہ ''آپ سید العلماء ''ہیں۔ ہم نے جو نادانستگی سے آپ کی نسبت جو کچھ کہا ہے، وہ معاف کر دیجئے۔ امام صاحب نے کہا: **غفر الله لنا و لکم اجمعین ۔**

اکابر محدثین نے بدگویوں کو زجر وتوبیخ کی

غرضکہ اہل انصاف شیوخ وقتاً فوقتاً اپنے خیالات سے رجوع کرتے جاتے تھے اور اُس کے ساتھ ہی حاسد اور مخالف جو الزام امام صاحب پر لگاتے اُس کو رد کر کے اُن لوگوں کو زجر وتوبیخ کیا کرتے کہ طالبین حق متنبہ ہو کر اُن لوگوں کے دام سے نکل جائیں۔

موفقؒ نے لکھا ہے کہ محمد ابن عبدالوہاب کہتے ہیں کہ ایک روز ہم عبداللہ بن یزید مقریؒ کے حلقہ میں بیٹھے تھے، انہوں نے ایک حدیث شروع کی جس کی ابتدا یہ تھی: **حدثنا ابو حنیفة۔''** یہ سنتے ہی کسی نے کہا: **لا مزید !** یعنی ہم اُن کی روایت نہیں چاہتے۔ کہا: خیر اس کو جانے دو، پھر کہا: ''**حدثنا النعمان بن ثابت**'' لوگ اُس روایت کو لکھنے لگے۔ دیکھ کر فرمایا: جو لوگ ابوحنیفہ کے نام کو بھی نہیں پہچانتے تو اُن کے فضل وتقدم کو کیا جانیں؟ باوجود اس کے کہتے ہیں کہ ہم اُن کی روایت نہیں چاہتے، ایسے لوگ زندے نہیں بلکہ مردے ہیں۔ پھر غصہ سے فرمایا: ایک مہینے تک تم لوگوں سے کوئی روایت بیان نہ کروں گا۔!

امام ذہبیؒ نے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن یزید مقری ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ وغیرہ کے استاذ ہیں اور ''خلاصہ'' میں لکھا ہے کہ اُن کی روایتیں کل صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جس بزرگوار نے تمام حلقہ کی طرف سے لا مزید کہہ دیا،

حاسدوں کی بات کا کس قدر اُس کو وثوق تھا کہ ایسے جلیل القدر محدث جن کو خود نے بھی استاذ تسلیم کیا تھا، اُن کی بات کو امام صاحب کے معاملہ میں نہ مانا۔ ہر چند انہوں نے **حدثنا** کہکر یہ باور کرایا کہ وہ میرے استاذ ہیں، جن کا حال میں خوب جانتا ہوں، مگر کچھ پروانہ کی اور امام صاحب کی توہین کر کے اُن کے دل پر ایسا صدمہ پہونچایا کہ ایک مہینے تک اُس گستاخی کے بدلہ میں تمام اہل حلقہ کو افضل العبادات سے محروم کر دیا۔ مقریؒ نے نام بدل کر جو وہی روایت پھر شروع کی، اُس سے غرض اُن لوگوں کی حماقت ثابت کرنی تھی کہ جو اتنا بھی نہ جانتے کہ ابوحنیفہؒ کون ہیں اور نعمان کون۔ ایسے لوگ ایک مُسلَّم اور محقق شیخ پر یہ الزام لگائیں کہ کسی غیر متدین اور بے علم شخص سے روایت لی ہے۔ کس درجہ کی حماقت اور بیباکی ہے۔ اور امام صاحب کے فضائل نہ جاننے والوں کو جو مردے قرار دیئے' اُس کی وجہ یہ کہ اُن کو ذرا بھی معنوی احساس ہوتا تو حاسدوں کے اقوال اور امام صاحب کے احوال کا موازنہ کر کے حق و باطل میں امتیاز کرتے۔

یہ روایت اوپر لکھی گئی کہ اسمٰعیل بن بشر کہتے ہیں کہ ایک بار میں مکی بن ابراہیم کی مجلس میں حاضر تھا، انہوں نے ایک روایت کی ابتداء یوں کی ''حدثنا ابو حنیفة'' ایک شخص نے کہا: حضرت ابن جریج کی کوئی روایت بیان کیجئے، ابوحنیفہ کی روایت کی ہمیں ضرورت نہیں! یہ سنتے ہی وہ غضبناک ہوگئے اور کہا: اے شخص، میری مجلس سے اٹھ جا! اور جب تک وہ اٹھایا نہیں گیا کوئی روایت نہیں بیان کی۔

اس سے ظاہر ہے کہ مکی بن ابراہیمؒ نے امام صاحب میں کلام کرنے والے کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اُس کو علم حدیث کی تعلیم دی جائے، اس لئے کہ جس کی طبیعت میں بیباکی ہو اور بزرگان دین کو وقعت کی نگاہوں سے نہ دیکھے اُس کو علم سکھانا ایسا ہے جیسا کہ سعدی علیہ الرحمہ نے کہا ہے:

بد گہر را علم وفن آموختن   دادن تیغ است دست راہزن

موفقؒ نے لکھا ہے کہ ایک بار عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک روایت ابوحنیفہؒ سے بیان کی ، اُس میں کسی نے کلام کیا تو آپ نے غصہ سے فرمایا: اس سے تمہارا مقصود کیا ہے؟ جس کو خدائے تعالیٰ نے رفعت دی، وہ ضرور رفیع المنزلت ہے، اور خدا نے جس کو پسند کیا اُس کے ممتاز اور پسندیدہ ہونے میں کلام نہیں ! پھر اُس سے پوچھا: کیا تم نے ابو حنیفہ کو دیکھا ہے؟ کہا: نہیں ، فرمایا: اگر دیکھتے تو کہد یتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امّت کے لئے اُن کو رحمت پیدا کیا۔ پھر فرمایا: اے لوگو! تم ابوحنیفہ کے باب میں بہت فضول گوئیاں کرتے ہو، مگر سمجھ رکھو جو شخص اُن کی مجلس میں نہیں گیا اور اُن کی کتابیں نہیں دیکھیں وہ محروم اور ناقص ہے۔ انتہی ۔

ابن مبارکؒ نے جو اُس شخص سے پوچھا کہ کیا تم نے ابوحنیفہ کو دیکھا ہے۔ اُس سے مقصود یہ تھا کہ اُس کی زبان سے کہلوادیں، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جس طرح سفہا نے اُن کو امام صاحب کی ملاقات سے روکا تھا، سب کو وہ روکتے تھے، پھر جب وہ نہ دیکھنے کا اقرار کریگا تو یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ بلاتحقیق مخالفوں کی باتوں پر اُس کو ایسا وثوق ہے کہ اُس کے مقابلہ میں اپنے مستند محقق استاذ کی ذاتی تحقیق کو بھی لغو سمجھتا ہے۔

''**الخیرات الحسان**'' میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ کے یہاں ایک بار طلبہ کا مجمع تھا، آپ حدیثیں بیان کرتے اور لوگ لکھتے جاتے تھے، ایک حدیث کی اسناد میں آپ نے کہا: **حدثنا نعمان بن ثابت** یہ سنتے ہی لوگوں کو توحش ہوا، چنانچہ ایک شخص نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا کہ نعمان کون؟ مطلب یہ کہ اگر کوئی دوسرے نعمان ہوں تو مضائقہ نہیں، کہیں ابوحنیفہ نہ ہوں ۔ مگر انہوں نے کہد یا: ابوحنیفہ جو مغز علم تھے۔ یہ سنتے ہی لوگ لکھنے سے ہاتھ کھینچ لئے ۔ ابن مبارکؒ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر فرمایا: اے لوگو! تم یہ کیسے

بے ادب اور ائمہ کے حال سے جاہل ہو اور علم و علما کی معرفت تمہیں کس درجہ کم ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ابوحنیفہ سے زیادہ کوئی مستحق اقتدا نہیں، وہ متقی، سراپا مغز، پارسا اور فقیہ تھے۔ علم کو انھوں نے ایسا منکشف کیا کہ کسی نے کیا ہی نہیں۔ پھر قسم کھائی کہ ایک مہینے تک اُن لوگوں کو حدیث کا درس نہ دونگا۔ انتہی۔

''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ نے ایک بار فرمایا کہ ابو حنیفہؒ افقه الناس تھے، اُن سے زیادہ سمجھدار میں نے نہیں دیکھا، وہ ایک آیت تھی۔ ایک شخص نے کہا: حضرت! خیر میں یا شر میں؟ فرمایا: اے شخص چپ رہ! شر میں مبالغہ منظور ہوتا ہے تو غایةً فی الشر کہا جاتا ہے اور آیت خیر کے ساتھ خاص ہے۔

دیکھئے! اتنی تعریف اور توصیف کے بعد معترض صاحب کو لفظ آیت میں پوچھنے کا موقع ملا کہ وہ نشانی خیر کی تھی یا شر کی؟ کاش یہی استفہام نیک نیتی سے ہوتا، جس کے جواب سے اصلاح کی توقع ہوسکتی۔ مگر وہ تو از راہ تمسخر تھا کیونکہ اتنی تعریفوں کے بعد جب لفظ آیت کہا گیا تو کیسا ہی بیوقوف ہو یہی سمجھے گا کہ اس سے تعریف مقصود ہے، شر کا وہاں کیا ذکر؟ اس سے ظاہر ہے کہ مخالفوں میں ایسے مسخرے بھی تھے جو امیر المومنین فی الحدیث سے عین درس میں تمسخر کیا کرتے۔ بخلاف اس کے امام صاحب کے مدّاح جتنے تھے' نہایت مہذّب، متدین، دیانت و تقویٰ میں ممتاز محدثین کے شیوخ تھے۔

امام صاحب کے توبہ کا قصہ

م ص ک۔ احمد ثقفی کہتے ہیں کہ ایک بار ہم عیسیٰ بن یونس کے یہاں بیٹھے تھے (غالبًا وہ حلقۂ درس تھا) انھوں نے کہا حدثنا ابو حنیفةؒ یہ کہتے ہی ایک شخص نے چیخ مار کر کہا: حضرت! کیا اُن سے دو بار توبہ نہیں لی گئی؟ فرمایا: خدا تجھ کو جلد ہلاک کرے! کفار سے

روایت کرتا ہے۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: لکھو؛ ابوحنیفہ سے اورع نہیں دیکھا!
امام صاحب کے توبہ کا قصہ یہ ہے کہ جب خوارج کا کوفہ پر تسلط ہوا تو لوگوں نے اُن سے کہا کہ اہل سنت و جماعت کے شیخ ابوحنیفہؒ ہیں، انہوں نے آپ کو گرفتار کیا اور چونکہ اُن کا اعتقاد ہے کہ جو شخص اُن کے اعتقادات کے مخالف ہو وہ کافر ہے، اس بنا پر امام صاحب سے کہا کہ اے شیخ! کفر سے توبہ کرو۔ آپ نے کہا: میں ہر کفر سے توبہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو چھوڑ دیا۔ جب آپ جانے لگے تو کسی نے کہد یا کہ انہوں نے دھوکا دیا، اُن کی مراد یہ ہے کہ تم جس کفر پر ہو، اُس سے توبہ ہے۔ یہ سنکر پھر آپ کو بلایا اور کہا: اے شیخ! تم نے اُس کفر سے توبہ کی جس پر ہم ہیں؟ امام صاحب نے کہا: یہ تم ظن سے کہتے ہو یا علم سے؟ کہا: ظن سے، فرمایا: حق تعالیٰ فرماتا ہے ''**ان بعض الظن اثم**''۔ اس آیت کے مطابق یہ ظن تمہاری خطا ہے اور جو خطا ہے، وہ تمہارے نزدیک کفر ہے، اس لئے پہلے تم کفر سے توبہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ تم سچ کہتے ہو ہم اپنے کفر سے توبہ کرتے ہیں، مگر تم بھی توبہ کرو! امام صاحب نے کہا میں ہر کفر سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ قصّہ امام موفق اور کردریؒ نے ابوبکر عتیق یمانی سے روایت کر کے اُن کا قول نقل کیا ہے کہ امام صاحب کے مخالفین جو کہا کرتے ہیں کہ اُن سے دوبار توبہ لی گئی، سو وہ یہی توبہ ہے۔ لوگوں کو شبہ میں ڈالنے کی غرض سے وہ اُس کو ذکر کیا کرتے ہیں۔
اب حاسدوں کی افترا پردازی پر غور کیجئے کہ صرف دوبار کے توبہ کا لفظ اُن کو مل گیا اور اُس پر ایک بڑی بنیاد قائم کر دی کہ اور فسق و فجور اور مخالفت حدیث کا تو کیا ذکر، کفر تک نوبت پہونچ گئی تھی، جس سے دوبار توبہ لی گئی۔ یعنی توبہ پر قائم ہی نہ رہے بلکہ بار دیگر کفر ثابت ہونے پر مکرر توبہ پر مجبور کئے گئے۔ جو بیباک افترا پرداز اس قسم کے بے اصل الزام لگاتے ہوں تو اُن کا یہ کہنا کہ وہ حدیث نہیں جانتے تھے، صرف رائے سے فقہ گھڑی، کونسی

بڑی بات ہے؟ مگر حیرت اُن لوگوں سے ہے جو ایسے بے اصل باتوں کی تصدیق کر لیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ مخالف کیسا ہی عالم کیوں نہ ہو، مخالفت کی راہ سے جو کچھ کہے گا ہرگز قابل التفات نہیں۔

بدگویوں کی تاویل اور حیلہ جوئی

دیکھئے! ''تہذیب التہذیب'' میں حریز بن عثمان کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اسمٰعیل بن عیاش کہتے ہیں کہ میں نے خود حریز سے سنا ہے کہ کہتے تھے: یہ حدیث جو روایت کی جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ سے فرمایا کہ ''انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ'' حق ہے کہ لیکن سننے والے نے اُس میں خطا کی۔ میں نے کہا پھر اصل میں کیا ہے؟ کہا ''انت منی بمنزلۃ قارون من موسیٰ''۔

لیجئے! جو حدیث علی کرم اللہ وجہہ کی کمال فضیلت پر دلیل تھی اُس کو انہوں نے کمال منقصت اور مذمت پر دلیل بنادی۔ کہا ہارون اور کہاں قارون؟ مگر موقع اتنا مل گیا کہ سننے میں صرف قاف کی جگہ خوش اعتقادی سے ہاء سن لیا ہوگا۔ اور حریز سے یہ بھی روایت اُس میں لکھی ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بغلہ پر سوار ہونا چاہتے تھے، علیؓ نے آکر تنگ کو ڈھیلا کر دیا تاکہ حضرت گر پڑیں۔

موقع یہ ہوگا تنگ کھینچے کی ضرورت سے علی کرم اللہ وجہہ نزدیک گئے ہوں گے، اُس کو مخالفانہ پیرایہ میں بیان کر دیا۔

اسی قسم کی یہ توجیہ بھی سنی گئی کہ کسی صاحب نے مناظرہ میں صدیق اکبرؓ کی فضیلت پر یہ آیت پیش کی ''اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن'' توشیعی صاحب اس کے جواب میں کیا فرماتے ہیں کہ غار میں ابوبکر پکار پکار کر روتے تھے، اس غرض سے کہ

لوگ جمع ہو کر حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر لیں اور ہر چند حضرت ''لا تحزن'' فرماتے تھے، مگر وہ چپ نہیں رہتے تھے۔

دیکھئے ! بغض وحسد نے کہاں تک نوبت پہونچا دی کہ قرآن وحدیث میں تحریف و تصرف کر ڈالا۔

اب حریز بن عثمان کا حال یہی معلوم کر لیجئے ، جنہوں نے ہارون کو قارون بنا دیا۔ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ '' وہ تابعی ہیں ، امام بخاریؒ نے اُن کی روایت کو بخاری شریف میں داخل کیا ہے امام احمدؒ وغیرہ نے اُن کی توثیق کی ہے'' مگر علی کرم اللہ وجہہ سے چونکہ اُن کو بغض تھا اس وجہ سے توہین کے اسباب پیدا کرتے تھے اور اسی میں لکھا ہے کہ ابن حبان کہتے ہیں کہ اُن کی عادت تھی کہ ہر روز ستر بار صبح اور ستر بار شام کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر لعنت کرتے تھے، جب اُس کا سبب دریافت کیا گیا تو کہا کہ انہوں نے میرے آباءواجداد کا سر کاٹا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اُسی زمانہ میں ایسے بھی لوگ تھے کہ علی کرم اللہ وجہہ جیسے جلیل القدر صحابی کی شان میں اپنی ذاتی خصومت کی وجہ سے بے اصل باتیں تراشتے اور لعنت کرتے تھے تو ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بے اصل باتیں بنانا اور الزام لگانا کونسی بڑی بات ہے؟ آخر امام صاحب سے بھی تو اُن کو سخت صدمہ پہونچا تھا کہ اُن کی کساد بازاری ہوگی ، جس کی خبر اکابر محدثین نے دی ہے۔

''تہذیب الکمال'' میں لکھا ہے کہ ابی عائشہؒ نے حلقہ درس میں ایک روایت ابوحنیفہؒ سے کی ، بعض حاضرین درس نے کہا ''لا نریدہ'' ، یعنی ہم اُن کی روایت نہیں چاہتے۔ انہوں نے کہا: اگر تم اُن کو دیکھتے تو اُن کی روایت کی خواہش کرتے۔

مطلب یہ کہ جنہوں نے اُن کو دیکھا ہے اور اُن میں بھی خاص کر وکیع اور مسعر اور عبداللہ ابن مبارک جیسے اہل تدین ہوں ، اُن کی قدر جانتے ہیں ہر کس و ناکس کو کیا قدر ؟ گویا حاسدین نے

بھی اُن کو دیکھا تھا مگر حسد وبغض نے اُن کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ ڈالدیا تھا کہ وہ دیکھ نہ سکے، جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ''وتراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون''۔

م ص۔ احمد بن حاج نیشاپوری کہتے ہیں کہ مسلم بن خالد زنجی ایک فاضل تھے، جو تدریس اور مسائل کی تحقیق کیا کرتے تھے، ایک روز میں اُن کے حلقہ میں تھا اور محمد بن مسلم طائفی بھی شریک تھے، ابوحنیفہؒ کا ذکر آیا۔ مسلم بن خالد نے اُن کی ثنا وصفت میں بہت سارے امور بیان کئے۔ محمد بن مسلم نے کہا: اتنے اوصاف اُن میں نہ تھے۔ مسلم نے کہا بلکہ اُس سے بھی زیادہ تھے۔ یہ سنکر محمد بن مسلم خاموش ہوگئے اور اُن کے طور سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو بھی ان امور کا اقرار تھا۔ انتہی۔

غرضکہ حق پسند اور اہل انصاف علما نے امام صاحب کی ثنا وصفت کو اور معترضین کی جرح کے مقابلہ میں اُن کی تعدیل کو لازم سمجھا تھا۔

امام صاحب کی ثناء وصفت نہ کرنے والوں کی خرابی

م ص۔ بشر بن یحییٰ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم عبداللہ بن مبارکؒ کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے طاؤسؒ کے قول کی روایت کی اور اُس کے خلاف میں ابوحنیفہؒ سے ایک روایت کی۔ اُس شخص نے کہا: ہم طاؤس کا قول قبول کرتے ہیں اور ابوحنیفہؒ کے قول کو دیوار پر دے مارتے ہیں۔ فرمایا: ائے کمبخت، خدا کی قسم! اگر تو اُن کو دیکھتا تو یہ کبھی نہ کہتا اور وہ اتنے دلائل قائم کرتے کہ تجھے اُن کے قول کو رد کرنا نہ ہوسکتا۔

م ص ک: خلف ابن ایوب کہا کرتے تھے کہ جو شخص ابوحنیفہ کے باب میں افراط نہ کرے ہم اُس سے بدگمان ہوتے ہیں، کسی نے پوچھا: افراط کی کیا صورت؟ فرمایا: یہ کہنا چاہئے کہ اُن کے زمانہ میں کوئی اُن سے اعلم اور افقہ نہ تھا۔ انتہی۔

بدگمانی کی یہی وجہ تھی کہ اُس نے ایسی بات کا انکار کیا جس کے تمام محققین قائل ہیں، جس سے خیال کیا جاتا ہے کہ حاسدوں کا افسوں اُس پر کارگر ہو گیا۔

دیکھئے! محدثین کو امام صاحب کے باب میں کس قدر تشدد تھا! اگر یہ تشدد نہ ہوتا تو اُن کے حاسد اُس زمانہ میں اس کثرت سے تھے کہ فقہ حنفیہ کو کبھی فروغ پانے نہ دیتے اور اُن کے افترا پردازیوں سے یہ مذہب حق نیست و نابود ہو جاتا۔ چونکہ اہل حق کا فرض ہے کہ احقاق حق میں مبالغہ کریں، اس لئے ان حضرات کو اس قدر تشدد کرنے کی ضرورت ہوئی۔

امام صاحب کا مخالف بد مذہب ہے

م ص۔ عبدالعزیز بن ابی رواد ؒ کہتے ہیں کہ ہمارے اور لوگوں کے بیچ میں ابوحنیفہ ہیں، جس نے اُن کو دوست رکھا ہم اُن کو اہل سنت و جماعت سے سمجھتے ہیں اور جس نے اُن کے ساتھ بغض رکھا ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اہل بدعت سے ہے۔ انتہی۔

دیکھئے! سنی اور بدعتی کی یہ شناخت اُس زمانہ میں قرار دی گئی تھی جو خیر القرون سے تھا۔

اصل منشا اس کا یہ ہے کہ امام صاحب کی تقریر کے مقابلہ میں کوئی بدعتی ٹھہر نہیں سکتا تھا، جس کا حال اوپر معلوم ہوا۔ اس وجہ سے کل اہل مذاہب باطلہ آپ کے دشمن اور اہل حق آپ کے دوست اور خیر خواہ تھے۔ اور چونکہ حاسد امام صاحب کی توہین کرتے، اہل بدعت کو تقویت دیتے تھے اور حدیث شریف میں ہے: ’’**من کثر سواد قوم فھو منھم**‘‘ یعنی جو کوئی کسی قوم کے مجمع کو زیادہ کرے، وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔

اس لئے اہل سنت و جماعت نے یہ شناخت ہی مقرر کر دی کہ جو امام صاحب کا مخالف ہو وہ بدعتی ہے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے حاسدوں کو امام صاحب کی بدگوئی سے زبان روکنے کی ضرورت ہوئی۔ اور فقہ حنفیہ بہت جلد شائع ہو گئی۔

امام صاحب کی بدگوئی باعثِ عذاب الٰہی ہے

م ک ۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں: جب میں سنتا ہوں کہ کوئی شخص ابوحنیفہؒ کی بدگوئی کرتا ہے تو مجھے اُس کی صورت دیکھنی اور اُس کے ساتھ بیٹھنا گوارانہیں ہوتا، اس خوف کے مارے کہ کہیں عذاب الٰہی نازل نہ ہوجائے، جس میں' میں بھی مبتلا ہوجاؤں!۔ اُس کے بعد کہا: یا اللہ، تو جانتا ہے کہ یہ لوگ جس قسم سے اُن کا ذکر کرتے ہیں، میں اُس سے راضی نہیں ہوں اور یہ لوگ جو بیان کرتے ہیں وہ اُس سے بہتر تھے۔ خدا کی قسم! وہ پرہیزگار تھے اور زبان کو بُری باتوں سے روکتے تھے انتہی۔

امیر المومنین فی الحدیث جن کا اولیاء اللہ میں ہونا محدثین اور اولیاء اللہ کی تصریحات سے ثابت ہے، اُن کو اس بات کا احساس تھا کہ امام صاحب کی بدگوئی موجب عذاب الٰہی ہے۔ عوام الناس خصوصاً حاسدین اُس کو کیا جانیں؟

م ص ۔ عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: خدا خوار کرے اُس شخص کو جو ابوحنیفہؒ کو بُرائی سے یاد کرتا ہے!۔

تمام السنة حب ابی حنیفة

خ ۔ ابراہیم بن معاویہ ضریر کا قول ہے: ''تمام السنة حب ابی حنیفة'' ابراہیم بن معاویہ کا حال ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے کہ ابوزرعہ نے اُن کی نسبت کہا ہے کہ وہ صدق اور صاحب سنت ہیں۔

دیکھئے! صاحب سنت، امام صاحب کی محبت کو متمم سنت کہہ رہے ہیں تو خیال کیجئے کہ کس درجہ اُن کی محبت کی ضرورت سمجھی گئی ہے؟۔ غرضکہ حاسدین اور مخالفین کے تعلیم یافتہ لوگ جب اکابر محدثین کے حلقوں میں جاتے اور امام صاحب کی شان میں کچھ کلام کرتے، تو

خوب ہی زجر وتوبیخ ہوتی، جس سے اکثروں کی اصلاح ہو جاتی تھی، مگر جس بُری بات کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اُس کا بالکلیہ قلع قمع ہونا قریب قریب محال کے ہے۔
دیکھئے! کیسے کیسے مذاہب باطلہ دنیا میں رائج ہیں کہ نہ عقل اُن کو قبول کر سکتی ہے نہ نقل یاری دیتی ہے۔ اور باایں ہمہ اہل حق نے اُن کے ابطال میں زور بھی لگایا اور کوششیں کیں، مگر یہ نہ ہوسکا کہ صفحہ ہستی کو اُن سے پاک وصاف کریں۔ اسی طرح جو مذہب امام صاحب کے معاملہ میں حاسدوں نے تراشا تھا، اہل حق کی سعی سے اُس کا قلع قمع نہ ہوسکا۔ چنانچہ اور مذاہب کے پہلو بہ پہلو وہ بھی اب تک دائر وسائر ہے۔ حالانکہ ہر زمانہ کے علمائے اہل سنت و جماعت اُس مذہب کے مقلدوں کے مقابلہ میں امام صاحب کے مناقب میں کتابیں تصنیف کرتے رہے۔

امام صاحب کی مناقب کی کتابیں

مولانا واستاذنا مولوی محمد عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''**التعلیق الممجد**'' میں لکھا ہے کہ ایک جماعت نے امام صاحب کے مناقب میں کتابیں لکھی ہیں۔ اگر اُن پر طعن کرنے والا محدث یا شافعی المذہب ہو تو اُس کے ہم مذہب علما کی تصانیف کو ہم پیش کریں گے۔ جیسے: ''**تبییض الصحیفہ**'' مؤلفہ امام سیوطی اور ''**خیرات الحسان**'' مولفہ ابن حجر مکی اور امام ذہبی کی تصانیف جیسے **تذکرة الحفاظ** اور **کاشف** اور وہ رسالہ جو خاص امام صاحب کے مناقب میں اُنہوں نے لکھا ہے اور ابن خلکان اور یافعی اور حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام نووی اور امام غزالیؒ وغیرہم کی تصانیف جن میں امام صاحب کے مناقب مذکور ہیں۔
اور اگر وہ مالکی ہو تو علمائے مالکیہ مثل حافظ ابن عبدالبر وغیرہ کی تصانیف پر اُس کو مطلع کریں گے۔

اوراگر حنبلی ہوتو ''تنویر الصحیفة فی مناقب ابی حنیفة '' مولفہ یوسف بن عبدالہادی الحنبلی وغیرہ پیش کریں گے۔

اوراگر مجتہد ہوتو مجتہدین نے جواُن کی ثنا وصفت کی ہے، اُس کو دکھائیں گے اوراگرکوئی عامی لامذہب ہوتو عوام کالانعام کا اعتبار ہی کیا؟ انتہی ۔

دیکھئے! صرف صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کے مناقب کی جوخبر دی ہے، وہ بیس سے زیادہ کتابیں ہیں، جن کی فہرست شمس العلما مولوی شبلی صاحب نے سیرۃ النعمان میں لکھی ہے۔

غرضکہ کل مذاہب اہل سنت میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس کے منصف مزاج علما نے امام صاحب کے مناقب میں کتابیں نہیں لکھیں حتی کہ جار اللہ زمخشری نے بھی ''شقائق النعمان'' لکھی ہے۔ان کے سوامعلوم نہیں اور کتنی کتابیں بلاد اسلامیہ میں لکھی گئی ہیں۔

یہاں یہ بات معلوم کرنے کے قابل ہیکہ ''تبییض الصحیفة'' میں امام سیوطیؒ نے اور ''الخیرات الحسان '' میں ابن حجرؒ نے جوروایتیں، امام صاحب کے مناقب میں لکھی ہیں اکثر بلکہ تقریباً کل خطیب بغدادی کی تاریخ سے نقل کی ہیں ۔اُس کی وجہ یہ ہوگی کہ خطیب ، امام صاحب کے سخت مخالف تھے، اس لئے کہ حاسدین کے اقوال کا ایک بڑا ذخیرہ انہوں نے تاریخ میں جمع کر دیا ہے ، پھر جب اُسی تاریخ میں اکابر محدثین کے اقوال امام صاحب کی تعریفوں میں منقول ہیں تو مقبولہ خصم ہونے کی وجہ سے اُن کو زیادہ تر وقعت اور وثوق ہوگا۔

معاصرین کی جرح عموماً مقبول نہیں

اب یہ بات معلوم کرنی چاہئے کہ خطیب بغدادیؒ نے امام صاحب کی توہین میں جتنے

اقوال نقل کئے ہیں ان میں سے اُن لوگوں کے اقوال جنہوں نے امام صاحب کو دیکھا ہی نہیں، خواہ وہ اُن کے زمانہ میں ہوں یا نہ ہوں، اُن کی تقلیدی جرح اور بدگوئیاں امام صاحب کی نسبت کسی طرح مقبول ہو ہی نہیں سکتی! جیسا کہ ابن مبارکؒ وغیرہ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ اگر وہ لوگ امام صاحب کو دیکھتے تو مخالفت کر ہی نہ سکتے۔ انتہی۔ وہ لوگ جو امام صاحب کے معاصر تھے اور اُن کے فضل کو دیکھ کر اور اُن کی تقریروں کو سنکر بدگوئیاں کیں، وہ حاسد اور امام صاحب کے دشمن تھے، جس کی خبر اکابر محدثین نے دی ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوا اور یہ کوئی مستبعد بات نہیں اس قسم کے علما کی خبر بطور پیشین گوئی خود ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے: ''قال النبی صلی الله علیه وسلم : یاتی علی امتی زمان یحسد الفقهاء بعضهم بعضاً ''ک'' فی تاریخه و الخطیب . کذا فی کنز العمال''۔

اور حاسدوں کی اس قسم کی خبروں کا کوئی اعتبار نہیں ۔ مولانا مولوی محمد عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''السعی المشکور'' میں لکھا ہے کہ ابو عبداللہ ذھبی ''سیر اعلام النبلاء'' میں محمد بن حاتم سمین مفسر کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ذکره ابو حفص الفلاس فقال لیس بشئ . قلت هذا من کلام الاقران الذی لا یسمع ، فان الرجل ثبت حجة . انتهی۔

اور ابن حجر مکی رسالہ ''الخیرات الحسان فی مناقب النعمان'' میں لکھتے ہیں: ان قول الاقران بعضهم فی بعض غیر مقبول ، قد صرح الحافظان الذهبی و ابن حجر بذلک ، قالا : و لا سیما اذا لاح انه لعداوة او لمذهب اذ الحسد لا ینجو منه الا من عصمه الله۔ قال الذهبی : و ما علمت ان عصرا سلم اهله من ذلک الاعصر النبیین و الصّدیقین۔ انتہی۔ اور یہ بھی اُسی میں ہے: قال

التاج السبکی فی "الطبقات" الحذر کل الحذر ان تفهم من قاعدتهم ان الجرح مقدم علی التعدیل علی اطلاقها ، بل الصواب ان من ثبتَت امامته وعدالته و کثر مادحوه و مزکوه و ندر جارحه ، و کانت هناک قرینة دالة علی سبب جرحه من تعصب مذهبی او غیره لم یلتفت الی جرحه۔ ثم قال بعد کلام طویل : قد عرفناک ان الجارح لا یقبل منه الجرح ، و ان فسره فی حق من غلبت طاعاته علی معاصیه و مادحوه علی ذامیه ، و مزکوه علی جارحیه ، اذا کانت هناک قرینة یشهد العقل بان مثلها حامل علی الوقیعة فیه من تعصّب مذهبی او منافسة دنیویة کما یکون بین النظراء أو غیر ذالک ، وحینئذ فلا یلتفت الی کلام الثوری وغیره فی ابی حنیفة ، و ابن ابی ذئب وغیره فی مالک ، و ابن معین فی الشافعی ، و النسائی فی احمد بن صالح و نحو ذلک۔ قال ولو اطلقنا تقدیم الجرح لما سلم لنا احد من الأئمة اذ ما من امام الاوقد طعن فیه الطاعنون و هلک فیه هالکون انتهی۔

اور فتح المغیث میں ہے: لکن قد عقد ابن عبدالبر فی جامعه بابا لکلام الاقران المتعاصرین بعضهم فی بعض و رای ان اهل العلم لا یقبل الجرح فیهم الا ببیان واضح فان انضم الی ذلک عداوة فهو اولیٰ بعدم القبول انتهی۔

اور جاراللہ بن عبدالعزیز عمر الہاشمی المکی المعروف بابن فہد المتوفی فی سنۃ ۹۶۰ ھو امش ضوء لامع فی اعیان القرن التاسع میں تحت ترجمہ سیوطی کے جوسخاوی نے ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: الذی ادین الله به ان ما قال کل منهما ای السیوطی والسخاوی فی صاحبه لا یحتج به کمقالة المتعاصرین فی بعض مع ان الحافظ السخاوی

انصف صاحب الترجمة بما ترجمه به ، ولم ینصف بما قاله فی کلامه و عند الله یجتمع الخصوم انتہی ۔

اور ابن تیمیہ منہاج السنہ میں بحث جوابات مطاعن عثمانیہ میں لکھتے ہیں: و معلوم ان مجرد قول الخصم فی خصمه لا یوجب القدح فی واحد منهما و کذلک کلام احد المتشاجرین فی الاخر۔ انتہی ۔ ماحصل ان اقوال کا یہ ہے کہ ہمعصر علما جو ایک دوسرے میں کلام کرتے ہیں، اُس میں دیکھا جائے کہ اُس کا منشا کیا ہے؟ اگر حسد یا تعصب مذہبی یا مناقشہ دنیوی وغیرہ، اور ایسے لوگوں میں کلام ہو جن کی امامت، عدالت ثابت ہو اور طاعت معصیت پر غالب ہو اور مدح کرنے والے اُن کی کثرت سے ہوں تو ایسے لوگوں کی نسبت کسی کی جرح قابل التفات نہیں، اس وجہ سے ثوری نے جو ابوحنیفہ میں اور ابن ابی ذئب وغیرہ نے امام مالک اور ابن معین نے شافعی اور نسائی نے احمد بن صالح اور سخاوی نے سیوطی میں جو کلام کیا ہے، قابل اعتبار نہیں۔ انتہی ۔

طبقات شافعیہ میں امام سبکیؒ نے لکھا ہے کہ ابو زرعہ اور ابو حاتمؒ نے امام بخاریؒ کو بھی متروک لکھا ہے، مگر اُن کے کہنے سے وہ متروک نہیں ہو سکتے اور لکھا ہے کہ ابن عبدالبرؒ نے ''کتاب العلم'' میں علما کے باہمی کلام سے متعلق ایک باب ہی مستقل لکھا ہے اور اُس کی ابتدا اس حدیث سے کی ہے، جو زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: دب الیکم داء الامم قبلکم ''الحسد و البغضاء'' یعنی تم لوگوں میں پہلی امتوں کی بیماری حسد اور بغض سرایت کر گئی ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے: ''استمعوا العلماء و لا تصدقوا بعضهم علی بعض'' یعنی علما کی بات سنو، مگر ایک دوسرے میں جو وہ کلام کرتے ہیں، اُس کی تصدیق مت کرو۔

''وعن مالک بن دینار : یوخذ بقول العلماء و القراء فی کل شئ الا

قول بعضھم فی بعض'' یعنی ہر کلام میں علما کا قول قبول کیا جائے مگر ایک دوسرے میں جو وہ کلام کرتے ہیں قابل اعتبار نہیں۔

ابن عبدالرفیع نے ''معین الحکام'' میں عبداللہ بن وہب سے روایت کی ہے کہ ایک عالم کی شہادت دوسرے عالم کے ضرر پر قبول نہ کی جائے۔

اس لئے کہ علما کا باہمی حسد اس بلا کا ہوتا ہے کہ اوروں میں نہیں ہوتا۔

سفیان ثوری اور مالک بن دینار کا بھی یہی قول ہے۔انتہی۔

میزان الاعتدال میں امام ذہبیؒ نے احمد بن عبداللہ ابونعیم اصبہانی کے ترجمہ میں لکھا ہے ابن مندہ نے اُن میں ایسا قبیح کلام کیا ہے کہ اُس کی حکایت مناسب نہیں۔اسی طرح انہوں نے بھی ابن مندہ میں کلام کیا ہے۔مگر دونوں کے کلام قابل اعتبار نہیں۔کیونکہ وہ دونوں مقبول ہیں۔اُس کے بعد لکھا ہے کہ اَقْرَان جو ایک دوسرے میں کلام کرتے ہیں، وہ قابل اعتبار نہیں۔خصوصاً معلوم ہو جائے کہ اُس کی وجہ عداوت یا مذہب یا حسد ہے۔یہ ایسی بلا ہے کہ اُس سے کوئی نجات نہیں پا سکتا، سوائے اس کے کہ جس کو خدا بچائے۔ میرے علم میں انبیاء اور صدیقین کے سوا کسی زمانہ کے لوگ اس سے بچے ہوئے نظر نہیں آتے۔اگر چاہوں تو کئی جزء اس کے نظائر میں لکھ سکتا ہوں۔انتہی۔

غرضکہ امام صاحب کے معاصر محدثین میں سے جن حضرات نے اُن میں کلام کیا ہے اکثر اُن میں وہ ہیں جو ابتدائی خیالات سے تائب ہو گئے، جیسے: سفیان ثوری، اوزاعی اور وکیع وغیرہ۔اُن کے جس قدر کلام امام صاحب کی تشنیع اور الزامات سے متعلق ہیں اُن سے امام صاحب کی زیادہ تر توثیق ہوتی ہے، اس لئے کہ اُن کا رجوع کرنا اس بات پر دلیل بین ہے کہ بعد تحقیق اُن پر یہ منکشف ہو گیا کہ امام صاحب اُن تمام الزامات سے بری ہیں۔مثلاً بڑا الزام وہ بلکہ کل مخالف بھی لگاتے تھے کہ امام صاحب حدیث نہیں جانتے یا مخالف حدیث رائے قائم کیا کرتے ہیں۔سو جب یہ حضرات مخالفت سے توبہ کر کے امام صاحب کی تعریفیں

کرنے لگے تو اس سے یقیناً معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک وہ الزامات بے اصل ثابت ہوئے۔اس کے بعد جو لوگ یہی کہے جاتے ہیں کہ امام صاحب حدیث نہیں جانتے تھے اور رائے پر عمل کرتے تھے، سو وہ در پردہ سفیان ثوری وغیرہ اکابر محدثین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ **نعوذ باللہ** وہ جھوٹے تھے۔ پھر امام صاحب کی جرح وتعدیل کرنے والوں کا موازنہ کیا جائے تو تعدیل کرنے والے محدثین میں اعلیٰ درجہ کے حضرات ہیں، جن کے اسمائے گرامی مع حالات اوپر مذکور ہوئے اور نیز تعداد بھی انہی حضرات کی زیادہ ہے اور جارحین کی تعداد بھی کم ہے۔ جیسا کہ مولانا استاذنا مولوی محمد عبدالحی صاحبؒ نے **الرفیع التکمیل** میں ابن عبدالبرؒ کا قول نقل فرمایا کہ **الذین رووا عن ابی حنیفة و وثقوہ واثنوا علیه اکثر من الذین تکلموا فیه۔** اس سے ثابت ہے کہ جرح کرنے والے معاصرین تھوڑے تھے اور جو الزام وہ لگاتے تھے، اکابر محدثین کی جماعت کثیرہ کی گواہی اُن تمام الزاموں سے امام صاحب کو بَری کر رہی ہے اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے الزام لگانے کا منشا حسد تھا یا لاعلمی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی بات قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔

بہر حال اکابر محدثین کے تائب ہونے اور توثیق کرنے سے یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ امام صاحب اُن تمام الزاموں سے بَری ہیں جن کو مخالف نقل محفل بنا کر طالبین حق کو امام صاحب سے بدظن کرتے ہیں اور بمصداق آیۂ شریفہ ''**ان بعض الظن اثم**'' خود بھی گناہ میں پڑتے ہیں اور اوروں کو بھی گناہ میں ڈالتے ہیں۔ **نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔**

موازنۂ علم امام صاحب اور امام بخاری صاحب

جب ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ اکابر محدثین نے اوائل میں امام صاحب پر جو الزام لگائے، سب سے توبہ کرکے اُن کے علم وفضل اور ورع کا اعتراف کرلیا، تو اُس کے بعد کوئی

طعن قابل توجہ نہ رہا، مگر مزید توضیح کے لئے بعض مطاعن میں تفصیلی بحث بھی کی جاتی ہے۔

امام صاحب پر ایک طعن یہ کیا جاتا ہے کہ وہ حدیث نہیں جانتے تھے۔ اس کا جواب مباحث سابقہ سے ظاہر ہے کہ اکابر محدثین نے اعتراف کیا ہے کہ امام صاحب علم وتفقہ میں بے مثل و بے نظیر تھے، اس سے اُن کی حدیث دانی کا حال خود معلوم ہوگیا، کیونکہ اُس زمانہ میں سوائے قرآن وحدیث کے مسلمانوں میں کوئی علم ایسا نہ تھا جس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہوں۔ اور یہ نہیں ہوسکتا کہ امام صاحب کے علم کی تعریف کرنے والوں کی مراد رائے ہو، کیونکہ ابن عبدالبرؒ نے کتاب ''**جامع بین العلم و فضله**'' کے ''**باب معرفة اصول العلم**'' میں لکھا ہے کہ متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق ہے کہ رائے کو علم نہیں کہتے اور ایک جماعت نے خاص حدیث کی تصریح بھی کر دی ہے اور امیر المومنین فی الحدیث یعنی ابن مبارکؒ نے اُن کو حدیث دانی ہی کی وجہ سے امام اعظم کہا ہے۔ ایک جماعت محدثین نے خبر دی ہے کہ مناظرہ (جو صرف احقاق حق کے لئے کیا جاتا ہے) اُس میں امام صاحب پر کوئی غالب نہیں آتا تھا۔ اس سے بھی اُن کی حدیث دانی ظاہر ہے کیونکہ اگر حدیث ہی جانتے نہ تھے تو دلیل کیا پیش کرتے ہوں گے؟ پھر جوق جوق محدثین دور دور سے آ کر حلقۂ درس میں جو شریک ہوتے تھے کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ اُن کے تبحر علمی اور علما میں ممتاز ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ امام صاحب جس زمانہ میں تھے وہ شباب علم کا زمانہ تھا اور اُس کے بعد انحطاط شروع ہوگیا اور جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بُعد ہوتا گیا، علم میں کمی آتی گئی۔

دیکھ لیجئے! امام احمد بن حنبلؒ کو محدثین نے آٹھویں طبقہ میں لکھا ہے اور امام بخاریؒ کو نویں طبقہ میں۔ اس ایک ہی طبقہ کے تقدم وتأخر میں علم کی اس قدر کمی ہوئی کہ ایکبارگی چھ لاکھ سے زیادہ صحیح حدیثیں جاتی رہیں اور صرف ایک لاکھ رہ گئیں۔ جس کا ثبوت اس سے

ہوتا ہے کہ امام احمدؒ سات لاکھ سے زیادہ صحیح حدیثوں کی خبر دیتے ہیں جو اُن کو یاد تھیں۔ اور امام بخاریؒ کو اُن میں سے صرف ایک لاکھ صحیح حدیثیں پہونچیں۔ کیوں نہ ہو۔ صحیح حدیث ہے ''کما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا ياتى عليكم زمان الا الذى بعده شر منه۔ الحديث رواه البخارى'' یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ہر زمانہ کے بعد والا زمانہ بدتر ہوگا۔ انتہی۔

اب اس صحیح حدیث کے مقابلہ میں کون کہہ سکتا ہے امام بخاریؒ کا زمانہ امام صاحب کے زمانہ سے فضیلت علمی میں بہتر تھا؟ جب نویں طبقہ کی نسبت آٹھویں طبقہ میں علم اس قدر زیادہ تھا تو امام صاحب پانچویں طبقہ میں تھے۔ قیاس کیجئے! اُس زمانہ میں کس قدر علم ہوگا اور نویں طبقہ کو اُس کے ساتھ کیا نسبت؟ یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ امام بخاریؒ نے طلب علم میں نہایت کوشش کی، مگر صرف (۱۰۸۰) ایک ہزار اسی استاذ اُن کو ملے، جیسا کہ مقدمہ فتح الباری میں لکھا ہے اور اوپر معلوم ہوا کہ امام صاحب کے چار ہزار استاذ تھے، جن سے امام صاحب نے صرف حدیثیں حاصل کی تھیں۔

اب تعصب کو ایک طرف رکھ کے امام صاحب اور امام بخاری رحمہما اللہ کے علم کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو کہ دونوں کے علم میں کس قدر تفاوت ہے۔ امام صاحب اُس زمانہ میں تھے جس کا خیر القرون ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، جو دینی اور علمی برکات سے مالا مال تھا، اُس پر امام صاحب کے اساتذہ کی کثرت اور اساتذہ بھی اُس زمانہ کے، جس میں جوش اسلامی اور شوق علم ہر فرد کے رگ و پے میں موجزن تھا اور امام بخاری ایسے زمانہ میں تھے کہ آثار قیامت کی ابتدا ہو چکی تھی، کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے: قال النبى صلى الله عليه وسلم: من اشراط الساعة أن يظهر الجهل، و يقل العلم ...... الحديث رواه البخارى۔ ہر چند پورا مصداق اس کا ہمارا زمانہ ہے لیکن امام احمدؒ کو سات لاکھ سے زیادہ صحیح حدیثیں پہونچیں تھیں اور امام بخاریؒ کو صرف ایک

لاکھ پہونچیں ۔تو اس سے ظاہر ہے کہ قلت علم اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی اور اُس زمانہ کے محدثین اور خود امام بخاریؒ کے اساتذہ نے اُن کی تبحر علمی اور اعلم الناس ہونے کی شہادتیں دیں ۔اس سے اہل انصاف خود سمجھ سکتے ہیں کہ امام صاحب کو صحیح روایتیں زیادہ پہونچی ہوں گی یا امام بخاری صاحب کو؟ ۔

بقول امام احمدؒ امام بخاریؒ فتوی کے مجاز نہیں

امام صاحب نے خدمت افتاء حسبۃً للہ جو اپنے ذمہ لی ،اُس کی وجہ یہی تھی کہ اُس کا کافی سرمایہ اُن کے پاس مہیّا ہوگیا تھا ، ورنہ اُن کا تقویٰ اور احتیاط کا مقتضی تو یہ تھا کہ کبھی اس کام کو قبول نہ کرتے ۔جس طرح خدمت قضا کو قبول نہ کیا اور اگر بغیر سرمایہ حدیث کے اُن کی جرأت اس کام پر ثابت ہوتی تو اُن کے اساتذہ اُن کے فتوی کو ہرگز قبول نہ کرتے ۔ کیونکہ فتویٰ دینے کے لئے ایک معتد بہ سرمایۂ حدیث کی ضرورت ہے ۔جیسا کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھا ہے کہ امام احمدؒ سے کسی نے پوچھا کے فتویٰ دینے کے لئے ایک لاکھ حدیثیں کافی ہوسکتی ہیں؟ فرمایا: نہیں ! وہ شخص بڑھاتا گیا یہاں تک کہ جب اُس نے کہا: پانچ لاکھ حدیثیں کافی ہوسکتی ہیں؟ فرمایا: میں امید رکھتا ہوں کہ اتنی حدیثیں کافی ہوجائیں گی ۔غرضکہ باوجود تقویٰ واحتیاط خالصاً لوجہ اللہ امام صاحب کا فقہ کو مدون کرنا اور اکابر محدثین نے اُس کو اور اُن کے فتووں کو مان لینا ، اس بات پر شہادت دے رہا ہیکہ اقلاً پانچ لاکھ صحیح حدیثوں کا سرمایہ تو ضرور اُن کے پاس تھا ،جس کی ضرورت امام احمد بن حنبلؒ نے بیان کی ہے ۔اور چونکہ امام بخاریؒ کو خود اقرار ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ صحیح حدیثیں یاد نہیں ہیں ۔اس لئے امام احمدؒ کے قول کے مطابق وہ فتویٰ دینے کے مجاز نہ تھے ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ''عقدالجید'' میں جو لکھا ہیکہ احادیث ترمذی ونسائی وابوداؤد پیش نظر ہوں تو اجتہاد کے لئے کافی ہیں ۔ یہ شاید متاخرین نے شرط

لگائی ہوگی، مگر قدماء میں یہ شرط تھی، کیونکہ امام احمدؒ اُس کے لئے یہ شرط لگا رہے ہیں کہ اقلاً پانچ لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔

یہاں یہ بات بھی معلوم کرنے کے قابل ہے کہ امام احمدؒ کو جو سات لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں، اگر بالفرض اتنی حدیثیں امام صاحب کو یاد نہ ہوں اور صرف آٹھ دس ہزار ہی یاد ہوں تو وہی اُن لاکھوں حدیثوں کی قوت میں ہوسکتی ہیں۔ اس لئے کہ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں امام احمدؒ کے طبقہ کی نسبت لکھا ہے کہ اُس وقت ایک ایک حدیث کے لئے سوسو طریقوں سے زیادہ طریقے یعنی اسنادیں طلب کی جاتیں اور اُس کے لئے متابعات اور شواہد ڈھونڈے جاتے تھے۔ انتہی۔ وجہ اُس کی یہ تھی کہ جوں جوں زمانۂ نبوی سے دوری ہوتی گئی، تدین میں ضعف آتا گیا۔ پھر جب وسائط بکثرت ہوں تو ہر شخص کا متصف بجمیع صفات حسنہ ثابت ہونا دشوار ہے، جس پر صحت حدیث کا مدار ہے۔ یہ بات اس سے بآسانی معلوم ہوسکتی ہے کہ اگر امام بخاریؒ ہمارے زمانہ میں ہوتے تو غالباً ایک روایت بھی اُن کے شروط کے مطابق اُن کو نہ ملتی، کیونکہ اُسی زمانہ میں اُن کو بعض اُمور سے اغماض کرنے کی ضرورت ہوگئی تھی۔ جیسا کہ ''میزان الاعتدال'' میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ علی ابن عبداللہ ابن جعفر جو علی ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں، بعض محدثین نے اُن میں کلام کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد نے اُن کو آخر میں ترک کر دیا اور ابراہیم حربی نے بھی اُن کی روایتیں نہیں لیں اور امام مسلمؒ نے بھی اُن کو ترک کر دیا اور عقیلی نے اُن کو ضعفا میں ذکر کیا، مگر امام بخاریؒ نے ان امور سے اغماض کر کے عقیلی سے کہا کہ اگر ان بزرگواروں کی حدیثیں چھوڑ دی جائیں تو یہ نوبت پہونچ جائیں گی کہ ہم لوگ دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور خطاب منقطع ہو جائے اور آثار فنا ہو جائیں اور زندیقوں کا غلبہ ہو جائے۔ اے عقیلی! کیا تمہیں عقل نہیں؟ تم کیسے لوگوں میں کلام کرتے ہو؟ بھلا ایک ثقہ تو بتلاؤ جس سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو!

الحاصل آٹھویں اور اُس کے بعد کے طبقہ والوں کو کثرت وسائط اور قلت تدین کی وجہ سے ایسی حدیثیں بہت کم ملیں، جن کے اسنادوں کے کل راوی مستند اور مقبول ہوں، اس لئے بھی بہت سی حدیثوں کو ساقط الاعتبار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ ''نکت'' میں ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے: ''**کلما کثرت رجال الاسناد احتیاج الناقد له الی کثرت البحث عن احوالهم**''۔

اسناد عالی جو محدثین کو مطلوب اور مرغوب ہوتی ہے، اُس کی یہی وجہ ہے کہ جس قدر اسناد میں لوگ کم ہوں گے خلل کم ہوگا۔ جیسا کہ ابن صلاحؒ نے مقدمہ میں لکھا ہے ''**العلق یبعد الاسناد من الخل لان کل واحد من رجاله یحتمل ان یقع الخلل من جهته سهواً او عمداً ففی قلتهم قلة جهات الخلل ، و فی کثرتهم کثرة جهات الخلل و هذا اجلیٰ و اوضح**''

حاصل یہ کہ جس قدر رجال اسناد میں کم ہوں، خلل کا اندیشہ کم ہے اور جس قدر زیادہ ہوں زیادہ ہے۔

دیکھئے کہ امام صاحب چونکہ پانچویں طبقہ میں ہیں، اس لئے اُن کی اسناد میں رجال بہت کم ہوتے تھے، تقریباً کل اساتذہ تابعی تھے، جن کا اہل خیر اور متدین ہونا اس حدیث شریف سے ثابت ہے جو بخاری شریف میں ہے: ''**قال النبی صلی الله علیه وسلم خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم۔ ثم یجئی قوم تسبق شهادة احدهم یمینه و یمینه شهادته**''۔ اور ایک روایت میں ہے: ''**ثم یفشو الکذب**''۔

اور قطع نظر اس کے اہل تدین جب کسی سے روایت لیتے ہیں، پہلے اُن کو جانچ لیتے ہیں، کیونکہ خبر میں وارد ہے کہ جس سے تم علم لیتے ہو، پہلے دیکھ لو کہ وہ اس قابل ہے یا نہیں

''کما ورد عن علی کرم الله وجهه : انظروا ممن تاخذون هذا العلم فانما هو الدین''۔

نکت میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اگر چہ امام بخاریؒ کے بعض شیوخ میں کلام کیا گیا ہے لیکن چونکہ امام بخاریؒ کو اُن سے ملاقات تھی اور اُن کے احوال کو خوب دریافت کر چکے تھے، اس لئے اُن کی روایت معتبر سمجھی جاتی ہے ''کما قال : الذین انفردبهم البخاری ممن تکلم فیه اکثرهم من شیوخه الذین لقیهم و عرف احوالهم و اطلع علی احادیثهم فمیز جیدها من ردیها بخلاف مسلم فان اکثر من تفرد بتخریج حدیثه ممن تکلم فیه من المتقدمین ۔ و لا شک ان المرء اشد معرفة بحدیث شیوخه و تصحیح حدیثهم من ضعیفه ممن تقدم عن عصرهم'' ۔

اسی طرح امام صاحب نے جن کو استاذ بنالیا تھا، اُن کے تدین سے وہ بخوبی واقف تھے، اس وجہ سے اُن کے معتبر اور موثق ہونے میں کلام ہی نہیں ۔ اب رہے اُن کے اساتذہ، سو اگر وہ صحابہ میں ہیں تو اُن میں کون کلام کرسکتا ہے؟ وہ سب عدول ہیں ۔ نہ اُن کی تعدیل کی ضرورت ہے نہ اُن کی حدیث کے لئے متابع اور شاہد کی تلاش کرنے کی احتیاج ۔ اور اگر وہ بھی تابعی ہیں تو اُن میں بھی بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ کیونکہ یہ زمانہ مبشر بالخیر ہونے کی وجہ سے اُن حضرات میں کذب کا احتمال بہت ہی ضعیف ہے اور اگر توثیق کے لئے متابع اور شاہد کی ضرورت ہوئی بھی تو ایک دو روایتیں اُس کے لئے کافی ہیں ۔

''میزان الاعتدال'' میں امام ذہبیؒ نے علی ابن عبداللہ کے حال میں امام بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے: ''بل الثقة الحافظ اذا انفرد باحادیث کان ارفع له و اکمل لرتبتهٖ و ادل علی اعتنائه بعلم الاثر و ضبطه دون اقرانه لاشیاء

ماعرفوھا ، اللھم الا ان یتبین غلطه و وھمه فی الشئ فیعرف ذلک ، فانظر اول شئ الی اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم الکبار والصغار ما فیھم احد الاوقد انفردبسنة فیقال له: ھذا الحدیث لا یتابع علیه ، و کذلک التابعون کل واحد عنده مالیس عند الاخر من العلم"

امام بخاریؒ صاحب کے اس قول سے تو صاف ظاہر ہے کہ صحابہ اورتابعین سے جو روایت لی جاتی تھی، اُس کی توثیق کے لئے اس تحقیق کی حاجت نہ تھی کہ کسی دوسرے نے بھی وہ روایت کی ہے یا اُسی کے معنی میں دوسری روایت بھی وارد ہے یا نہیں۔

تدوینِ کتبِ حدیث

الحاصل آٹھویں اورنویں طبقے والوں کوایک ایک حدیث کے لئے سوسوطریقے معلوم کرنے کی ضرورت تھی، جس کی وجہ سے ایک ایک حدیث سوسوحدیثیں بن جاتی تھیں اور قدماء کی سینکڑوں یا ہزاروں حدیثیں متاخرین کو پہونچنے تک لاکھوں کے شمار میں آجاتی تھیں، جس کا حال پیشتر معلوم ہوا۔ غرض قدماء کے یہاں قلت تعداد احادیث بہ نسبت متأخرین کے ایک لازمی امر ہے۔ اس سے اُس اعتراض کا جواب بھی ہوگیا جو کہا جاتا ہے کہ (متاخرین کو لاکھوں حدیثیں پہونچی ہیں جو مجتہدین کونصیب نہیں ہوئیں)۔ اس لئے لاکھوں حدیثیں پہونچنا مُسلَّم ہے، مگر وہی جو قدماء کو پہونچی تھیں، ان ہی میں اسنادیں کثرت سے لگ کر لاکھوں بن گئیں، ورنہ اُن کو موضوعات کہنا پڑے گا۔ اگر تعمق نظر سے غور کیا جائے تو یہ بات مبرہن ہوجائیگی کہ جس قدر صحیح متون قدماء کو ملے تھے، متأخرین کو نصیب نہیں ہوئے۔ اس وجہ سے کہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ جتنی روایتیں کسی محدث کو پہونچی ہوں یہ ضرور نہیں کہ وہ سب اُن کے شاگردوں کو بھی پہونچ گئیں ہوں۔ دیکھ لیجئے کہ

امام بخاریؒ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں، مگر اُن کے کسی شاگرد نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ سب روایتیں ہم لوگوں کو پہونچ گئیں ہیں۔ اسی طرح امام احمدؒ کی سات لاکھ حدیثوں کا حال ہے۔ اگر وہ ضرور ہوتا تو امام بخاریؒ کو اُن کی وہ کُل حدیثیں پہونچتیں۔ کیونکہ وہ اُن کے ارشد تلامذہ میں تھے، حالانکہ اُن کو صرف لاکھ حدیثیں پہونچیں، وہ بھی امام احمدؒ سے نہیں، بلکہ ایک ہزار استادوں سے۔ اب غور کیجئے کہ پانچویں طبقے تک جو روایتیں پہونچی ہیں، اُن میں سے نویں طبقہ تک کتنی تلف ہوئی ہوں گی؟ پھر جو حدیثیں متاخرین کو پہونچیں اُن میں سے بہت سی ایسی اسنادوں سے پہونچیں، جن سے حدیث میں ضعف آ گیا، بلکہ قابل اعتبار نہ رہیں۔ غرضکہ صحیح حدیثوں کا جو ذخیرہ قدماء کے پاس تھا متأخرین کو نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ ابن تیمیہ نے ''رفع الملام'' میں لکھا ہے کہ ''**بل الذین کانوا قبل جمع هذه الدواوین اعلم بالسنة من المتأخرین یکثر لان کثیرا مما بلغهم و صح عندهم قد لا یبلغنا الا عن مجهول او باسناد منقطع او لا یبلغنا بالکلیة فکانت دواوینهم صدورهم التی تحوی اضعاف ما فی الدواوین و هذا امر لا یشک فیه من العلم القضیة**''۔

یعنی قدماء جو مصنفین کتب حدیث سے پہلے گذرے ہیں، اُن کو حدیث کا علم اُن مصنفین سے بدرجہا زیادہ تھا۔ اس لئے کہ جو روایتیں اُن کو پہونچی تھیں اور اُن کے نزدیک صحیح تھیں، اُن میں بعض مجہول شخصوں کے ذریعہ سے یا منقطع اسناد سے متأخرین کو پہونچی، جس سے وہ صحیح تر ہیں یا بالکل پہونچیں ہی نہیں۔ قدماء کے پاس اگرچہ کتابیں نہ تھیں، مگر اُن کے سینوں میں ان کتابوں سے کئی حصے زیادہ حدیثیں جمع تھیں اور یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی واقف شخص اس میں شک نہیں کرسکتا۔

ابن تیمیہ کی تحقیق کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو صحیح روایتیں امام صاحب کو چار ہزار مستند

استادوں سے پہونچی تھیں، آٹھویں اورنویں طبقے والوں کواُن میں سے ایک حصہ تو پہونچا ہی نہیں۔ اور جو حصہ پہونچا ہے، اُن میں سے بہت سی حدیثیں درجہ صحت سے ساقط ہوگئی ہیں۔ الحاصل اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جو صحیح روایتیں امام صاحب کو پہونچی تھیں وہ کُل امام بخاریؒ کو نہیں پہونچی تھیں اور جو ذخیرہ صحیح حدیثوں کا امام صاحب کے پاس تھا، امام بخاریؒ کے پاس نہ تھا۔ اس تقریر سے اُس اعتراض کا بھی جواب ہوگیا جو کہا جاتا ہے کہ امام صاحب کے زمانہ کے بعد تحقیق اور تدوین احادیث کی ہوئی۔ اس لئے جو حدیثیں صحاح ستہ میں ہیں وہی مستند ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اُس زمانہ میں تحقیق حدیث خوب ہوئی، مگر باقتضائے زمانہ اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردست چھ لاکھ سے زیادہ حدیثیں جن کی صحت امام احمدؒ کے نزدیک مُسلَّم تھی، ضعیف ہوگئیں۔ اگر صحت کا مدار صحاح ستہ ہی پر رکھا جائے تو جن احادیث کی صحت کو طبقہ خامسہ کے اکابر محدثین نے تسلیم کرلیا تھا، جن پر فقہ کا مدار ہے، اُن کو نویں طبقہ والوں کے خیال سے ضعیف بنانا ہوگا۔ جو نہ عقلاً جائز ہوسکتا ہے نہ نقلاً۔ حالانکہ اس طبقہ والوں نے نہ اُن لاکھوں حدیثوں کو ذکر کیا، نہ یہ تصریح کی اُس زمانہ کی کل حدیثیں جو، ان نئی تصنیفوں میں نہیں ہیں سب غلط یا ضعیف تھیں۔ قدماء نے احادیث کو جو مدون نہیں کیا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ تدوین احادیث کا مسئلہ اُس زمانہ میں مختلف فیہ تھا، چنانچہ امام سیوطیؒ نے ''تدریب الراوی'' میں لکھا ہے کہ ابن عمرؓ زید ابن ثابتؓ ابوموسیٰؓ ابوسعید خدریؓ ابوہریرہؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنھم اُس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے کہ یہ حدیث شریف جو مسلم شریف میں ہے: **''ان النبی صلی اللہ علیہ علیہ وسلم قال : لا تکتبوا عنی شیئاً الا القران۔ و من کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ''**۔ یعنی حضرت نے فرمایا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ مت

لکھواور اگر کسی نے کچھ لکھا ہوتو مٹا دے۔

اور بعض روایات، جواز کتابت پر بھی وارد ہیں۔ پھر جو حضرات کتابت کو جائز رکھتے ہیں، انہوں نے بھی تدوین کتب کو جائز نہیں رکھا۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ کتابت حدیث کو جائز رکھتے تھے اور تدوین احادیث میں صحابہ سے مشورہ لیا اور سب نے جمع کرنے کی رائے بھی دی، مگر ہمت نہ ہوئی۔ اور ایک مہینے تک اس باب میں استخارہ کرتے رہے۔ آخر فرمایا کہ میں نے سنن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن مجھے یہ بات یاد آ گئی کہ گذشتہ امتوں کے لوگوں نے کتابیں لکھیں اور انہیں میں مشغول ہو گئے۔ خدائے تعالیٰ کی کتابوں کو چھوڑ کر۔ خدا کی قسم! میں کتاب اللہ کو کسی چیز کے ساتھ ملتبس نہ کروں گا۔ انتہی مخلصاً۔

اور ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میرے والد نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں، ایک رات میں نے اُن کو دیکھا کہ بستر پر بے چین اور کروٹیں بدل رہے ہیں، میں نے پوچھا: کیا کوئی شکایت لاحق ہوئی ہے یا کوئی متوحش خبر پہونچی ہے، جس سے بے چین ہیں؟ کچھ جواب نہ دیا۔ اور صبح ہوتے ہی فرمایا کہ اے لڑکی! وہ احادیث جو تمہارے پاس رکھی ہیں لے آؤ! جب میں لئے گئی تو آگ منگوا کر جلا دیا۔ میں نے جلانے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مر جاؤں اور وہ حدیثیں میرے پاس رہیں اور ان میں کسی ایسے شخص کی روایتیں بھی ہوں جس کو میں نے امانت دار سمجھا اور اُس کے روایتوں کی توثیق کی اور دراصل وہ ایسی نہ ہو، جیسے اُس نے بیان کیا اور میں اُن کے نقل کرنے کا باعث ہو جاؤں۔ انتہی۔

چونکہ وہ ابتدائی زمانہ اسلام تھا اور قاعدہ کی بات ہے کہ ہر چیز کی ابتداء میں کمال درجہ کی احتیاط اور اقسام کی پابندیاں اور رعایتیں ہوا کرتی ہیں۔ اس لئے ایک مدت تک یہ احتیاط جاری رہی کہ جب کسی سے حدیث لیتے تو بہت دیکھ سمجھ کر لیتے اور اُس کی حفاظت میں اس

قدر اہتمام کیا جاتا کہ اپنے ہاتھ کے لکھے پر بھی بھروسہ نہ کرتے اور لفظ بلفظ اُس کو یاد کرتے اور شاگردوں کو پہونچانے کے وقت ذرا بھی شبہ کسی لفظ میں ہوتا تو اُس کی تصریح کردیتے کہ راوی نے یہ لفظ کہا ہے یا وہ لفظ، گو دونوں کے معنی ایک ہی ہوں، جیسا کہ احادیث کے دیکھنے والوں پر یہ امر منکشف ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، طبیعتوں میں احتیاط کم ہونے لگی اور احادیث میں ضعف بڑھنے لگا اور یہ امر مُسلَّم ہوگیا کہ اب احادیث مدون نہ کئے جائیں تو آنے والی نسلوں کو ایک حدیث بھی صحیح نہ پہونچیں گی اس لئے حفاظ حدیث رحمہم اللہ کو قدماء کی احتیاطیں مجبوراً چھوڑنی پڑیں۔

اب غور کیجئے کہ ان پچھلے طبقوں کا قیاس پہلے طبقوں پر کر کے اُن کو بے احتیاط ٹھہرانا اور اُن کی صحیح حدیثوں پر ضعف کا حکم لگانا اور پچھلے طبقوں کی حدیثوں کو مستند قرار دینا، کس قدر بے موقع ہے اور الٹی بات ہے۔

اس مقام میں یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ صحابہ جب ہر طرف متفرق ہوگئے تو جو حدیثیں اُن کو معلوم تھیں وہ روایت کرتے اور جن امور میں کوئی حدیث اُن کے پاس نہ ہوتی تو قیاس کرتے۔ اسی وجہ سے اختلافات واقع ہوئے اور ہر شہر کے فقہاء نے اُسی حدیث اور قیاسات کو قبول کیا، جو اُن کے اسلاف میں مروج تھے۔ چنانچہ امام محمدؒ کی ''کتاب الآثار'' سے ظاہر ہے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اقران کے مذہب پر تھے۔

امام صاحب کسی کے مقلد نہ تھے

یہ درست ہے کہ صحابہ جب متفرق ہوئے تو، کل احادیث کسی خاص شہر میں نہ رہے، بلکہ متفرق ہوگئے۔ اور اختلاف پیدا ہوا، اسی وجہ سے جب ہارون رشید نے امام مالکؒ سے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ موطا کو کعبہ شریف میں لٹکا دوں اور حکم کروں کہ اسی پر عمل کیا جائے''

امام مالکؒ نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ صحابہ شہروں میں متفرق ہوگئے اور اُن کی حدیثوں پر عمل ہوگیا ہے۔ مقصود یہ کہ موطا کی کل حدیثیں واجب العمل نہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ناسخ اور واجب العمل نہ ہوں دوسرے شہروں میں پہونچی ہوں اور اگر تلف ہوجائیں تو صحابہ اور تابعین نے جو کوششیں اشاعت علوم میں کی ہیں ضائع ہوجائیگی۔ اور دین صرف چند حدیثوں میں محدود ہوجائیگا۔ امام مالکؒ چونکہ دین کے خیر خواہ تھے اور خود پسند نہ تھے، اس لئے اپنی کتاب کو واجب العمل بنانا پسند نہیں کیا، تاکہ وہ کافی سرمایہ جو اسلامی دنیا میں شائع ہو چکا تھا، مجتہدوں کے ہاتھ سے جاتا نہ رہے۔ چنانچہ وہ کل سرمایہ امام صاحب کے ہاتھ آیا، جیسا کہ خزانہ داران علم حدیث اور اُن اکابر محدثین کے بیان سے ثابت ہے جن پر صحیح حدیثوں کی اسنادوں کا مدار ہے۔ اور جوق جوق محدثین جو ہر ملک و دیار سے آکر شریک حلقہ ہوکر اپنا اپنا فراہم کیا ہوا صحیح حدیثوں کا سرمایہ پیش کرتے تھے، وہ علاوہ تھا اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ امام صاحب، ابراہیم وغیرہ کے مذہب پر تھے، جیسا کہ امام محمد صاحب کی ''کتاب الآثار'' سے معلوم ہوتا ہے، سو یہ خلاف واقع ہے۔ اس لئے کہ ابن مبارکؒ وغیرہ کے اقوال سے ثابت ہے کہ امام صاحب کسی کے مذہب کے مقلد اور پابند نہ تھے۔ بلکہ علم اور تفقہ میں اُن کا وہ مرتبہ تھا کہ ''سید الفقہاء'' سمجھے جاتے تھے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اکابر تابعین کے زمانہ میں اگر وہ اس حالت پر ہوتے تو وہ بھی مثل اعمشؒ کے اُن کی طرف محتاج ہوتے۔ قابل حیرت یہ بات ہے کہ امام صاحب، ابراہیمؒ کے مقلد بنائے جاتے ہیں، حالانکہ جریرؒ امام احمدؒ وغیرہ کے استاذ ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے مغیرہؒ نے وصیت کی کہ ابو حنیفہؒ کے حلقہ کی ملازمت کروں: کیونکہ وہ ایسے شخص ہیں کہ اگر ابراہیم بھی اس وقت زندہ ہوتے تو اُن کی طرف محتاج ہوتے۔ **کمافی مناقب الکردری۔**

دیکھئے! اُس زمانہ کے اکابر محدثین کے حالات اور آخری زمانہ والوں کے خیالات میں

کس قدر تفاوت ہے۔ اور ابو عاصم نبیلؒ کا قول آپ نے دیکھ لیا کہ وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ سفیان ثوری تو کیا ابوحنیفہ۔ ابن جریج سے بھی افقہ ہیں۔ اور مقاتل ابن حیان کا قول بھی اوپر مذکور ہوا کہ میں تابعین کو بھی دیکھا اور تبع تابعین کو بھی، مگر ابوحنیفہ کے جیسا نکتہ رس اور صاحبِ بصیرت نہیں دیکھا اور یحیٰی ابن آدم کا قول بھی اوپر لکھا گیا، وہ کہتے ہیں کہ شریک اور داؤد امام صاحب کے علم کے مقابلہ میں گویا کمسن لڑکے ہیں، کاش وہ ان کا قول سمجھ ہی لیتے، حالانکہ یہ دونوں صاحب فقہ مشہور تھے۔

غرضکہ مذکورہ اقوال محدثین کو کوئی دیکھ لے تو اُس کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہ آئیگی کہ امام صاحب کسی کے مذہب پر تھے بلکہ یہ سمجھ جائیگا کے سربرآوردہ محدثین اُن کے مذہب پر فتویٰ دیتے اور اُن کی تقلید کرتے تھے۔ اور یہ بھی معلوم کرلیگا کہ اُن کے اجتہاد کا مدار صرف اُن چند آثار پر نہیں جو ''کتاب الاٰثار'' میں ہیں۔ بلکہ چار ہزار استادوں سے انہوں نے حدیث لی ہیں اور صدہا محدثین ہر ملک سے ذخیرے احادیث کے فراہم کر کے اُن کے حلقہ میں پیش کرتے تھے۔ صرف عبداللہ ابن مبارک ہی کے تبحر کو دیکھ لیجئے کہ محدثین نے کیا لکھا ہے۔ ''تذکرۃ الحفاظ'' میں امام ذہبی لکھتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں اُن سے زیادہ حدیث کی تلاش اور طلب کرنے والا کوئی نہ تھا۔ چار ہزار استاذ سے انہوں نے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ اگر اُن تمام دور دور سے آنے والے محدثین سے قطع نظر کر کے صرف عبداللہ ابن مبارکؒ کی دائمی حضوری امام صاحب کے پاس تصور کرلی جائے اور یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ امام صاحب سے زیادہ اُن کو حدیثیں یاد تھیں تو کیا کوئی عقلمند خیال کرسکتا ہیکہ امام صاحب کا سرمایۂ اجتہاد صرف ستر (۷۰) حدیثیں یا وہی آثار تھے جو ''کتاب الاثار'' میں لکھے ہیں؟ امام احمدؒ نے یہ کہاں لکھا ہے کہ امام صاحب کے اجتہاد کا مدار صرف ان ہی چند آثار پر ہے جو ''کتاب الاثار'' میں لکھے گئے؟۔

امام بخاریؒ غسل کر کے دو رکعت پڑھ کے ایک حدیث لکھتے تھے

بات یہ ہے کہ ہر مصنف کو تصنیف کے وقت ایک غرض ملحوظ ہوتی ہے، جس کو وہ پوری کرتا ہے۔ ''فتح الباری'' میں امام بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر ایک حدیث کے لکھنے سے پہلے وہ غسل کر کے دو رکعت نماز پڑھتے، جس سے سولہ برس میں وہ کتاب یعنی بخاری شریف پوری ہوئی۔ اور جتنی حدیثیں اُس میں لکھی گئیں سب صحیح ہیں اور اُن سے کئی حصے زیادہ صحیح حدیثیں چھوڑ دی گئیں۔ انتہی۔

اب دیکھئے! کہاں ایک لاکھ صحیح حدیثیں جو اُن کو یاد تھیں اور کہاں سات ہزار دوسو پچھتر جو اُس میں لکھی گئیں جیسا کہ فتح الباری میں بیان کیا ہے۔ اگر بالالتزام اور اہتمام وہ چھوڑ دیتے تو سولہ سال سے کم مدت میں ایک لاکھ حدیثیں اُس کتاب میں لکھ سکتے تھے۔ مگر پوری حدیثیں جمع کرنا اُن کو منظور ہی نہ تھا۔ اسی طرح امام صاحب کو ''کتاب الاثار'' کے لکھنے سے یہ مقصود نہ تھا کہ امام صاحب کے اجتہاد کا کل مادہ فراہم کر دیں بلکہ صرف ابراہیمؒ اور اُن کے چند اقران کا مذہب بیان کرنا مقصود تھا۔ جو امام صاحب کے اجتہاد کے مطابق ہو گیا، تاکہ اہل کوفہ کا توحش جو امام صاحب کے اجتہاد سے پیدا ہوا تھا، جاتا رہے۔

الحاصل امام صاحب کے اجتہاد کا سرمایہ صرف علماء کوفہ کے اقوال یا وہیں کی مرویات نہ تھیں بلکہ اسلامی ممالک کی کل حدیثیں اُن کے اجتہاد کے وقت اُن کے پیش نظر تھیں۔

یہاں شاید یہ سوال ہوگا کہ کل احادیث کا علم ایک شخص کو حاصل ہونا تقریباً محال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت قرائن اسی بات پر دال ہیں کہ کسی محدث کو پوری حدیثیں نہ ملی ہوں گی، چنانچہ اس سے ظاہر ہے کہ باوجودیکہ امام بخاریؒ کا شوق اور حافظہ مافوق العادت تھا، مگر سات لاکھ صحیح حدیثیں اُن کو بھی نہیں پہونچیں، حالانکہ وہ امام احمدؒ کے شاگرد خاص تھے۔ اگر کروڑ حدیثیں اُن کی مرویات کو صحیح نہ ہونے کی وجہ سے نہیں لیا تھا تو

سات لاکھ صحیح حدیثیں تو اُن سے ضرور لی ہوتیں، اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح روایتیں اُن سے لی تو تھیں مگر اُن میں سے چھ لاکھ ضعیف ہوگئیں۔ اس لئے کہ امام احمدؒ اُن کے نزدیک مستند شخص تھے، جس حدیث کو وہ صحیح کہہ دیتے اُن کو اُس کی صحت کا اعتراف کرنا ضرور ہوتا۔ اور امام احمدؒ کوئی گمنام شخص نہ تھے، بلکہ امام الوقت اور شہرۂ آفاق تھے اور اس قدر زمانہ بھی اُن کو مل گیا تھا کہ لاکھوں حدیثیں لے سکتے تھے کیونکہ امام احمد کا انتقال ۲۳۵ھ دوسو پینتیس ہجری میں ہے اور امام بخاریؒ کی ابتدائی طالب علمی ۲۰۵ھ دوسو پانچ ہجری میں ہے۔

فقہ حنفیہ سے کوئی حدیث خارج نہیں

جیسا کہ ''طبقات الحفاظ'' سے ظاہر ہے اور مقدمہ ''فتح الباری'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے علی ابن مدینی اور امامؒ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کو پوری بخاری شریف سنائی اور سوائے چار حدیثوں کے کل کتاب کی انہوں نے تحسین کی۔ غرض کہ رفع موانع اور وجود اسباب سے یہ بات قرین قیاس تھی کہ امام احمدؒ کے پاس جتنے صحیح حدیثیں تھیں امام بخاری کو پہونچتیں، مگر نہ پہونچیں۔ اس کے بعد کیونکر توقع ہوسکتی ہے کہ کسی کو پوری صحیح حدیثیں پہونچی ہوں گی۔ اگر چہ اس پر قیاس کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام صاحب کو بھی کل حدیثیں نہ پہونچی ہوں گی، مگر یہ کہنا تو بے موقع نہ ہوگا کہ جتنے حدیثیں امام بخاریؒ کو ایک ہزار استاذ سے پہونچی ہیں امام صاحب کو چار ہزار استاذ سے اُن سے زیادہ پہونچیں۔ پھر امام صاحب کے اجتہاد کا مدار صرف انہی روایتوں پر نہ تھا جو، اُن کو اُن کے اساتذہ سے پہونچی تھیں بلکہ ہر ملک کی حدیثوں کا ذخیرہ فراہم کر کے جوق جوق محدثین، امام صاحب کے روبرو پیش کرتے تھے اور اجتہاد کے وقت وہ سب پیش نظر رہتا تھا، چنانچہ یہ بات ابھی معلوم ہوئی کہ اعمشؒ سے اگر کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو فرماتے کہ ابوحنیفہ کے حلقہ میں جاؤ،

وہاں جو مسئلہ پیش ہوتا ہے، اُس پر وہ لوگ یہاں تک غور کرتے ہیں کہ وہ روشن ہو جاتا ہے۔
اس موقع میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ''جتنی حدیثیں ممالک اسلامیہ میں پہونچی تھیں، وہ کل امام صاحب کے اجتہاد کے وقت موجود تھیں'' تو کچھ بے موقع نہ ہوگا۔ بلکہ بعض محدثین نے تو صاف کہدیا کہ صحابہ کا کل علم امام صاحب اور اُن کے اصحاب میں موجود تھا، جس سے ثابت ہے کہ فقہ حنفیہ سے کوئی حدیث خارج نہ رہی۔ اسی وجہ سے اکابر محدثین اور خزان حدیث نے اُن کے اقوال پر فتویٰ دیئے اور اُن کی فقہ کی توثیق کی۔
کردریؒ نے ''مناقب'' میں ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ **''ما افتی الامام الا من اصل محکم''** یعنی امام صاحب کا ہر فتویٰ ایک اصل محکم پر مستند ہے۔
قرآن وحدیث پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ امام صاحب کو محدثین نے اہل رائے میں لکھا ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ وہ رائے سے مسئلے تراشتے تھے۔

امام صاحب کے اہل الرائے ہونے کا مطلب

قبل اس کے کہ اس اعتراض کا جواب دیا جائے رائے کی معنی بیان کرنے کی ضرورت ہے۔
''منتہی الارب'' میں لکھا ہے کہ رائے کے معنی بینائی دل کے ہیں اور اسی کو بصیرت بھی کہتے ہیں۔ ''فرائد اللغۃ'' میں لکھا ہے: **البصیرۃ فی القلب کالبصر فی العین، البصیرۃ تدرک المعقولات والبصر المحسوسات۔**
یہی بصیرت ہے، جس نے ایک جماعت کو عوام الناس سے ممتاز کر کے اعلیٰ درجہ کے خطاب الٰہی کا افتخار بخشا۔ **کما قال اللہ تعالیٰ ''فاعتبروا یا اولی الابصار''**
اسی بصیرت اور بینائی دل کو حق تعالیٰ نے اور ناموں سے ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے: **''ان فی ذلک لایات لاولی النهی . و قوله تعالی و واتقون یاولیٰ الالباب''**
ان احتمالات سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ بینائی دل کے سواء کوئی چیز نہیں، مگر ''فرائد

اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''**الرأی هو استحضار المقدمات و اجالة الخاطر فیها**'' اس معنی کے لحاظ سے رائے عقل کی اُس کیفیت کا نام ہوگا جو نظر و فکر میں کام دیتی ہو، اور بحسب کمی وزیادتی عقل، اُس کی بھی کمی وزیادتی ہوتی ہے۔

رائے کے یہ معنیٰ لفظ فقہ کے معنی کے قریب قریب ہیں جیسا کہ ''اساس البلاغۃ'' کی اس عبارت سے مستفاد ہے کہ ''**شهدت علیک بالفقه ای بالفهم و الفطنة**'' اور ''رقایق'' میں علامہ زمخشری نے لکھا ہے: ''**فقهت ای فطنت الحق و انفقته حقیقه الشق و الفتح . و الفقیه : العالم الذی یشق الاحکام و یفتش عن حقائقها و یفتح ما استغلق منها**''۔

حاصل یہ کہ فقہ اُس سمجھ کو کہتے ہیں جس سے موشگافیاں کر کے مسائل و احکام کا انکشاف کیا جاتا ہے، جس سے اغلاق اُن کا جاتا رہے۔ غرضکہ رائے، فقہ اور فہم، عقل سے متعلق ہیں۔ اور اُن چیزوں کا کمال عقل کے کمال کے ساتھ وابستہ ہے۔

اب عقل کو دیکھئے کہ فی نفسہ کیسی شریف چیز ہے، جہاں قرآن وحدیث میں عقل کا ذکر آتا ہے اُس سے عقل کی مدح اور تحسین ثابت ہوتی ہے، مثلاً ''**ان فی ذٰلک لاٰیات لاولی النهی . ان فی ذالک لایات لقوم یعقلون**'' وغیرہ اور جہاں بے عقلی مذکور ہے، اُس سے مذمت مقصود ہے ''**کما قال الله تعالیٰ : صم بکم عمی فهم لا یعقلون**''۔

اس میں شبہہ نہیں کہ عقل فی نفسہ ایک نعمت عظمیٰ ہے، جس کی تعریف ممکن نہیں۔ کیونکہ اسی عقل نے آدمی کو حیوانات سے جدا کر کے ممتاز بنایا۔ اسی عقل نے مسلمانوں کو کافروں سے علحدہ کر کے **اعلی علیین** تک پہونچادیا۔ ہرچند کفار کو جانوروں سے ممتاز بنانے والی عقل ہی ہے، مگر خدائے تعالیٰ نے اُس کا اعتبار نہ کر کے اُن کو بے عقل فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''**لهم قلوب لا یفقهون بها الی قوله ــ اولئک کالانعام بل هم اضل ـ و قوله تعالیٰ : فهم لا یعقلون**'' وجہ اُس کی یہ ہے کہ وہ اپنی عقلوں

سے باتیں بنا کر خدا اور رسول کے کلام کی مخالفت کیا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ کوئی مسلمان متدین یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ اپنی رائے اور قیاس سے قرآن وحدیث کی مخالفت کرے۔ مثلاً وہ لوگ عقل کی پیروی سے خدا کو اپنے پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ خدا کو بھی اولاد ہے۔ اور اپنی قدرت پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ مردوں کو زندہ کرنے کی اُس میں بھی قدرت نہیں۔ اور رسول کو اور آدمیوں پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک قسم کی مجنون تھے۔ اسی قسم کے اور بہت سارے مسائل ہیں کہ نصوص کے مقابلہ میں اپنے قیاسات وہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حق تعالیٰ نے ''قوم لا یعقلون'' فرمایا۔ ایسے قیاسات ہمارے دین میں ممنوع ہیں اور انہی کی شان میں ''اول من قاس ابلیس'' وارد ہوا ہے۔

اور عقل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ابلیس کو دیا، تو اُس نے یہ قیاس قائم کیا کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش خاک سے ہے اور اپنی پیدائش آگ سے، جو مشت خاک سے لطیف و عالی ہے، اور عالی نژاد کا کثیف الاصل کو سجدہ خلاف شان ہے۔ گو عقلائے دہر اس قیاس کی داد دیتے ہوں گے، مگر اہل ایمان تو یہی کہیں گے کہ قیاس کیسا ہی پرزور ہو، نص قطعی کے مقابلہ میں اُس کو پیش کرنا، باعث لعنت الٰہی ہے۔ ایسے قیاسوں میں بے شک ابلیس کی پیروی ہے جس سے ''اول من قاس ابلیس'' صادق آتا ہے اور صحابہ وغیرہ اہل حق اس قسم کے قیاسوں سے احتراز کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے کہ ''عن عبد اللہ بن جبیر ، قال : رأیت علیاً دعا بالماء لیتوضأ ، فمسح یدیه مسحا و مسح علی قدمیه . و قال : هذا وضوء من لم یحدث . ثم قال : لو لا انی رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم مسح علی ظهر قدمیه رایت ان بطونها احق الحدیث'' خلاصہ یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے قدموں کے اوپر مسح کر کے فرمایا

کہ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مسح کرتے نہ دیکھتا تو اپنی رائے سے بطون اقدام پر مسح کرتا مگر چونکہ وہ رائے مخالف حدیث ہے، اس لئے اُس کو ترک فرمایا۔ اسی طرح امام صاحب نے بھی کئی نظائر پیش کئے کہ احادیث کی وجہ سے انہوں نے اپنی رائے کو ترک کردیا، جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔

غرض کہ جو رائے نص قطعی کے مخالف ہو اُس سے احتراز کی ضرورت ہے۔

الحاصل آیات واحادیث سے ثابت ہے کہ جس طرح عقل اور رائے کی تعریف میں آیات وارد ہیں، اُس کی مذمت بھی وارد ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ رائے کی دو قسمیں ہیں: ایک ''مذموم'' جو مقابل نصوص ہو۔ اور دوسرے ''محمود'' جو ایسی نہ ہو۔ اور جن روایتوں میں رائے کی مذمت ہے، اُس سے رائے مذموم مراد ہے۔ مثلاً: عمرؓ کا یہ قول جو کنز العمال میں ہے کہ ''**ایاکم و اصحاب الرأی فانھم اعداء السنۃ ...... الحدیث**'' عمرؓ نے فرمایا: اصحاب الرائے سے بچو، کیونکہ وہ اعدائے سنت ہیں!۔ اس طرح ابن عباسؓ کا قول جو ''درمنثور'' میں ہے۔ ''**ایاکم و الرائی**'' یعنی رائی سے بچتے رہو!۔ دیکھئے! عمرؓ نے اصحاب الرائے کو ''**اعداء السنۃ**'' کہا، اس سے ظاہر ہے کہ رائے مذموم مراد ہے! اس لئے کہ جب اہل باطل کو منظور ہوتا ہے کہ جو کچھ اپنی رائے میں آئے اس پر عمل کریں تو وہ احادیث کو رد کردیتے ہیں۔

اسی وجہ سے معتزلہ صحت حدیث کے لئے اپنی شرطیں لگائیں کہ کوئی حدیثِ صحیح باقی نہ رہے۔ اسی طرح قادیانی وغیرہ فرق باطلہ میں مشاہد ہے کہ حدیث کو ساقط الاعتبار بنانے کی تدبیریں نکالتے جاتے ہیں، بخلاف ان کے، امام صاحب تو حدیث مرسل کو بھی صحیح سمجھتے ہیں اور رائے پر مقدم رکھتے ہیں۔ حالانکہ محدثین نے اپنی رائے سے اُس کو دائرہ صحاح سے خارج کردیا ہے۔

امام صاحب محدثین سے زیادہ حدیث کے پیرو ہیں

اب غور کیجئے کہ امام صاحب رائے کے زیادہ پیرو ہیں یا محدثین؟ اور امام صاحب حدیث کے زیادہ معتقد اور محبّ ہیں یا محدثین؟ مروی ہے کہ امام جعفر صادقؒ کہا کرتے تھے کہ اس اُمت کا بڑا فتنہ وہ قوم ہے جو اپنی رائے سے قیاس کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنادیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ حرام کو حلال بنانا، اُسی مذموم رائے کا کام ہے جو مخالفِ قرآن وحدیث ہے۔ الحاصل جو رائے، مخالفِ قرآن وحدیث ہو اُس کے مذموم ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ چنانچہ خود امام صاحب بھی اُس سے ڈراتے ہیں، جیسا کہ امام شعرانیؒ نے ''میزان'' میں ''فتوحات مکیہ'' سے نقل کیا ہے: **''ان ابا حنیفة کان یقول : ایاکم والقول فی دین الله بالرأی ، و علیکم باتباع السنة''** ! یعنی امام صاحب کہا کرتے تھے کہ اللہ کے دین میں کوئی بات رائے سے کہنا درست نہیں، اُس سے بچو اور سنت کی اتباع کرو۔

جب امام صاحب خود یہ فرمارہے ہیں تو یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے امر کے مرتکب تھے جس کو خود وہ بُرا سمجھتے تھے۔ اگرچہ باقتضائے بدگمانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا قول کچھ تھا اور عمل کچھ، صرف دھوکا دینے کی غرض سے رائے کی بُرائیاں بیان کیا کرتے تھے۔ مگر یاد رہے کہ اس بدگمانی کا بُرا اثر دور تک پہونچے گا، کیونکہ اسی کتاب کی بحث اجتہاد و قیاس میں معلوم ہوا کہ صحابہ اپنی رائے سے قیاس کیا کرتے تھے، حالانکہ وہ حضرات دین میں رائے لگانے کو بُرا سمجھتے تھے۔ چنانچہ ابھی معلوم ہوا کہ عمرؓ نے اصحاب الرائے سے اور ابن عباسؓ نے رائے سے ڈرایا ہے۔ باوجود اس کے عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے فتویٰ دیا کرتے تھے جیسا کہ امام شعرانیؒ نے ''میزان'' میں لکھا ہے کہ عمرؓ جب فتویٰ دیتے تو فرماتے : **''ھذا رأی عمرؓ فان کان صواباً فمن الله ، و ان کان خطأ فمن عمر''**

یعنی یہ عمر کی رائے ہے، اگر صواب پر ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا پر ہے تو عمر کی طرف سے ہے۔

اس موقع میں یہ کسی نے نہیں پوچھا کہ حضرت! رائے تو بُری چیز ہے، جس سے آپ خود ڈراتے ہیں، پھر آپ رائے سے فتویٰ کیوں دیتے ہیں؟

کاش! امام صاحب کے مخالف اُس وقت ہوتے اور یہ پوچھ لیتے، جس کا خاطر خواہ جواب ملتا اور ہمیشہ کا جھگڑا امٹ جاتا۔ اور سنن دارمی میں ہے: **عن عروة عن مروان بن الحكم قال : قال لی عثمان بن عفان : ان عمر قال لی انی قد رأیت فی الجد رأیًا فان رایتم ان تتبعوه فاتبعوه . قال عثمان ان نتبع رأیک فانه رشد و ان نتبع رأی الشیخ قبلک فنعم ذو الرأی کان ، فکان ابو بکر یجعله ابا.**

یعنی عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جد کی میراث کے بارے میں، میں نے ایک رائے سوچی ہے، اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو اُس کی اتباع کرو۔ انہوں نے کہا: اگر ہم آپ کی رائے کی اتباع کریں تو وہ بھی رشید ہے، لیکن آپ سے پہلے کے بزرگ یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عمدہ، ذی رائے تھے، اُن کی رائے کی اتباع کریں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے جد کو باپ قرار دیا تھا۔ انتہی۔

دیکھئے! عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں بھی اپنے رائے بیان کی اور عثمان رضی اللہ عنہ نے اُس کی، تعریف کی لیکن صدیق اکبرؓ کی رائے کو ترجیح دی اور اُن کو اعلیٰ درجہ کے صاحب رائے کہا۔

اب غور کیجئے کہ صدیق اکبرؓ باوجود صدیقیت کے، جب صاحب رائے ہوں تو ابوحنیفہ کا صاحب رائے ہونا کیوں قابل طعن ہو؟ بلکہ غور کیا جائے تو امام صاحب کی کمال فضیلت اس سے ثابت ہوتی ہے ''**ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء**''۔

یہاں یہ بھی معلوم کرلیا جائے کہ جس طرح عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کے ماننے پر جبر نہیں کیا، اس طرح امام صاحب بھی جبر نہیں کیا کرتے تھے، جیسا کہ ''الخیرات الحسان'' میں امام صاحب کا قول نقل کیا ہے: ''**ھذا الذی نحن علیه رأی لا یجبر علیه احد**'' ۔ اب غور کیجئے کہ امام صاحب کس قدر صحابہ کے متبع تھے کہ بات بات میں اتباع کو ملحوظ رکھتے تھے۔

''دارمی'' میں یہ روایت بھی ہے: ''**عن طاؤس ، قال : ربما رای ابن عباس الرأی ثم ترکه**'' یعنی بار بار ایسا ہوتا تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کسی مسئلہ میں کوئی رائے سوچتے، پھر اُس کو ترک دیتے تھے۔

یہی حال امام صاحب کا تھا کہ جب کوئی نئی دلیل پیش نظر ہو جاتی تو سابق کی رائے سے رجوع کر جاتے۔ اسی وجہ سے محدثین کا ایک اعتراض امام صاحب پر یہ بھی تھا کہ اُن کی بات میں قیام نہیں، جس کا حال سابقاً معلوم ہوا۔

الحاصل امام صاحب کے قول و فعل میں مخالفت کا گمان کرنا صحابہ پر الزام لگانا ہے حالانکہ یہ الزام نہ صحابہ پر عائد ہوسکتا ہے نہ امام صاحب پر۔ کیونکہ جس رائے کی برائی ان حضرات نے بیان کی ہے وہ رائے مذموم ہے، جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ اور جس رائے کا وہ استعمال کرتے تھے اُس کی اجازت قرآن و حدیث سے ثابت ہے، جس کو ہم بحث اجتہاد میں ثابت کر، آئے ہیں۔ بحث قیاس میں حدیث معاذؓ مذکور ہوئی کہ ''**اجتهد برائی و لا اکف**''۔ دیکھئے! خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو انہوں نے عرض کی کہ رائے لگانے میں ہرگز کمی اور کوتاہی نہ کرونگا۔

اور ربیعہؒ کا قول بھی مذکور ہوا کہ ''**ترک القرآن موضعا للسنة وترکَتِ السنة موضعا للرأی**'' یعنی جس طرح قرآن نے حدیث کی جگہ چھوڑ رکھی ہے، حدیث نے

رائے کی جگہ چھوڑ رکھی ہے۔

صحابہ میں اہلِ رائے کا فتویٰ چلتا تھا

''کنزالعمال'' میں یہ روایت ہے: **عن القاسم ان ابابکر الصدیقؓ کان اذا نزل به امر یرید فیه مشاورة اهل الرائی واهل الفقه دعا رجالا من المهاجرین والانصار ، و دعا عمر و عثمان ، و علیاً و عبد الرحمن بن عوف و معاذ بن جبل و ابی بن کعب و زید بن ثابت ، و کل هٰولاء کان یفتی فی خلافة ابی بکر ، و انما تصیر فتوی الناس الی هٰولاء ، فمضی ابوبکر علی ذلک ثم ولی عمر فکان یدعوا هؤلاء النفر و کانت الفتوی تصیر و هو خلیفة الی عثمان و ابی و زید . ''ابن سعد''۔**

ماحصل اس کا یہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عمرؔ عثمانؔ علیؔ عبدالرحمٰن بن عوفؔ معاذ بن جبلؔ ابیؔ اور زید رضی اللہ عنہم اہل رائے اور اہل فقہ تھے، ان ہی کا فتوی چلتا تھا، اُن کے بعد بھی ان ہی کا فتوی جاری رہا۔

اب دیکھئے کہ تخمیناً ایک لاکھ صحابہ میں سے فتویٰ کے لئے یہ چند حضرات جو اہل رائے اور اہل فقہ تھے، منتخب کئے گئے تھے، حالانکہ اہل حدیث کُل صحابہ تھے، کیونکہ فن حدیث کی ابتدا انہیں سے تھی، اس لئے کہ ان ہی حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث لیکر دست بدست امت کو پہونچایا، پھر اُن کے اہل حدیث ہونے میں کیا شبہ؟ بلکہ ممکن نہیں کہ اُن کی سی اہلیت اہل بیت کے بعد کسی طبقہ میں پائی جائے، باوجود اُس کے اُس خیر القرون میں اُن کا فتویٰ مستند تھا: بلکہ وہ سب کے سب اہل رائے اور اہل فقہ کے محتاج تھے اور اس میں کسی صحابی نے اختلاف بھی نہیں کیا۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ باجماعِ صحابہ فتویٰ دینے کی اہلیت صرف اہل رائے اور اہل فقہ میں منحصر ہے اور اوائل زمانۂ تابعین میں

بھی خاص خاص حضرات جو اہل رائے وفقہ سمجھے جاتے تھے اور باوجودیکہ اہل حدیث اُس وقت بکثرت تھے، مگر فتویٰ اُن کا نہیں چلتا تھا، جیسا کہ کتب رجال سے واضح ہے۔ اُسی قرن کے آخر میں جب امام صاحب اس درجہ کو پہونچے کے آپ کی رائے اور فقہ مسلم ہوگئی اور ایک جماعت کو آپ نے تعلیم دے کر اس قابل بنایا کہ مسائل میں رائے دے سکیں۔ اُس وقت شیوخ، محدثین وہ متبرک لقب جو صحابہ کرام کے زمانہ میں ایک منتخب جماعت کے ساتھ مختص تھا، ان کی جماعت کو عطا کیا۔ چنانچہ یہ حضرات اہل الرّائے اور امام صاحب، **امام اھل الرائے** مشہور ہوئے۔ امام شعرانیؒ نے ''میزان'' میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں جو قاضی تھے اُن کا انتقال ہوا اور خلیفہ وقت نے حکم دیا کہ اس خدمت کے اہل تلاش کئے جائیں، تو علما نے کہا کہ ابوحنیفہ سے افقہ اوراورع کوئی نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ آپ اُس زمانہ میں ممتاز اور منتخب تھے۔ بہرحال اہلحدیث نے آپ کو امام اہل الرائے تسلیم کرلیا ہے، چنانچہ اب تک آپ کے پیرو اسی لقب کے ساتھ ملقب ہیں۔ **الحمد لله علی ذٰلک** ۔

یہاں یہ خیال نہ کیا جائے کہ امام صاحب کی جماعت کو جو اُس زمانہ کے محدثین نے ملقب بلقب ''اہل الرائے'' کیا تھا، وہ بدنیتی سے تھا، جس طرح آخری زمانہ کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو صحابہ فتویٰ کے لئے منتخب کئے گئے تھے، ان کی وجہِ تخصیص اور باعث انتخاب یہی صفت تھی کہ وہ اہل رائے اور اہل فقہ تھے، جیسا کہ روایتِ مذکورۂ بالا سے ثابت ہے، سو یہ صفت علی وجہ اتم امام صاحب میں موجود تھی، چنانچہ امام باقر، امام جعفر صادق، امام مالک، اسحاق بن راہویہ، سفیان ثوری' سفیان بن عیینہ' ابن مبارک، یحییٰ بن آدم، وکیع، امام شافعی، مکی بن ابراہیم' ابوداؤد، عیسیٰ بن یونس، عبداللہ بن نمیر' رقبہ بن مسقلہ، عبدالرحمٰن مسعودی، مقری' خلف بن ایوب' عفان

بن سیار، حسن بن عمارہ، عبداللہ بن اسحٰق، معمر، معروف بن حیان، عطان بن جبلہ وغیرہ اکابر محدثینؒ کی گواہی سے ثابت ہے کہ اُس زمانہ میں امام صاحب سے **افقہ** اورزیادہ سمجھدار کوئی نہ تھا۔

اور حفص بن غیاث، ابن مبارک، مقاتل بن حیان، شعبہ، علی بن عاصم، خارجہ بن مصعب، بکر بن خنیس، یزید بن ہارون، امام شافعیؒ وغیرہ کی گواہی سے ثابت ہے کہ امام صاحب سے **اعقل** کوئی اُس زمانہ میں نہ تھا۔اور ابھی معلوم ہوا کہ رائے اور عقل ایک ہی چیز ہے، یا دونوں متلازم ہیں۔

غرضکہ اکابر محدثین امام صاحب کو رائے اور تفقہ میں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔اور اُن کو معلوم تھا کہ یہی صفات باعث انتخاب وامتیاز افراد صحابہ تھے،جن کی وجہ سے وہ فتویٰ دینے کے قابل سمجھے گئے تھے۔پھر انہی حضرات نے امام صاحب کے فتویٰ کو مستند اور قابل نفاذ بیان کیا بلکہ بعض حضرات نے تو تصریح کردی کہ فقہ حنفیہ پر یعنی امام صاحب کے فتووں پر اجماع ہوگیا۔تو اب غور کیجئے کہ ان حضرات نے لقب اہل الرائے تجویز کرنے کے وقت اُس منتخب جماعت صحابہ کو پیش نظر رکھا تھا، جو اہل رائے اور اہل فقہ سمجھی گئی تھی یا اُس بے دینوں کی جماعت کو جو اَلَلّہا نہ قیاس کیا کرتی تھی؟

اگر اتنی کھلی شہادتوں اور واضح قرائن کے بعد بھی خیال کیا جائے کہ لقب اہل الرائے سے توہین مقصود ہے تو سوائے انا للہ پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ احمد بن شعبہ جو امام اور شیخ وقت سمجھے جاتے تھے اور یحییٰ بن معین کے رفیق تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ جو شخص علم فطن کا طالب ہو، اُس کو چاہئے کہ آثار کو طلب کرے اور جو شخص علم خبر یعنی حدیث کا طالب ہو، اُس کو رائے کی ضرورت ہے۔انتہی۔

دیکھئے! علم حدیث کے لئے انہوں نے رائے یعنی فقہ کو ضروری قرار دیا۔ اس لئے کہ احادیث کا سمجھنا اور اُن پر تطبیق دینی ہر کسی کا کام نہیں۔ اسی وجہ سے عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ احادیث وآثار کے لئے ابوحنیفہ کی ضرورت ہے۔ اور ابن معینؒ نے فرمایا ''الرأی رأی ابی حنیفۃ، علیہ ادرکت الناس''

''جامع بیان العلم و فضلہ'' میں ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے اوزاعیؒ کہا کرتے تھے کہ سلف کے اقوال کو مت چھوڑو۔ اگرچہ تم کو لوگ ترک کردیں اور لوگوں کی رایوں سے بچتے رہو، اگرچہ وہ اپنے اقوال کو آراستہ کر دکھائیں۔ انتہی۔

دیکھئے! رائے سے اُن کو کس قدر احتراز تھا اور سلف کی پیروی کس درجہ ملحوظ تھی۔ باوجود اس کے آپ نے دیکھ لیا کہ امام صاحب کی کیسی تعریفیں انہوں نے کیں اور صاف کہدیا کہ ہم عطار ہیں اور آپ طبیب۔ اور امام صاحب کی نسبت جو بدگمانی تھی اُس سے توبہ کی، جس کا مطلب ظاہر ہے کہ امام صاحب کی رائے کو وہ محمود سمجھتے تھے۔ اور اسی میں لکھا ہے کہ ابن مبارکؒ کہا کرتے تھے کہ اثر پر اعتماد کرو اور وہ رائے اختیار کرو جو تفسیر حدیث کرے۔ انتہی۔

دیکھئے! اُنہوں نے صرف اُس رائے کے اختیار کرنے کی اجازت دی جو تفسیر حدیث ہو۔ اور امام صاحب کی رائے کے وہ ایسے دلدادہ تھے کہ عمر بھر اُن ہی کی خدمت میں رہے اور امام صاحب کے انتقال کے بعد فقہ حنفیہ کی کتابوں کو تلاش کر کے اُن کا مطالعہ کیا کرتے اور آخر صاف کہدیا کہ اُن کی رائے تفسیر حدیث ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کی رائے اُن کے نزدیک مستند اور محمود تھی۔

ابن عبدالبرؒ نے کتاب ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں ایک باب ہی مذمت رائے میں لکھا ہے، جس کا عنوان یہ ہے: ''باب ما جاء فی ذم القول فی دین اللہ بالرأی والظن بالقیاس''۔ اور اُس میں کئی حدیثیں اور اقوال صحابہ وتابعین ذکر کئے ہیں، جن

میں رائے اور قیاس کی مذمت بالتصریح ہے۔اس باب کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ رائے اور قیاس کے وہ سخت دشمن تھے اور امام صاحب پر محدثین نے جوطعن وتشنیع کی، وہ بھی اُس میں ذکر کیا ہے، مگر آخر باب میں لکھ دیا کہ جن محدثین نے امام صاحب سے روایت اور اُن کی توثیق وتوصیف کی ہے وہ بہ نسبت اُن محدثین کے، جنہوں نے اُن میں کلام کیا ہے، زیادہ ہیں۔اور اُسی میں لکھا ہے کہ علمائے امت سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ کوئی حدیث شریف اُس کے نزدیک ثابت ہو اور وہ اُس کو رد کر دے، البتہ یہ ہوتا ہے کہ اُس حدیث کی سند میں کلام ہوتا ہے یا وہ حدیث دوسری حدیث یا اجماع کی وجہ سے منسوخ سمجھی جاتی ہے یا کوئی اصل ایسا ہوتا ہے، جس کے انقیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ان وجوہ سے اُس حدیث پر عمل نہیں کیا جاتا۔اگر بغیر اُن اسباب کے کوئی عالم کسی حدیث کو اپنی رائے سے رد کر دے تو اُس کی عدالت باقی نہیں رہ سکتی، چہ جائیکہ وہ امام سمجھا جائے اور ابوحنیفہ پر سوائے رائے کے یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ مرجی تھے۔اور اُس کے سوا حسد کی وجہ سے ایسی ایسی باتیں اُن کی نسبت تراشی گئیں کہ اُن کے لائق نہیں۔حالانکہ ایک جماعت علما نے اُن کی ثنا وصفت کی اور اُن کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے، اگر ہمیں فرصت ہوگی تو اُن کے فضائل میں ایک کتاب لکھیں گے۔انتہی ملخصاً۔

اب دیکھئے! ایسے متشدد اور رائے کے دشمن شخص امام صاحب کے خاص فضائل میں ایک کتاب لکھنے کو مستعد ہیں تو اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ امام صاحب کی رائے اُن کے نزدیک محمود تھی یا مذموم؟

الحاصل اکابر محدثین کی تصریحات سے ثابت ہے کہ امام صاحب اُن اہل الرائے میں سمجھے جاتے تھے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے اراکین دین اور مفتیان شرع متین تھے، جس سے آپ کی کمال فضیلت اور عظمت ثابت ہے، جو دوسرے محدثین کو

نصیب نہیں۔مگر مخالفین کو وہ کب گوارا تھا، وہ ہمیشہ مدح کو ذم بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ابھی معلوم ہوا کہ حدیث ’’**انت منی بمنزلۃ ہارون**‘‘ میں ہارون کو قارون بنا ہی دیا۔اوراس پر قرینہ جما دیا۔اسی کو دیکھ لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کیسے ظاہر و باہر تھے، جن سے جوق جوق اہل انصاف اسلام لاتے جاتے تھے، ایسے معجزوں کو حاسدوں نے سحر قرار دے کراس بات کی شہرت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساحر ہیں۔**نعوذ باللہ من ذالک**۔اسی طرح قرآن کو’’**اساطیر الاولین**‘‘یعنی کہانیاں کہتے تھے۔اس قرینہ سے کہ اُس میں اُمَمِ سابقہ کے واقعات بھی مذکور ہیں۔حالانکہ اُن عبرت انگیز واقعات میں کس قدر فوائد ومنافع ملحوظ ہیں۔

چونکہ اُس زمانہ میں اہل مذاہب باطلہ، رائے لگا لگا کر احادیث کو رد کر دیا کرتے تھے، جیسا کہ ابن عبدالبرؒ نے جامع مذکور میں لکھا ہے کہ جہم وغیرہ اپنی رائے سے حدیثوں کو رد کرتے تھے۔چنانچہ اُن کا قول ہے کہ قیامت میں بھی رؤیت الٰہی نہ ہوگی، کیونکہ رؤیت ہو تو جہت وغیرہ لازم آتی ہے۔اوراُسی بنا پر حدیث ’’**انکم ترون ربکم یوم القیامۃ**‘‘ کو ردکر دیااورقولہ تعالیٰ ’’**وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ**‘‘ میں ایسی تاویلیں کیں کہ نہ اہل لسان جانتے ہیں نہ اہل اثر۔اور عذاب قبر کے باب میں حالانکہ احادیث بکثرت وارد ہیں اور حد تواتر کو پہونچ گئے ہیں، مگر سب کو رد کر دیا۔اور نیز احادیث شفاعت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ دوزخ میں جو گیا پھر وہ اس سے نہیں نکل سکتا۔انتہی۔

حاسدوں کو لفظ اہل الرائے سے موقع مل گیا کہ امام صاحب کو محدثین نے جو اہل الرائے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی رائے مذموم ہےاوروہ اہل مذاہب باطلہ میں شامل ہیں۔اوراُس پر چند مسائل بھی پیش کر دیئے، جو بظاہر بعض احادیث کے مخالف ہیں۔حالانکہ دراصل وہ مخالفت ایسی ہے جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ زکوٰۃ میں حدیث

صحیح کی مخالفت کی تھی ۔غرض کہ یہ افسوں، ناواقف لوگوں پر بہت جلد اثر کر گیا اور طلبہ میں عام شہرت ہوگئی کہ امام صاحب اہل الرائے میں ہیں، یعنی مخالف احادیث اپنی رائے قائم کیا کرتے ہیں ۔اس طوفان بے تمیزی نے یہاں تک اثر کیا کہ اکابر محدثین ہر چند اُن کو سمجھاتے کہ امام صاحب محدثین وفقہا میں فرد لاثانی اور تقویٰ وتورع میں بے نظیر تھے اور خوف خدا، انہیں اس درجہ تھا کہ کوئی بات دین میں انہوں نے نہیں بڑھائی ۔مگر، وہ کم فہم، کج بحثی سے یہی کہے جاتے کہ محدثین نے اُن کو اہل الرائے کہد یا ہے، اس لئے ہم نہ اُن کی حدیث لیں گے اور نہ اُن کے اقوال ! ۔آخران حضرات کو یہ کہنا پڑا کہ وہ اہل الرائے میں تھے ہی نہیں، چنانچہ کردریؒ نے عبدالعزیز ابن رواداور یٰسین زیات کا قول نقل کیا ہے کہ ''**اصحاب الرأی اعداء السنة وهم الحرورية و اهل الهواء . و اما ابو حنيفة و اصحابه فهم قاسوا على السنة**'' یعنی اصحاب الرائے سنت کے دشمن ہیں اور وہ فرقۂ حروریہ اور اہل ہوا ہیں، لیکن ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب سُو، انہوں نے سنت پر قیاس کیا ہے ۔یعنی اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کہی جیسے حروریہ یعنی خوارج وغیرہ فرق باطلہ کہا کرتے ہیں ۔

''ملل ونحل''میں شہرستانی اور ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ خوارج کے بعض فرقوں نے صبح کی نماز ایک رکعت اور شام کی نماز ایک مقرر کی تھی اور سورہ یوسف کو کلام الٰہی نہیں سمجھتے تھے، اس لئے کہ اس میں عشق کا قصہ مذکور ہے، جس کا بیان عقلاً شان کلام الٰہی سے بعید ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ اہل ہوا اپنی رائے کے مقابلہ میں نہ کلام الٰہی کو کوئی چیز سمجھتے ہیں نہ احادیث نبویہ کو ۔بخلاف امام صاحب کے کہ وہ اپنی رائے سے قرآن وحدیث کو ثابت اور واضح کرتے ہیں، جیسا کہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ'' **لا تقولوا رأی ابی حنیفة ، ولکن قولوا تفسیر الحدیث ۔ ذکره الکردریؒ** '' یعنی ابوحنیفہ کی رائے مت

کہو بلکہ اُس کو تفسیر حدیث کہو۔

ابن مبارکؒ نے جب دیکھا کہ سُفہاء نے فقہ کو امام صاحب کی رائے قرار دی ہے اور وہ جانتے نہیں، رائے صائب کس درجہ کی چیز ہے اور رائے کو انہوں نے صرف مذموم سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ فقہ رائے ہے ہی نہیں، وہ تو تفسیر حدیث ہے۔ یہ قول بھی ابن مبارکؒ کا اوپر مذکور ہوا کہ اگر رائے سے کہنے کی کسی کو اجازت ہوتی تو ابو حنیفہ اُس کے زیادہ تر مستحق تھے۔ اس میں انہوں نے امام صاحب کی رائے کی تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرا دیا کہ باوجود اس اصابت رائے کے، اُن کو بھی اجازت نہ تھی کہ اپنی رائے سے کوئی بات دین میں زیادہ کریں۔ اس لئے انہوں نے اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کہی، بلکہ جو کچھ کہا وہ سب تفسیر حدیث ہے۔

الحاصل جس معنی کے لحاظ سے طلبہ بہ تقلیدِ مخالفین، امام صاحب کو اہل الرائے کہا کرتے تھے، اکابر محدثین نے اُس کو رد کر دیا اور اُن اصحاب الرائے میں آپ کو سمجھتے تھے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ایک خاص جماعت اس نام اور صفت کے مصداق تھی۔

اگر کہا جائے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی امام صاحب کی رائے پر اعتراض کیا ہے، جیسا کہ ''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا کہ کونسی چیز ابو حنیفہ کی ناپسندیدگی کا باعث ہوئی ؟ کہا: رائے۔ سائل نے کہا: رائے تو امام مالک بھی مسائل میں لگایا کرتے تھے؟۔ کہا: ابو حنیفہ اس باب میں اُن سے زیادہ تھے۔ کہا: جب مالک بھی اس بات میں شریک تھے تو بقدر حصہ ان میں بھی کلام کیا جاتا، ابو حنیفہ کی تخصیص کی کیا وجہ؟ امام احمدؒ سے اس کا جواب نہ ہو سکا اور ساکت ہو گئے۔ انتہی۔

قبل جواب یہ بات معلوم کی جائے کہ امام احمدؒ کے اکثر اساتذہ امام صاحب کے مداح اور معتقد رہے۔ چنانچہ اسی ایک سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ امام احمدؒ، وکیع اور یحییٰ ابن القطان کے

شاگرد ہیں۔اور وکیع ،سفیان ثوریؒ کے شاگرد ہیں اور ثوری شعبہؒ کے اور شعبہ،اوزاعیؒ کے شاگرد ہیں اور اوزاعی ،عطاء ابن ابی رباح کے شاگرد ہیں ۔اب دیکھئے کہ اس تمام سلسلہ کے حضرات امام صاحب کے مداح ہیں اور اُن کو وقعت کی نظروں سے دیکھا کئے ۔ چنانچہ امام موفقؒ نے مناقب میں لکھا ہے کہ حارث ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ عطاء ابن ابی رباح کی مجلس میں طلبہ کی وہ کثرت ہوا کرتی تھی کہ آگے پیچھے جہاں جگہ مل جاتی ، بیٹھ جاتے ،مگر جب ابوحنیفہؒ آتے تو عطاء لوگوں کو ہٹا کر اپنے پاس اُن کو جگہ دیتے ۔

اب عطاء کے حلقۂ درس کا حال بھی سُن لیجئے کہ اُس میں ایوب اور حسین معلم اور ابن جریج اور اسحٰق اور اوزاعی رحمہم اللہ جیسے سر آمد روزگار رہا کرتے ،جیسا کہ ''تذکرۃ الحفاظ'' میں لکھا ہے۔

اب غور کیجئے کہ جب ایسے جلیل القدر استاذ کے حلقۂ درس میں اور ایسے معزز ہم درسوں کی جماعت میں امام صاحب کی یہ عزت طالب علمی کے زمانہ میں تھی تو کس درجہ اُن کو معزز سمجھنا چاہئے ؟۔سالیکہ نحوست از بہارش پیداست ۔غرض کہ عطاءؒ نے امام صاحب کی توقیر کر کے تمام علما کے نظروں میں انہیں با وقعت ثابت کر دیا ۔اُن کے بعد اوزاعیؒ نے امام صاحب سے گفتگو کر کے اُن کے فضل وکمال کو تسلیم کر لیا۔ پھر شعبہ نے امام صاحب کی تعریفیں کیں ۔ پھر سفیان ثوریؒ نے تعظیم وتکریم اور اُن کی کتابوں کی قدردانی کی ، پھر وکیع اور یحییٰ رحمہما اللہ نے تو اُن کو اپنا مقتدا ہی بنا لیا،جیسا کہ یہ تمام امور سابقاً مکرر مذکور ہو چکے ہیں ۔ جب امام احمدؒ کے پانچ درجوں کے استادوں نے امام صاحب کو معظم اور قابل قدر تسلیم کر لیا ،اور بعضوں نے اپنا مقتداء دین میں بنا لیا تو امام احمدؒ کا قول ان حضرات کے مشاہدات کے مقابلہ میں کیونکر قابل وثوق ہوسکتا ہے؟۔کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس سلسلہ کے اساتذہ جس کو سلسلۃ الذہب کہنا چاہئے ،ایسے بے تدین لوگ تھے کہ بغیر تحقیق کے ایک غیر متدین ،مطعون شخص کی تعریفیں بالاتفاق کر کے مسلمانوں کو

دھوکا دیا؟۔**معاذ الله** ہرگز نہیں۔ پھر صرف اسی ایک سلسلہ کے اساتذہ نے امام صاحب کی توثیق نہیں کی ، بلکہ بیس، پچیس استادوں کی توثیق تو اسی کتاب میں مذکور ہوچکی۔ یہ حضرات اس جلالت شان کے تھے کہ جس پر انہوں نے جرح کی ، قیامت تک اُس کا اندمال نہ ہوسکا۔ غور کیا جائے تو امام احمدؒ کی نسبت یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ اپنے مستند اساتذہ سے امام صاحب کی تعریفیں سننے کے بعد وہ بھی اُن سے بدگمان رہے ہوں، بلکہ ظن غالب ہے کہ انہوں نے بعض محدثین کا خیال امام صاحب کی نسبت بیان کردیا۔ اوراُس پر قرینہ یہ ہے کہ وہ امام صاحب کی تعریف وتوصیف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ''الخیرات الحسان'' میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ ''ابوحنیفہ'' اہل ورع اورزہد سے تھے۔ انہوں نے آخرت کو ایسے طریقے سے اختیار کیا کہ دوسرے سے ہونا مشکل۔ بادشاہ وقت کی جانب سے خدمت قضا قبول کرنے پر اصرار اورتشدد ہوا اورکوڑے لگائے گئے ،مگرانہوں نے قبول نہ کیا۔خدا کی اُن پررحمت اوررضامندی ہو۔انتہی۔

اوراُن کا یہ قول بھی اوپر مذکور ہوا کہ ابوحنیفہؒ اورابویوسفؒ اورمحمد **رحمهم الله** کا جس مسئلہ میں اتفاق ہوتو کسی کی مخالفت سننے کے قابل نہیں۔ اگرامام صاحب کی رائے کو وہ قبیح سمجھتے تو اُن کے ورع وغیرہ کی تعریف کبھی نہ کرتے۔ اس لئے کہ جوشخص خلاف شرع عقلی بات، دین میں داخل کردے تو اُس کا تورع کجا، فاسق ہونے میں اُس کے کسی کوکلام نہیں۔ اُن کومتورع کہنے سے ثابت ہوگیا کہ امام صاحب کی رائے کو وہ مخالفِ حدیث نہیں سمجھے۔

اوراگر بفرض امام احمدؒ قیاس اورتفقہ کے قائل نہ تھے تو وہ مجتہد تھے، اُن کو اپنے اجتہاد اور ظن پرعمل کرنا ضروری تھا، مگراُن کے اجتہاد کا اثر امام صاحب اور دوسرے محدثین کے اجتہاد پر پڑ نہیں سکتا۔ اور چونکہ تفقہ اورقیاس قرآن وحدیث وعمل صحابہ وتابعین سے ثابت ہے، جس کے دلائل بکثرت ہیں اورابھی بخاری شریف کی حدیث سے ثابت ہوا، اور اجتہاد میں کثرت علم اوروفورعقل کی ضرورت ہے، جن کا وجود امام صاحب میں **علی**

وجہ اتم تھا، جیسا کہ اکابرِ دین کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ وہ **اعلم الناس** اور **اعقل الناس** تھے، اس لئے اُن کا تفقہ اوراجتہاد سب سے بڑھ گیا۔ اسی وجہ سے محدثین نے اُن کو **افقہ الناس** اور **سید الفقہاء** کہا اورامام شافعیؒ۔ جو امام احمد ابن حنبل کے استاذ ہیں۔ فرماتے ہیں ''**الناس عیال لابی حنیفة فی الفقه**'' اور امیر المومنین فی الحدیث نے اُن کو امام اعظم کا لقب دیا۔ اورامام احمدؒ ان تمام امور سے غالباً واقف رہے۔ اس وجہ سے یہ ہرگزنہیں کہہ سکتے کہ وہ امام صاحب کی رائے کو مذموم اور فقہ کوخلافِ حدیث سمجھتے تھے۔

تقریرِ سابق سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ مخالفین کے نزدیک اہل الرائے کے معنیٰ یہ تھے کہ اپنی رائے سے وہ احادیث کورد کردیا کرتے ہیں اور محققین، **اھل الرائے** اُن اکابر محدثین کو سمجھتے تھے جن میں فتویٰ دینے کی قابلیت ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے جو''انصاف'' میں لکھا ہے: ''**المراد من اھل الرأی قوم توجھوا بعد المسائل المجمع علیھا بین المسلمین او بین جمھورھم الی التخریج علی اصل رجل من المتقدمین ' وکان اکثر امرھم حمل النظیر علی النظیر، والرد الی اصل من الاصول دون تتبع الاحادیث و الآثار۔ والظاھری من لا یقول بالقیاس ولا باثار الصحابة والتابعین کداؤد و ابن حزم ' وبینھما المحققون من اھل السنة کأحمد و اسحٰق**''۔

سو یہ اصل اہل الرائے کی تعریف نہیں ہوسکتی، منشا اس تعریف کا یہی ہوگا کہ جس طرح ابن مبارکؒ نے عوام الناس کے خیال سے امام صاحب کو اہل الرائے سے علحدہ کردیا، اسی طرح شاہ صاحب نے بھی علحدہ کردیا۔ جیسا کہ ''**توجھوا الی التخریج علی اصل رجل من المتقدمین**'' اور''**اکثر امرھم حمل النظیر**'' اور **دون تتبع الاحادیث والآثار** سے ظاہر ہے۔ اس لئے کہ امام صاحب تو احادیث کوتلاش کرکے

اُن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔ اوراس باب میں وہ کسی کے اصل کے پابند بھی نہ تھے، بلکہ مجتہد مطلق تھے۔ شاہ صاحب نے اہل الرائے کی جو تفسیر کی ہے، البتہ اُن کے زمانہ کے فقہاء پر صادق تھی، جیسا کہ ''**حمل النظیر علی النظیر**'' اور ''**التخریج علی اصل رجل من المتقدمین**'' سے ظاہر ہے۔ رہا یہ کہ جس معنی کے لحاظ سے امام صاحب کو افتخار اہل الرائے کے امام ہونے کا حاصل ہے، جس میں نہ امام احمد شریک ہو سکتے ہیں نہ اسحٰق وغیرہ۔ سواس کو عوام الناس کے خیال سے بیان نہیں کیا اور علما کی وسعت علمی پر حوالہ کر دیا، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اکابر محدثین نے اُس جماعت اہل الرائے میں اُن کو شریک کیا ہے جس کی ابتداء صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی ہے، جس کی رائے شریعت میں محمود سمجھی جاتی ہے۔ غرض کہ اکابر محدثین نے امام صاحب کی جماعت کو اہل الرائے کے لقب سے ملقب کیا، وہ بدنیتی سے نہ تھا، بلکہ اُس سے اُن کی مدح مقصود تھی۔

التماس بخدمت حضرات غیر مقلدین

اب ہم حضرات غیر مقلدین کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ جب امیر المؤمنین فی الحدیث وغیرہ شیوخِ محدثین کی گواہیوں سے ثابت ہوگیا کہ لاکھوں احادیثِ صحیحہ تلف ہوگئیں اور اکابر محدثین فقہ پر عمل کرتے آئے۔ تو اب اہل اسلام، تقلید سے کیوں روکے جاتے ہیں؟ اور جو عذر کیا جاتا ہے کہ فقہ کے چند مسائل احادیث موجودہ کے مخالف ہیں، سو وہ معقول نہیں۔ اس لئے کہ اکابر محدثین نے فقہ کو تفسیر حدیث کہا ہے اور وہ اسی وقت صادق آئیگا کہ وہ مسائل دوسری احادیث صحیحہ کے موافق ہوں، جن کا تلف ہونا امام بخاریؒ کی شہادت سے ثابت ہے۔ اگر ایسے قرائنِ واضحہ بھی اعتبار کے قابل نہ ہوں تو بخاری شریف بھی قابل اعتبار نہ رہے گی!۔ کیونکہ اُس میں جتنی حدیثیں ہیں، سب وہ ہیں جو مفید قطع نہیں ہوسکتیں۔ پھر اس کو معتمد علیہ بنانے والی کون چیز ہے؟ وہی قرینۂ خارجیہ ہے یعنی جلالت

شان مصنفؒ ۔ہاں ! اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ کل صحیح حدیثیں بخاری شریف میں موجود ہیں اور کوئی تلف نہ ہوئی، یا امام بخاری نے کل واجب العمل حدیثوں کو جمع کر دیا ہے اور ان ہی کا واجب العمل ہونا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہو جاتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ واقعی وہ مسائل مخالف حدیث ہیں۔مگر یہ دونوں امر نہ ثابت ہوئے، نہ ہو سکتے ہیں، پھر صرف احتمال پر فقہ کو بے اعتبار کہنا کیونکر صحیح ہوگا ؟۔اور احتمال بھی کیسا کہ اکابر محدثین کی تصریحات اُس کو رد کر رہی ہیں، کیونکہ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ فقہ حنفیہ، حدیثوں کی تفسیر ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے : لاکھوں علماء جن میں ہزار ہا ماہرینِ حدیث ہیں، برابر تقلید مذاہب کرتے آئے، اور بلاد اسلامیہ میں جس قدر مقلدین کی کثرت ہے محتاج بیان نہیں، اہل نجد باوجود یکہ نہایت متشدد ہیں، مگر وہ بھی حنابلہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔غرض کہ تقریباً کل اہل سنت و جماعت مقلد ہیں، ان سب کو گمراہ اور مستحق دوزخ قرار دینا کیونکر صحیح ہوگا۔؟

اس موقع پر یہ کہا جاتا ہے کہ اہل حق تھوڑے ہی ہوا کرتے ہیں، سو وہ صحیح نہیں۔اس لئے کہ اگر یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے تو کُل فِرَقِ باطلہ اہل سنت و جماعت کے ساتھ نسبت لگا کر اپنی قلت کو حقانیت کی دلیل بتائیں گے، کیونکہ کسی زمانہ میں کسی فرقہ کے لوگوں کی تعداد اہل سنت کی تعداد کو نہیں پہونچی۔

ادنیٰ تامل سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ گمراہ تو اُس کو سمجھنا چاہئے جو قرآن و حدیث کو نہ مانے۔اور مقلدین کے مذہب کا مدار قرآن و حدیث پر ہے۔کیونکہ ''فقہ حنفیہ'' قرآن و حدیث ہی کا خلاصہ ثابت کرتے ہیں، جس پر اکابر محدثین نے بھی گواہی دی ہے۔اور یہ کبھی ثابت نہیں ہوسکتا کہ بخاری شریف میں تمام احادیث اور قرآن جمع ہے یا وہ سب کا خلاصہ ہے، باوجود اپنے دلائل و قرائن کے، اس فکر میں لگے رہنا کہ مقلدین کسی طرح گمراہ اور دوزخی بنائے جائیں، کس قدر ظلم اور اصول اسلامیہ سے کس قدر دور ہے؟۔حکم تو یہ ہو رہا ہے کہ ''کونوا عباد اللہ اخوانا'' اور یہاں عمل یہ ہو رہا ہے کہ اگر بس چلے تو پہلے

مقلدوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور اُس پر دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ پہلے گھر کو صاف اور پاک کیا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہمیشہ مار پیٹ اور مقدمہ بازیاں ہوتی رہتی ہیں، جس میں طرفین کا زور و زر بے انتہا خرچ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ دوسرے اقوام اور اہل مذاہب باطلہ موقع پا کر اسلام پر حملہ پر حملہ کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ عقائد اسلامیہ میں خدشے پیدا کر کے لاکھوں مسلمانوں کو انہوں نے متزلزل کر دیا، بلکہ عیسائی اور آریہ وغیرہ بنا ڈالا۔ اگر طرفین کے علما متفقہ کوشش سے مخالفوں کی مدافعت کرتے تو کیا ممکن تھا کہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی سر اٹھا سکتا۔

افسوس ہے کہ جس قدر طبیعت کا زور ہے، اس میں صرف کیا جاتا ہے کہ چند فقہی مسائل احادیث کے مخالف ثابت ہو جائیں، حالانکہ جب سے بخاری شریف بنی ہے، یہی مسائل معرکۃ الاراء ہیں۔ اور طرفین سے سوال و جواب ہوا کئے، جو کتابوں میں مذکور ہیں۔

اب ان باتوں سے کوئی فائدہ جدید نہیں ہوسکتا، بلکہ نقصان یہ ہو رہا ہے کہ اس خانہ جنگی نے دونوں گروہ کو ایسا باہم مشغول کر رکھا ہے کہ خبر تک نہیں کہ مخالفوں کے حملوں سے اسلام پر کیا گزر رہی ہے۔

خدائے تعالیٰ کو کیا جواب دیا جائیگا، جب یہ سوال ہوگا کہ تمہاری خانہ جنگیوں نے ہزار دینداروں کو بے دین اور ضعیف الایمان بنا دیا اور اسلام کو ضعیف کر دیا؟۔ کیا آیۃ شریفہ ” **ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم**“ وغیرہ آیات و احادیث تمہیں پہونچی نہ تھی۔

بہرحال اس زمانہ میں یہ امر علماء کے پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر کوئی مقلد یا غیر مقلد رہے تو وہ نہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگا نہ عمل بالحدیث سے۔ بخلاف اُس کے اگر کوئی مسلمان مخالفوں کے دام میں آ جائے تو اسلام ہی سے خارج ہو جائیگا۔ اس لئے علماء طرفین کو اس کی روک تھام ضروری ہے۔ **و ما توفيقنا الا بالله ۔ و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمين ۔**